جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو
(حضرت والا دامت برکاتہم)

حضرت والا کے سامنے مجلس میں کی گئی اشعار کی تشریحات وتقریرات کا مجموعہ

جلد اوّل

شارح
حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند
استاذ الحدیث دار العلوم آزادول جنوبی افریقہ

خلیفہ ومجاز بیعت
شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو
(حضرت والا دامت برکاتہم)

حضرت والا کے سامنے مجلس میں کی گئی اشعار کی تشریحات وتقریرات کا مجموعہ

عرفانِ محبت
شرح
فیضانِ محبت

جلد اوّل

مجموعہ کلام
شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

شارح
حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند
استاذ الحدیث دار العلوم آزادول جنوبی افریقہ

خلیفہ و مجازِ بیعت
شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ

فہرست

افتتاحیہ

۱۲؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ

اس طرح دردِ دل بھی تھا میرے بیاں کے ساتھ
جیسے کہ میرا دل بھی تھا میری زباں کے ساتھ
اختؔر

احقر کا مجموعۂ کلام بعنوان ''فیضانِ محبت''، جس کے تقریباً نوّے فیصد اشعار میری زندگی کے ۶۶ سال کے بعد اچانک قلب کی آہ وفغاں کے ساتھ زبان ترجمان دردِ دل سے نمودار ہوئے اور بعض راتوں میں بے ساختہ آنکھ کھل گئی اور نیند غائب ہوگئی اور بغیر محنت وکاوشِ دماغی محض عطائے رحمتِ حق تعالیٰ شانہٗ سے یہ اشعار موزوں ہوگئے۔ جو درحقیقت اس مضمون کے حقیقی ترجمان ہیں ؎

دیکھ کے اپنے ضعف کو اور قصورِ بندگی
آہ و فغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں
اختؔر

راقم الحروف
حکیم محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہ، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ دعائیہ

حضرت اقدس عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

محبی المکرّم مفتی محمد امجد صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ نے میرے اشعار کی تشریح قرآن وحدیث سے مدلل کی ہے قابل وجد ہے اور اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر تشریح کوئی نہیں کرسکتا تھا یہ صرف مفتی صاحب ہی کا حصہ ہے اس تشریح سے عوام کے لیے ان اشعار کا سمجھنا اور عمل کرنا آسان ہوگیا اور اشعار میں جو ابہام ہوتا ہے جس سے عوام الناس اشکالات کا شکار ہوجاتے ہیں قرآن وحدیث کے حوالوں سے وہ رفع ہوگیا اور الحمدللہ ثابت ہوگیا کہ ہر شعر حدود شریعت وسنت کے دائرہ میں ہے اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ اشعار منجانب اللہ قلب پر وارد ہوئے ہیں بالقصد موزوں نہیں کیے گئے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی محنتوں کو قبول فرمائے اور پورے اشعار کی تشریح کی باحسن وجوہ تکمیل فرمائے اور قیامت تک کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہ
۲۸؍شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ
مطابق ۲۰؍اگست ۲۰۰۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا یونس پٹیل صاحب دامت برکاتہم (سابق) صدر جمعیت علماء جنوبی افریقہ نیٹال

فیضانِ محبت کے افتتاحیہ میں سیدی و مرشدی عارف باللہ حضرت شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم نے تحریر فرمایا ہے کہ اس مجموعہ کلام کے تقریباً نوے فیصد اشعار حضرت اقدس کی زندگی کے ۶۶ رسال کے بعد اچانک قلب کی آہ وفغاں کے ساتھ زبان ترجمان دردِ دل سے نمودار ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہ اشعار بغیر محنت و کاوش دماغی محض عطائے رحمت حق تعالیٰ شانہٗ سے موزوں ہوگئے اس کے بعد اب ان اشعار کے الہامی ہونے میں ہم لوگوں کو کیا شک ہوسکتا ہے۔

بہرحال حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا علامہ یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر سینکڑوں اکابر علماء حق محدثین مفسرین مشائخ طریقت نے حضرت اقدس کی پاکیزہ زندگی، بلند خیالی، حسنِ ذوق، عظیم نسبت مع اللہ اور کمال درجہ کے عشق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت دی ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلیفہ ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس دامت برکاتہم کو ایسا کیف باطن عطا فرمایا ہے جو دوسروں کے لیے بھی کیف آفریں ہے۔

بہرحال حضرت دامت برکاتہم کا فیضان محبت میں حمد باری تعالیٰ ہو یا نعتیہ کلام ہو یا نظمیں ہوں سب دل پر عجیب اثر اور کیفیت پیدا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت اور اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، عشق مجازی سے نجات ملتی ہے اور عشق حقیقی کا حصول ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی امجد صاحب دامت برکاتہم نے حضرت اقدس کے روحانی اور الہامی اشعار کی جو تشریح کی یہ انہی کا کمال ہے بلکہ بہت سے مقامات میں تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی تشریح ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت اقدس کی پوری توجہ دعاؤں اور فیض کی وجہ سے قلم اور زبان تو حضرت مفتی امجد صاحب دامت برکاتہم کی ہے لیکن مضامین اور تشریح حضرت اقدس دامت برکاتہم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی اس محنت اور عظیم خدمت کو بے انتہاء شرف قبولیت بخشیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت سیدی و مرشدی دامت برکاتہم کا سایہ تادیر صحت و عافیت کے ساتھ ہم لوگوں کے سروں پر سلامت رکھیں، آمین۔

محتاج و طالب دعا

احقر یونس یوسف پٹیل غفرلہٗ

۲۵ رشعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۷ راگست ۲۰۰۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم آزادوِل جنوبی افریقہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْكَرِیْمِ

حضرت مفتی امجد صاحب، عارف باللہ رومی وقت مجدد زمانہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے خصوصی خلفاء میں سے ہیں اور ساؤتھ افریقہ سے حضرت والا کی خدمت میں برابر حاضری دیتے رہتے ہیں حضرت والا کی مجالس میں جب حضرت کے کوئی خصوصی خلیفہ یا مہمان ہوتے ہیں تو حضرت والا ان سے بیان کرواتے ہیں۔

حضرت مفتی امجد صاحب نے حضرت والا کے اشعار کی تشریح شروع کی اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت رہی اور حضرت والا کی خصوصی توجہ سے عجیب وغریب تشریح ہوتی رہی جس میں خاص بات یہ رہی کہ ہر شعر کو قرآن وحدیث سے ثابت کرتے ہیں حضرت والا کو یہ تشریحات بے حد پسند آئیں اور دعا دیتے رہے اور حاضرین مجلس پر بہت زبردست اثر ہوتا رہا حاضرین بہت اہتمام سے کیسٹ لیتے رہے اور سنتے اور سناتے رہے چاروں طرف سے تقاضے ہوئے بلکہ اصرار تک کی نوبت پہنچی کہ ان تشریحات کو قلم بند کیا جائے تو یہ مرحلہ طے ہوا اور آپ کے ہاتھ میں ان تقاریر وتشریحات کا سنہرا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو حضرت مفتی صاحب کے حق میں قبول فرمائے بارآور فرمائے نجات کا سامان اور آخرت کا ذخیرہ بنائے اور ہم سامعین وقارئین کے لیے مشعل راہ بنائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے قبول فرمائے۔

جَزَاهُمُ اللهُ خَيْرًا

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ

(مولانا) عبدالحمید (صاحب دامت برکاتہم)
مہتمم دارالعلوم آزادول، جنوبی افریقہ

❁❁❁❁

پیش لفظ از شارح کتاب

توفیق الٰہی وفضل الٰہی اور میرے محبوب شیخ ومرشد عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خاص دعاؤں اور توجہات کا ثمرہ ونتیجہ ہے کہ احقر سے حضرت والا کی کتاب فیضان محبت کے اشعار کی تشریح وتوضیح کا کام ہوگیا ورنہ حقیقت حال تو یہ ہے کہ احقر نہ تو علمی لحاظ سے اس قابل تھا اور نہ ہی عملی اعتبار سے لیکن بہرحال جب اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو پھر اس کے لیے اسباب بھی بنتے چلے جاتے ہیں کیونکہ جس طرح اسباب سے نتائج امر حق کے تابع ہیں اسی طرح اسباب بھی اپنے وجود میں امر الٰہی کے پابند ہیں۔

چنانچہ صورتِ حال یہ ہوئی کہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۷ء میں احقر کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ مدرسہ سے چھٹی لے کر ایک لمبی مدت کے لیے اپنے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیے کیونکہ ہمارے تقریباً تمام ہی دیو بند وسہارنپور کے بزرگانِ دین اپنے مشائخ کی صحبتوں میں طویل عرصہ کے لیے قیام کیا کرتے تھے اور تزکیہ نفس وتصفیہ اخلاق کے باب میں ان سے مستفید ہوتے تھے صرف مدارس سے سندِ فراغت لینے کو اپنے لیے کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے قال کو حال میں بدلنے کے لیے کوشاں رہتے تھے حسب ارشاد مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو

پیش مرد کاملے پامال شو

تو اسی جذبۂ وارادہ کے تحت احقر نے اپنے دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی اور اس میں صاف صاف لفظوں میں اپنا مقصود پیش کردیا۔ بحمداللہ تعالیٰ حضرت مہتمم صاحب نے نہ صرف یہ کہ ایک سال کی رخصت منظور فرمائی بلکہ بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار فرمایا اور مقاصد میں کامیابی کے لیے اپنی خاص دعاؤں سے نوازا۔

اب دوسری جانب اہل وعیال کی شرعی ذمہ داری کا معاملہ سامنے تھا تو احقر نے توفیق الٰہی سے ایسی صورت اختیار کی کہ اس ذمہ داری کی شرعی واخلاقی حدود کی تکمیل کے ساتھ ساتھ حضرت والا کے پاس رہنا میسر ہوگیا اور اسی نظام کے تحت اواخر شوال میں کراچی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کی سعادت میسر آگئی اور حضرت والا سے اپنا مقصد سفر پیش کردیا کہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کے لیے حاضری ہوئی ہے جس پر حضرت والا بھی بہت خوش ہوئے البتہ فوراً یہ سوال کیا کہ مجالس کے علاوہ دیگر اوقات میں کیا مشغلہ رہے گا تو احقر نے عرض کردیا کہ حضرت کی مختلف کتابوں اور اپنے اکابر کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کرتا رہوں گا۔

جہاں تک فیضان محبت کی باقاعدہ شرح کا معاملہ ہے تو اس وقت اس کا کوئی خاص ارادہ ذہن میں نہیں تھا

اور نہ کوئی نظم وترتیب پہلے سے سامنے تھی ہاں وقتاً فوقتاً جب فیضانِ محبت کے اشعار سنتا تو یہ خیال دل میں آتا تھا کہ ان اشعار میں اس قدر جامعیت اور افادیت ہے کہ ان کو شرح بسیط کے ساتھ آیات واحادیث کے ساتھ مدلل کیا جانا چاہیے تاکہ عوام وخواص سب کے لیے اس کی افادیت عام وتام ہوجائے اس لیے کہ بلاشک وشبہ حضرت کے کلام کی تاثیر کو دیکھ کر فارسی کا یہ جملہ زبان پر آجاتا ہے ''از دل خیزد بر دل ریزد'' شعر ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہ ہو طاقت پروازمگر رکھتی ہے

اور میرے محبوب شیخ حضرتِ والا دامت برکاتہم کا شعر ہے ؎

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرح محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

ایک ایک شعر اس قدر معرفت ومحبت خداوندی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس قدر مؤثر اور نصیحت آموز ہے کہ کیسا ہی بے درد ہو اس کو سننے کے بعد درد آشنا ہوجائے اور اہل دل کے دلوں کو تڑپا کر رکھ دے جیسا کہ حضرت خالد اقبال تائب صاحب اس کی ترجمانی کچھ یوں کرتے ہیں ؎

یہ نہیں کہتے کہ یکدم باخدا ہوجائے گا
کم سے کم بے درد یاں درد آشنا ہوجائے گا

بہرحال دل میں گذرنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ایک صورت غیب سے وجود میں آگئی۔ وہ اس طرح کہ احقر کے بعض احباب نے حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ حضرت یہ اشعار پڑھنا جانتے ہیں اس لیے ان سے اپنا کلام فیضان محبت ہمیں سنوادیجیے اگرچہ اپنا معمول خانقاہ میں اپنے شیخ کے سامنے کان بن کر رہنے کا تھا زبان بن کر نہیں کیونکہ کان بن کر رہنا زیادہ مفید اور اسلم واحوط راستہ ہے اور اپنے اکابر ومشائخ کا طریقہ ہے اس لیے برسوں سے یہی معمول رہا کہ خانقاہ حاضر ہوتا اور حضرت کی مجالس میں شریک ہوکر استفادہ کرتا تھا اور اس میں بڑا لطف وحلاوت ملتی تھی اور مقصود اصلی جو کہ صحبت شیخ ہے وہ حاصل ہوجایا کرتا تھا مگر اس مرتبہ خود حضرت والا نے اپنے اشعار سنانے کا حکم فرمایا۔ احقر نے حضرت کا کلام ''سکونِ دل در مجلس اہلِ دل'' پڑھ کر سنایا جو بعینہٖ احقر نے حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہردوئی میں سنایا تھا اور اس کی اجمالی طور پر شرح پیش کردی جس سے حضرت والا اور دیگر اہل مجلس بہت ہی مسرور ہوئے اور پھر الامر فوق الادب کے اصول کے تحت حضرت والا کے حکم سے روزانہ مجلس میں اشعار فیضانِ محبت پڑھنے اور ان کی شرح کرنے کی ذمہ داری احقر کو سونپ دی گئی۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے تقریباً پوری کتاب کے اشعار پڑھ کر حضرت والا کے سامنے ان کی تشریح کا کام اسی مجلس عوام وخواص میں پورا ہوگیا۔ اور اگر کسی مقام پر بندہ کو شبہ ہوا تو حضرت

میر صاحب دامت برکاتہم سے اس کو رفع کرلیا گیا اس لیے دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت میر صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی تَوْفِیْقِہٖ وَکَرَمِہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔

دوسری جانب مسلسل خصوصی وعمومی احباب ان تشریحات کو کتابی شکل میں لانے کے لیے فرمائش پیش کرنے لگے کبھی یہ درخواست حضرت میر صاحب دامت برکاتہم سے کی جاتی اور کبھی یہی بات احقر کے کانوں تک پہنچتی یہاں تک کہ حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد اور خلیفہ حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب نے بھی اپنے سفر کراچی کے موقعہ پر ان تشریحات کو سن کر حضرت مولانا مظہر صاحب دامت برکاتہم سے فرمایا کہ ان تشریحات کو کتابی شکل میں لانا چاہیے۔ ہوتے ہوتے یہ بات حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے سامنے پہنچی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی طباعت وترجمہ عربی وانگریزی کی بھی بعض حضرات نے ذمہ داری لے لی۔ ان وجوہات کی بنیاد پر احقر نے اس جانب توجہ کی۔ اس سلسلہ میں محترم مولوی ومفتی محمد طاہر اور برادر مکرم جناب عارف بلوچ دل کی گہرائیوں سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی ترتیب کے ساتھ تمام تشریحات کو کیسٹوں میں جمع کررکھا تھا۔ احقر نے ان سے رابطہ کیا اور پھر بعض ایسے حضرات تیار ہوئے جو ان کیسٹوں سے نقل کرنے کا کام انجام دیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں مولوی عبدالولی (زرولی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ہمارے خصوصی محسن ومشفق محترم ومکرم جناب عبداللہ فیروز میمن صاحب کی خاص سعی وکوشش رہی کہ انہوں نے اپنے احبابِ خاص میں سے چند نقل کرنے والوں کو تیار کیا اور ماشاء اللہ انہوں نے بہت جلد یہ کام انجام دے دیا اور بِفَضْلِہٖ تَعَالٰی وَتَوْفِیْقِہٖ وَکَرَمِہٖ وَاِحْسَانِہٖ آج یکم رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۳/اگست ۲۰۰۹ء جلد اوّل کا کام مکمل ہوا اور جناب مفتی محمد عاصم کا کمپوزنگ کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس جلد اوّل میں فیضانِ محبت کے شروع کے پانچ عنوانات کی مکمل تشریح ہے (۱) حمد باری تعالیٰ (۲) مناجات (۳) نذرانہ عقیدت (۴) منقبت صحابہ (۵) درمدح شیخ۔ اور فیضانِ محبت کا آخری حصہ بنام ''کلامِ معرفت ومحبت'' میں سے شروع کی چند نظمیں ہیں جس میں حضرت والا کے دردِ دل اور سوزِ دروں کی تشریح ہے اور بقیہ نظموں کی تشریحات ان شاء اللہ جلد ہی ترتیب وتعلیق اور تصحیح وتنقیح کے مراحل سے گذر کر وہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ شارح ومرتب اور جملہ معاونین کو اخلاص کامل کی دولت عطا فرما کر اس شرح کو نفع خلق اور رضائے خالق کا ذریعہ بنادے اور ہم سب حضرت والا کے خدام ومتعلقین کو حضرت کی صحیح قدردانی اور حضرت کے فیوض سے پورے طور پر مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمادے۔

راقم السطور: محمد امجد قاسمی استاذ دار العلوم آزاد وِل، جنوبی افریقہ

مقیم حال خانقاہ امدادیہ اشرفیہ گلشن اقبال کراچی

یکم رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۳/اگست ۲۰۰۹ء

مقدمہ از شارح کتاب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ

شعر گوئی قرآن وسنت کی روشنی میں

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً﴾

(صحیح البخاری، کتاب الادب)

کہ بے شک بعض شعر حکمت آمیز ہوتے ہیں جو لوگوں کے لیے نافع ہوتے ہیں عام طور پر لوگ اشعار کے بارے میں اس مغالطہ کا شکار رہتے ہیں کہ اشعار کا پڑھنا پڑھانا بے کار لوگوں کا کام ہے اور شعر وشاعری اچھی چیز نہیں ہے بلکہ ان میں لگنا اپنے قیمتی اوقات حیات کو ضائع کرنا ہے کوئی خاص دینی نفع اشعار کے پڑھنے پڑھانے میں وابستہ نہیں ہے اسی لیے وہ ایسی مجالس سے دور رہتے ہیں جہاں حمد ونعت اور اصلاحی اشعار وغیرہ پڑھے جاتے ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر بعضوں سے تو یہ سنا گیا ہے کہ یہاں کوئی وعظ وبیان تو ہے نہیں اور یہ تو مشاعرہ ہو رہا ہے اس لیے اس میں شرکت کیوں کریں اور بعضوں نے تو اس حد تک تجاوز عن الحد کیا کہ یہ شعر وشاعری اور نظم ونعت خوانی یہ تو بریلوی اور بدعتی لوگوں کا کام ہے اپنے اہل حق علماء دیوبند کا اس سے کیا تعلق۔

یہ غلط فہمی ٹھیک اسی طرح ہے جیسے بعض اچھے خاصے دیندار اگر کسی عالم کو اپنی حفاظت ودفاع کی خاطر بندوق وپستول کی بات کرتے سنیں تو بڑی حیرت وتعجب سے کہتے ہیں کہ مولانا آپ بندوق اور پستول کو کیا کرو گے یہ تو بدمعاش اور غنڈے لوگوں کا کام ہے مگر افسوس کہ اس کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اسلحہ جب بدمعاشوں اور غنڈوں کے ہاتھ میں ہوگا تو اس سے بدمعاشی اور غنڈہ گردی پھیلے گی اور جب اہل صلاح واہل دین کے ہاتھوں میں ہوگا تو اس سے صلاح اور دین پھیلے گا۔

بس بالکل ایسا ہی معاملہ اشعار کا ہے کہ جب اشعار میں اللہ تعالیٰ کی محبت ومعرفت پیش کی جائے گی اور فنائے دنیا وزوالِ حسن عارضی پیش ہوگا تو پھر سامعین کے قلوب انوار محبت سے منور اور روشن ہوں گے۔ دراصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت سے بعض حضرات کو دھوکہ ہوا اور غلط فہمی ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پوری آیت نہیں پڑھی احقر اس آیت کو مع اس کی تفسیر کے پیش کیے دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝﴾

(سورۃ الشعرآء، اٰیۃ: ۲۲۵-۲۲۴)

مفسرین اور شراح بخاری نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے تین مشہور شاعر صحابہ حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم تو شعر کہتے ہیں۔ آپ نے ارشادفرمایا کہ اگلا جملہ بھی تو پڑھو اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی اس سے ان شعراء کو مستثنیٰ کردیا گیا جو کہ مؤمن اور صالح ہیں تب وہ مطمئن ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشادفرمارہے ہیں کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح اختیار کیا اور اللہ کا بکثرت ذکر کیا اور ظلم کے بعد بدلہ لیا (یعنی کسی کی ہجو اس وقت کی جب پہل کسی اور نے کی ایسی صورت میں ان کی جوابی ہجو مورد عتاب نہیں)

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ نے الادب المفرد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے:

﴿اَلشِّعْرُ مِنْهُ حَسَنٌ وَمِنْهُ قَبِيْحٌ خُذِ الْحَسَنَ وَدَعِ الْقَبِيْحَ وَلَقَدْ رَوَيْتُ مِنْ شِعْرِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَشْعَارًا مِنْهَا الْقَصِيْدَةُ فِيْهَا اَرْبَعُوْنَ بَيْتًا﴾

یعنی اشعار میں اچھے برے دونوں طرح کے ہوتے ہیں تم اچھوں کو لےلو اور برے اشعار کو چھوڑ دو اور میں نے کعب بن مالک کے اشعار نقل کیے اس میں ایک قصیدہ چالیس اشعار پر مشتمل تھا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صحابی حضرت شرید بن سوید الثقفی رضی اللہ عنہ کا فرمان نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سناتا رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے:

﴿قَالَ هِيهْ فَاَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهْ ثُمَّ اَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهْ حَتّٰى اَنْشَدْتُهُ مِأَةَ بَيْتٍ﴾

(صحیح مسلم ،کتاب الشعر)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید سنانے کی فرمائش کرتے رہے اور میں مزید سناتا رہا یہاں تک کہ میں نے ایک ایک کرکے سو شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائے۔ حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ:

﴿عَنْ جَابِرِ بْنِ سُمُرَةَ قَالَ جَالَسْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثَرَ مِنْ مِّأَةِ مَرَّةٍ فَكَانَ اَصْحَابُهُ يَتَنَاشَدُوْنَ الشِّعْرَ وَ يَتَذَاكَرُوْنَ اَشْيَآءَ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَهُوَ سَاكِتٌ فَرُبَمَا يَتَبَسَّمُ مَعَهُمْ﴾

(سنن الترمذی، ج: ۲، ص: ۱۱۲)

حضرت جابر بن سمرۃ فرماتے ہیں کہ میں سو مرتبہ سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھا تو دیکھا کہ حضرات صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اشعار اور زمانہ جاہلیت کی باتیں سنایا کرتے حضور انہیں منع نہیں فرماتے تھے البتہ کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔

بے شک بعض روایات سے اشعار کہنے کی مذمت اور شعر گوئی میں اشتغال کی قباحت معلوم ہوتی ہے تو دراصل ان تمام روایات کا محمل ومطلب ایسے اشعار ہیں کہ جن میں بے ہودگی، جھوٹ اور فحاشی ہو یا اس شخص کے بارے میں ہے کہ جو شعر وشاعری کو اپنی زندگی کا مقصد ومشغلہ اس طرح بنالے کہ دوسرے واجبات وفرائض کی ادائیگی میں مخل ہو۔

چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے لان يمتلي جوف احدكم قيحا خير له من ان يمتلي شعرا کہ تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے یہاں تک کہ اس کو خراب کردے یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کا پیٹ شعر سے بھرا ہو۔ اس حدیث پاک کے تحت ترمذی کے حاشیہ پر ہے کہ المراد كثرته بحيث يشغله عن القرآن وذكر الله والعلوم الشرعية یعنی شعر گوئی کی یہ مذمت اس وقت ہے کہ جب ان میں اس قدر اشتعال ہو جائے کہ جو آدمی کو تلاوت کلام اللہ اور ذکر اللہ سے غافل کردے اور علوم دینیہ وشرعیہ سے دور کردے۔ (سنن الترمذی، جلد:۲، صفحہ:۱۱۲، کشف الباری، کتاب الادب)

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ فی نفسہ شعر گوئی معیوب اور بری چیز نہیں ہے۔ اس لیے بہت سے صحابہ شاعر تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اشعار سنا کرتے تھے اور حضرت حسان کے لیے تو باقاعدہ مسجد میں منبر لگایا جاتا تھا اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ہر شئے کو اس کی اسلامی حدود میں رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے، آمین۔

راقم السطور

محمد امجد قاسمی عفا اللہ تعالیٰ عنہ، استاذ دار العلوم آزاد ول، جنوبی افریقہ

شعر و شاعری اور میرے شیخ عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

احقر کا اول اصلاحی تعلق حضرت مولانا مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا اس کے بعد باضابطہ حضرت والا سے اصلاحی تعلق ہوا اور اپنے مختصر سے اصلاحی تعلق کے زمانہ میں حضرت والا کی صحبت میں رہنے کا موقعہ ملا اور حضرت کے اشعار کو سننے اور پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو یہ اندازہ ہوا کہ ان اشعار کی حقیقت بالکل اس طرح ہے کہ جیسے کوئی درد و تکلیف میں مبتلاء شخص بلا کسی تمرین و مشق اور بغیر کسی تصنع و تکلف کے اپنا درد و تکلیف بیان کرتا ہے ٹھیک اسی طرح حضرت والا کے قلب مبارک میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد پیدا ہوا تو حق تعالیٰ نے زبان ترجمان درد دل بھی عطا فرمادی اسی لیے حضرت والا نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

تم اصلاح کی اس میں کوشش نہ کرنا
یہ ہے داستاں دردِ دل کی ہماری
میری شاعری بس میرا دردِ دل ہے
لغت پڑھ سکے گی اسے کیا تمہاری

حضرت والا کی زندگی کے پہلے شعر کو ملاحظہ کیجئے اور مضمون بالا کا اندازہ لگائیے ؎

دردِ فرقت سے میرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں اک ماہی بے آب ہے

حقیقت یہ ہے کہ علوم و معارف اور اسرار و حکم شرعیہ قلب پر وارد ہوتے چلے گئے اور بلا کسی دماغی کد و کاوش کے اشعار کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے اور تمام اشعار پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہر ہر شعر کا بنیادی سبق اور مرکز و محور دین و شریعت کی تبلیغ اور تصوف و تزکیہ کی تلقین اور خوف و خشیت خداوندی اور معرفت و محبت الٰہی کی تعلیم ہے۔

غیر اللہ سے دل لگانے کا خطرناک اور مہلک انجام عشق مجازی کی تباہ کاریاں بڑے مؤثر اور پرکشش انداز میں بصورت اشعار پیش فرمائی ہیں اس لیے ہر شعر احقر کے ناقص علم کے مطابق قرآن کریم کی کسی آیت یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کی تشریح نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے مولانا رومی کی مثنوی کے متعلق کہے گئے شعر کی توجیہ میں ارشاد فرمایا ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زباں پہلوی

یعنی مثنوی قرآن کریم کی طرح وحی نہیں ہے مگر ایک الہامی کلام ہے جو منجانب اللہ مولانا رومی کے قلب پر

وارد ہوا ہے اور اہل دل اہل اللہ کے کلام کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے چنانچہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری جب حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی سے کچھ نئے اشعار سننا چاہتے اور اس کی فرمائش کرتے تو یوں ارشاد فرماتے کہ کچھ آیا ہو تو سنا دیں یہ نہ فرماتے کہ کچھ اشعار بنائے ہوں تو سنا دیجیے اور فرماتے کہ کچھ تازہ وارد ہوا ہو تو پیش فرمادیں۔

اسی لیے ان حضرات کے مجموعۂ کلام کے ایک ایک شعر میں گھنٹوں گھنٹوں کے وعظ کی تاثیر ہوا کرتی ہے جیسا کہ حضرت والا سے ایک مرتبہ کسی نے حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی کا ایک شعر سنا تو اپنے وطن جا کر حضرت کو لکھا کہ اس شعر میں مجھے گھنٹوں کے وعظ کا مزہ آیا اور وہ شعر یہ تھا کہ ؎

نہیں رہتے ہیں ہم کیوں چاہیے ہم کو جہاں رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہاں رہنا وہاں رہنا

حضرت علامہ یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت والا کی مثنوی کو دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ مجھے مولانا رومی کے اور ان کے کلام میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔ ایران کے ایک عالم علامہ محی الدین زاہدی قاسمی حضرت والا کی معارف مثنوی دیکھ کر ارشاد فرمایا ''ہر کہ مثنوی اختر را بخواند او را مثنوی مولانا روم پندار د لاریب کہ مولانا شاہ حکیم محمد اختر رومی عصر اند''

اس لیے حضرت والا کے ان اشعار کو عام شعر وشاعری کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلا ریب اشعار فیضان محبت علم وعرفان اور توحید وتصوف کا خزانہ ہے جن کو سن کر سامعین اپنے ایمان میں تازگی اور حلاوت محسوس کرتے ہیں اور ان کو اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے طبائع گناہوں سے متنفر اور طاعات کی جانب مائل دکھائی دینے لگتی ہیں بالخصوص حسن بتاں کے عشق کی خطرناک دلدلوں میں پھنسے ہوئے لوگ بآسانی ان سے نکل آتے ہیں جیسا کہ ہزاروں عشاق مجازی حضرت والا کے خاص انداز تربیت کے ذریعہ اس دلدل سے نکل کر اپنے مولیٰ کی محبت کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔

اور اس کی خاص وجہ وہی ہے کہ ان اشعار کی شاعری کا عنصر گل وبلبل کی داستان یا ساغر وصہبا اور قلقل ومینا کی حکایت نہیں بلکہ درس توحید وتوقیر رسالت، درد محبت، نور معرفت، تسلیک وتربیت ہے اور حضرت والا نثر کے بجائے نظم میں درد محبت سے آشنا بناتے ہیں اور معرفت الٰہی کا راستہ دکھاتے ہیں اور دلکش طریقہ سے سالکین کی تربیت فرماتے ہیں جس کے قلب میں محبت الٰہی کی ذراسی چسک ہو اور راہ سلوک سے کسی قدر ذوق ہو تو وہ بخوبی محسوس کرسکتا ہے کہ ہر ہر شعر میں ایسا جذب وکیف ہے اور نسبت باطنی کے تذکرے ایسے دلسوز انداز سے فرمائے گئے ہیں کہ جو کیسے ہی نا آشنائے درد کو آشنائے درد اور بسمل کردیتے ہیں۔

یہ وہ حقائق ہیں کہ حضرت والا کے کلام کی شرح پڑھ کر قارئین خود ان کا اندازہ لگالیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت والا کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے اور تادیر ہمارے اوپر حضرت کا سایہ قائم رکھے اور ہر قول وفعل میں کمال اخلاص وللہیت عطا فرمادے، امین۔

راقم السطور

محمد امجد قاسمی استاذ دار العلوم آزادوِل، جنوبی افریقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ زمیں جیسے ہے آسماں میں

جس سے ہیں آپ خوش اس جہاں میں — وہ شب و روز ہے گلستاں میں
دیکھ کر میرے اشکِ ندامت — ابرِ رحمت کی بارش ہے جاں میں
آپ کا سنگِ در اور مرا سر — حاصلِ زندگی ہے جہاں میں
سارے عالم کی لذت سمٹ کر — آگئی ہے ترے آستاں میں
لذتِ ذکرِ حق اَللہ اَللہ — اور کیا لطف آہ و فغاں میں
کیا کہوں قربِ سجدہ کا عالم — یہ زمیں جیسے ہے آسماں میں
برق گرنا مگر رخ بدل کر — آہ سنتا ہوں میں آشیاں میں
عالمِ غیب کا یہ کرم ہے — چشمِ بینا دیا قلب و جاں میں
درسِ تسلیم و خونِ تمنا — ہے نہاں عشق کی داستاں میں
لذتِ قربِ بے انتہاء کو — کس طرح لائے اختؔر زباں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ گلستان: باغ۔ اشک: آنسو۔ ابر: بادل۔ سنگِ در: چوکھٹ۔ آستان: اللہ تعالیٰ کا در۔ آہ وفغاں: گریہ وزاری۔ برق: بجلی۔ آشیاں: گھونسلہ۔ عالمِ غیب: اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ چشمِ بینا: دیکھنے والی آنکھ۔ درسِ تسلیم: اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنے کا سبق۔ خونِ تمنا: حرام خواہشات پر عمل نہ کرنا۔ نہاں: پوشیدہ۔ داستان: کہانی۔

رضائے الٰہی لطفِ دو جہاں کی ضامن ہے

جس سے ہیں آپ خوش اس جہاں میں
وہ شب و روز ہے گلستاں میں

اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ مومن کے اصلی مقصدِ حیات کو پیش فرمارہے ہیں کہ جب بندہ مومن اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرلے تو اس نے اپنی زندگی کے اصلی مقصد کو پالیا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے راضی اور خوش ہونے کی بنیاد پر اس کی دنیوی حیات بھی پرلطف کردی جاتی ہے اور وہ ہر وقت ایسا شاداں اور فرحاں رہتا ہے جیسے کہ وہ ہر گھڑی کسی گلشن و پارک (Park) کی پرکیف بہاروں میں جی رہا ہو اور اس کے لیل ونہار بڑی مسرت اور شادمانی سے گذرتے ہیں خود قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۹۷)

ترجمہ: جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو (کیونکہ کافر کے اعمال صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو دنیا میں تو بالطف زندگی دیں گے اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ (معارف القرآن جلد: ۵، ص: ۳۸۶)

ناموافق حالات سے اولیاء اللہ کیوں متاثر نہیں ہوتے

اگرچہ بشری نوعیت کے احوال ومسائل سے اللہ والا بھی گذرتا ہے اور اسے بھی دنیوی تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے اور مسرت وخوشی اور رنج وغم کے ملے جلے احوال سے وہ بھی الگ تھلگ نہیں رہتا ہے مگر یہ جملہ اقسام کے مسائل بس اس کے جسم کے اوپر ہوکر گذرتے ہیں اور دل ان کے اثر سے متاثر نہیں ہو پاتا ہے اور اگر متاثر ہو بھی جائے تو بس اس حد تک کہ یہ سب کچھ میرے محبوب کی طرف سے ہے اور وہ محبوب بھی ایسا کہ جو حاکم بھی ہے اور حکیم بھی ہے اس لیے بے چین وپریشان ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ اپنے محبوب کی رضاء میں راضی اور خوش رہتا ہے تو ان احوال سے اس کے قلب کا چین وسکون بے چینی وبے سکونی سے تبدیل نہیں ہوتا اور ہر گھڑی اس کا دل اپنے مولیٰ کی محبت میں باغ وبہار رہتا ہے جس کے نتیجہ میں اسے وہ حلاوت ولذت عطا ہوتی ہے کہ جس کی اہل دنیا کو ہوا بھی نہیں لگی ہوتی۔ اس لیے حضرت والا اس شعر میں ایک ایسا سبق پڑھا رہے ہیں کہ جو دونوں جہاں کی سلامتی وعافیت اور عزت وراحت اور فرحت ومسرت کا ضامن ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ ہم اپنے مولیٰ کو راضی کریں خواہ ہمارا نفس ناخوش ہو اور ایسے امور سے دور رہیں کہ جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض وناخوش ہوتا ہے اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہماری زندگی میں اعلیٰ درجہ کا تقویٰ ہو اور گناہوں سے کلی طور پر اجتناب وپرہیز ہو کیونکہ حدیث پاک میں یہ مضمون موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ گناہوں اور نافرمانیوں سے ناراض ہوتے ہیں اور اس پر دنیا وآخرت میں نوع بنوع عذاب دیئے جاتے ہیں اور جب گناہوں سے مکمل اجتناب ہوتا ہے تو پھر یہ دنیا ہی ایک طرح کی جنت بن جاتی ہے۔

دنیا وآخرت کی جنت

چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ کریم کی آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ کے تحت یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ:

﴿وَقَالَ بَعْضُ الصُّوْفِيَةِ جَنَّةٌ مُعَجَّلَةٌ فِي الدُّنْيَا بِالْحُضُوْرِ مَعَ الْمَوْلٰى وَجَنَّةٌ مُؤَجَّلَةٌ فِي الْاٰخِرَةِ بِلِقَآءِ الْمَوْلٰى وَالدَّرَجَاتِ الْعُلٰى﴾

(المرقاۃ، ج: ۵، ص: ۲۱۳، مطبوعۃ: المکتبۃ الحقانیۃ)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے عاشقوں کو ایک جنت دنیا میں عطا فرماتے ہیں اور ایک جنت آخرت میں ۔ دنیا میں جنت تعلق مع اللہ تعالیٰ کی لذت ہے اور آخرت کی جنت لقائے مولیٰ اور دیدارِ حق کی لذت ہے اور حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں یعنی جو شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر حساب و کتاب سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنتیں ہیں ۔

اللہ تعالیٰ سے خوف کے معنی یہ ہیں کہ جلوت و خلوت میں اور ظاہر و باطن کے تمام احوال میں اس کو یہ دائمی مراقبہ رہتا ہو کہ مجھے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا اور اعمال کا حساب دینا ہے اور ظاہر ہے جس کو ایسا مراقبہ ہمیشہ رہتا ہو وہ گناہ کے پاس نہیں جائے گا اور قرطبی وغیرہ بعض حضراتِ مفسرین نے مقامِ رب کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر قول و فعل اور خفیہ و علانیہ پر نگراں اور قائم ہے ہماری ہر حرکت اس کے سامنے ہے حاصل اس کا بھی وہی ہوگا کہ حق تعالیٰ کا یہ مراقبہ اس کو گناہوں سے بچا دے گا ۔ (معارف القرآن ، ج:۸ ، ص:۲۶۱)

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا ارشادِ گرامی

اسی مضمون کو حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت ج:۲ ، ص:۱۷۶ پر کچھ یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس ایمان و یقین اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس صحیح تعلق اور مخلوق سے آزادی اور قلب سے وارستگی اور بے تعلقی کے بعد انسان کو وہ سکینت و سرور حاصل ہوتا ہے کہ اس زندگی ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے (جیسا کہ ابن قیم نے نقل کیا ہے) خود ایک بار فرمایا کہ:

﴿إِنَّ فِي الدُّنْيَا جَنَّةً مَنْ لَمْ يَدْخُلْهَا لَمْ يَدْخُلْ جَنَّةَ الْآخِرَةِ﴾

دنیا میں (مومن کے لیے) ایک ایسی جنت ہے کہ جو اس میں یہاں داخل نہ ہوا آخرت کی جنت سے بھی محروم رہے گا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے مخلص بندوں کو اس زندگی میں بھی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی دولت عطا فرماتا ہے اور وہ اس کا نمونہ (بقدرِ وسعتِ دنیا) یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں ۔ یہی مضمون ہے جس کو حضرت والا نے اس مذکورہ شعر میں ذکر فرمایا ہے اور دوسرے مختلف اشعار میں بھی مختلف انداز سے یہ ذکر فرمایا ہے ، جیسے ارشاد فرمایا کہ ۔

جو خوش ہیں آپ تو ہر سو بہار کا عالم
وگرنہ سارا یہ عالم ہی عالم غم ہے
جو خوش ہیں آپ تو عالم ہمارا عالم ہے
وگرنہ اپنا بھی عالم تباہ و برہم ہے
جس طرف کو رخ کیا تو نے گلستاں ہوگیا
تو نے رخ پھیرا جدھر سے وہ بیاباں ہوگیا

توبہ روح کی ٹھنڈک ہے

دیکھ کر میرے اشکِ ندامت
ابرِ رحمت کی بارش ہے جاں میں

حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں یوں اپنے لیے پریشانی وندامت کا اظہار فرمایا کہ:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت ۲۳)

ترجمہ: دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا (کہ پوری احتیاط اور تأمل سے کام نہ لیا) اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے۔
(معارف القرآن، ج:۳، ص:۵۳۱)

اور اپنی اس ادا سے بارگاہِ الٰہی میں مقبول قرار پائے اور شیطان نے اپنے کیے پر ندامت وشرمندگی کے بجائے مزید اکڑ اور تکبر میں آ کر یوں کہا کہ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ بالآخر ہمیشہ کے لیے بارگاہِ الٰہی سے مردود قرار پایا۔

اس لیے قرآن وحدیث میں توبہ کے بڑے فضائل مذکور ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہ ادا بڑی محبوب اور بہت پسند ہے اور جگہ جگہ توبہ پر دنیا وآخرت کی نعمتوں کا حصول موعود ہے اسی مضمون کو حضرت والا پیش فرمارہے ہیں کہ جب توفیقِ الٰہی سے مجھے اپنے گناہوں اور غفلتوں پر نادم وشرمندہ ہو کر آنسو گرانے کی سعادت ملتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے رگ وریشہ میں رحمتِ الٰہی کی بارش کی تری پہنچ کر میرے قلب وجگر کو سیراب کررہی ہے اور میرے بدن کا رواں رواں فرحت ومسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان جتنی اللہ تعالیٰ کی معرفت ومحبت میں ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے قلب میں عظمتِ باری تعالیٰ بڑھتی جاتی ہے تو پھر اسے اپنا کیا ہوا سب کچھ ہیچ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ سوچتا رہتا اور بزبانِ حال یوں کہتا رہتا ہے کہ اے خدا مجھے جیسی تیری معرفت حاصل کرنی چاہیے تھی میں نہ کرسکا اور جیسا تجھ پر فدا ہونا چاہیے تھا میں نہ ہوسکا۔

اس طرح نادم وشرمندہ ہو کر بارگاہِ الٰہی میں اشکِ ندامت گراتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب وجاں کو مسرور کردیتے ہیں اور اس کے دل ودماغ کو باغ وبہار کردیتے ہیں اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے جسم کے رگ وریشے میں بارانِ رحمتِ خداوندی کے ذریعہ صفائی وطہارت ہو کر مشامِ جان معطر ہورہے ہیں اور سکون واطمینان کی لہریں اس کے جسم کے روئیں روئیں میں دوڑنے لگتی ہیں اور اس کے دل ودماغ سے جملہ قسم کے غموم وہموم اور آلام وافکار کا خاتمہ کردیا جاتا ہے۔

توبہ کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر معارف القرآن میں سورہ تحریم، پ:۲۸ میں توبۃً نصوحًا کے ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے سوال کیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جس میں چھ چیزیں جمع ہوں (۱) اپنے گذشتہ برے عمل پر ندامت (۲) جو فرائض وواجبات اللہ تعالیٰ کے چھوٹے ہیں ان کی قضا (۳) کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا تو اسکی واپسی (۴) کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی تھی تو اس سے معافی (۵) آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم وارادہ (۶) اور یہ کہ جس طرح اس نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اب وہ اطاعت کرتے ہوئے دیکھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو شرائط توبہ بیان فرمائی ہیں وہ سبھی کے نزدیک مسلم ہیں بعض نے مختصر بعض نے مفصل بیان کردیا ہے۔

بہرحال اشکِ ندامت گرانا یہ ایسا نسخہ ہے کہ جو قربِ الٰہی کے لیے اکسیر ہے اور امت کے تمام اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی زندگی کا حصہ بن کر رہا اور پھر ان کی زندگیوں میں وہ بہار آئی کہ ساری دنیا نے اس کو دیکھا۔

حاصلِ زندگی

آپ کا سنگِ در اور میرا سر
حاصلِ زندگی ہے جہاں میں

ارشاد فرماتے ہیں کہ میری زندگی کا حاصل اور میرا مقصدِ حیات یہ ہے کہ ہر وقت آپ کے حکم کے سامنے سرنگوں اور آپ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر اپنا اظہار بندگی کروں اور میرے مولیٰ کا جو بھی حکم ہو اس پر دل وجان سے قربان ہو جاؤں نہ تو اس کی خاطر مجھے اپنے منافع ومصالح کے فوت ہو جانے کا رنج وغم ہو اور نہ کسی سے کسی قسم کے خوف وملامت کی پرواہ ہو اور اس کے لیے اگرچہ مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے لیکن میں ایک پل جھپکنے کے برابر بھی اپنے اللہ کو ناراض نہ کروں خواہ سارے اہلِ دنیا ناراض ہوتے ہوں ورنہ اگر میں نے مخلوق کا خیال کر کے اپنے مولیٰ کی حکم عدولی کر لی تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے در سے ہٹ گیا اور مقصودِ حیات میں ناکام ہو گیا۔

غرض کہ میں سب سے کٹ کر بس آپ کا ہو رہوں اور درحقیقت یہی کامل عبدیت اور کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ کی روح ہے اور اس کا سب سے اہم سبق ہے اور جب بندۂ مومن کی زندگی میں یہ بات پیدا ہو جائے اور اسے بجز رضائے مولیٰ کسی نفع وضرر کا خیال دل میں نہ رہے تو بس سمجھو کہ کلمہ اس کی زندگی میں رچ بس گیا ہے اور ہر مومن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہی چاہا ہے کہ میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردو اپنے منافع ومضار کا خیال دل سے نکال باہر کرو پھر دیکھو کہ کیسے باری تعالیٰ کی نصرت ومدد ہر قدم پر ہمارے شاملِ حال ہوتی ہے اور مشکلاتِ حیات کیسے

سہل اور آسان ہوتی جاتی ہیں، جن کو حل کرنے کے لیے آج کا انسان اپنی ساری عمر کو بے انتہا بے چینی و پریشانی میں گزار دیتا ہے۔ حسنِ ظن یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے شیخ دامت برکاتہم العالیہ کو یہی مقامِ بندگی عطا کیا ہے جیسا کہ اس پر حضرت والا کی پوری زندگی شاہد ہے۔

اور حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جب انسان اس طرح اللہ تعالیٰ کے در پر مر مٹنا اختیار کرتا ہے اور مشکلات و پریشانیوں میں خدا کے حکم کو نہیں چھوڑتا اور راہِ خدا کا ہر غم برداشت کرنے لگتا ہے تو پھر حق تعالیٰ اسے اپنی راہ کی عجیب لذت وحلاوت نصیب فرماتے ہیں اور اسے وہ کیفِ ایمانی عطا ہوتا ہے کہ جس پر دونوں جہاں کی راحتیں فدا و قربان ہوتی ہیں اور اگر ہم بغور دیکھیں تو قرآنِ کریم کی آیت جس میں مقصدِ تخلیق جن وانس کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اس شعر میں مذکور ہے کیونکہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾

(سورۃ الذّاریات، آیت: ۵۶)

ترجمہ: اور میں نے جن وانس کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۱۷۱)

عبادت کی حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ بس مسجد کے اندر نماز ادا کرلی یا صوم وصلاۃ وحج وزکوٰۃ کا اہتمام کرلیا اور باقی شعبہائے زندگی میں دین سے صرفِ نظر کیے رہا بلکہ درحقیقت عبادت کے مفہوم میں زندگی کے تمام شعبوں میں ہر ہر قدم پر خدا کا حکم بجالانا اور اس کی فرمانبرداری کرنا شامل ہے اور یہی کامل اسلام ہے جو ہم سے مطلوب ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً اے مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ مسجدوں میں ہو یا گھروں میں، بازاروں میں ہو یا صحراؤں میں اور صحت میں ہو یا مرض میں، راحت میں ہو یا مصیبت میں، خوشی میں ہو یا غم میں بس جس حال کا جو حکم ہے اس حالت میں اس حکم کو بجالانا یہی کامل طاعت وبندگی ہے اور یہی حضرت والا کے شعر کا خلاصہ ہے کہ ہر آن میں اپنے مولیٰ کے سامنے سرنگوں رہوں۔

لذّاتِ عالم کا کیپسول (Capsule)

سارے عالم کی لذت سمٹ کر
آگئی ہے ترے آستاں میں

اگر غور کریں تو اس سے پہلے شعر میں اور اس شعر کے درمیان ایک عجیب مناسبت اور ربط ہے اور وہ یہ ہے کہ اول شعر کے مضمون سے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہر وقت مولیٰ کے سنگِ در پر سر رکھنا اور ہر گھڑی حکمِ الٰہی کا خیال رکھ کر زندگی گذارنا یہ تو بڑا مشکل اور دشوار کام ہوگا اور اس کے نتیجہ میں تو پھر ہم زندگی کے مزوں سے محروم ہو جائیں گے اور لذاتِ دنیویہ کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔

بے شک آخرت تو بن جائے گی اور وہاں کا لطف وعیش تو میسر ہو جائے گا لیکن دنیا کے باغ وبہار اور

راحت وآرام سے محروم ہونا پڑے گا اور بالفاظِ مختصر پھر تو ہماری دنیوی زندگی بالکل بے مزہ ہو کر رہ جائے گی۔

تو اس شعر میں حضرت والا نے گویا اسی سوال کا جواب پیش فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے در پر مر مٹنے میں جو لطف اور مزہ ہے اس کے سامنے دنیا کے مزے اور لذتیں ہیچ ہیں، حق تعالیٰ نے اپنے در پر جھکنے اور اپنی فرمانبرداری میں ایسی لذت رکھی ہے کہ جس کو چکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کا چین وسکون اپنے در پر رکھ دیا ہے جملہ لذاتِ عالم کو اپنے آستاں میں سمو دیا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ یہ ایک ایسا کیپسول (Capsule) ہے کہ جس کے اندر حق تعالیٰ نے سارے عالم کی لذتوں اور مزوں کے وٹامن (Vitamin) جمع کر دیئے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا بے بنیاد ہے کہ دین وشریعت کی تابعداری سے دنیوی زندگی بے کیف ہو جائے گی۔ بلکہ حقیقی کیف و مزہ اس کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

لطفِ طاعات حاصل نہ ہونے کی وجہ

جو لوگ یہ سوچتے ہیں اس کی وجہ اور بنیاد ان کے حواس پر چڑھا ہوا وہ زہر ہے جس کے بعد وہ قوت اپنا کام صحیح نہیں کر پاتی ہے جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور اس کے اعضاء پر اس کا زہر چڑھ گیا ہو تو اسے اب کڑوی چیز میٹھی معلوم ہونے لگتی ہے کیونکہ اس کی جسمانی صحت کا نظام بگڑ چکا ہے۔

بالکل اسی طرح گناہوں اور نافرمانیوں کا معاملہ ہے کہ ایک عرصہ تک ان میں مبتلا رہنے سے نہ ہماری قوتِ ذائقہ صحیح رہتی ہے اور نہ قوتِ شامہ درست رہتی ہے نہ دل ودماغ صحیح کام کرتے ہیں۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ اس امت میں مسخ الوجوہ (چہروں کا مسخ ہونا) تو نہ ہوگا لیکن مسخ القلوب (دلوں کا) مسخ باقی رہے گا تو گناہوں کی نحوست سے دل ودماغ کے سوچنے سمجھنے کا انداز اور طور طریقہ بدل جاتا ہے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتا ہے گناہوں اور نافرمانیوں میں مزہ آتا ہے اور عبادات وطاعات میں سستی وکاہلی اور بدذوقی کا شکار رہتا ہے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ حضرات انبیاءِ علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے کامل ظاہری وباطنی صحت وسلامتی والے اعضاء دے کر دنیا میں بھیجا ہے جن کا ادراک واحساس اور ذوق ووجدان بالکل صحیح اور درست ہوتا ہے اور ان کے قول کو اس باب میں حجت ودلیل سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ اشیاء کی صحیح کیفیت وحالت اور اعمال کی حقیقی تاثیر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿وجُعلتْ قُرَّةُ عَيْنِى فِى الصَّلٰوةِ﴾

(سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، ج ۲، ص ۹۳)

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، یعنی جو سرور وانبساط اور لطف ومزہ مجھے نماز میں ملتا ہے وہ کائنات کی کسی بھی چیز میں نہیں ہے اس لیے نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

تو گویا اس ارشاد نبوی سے نماز کے اصل مزاج وطبیعت کا علم حاصل ہو گیا کہ اصل نماز کی یہ شان ہے کہ

اس سے سرور واطمینان اور لذت وفرحت حاصل ہوتی ہے لیکن اگر کسی کو نماز میں لگ کر ایسا محسوس نہ ہوتو درحقیقت اسے اپنے باطن کی گندگی و بیماری کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہیے کہ جس کے سبب ایسا ہو رہا ہے اور اس کا ادراک متغیر ہے نہ یہ کہ وہ نماز کی اس تاثیر کے متعلق کسی شک وشبہ میں پڑ جائے۔ آخر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے تھے تو ان کے نماز میں محو ہونے، کھو جانے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان پر تیر برسائے جاتے اور ان کے بدن سے خون نکلتا رہتا تھا مگر ان کے بدن میں ذرا جنبش نہ ہونے پاتی تھی اور وہ مثلِ ستون کے کھڑے رہتے تھے بالآخر پوچھے جانے پر جواب یہ ہوتا تھا کہ اس سورت قرآن کی تلاوت نے مجھے نماز توڑنے سے روک دیا اور اس کے مضامین میں غور فکر اور استحضارِ عظمتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ملنے والا لطف وحلاوت اس درد و تکلیف سے بڑھ کر تھا جو مجھے تیروں کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

آج جو ذکر و تلاوت اور صلاۃ و مناجات میں لذت نہیں ہے درحقیقت اس کی وجہ ہم میں خود اپنے اندر ہے ورنہ جیسے حضرت والا نے ارشاد فرمایا ہے کہ سارے عالم کی لذت اللہ تعالیٰ نے اپنے در پر جھکنے اور سرنگوں ہونے میں رکھ دی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ نماز کے بعد بیٹھے رو رہے تھے، جب حضرت سے سبب دریافت کیا تو ارشاد فرمایا کہ بیس سال سے میری تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی تھی مگر آج فوت ہو گئی ہے اس کا اتنا صدمہ ہوا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہونے میں ان کو کیا کچھ ملتا تھا کہ اس کے چھوٹ جانے کے سبب ایسا رو رہے ہیں جیسے ایک عظیم دولت چھوٹ گئی ہو۔

حلاوتِ ذکر کی حکمت

لذتِ ذکرِ حق اللہ اللہ
اور کیا لطف آہ فغاں میں

یہ شعر عربی کی اصطلاح کے اعتبار سے گویا کہ **تخصیص بعد التعمیم** ہے کہ اول تو حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے در پر جھکنے میں پوری حلاوت ہے۔ اب خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی حلاوت کو پیش فرما رہے ہیں کہ بس کیا بیان کروں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیسی حلاوت ولذت ملتی ہے کہ دنیا و مافیہا کے مزے اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں اور اس کو حضرت والا نے مختلف مواقع پر مختلف انداز سے سمجھایا ہے کہ جو خدا ساری کائنات کی لذیذ ترین چیزوں کا خالق ہے اور شمس وقمر کو جمال بخشنے والا ہے خود اس کے نام کی لذت کا کیا عالم ہوگا، اسی کو ایک دوسری نظم میں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

ارے یارو! جو خالق ہو شکر کا
جمال شمس کا نور قمر کا

نہ لذت پوچھ پھر ذکر خدا کی
حلاوت نام پاک کبریاء کی

اور اسی کو دوسرے انداز میں یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام ان کے عشاق کے لیے جام و مینا کی طرح ہے۔

اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

اس کے نامِ مبارک کی حلاوت ومٹھاس کے سامنے دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی لذیذ چیز بھی کیا حقیقت رکھتی ہے۔ چنانچہ اپنے وقت کے بڑے عالم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مضمون کے متعلق شعر یاد آیا۔

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیرِ دورِ جام ہے

اور درحقیقت یہ ایسا معاملہ ہے کہ جیسے اگر کوئی یوں کہے چینی میٹھی اور شہد وسیب بھی میٹھا مگر ان میں کیا فرق ہے؟ تو ہم اور آپ اس فرق کو بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ بس اس کے جاننے کی ایک ہی آسان صورت ہے کہ اس کو کھاؤ اور ان میں فرق کا پتہ لگا لو، تو بالکل اسی طرح کسی اللہ والے کی صحبت میں چند دن اللہ اللہ کر کے اس کی حلاوت کا پتہ چلتا ہے۔

مقامِ قربِ سجدہ کی حکمت

کیا کہوں قربِ سجدہ کا عالم
یہ زمیں جیسے ہے آسماں میں

حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے جس مضمون کو ذکر فرمایا ہے وہ مضمون قلبی ادراک واحساس اور کیفیاتِ روحانیہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کا لفظوں سے سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ لغت محض معانی کو تعبیر کرتی ہے اس پر حضرت والا کے اشعار ہیں۔

جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پا سکتے نہیں دردِ نہانی
لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک طویل زمانہ گزارا اور شب وروز کے معمولات دیکھے خاص طور پر وہ آہِ سحر گاہی اور نالہ نیم شبی کے حسین

ودلکش مناظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے طویل سجدوں کی حلاوت ولذت اور اس میں ملنے والے قربِ خداوندی کا مزہ چکھا ہے اور اپنے شیخ کی ذکر وتلاوت کے دوران نکلنے والی آہوں کی چاشنی ومٹھاس کو خود چکھا ہے۔ حدیثِ پاک کا مضمون ہے:

﴿اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الصلوة، باب ما یُقال فی الرکوع والسجود، ج: ا، ص: ۱۹۱)

بندہ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب جبھی ہوتا ہے جبکہ وہ حالتِ سجود میں ہو اور خاص طور پر جو خشوع وخضوع اور عظمتِ باری تعالیٰ کے استحضار کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہوتا ہے اور اپنے دل سے ہر قسم کے غیر اللہ کو نکال کر دل کو پاک وصاف کر چکا ہوتا ہے تو پھر اس کے سجدے اگر چہ اس زمین پر ہوں مگر اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں اللہ کے بالکل سامنے سربسجود ہوں اور یہ زمین آسمان میں ہے اور وہ مقامِ شہود میں ہوتا ہے اور گویا کہ اس وقت بندہ اور خدا کے درمیان سے سارے حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں اور یہ محض خیالی ووہمی درجہ کی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں پر خصوصی فضل فرماتے ہیں اور وہ مجاہدات کی بھٹی سے گذرتے ہیں تو ان کو یہ صفت درجۂ حقیقت میں حاصل ہو جاتی ہے اور اس صفت کا تذکرہ حدیثِ جبرئیل میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ جیسے تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یہ اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جسے مقامِ مشاہدہ کہتے ہیں، اور اگر اتنا نہ ہو سکے تو کم سے کم اتنا تو سوچو کہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں اور یہ مقامِ مراقبہ ہے۔

آہ! آج ہمارے سجدے

اب رہ گیا یہ ذہنی خلجان کہ سجدے تو ہم بھی کرتے ہیں مگر ہمیں یہ سب صفات حاصل نہیں اور نہ کوئی قرب کی حلاوت ولذت کا ادراک واحساس ہوتا ہے آخر کیا ہمارا سجدہ سجدہ نہیں ہے؟

اس سلسلہ میں یہ ذہن میں رکھنے کی چیز ہے کہ ایک تو سجدہ وہ ہے کہ سر کو زمین پر رکھ دیا مگر دل ودماغ مختلف قسم کے حسین چہروں اور نقشوں کی تصویروں میں ڈوبے ہوئے ہیں یا دولت وثروت، جاہ ومنصب اور سلطنت وحکومت کے مختلف بتوں کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور مخلوقات سے طرح طرح کی امید وخوف کے درمیان اٹکے ہوئے ہیں تو گو کہ یہ سجدۂ صلوٰۃ ہے اور صحت صلوٰۃ کے لیے کافی ہے مگر اس میں کیا شک ہو سکتا ہے اور اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ جس سجدہ میں زمین پر سر رکھنے کے ساتھ ساتھ دل ودماغ بھی متحضر ہوں اور دل ودماغ بھی اسی طرح بارگاہِ رب العزت کی عظمت کے سامنے جھکے ہوئے ہوں تو اس سجدہ کی حالت وتاثیر بالکل جداگانہ ہوگی ورنہ جب دل میں ہزاروں قسم کے غیر اللہ بھرے ہوئے ہوں تو پھر سجدہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس کو ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شعر میں یوں پیش کیا ہے کہ ؎

میں جو سر بہ سجدہ کبھی ہوا تو زمین سے آنے لگی صدا

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مختلف اقسام کے غیر اللہ جب دل میں رچے بسے ہوتے ہیں تو بس سر تو سجدہ میں پڑا ہوتا ہے مگر اس کے دل و دماغ اِدھر اُدھر کھوئے ہوئے رہتے ہیں تو گو کہ نماز ادا ہو جائے گی مگر ایسے شخص سے زمین بھی زبانِ حال سے یوں گویا ہوتی ہے کہ ارے غیر اللہ سے آشنا انسان تو پہلے دل سے اس کو نکال کر باہر کر پھر سجدہ کی حلاوت پالے اس کے بغیر تجھے اس سجدہ سے کچھ ملنے والا نہیں ہے جو قربِ خداوندی کی حلاوت اور جو سر بسجود ہونے کا مزہ مومن موحد کو نصیب ہوتا ہے وہ ایسے شخص کا حصہ کہاں ہو سکتا ہے۔

بس یہی وہ چیز ہے کہ جو ان دو سجدوں کے اثرات و نتائج میں فرق پیدا کر دیتی ہے اول سجدہ بارانِ رحمتِ خداوندی کا سبب ہوتا ہے اور مشامِ جان قربِ خداوندی کے انوار سے منور اور خوشبو سے معطر ہو کر مہکنے لگتے ہیں اور یہ سجدہ بندۂ مومن کے لیے دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی کا ضامن اور آلام و افکارِ دو جہاں سے حفاظت کا کفیل ہے اسی کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے شعر میں یوں پیش فرمایا ہے کہ ۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ اٹھتی تھی

تڑپ رہے ہیں اسے آج منبر و محراب

ایذائے اولیاء اللہ، اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنا ہے

برق گرنا مگر رُخ بدل کر

آہ سنتا ہوں میں آشیاں میں

کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی محروم القسمت ہوتے ہیں اور ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جو نبیوں اور ولیوں کے دشمن ہوتے ہیں اور ان کو ستانے اور ان کی ایذاء کے درپے رہتے ہیں اور ان کے ظلم سے نہ عوام الناس بچتے اور نہ وہ اللہ والوں کا خیال کرتے ہیں جب کہ اس پر سخت وعید آئی ہے اور حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کو ستانے اور ایذا پہنچانے پر اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اتنی سخت وعید ہے کہ پوری شریعت میں سوائے دو گناہوں کے تیسرے کسی بھی گناہ پر نہیں آئی ہے ایک تو سود کا مال کھانے اور استعمال کرنے پر اور دوسرے کسی خدا کے ولی کو ستانے اور تکلیف پہنچانے پر۔ چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

«قَالَ الْاَئِمَّةُ لَيْسَ فِى الْمَعَاصِىْ مَنْ تَوَعَّدَ اللّٰهُ اَرْبَابَهَا بِاَنَّهٗ مُحَارِبُهٗ اِلَّا هٰذَا وَ اَكْلُ الرِّبَا قَالَ تَعَالٰى فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَهٰذَا يَدُلُّ عَلٰى مَا فِىْ هَاتَيْنِ الْخَصْلَتَيْنِ مِنْ عِظَمِ الْخَطَرِ اِذْ مُحَارَبَةُ اللّٰهِ لِلْعَبْدِ تَدُلُّ عَلٰى سُوْءِ خَاتِمَتِهٖ لِاَنَّ مَنْ حَارَبَهُ اللّٰهُ لَا يُفْلِحُ اَبَدًا»

(المرقاۃ، ج ۵، ص [illegible]، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

خلاصہ یہ ہے کہ گناہوں میں اتنی سخت وعید والا گناہ کوئی بھی نہیں ہے اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں کس قدر خطرہ کی بات ہے کیونکہ خدا جب کسی سے جنگ کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا خاتمہ برا ہوگا اس لیے کہ خدا کا فریق جس سے خدا جنگ کررہا ہو وہ کبھی بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا ہے اس لیے حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اے ظالم ذرا سنبھل اور غور کر تو جدھر ظلم کرنے چلا ہے یہ ان خدا کے بندوں کا آشیاں ہے جس میں وہ صبح وشام اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے آہیں بھرتے ہیں اور ایسے خدا ترسوں کے آشیانہ کو اجاڑ کر اپنی تباہی و بربادی کا سامان نہ کر اور اپنے ظلم کے رخ کو پھیر دے اور اس سے باز آجا۔

بصارت وبصیرت دو عظیم نعمتیں

عالمِ غیب کا یہ کرم ہے
چشمِ بینا دیا قلب و جاں میں

ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے میرے قلب وجان میں چشمِ بینا اور بصارت کی حفاظت سے بصیرتِ قلب عطا فرمائی ہے اور ظاہری آنکھوں کے ساتھ ساتھ باطنی آنکھیں بھی مرحمت فرمائی ہیں جو کہ اصل ہیں اور اہم ہیں اگر وہ نہ عطا ہوں تو پھر ان ظاہری آنکھوں کے ہونے کے باوجود انسان گویا کہ اندھا ہوتا ہے کیونکہ ان کو صحیح مقصد کے لیے استعمال نہیں کرپاتا ہے اور جس غرض ومقصد کے لیے یہ قوتیں عطا ہوتی ہیں اس کے خلاف استعمال ہونے کی وجہ سے بجائے نفع کے ضرر کا سامان ہوتی ہیں اور جب ممنوع اور حرام جگہوں سے بصارت کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ حرام خوشیاں اور لذتیں درآمد نہیں کی جاتی اور قدرتِ خداوندی کے مظاہر ومعالم پر نظر ڈال کر معرفتِ الٰہی حاصل کی جاتی ہے تو پھر اسے دل کی آنکھیں عطا ہوتی ہیں اور یہ ایسا تحفۂ الٰہی ہے کہ جب یہ مل جاتا ہے تو پھر اس کے لیے کائنات کا ذرہ ذرہ معرفتِ خداوندی میں اضافہ کا ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ہر شی میں اپنے مولیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اسی پر حضرت والا کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

جب بصارت کی حفاظت سے بصیرت مل گئی
ہو کے نادیدہ بھی اس کی آنکھ نادیدہ نہیں

صاحبو! یوں تو سارا بدن اور بدن کے سارے اعضاء باری تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں، حق تعالیٰ نے تین اعضاء کو اپنی بڑی نعمتوں میں شمار فرمایا اور انسان کو اس کا احساس دلایا تاکہ وہ ان اعضاء کو مولیٰ کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت ۷۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۳۶۸)

اعضاء کے غلط استعمال پر دنیوی واخروی سزا

اور دوسری آیت میں ان کے استعمال کا طریقہ اور پھر اس کے خلاف ہونے پر باز پرس کیے جانے کی خبر بھی دے دی گئی ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾

(سورۃ بنی اسرآئیل، آیت:۳۶)

ترجمہ: اور جس بات کی تم کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب سے (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی۔ (معارف القرآن، جلد:۵،ص:۴۶۹)

آنکھ اور کان کا استعمال کس کس کام میں کیا ہے اور بے دلیل بات کا خیال دل میں کیوں جمایا؟ اور پھر اسی کے مطابق اس کی سزا ہوگی جو آخرت میں ملے گی اور نقد سزا جو دنیا میں ملتی ہے وہ قرآن کی دوسری آیت میں مذکور ہے کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ان کے اعمال کے سبب ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے اور ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ﴾

(سورۃ الحج، آیت:۴۶)

ترجمہ: آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۶،ص:۲۷۳)

اور دلوں کا اندھا ہونے اور آنکھوں پر پردہ پڑنے اور سمع وبصر پر مہر لگنے کی نوعیت احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں مسلسل لگا رہتا ہے حرام خواہشات اور لذات میں پڑا رہتا ہے حسین لڑکے لڑکیوں کے ساتھ حرام عشق بازی اور گانے باجوں کی حرام لذتوں میں پڑ کر اپنا دل بہلاتا رہتا ہے تو پھر دل پر سیاہ نکتے لگتے لگتے پورا دل بالکل سیاہ اور تاریک کردیا جاتا ہے اور پھر اس کے دل ودماغ میں قبولِ حق کی صلاحیت ہی ختم ہوجاتی ہے اور وہ بالکل ویسا ہوجاتا ہے جس کو قرآن نے یوں تعبیر فرمایا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾

(سورۃ الاعراف، آیت:۱۷۹)

ترجمہ: ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۴،ص:۱۲۳)

اور اب نہ تو ان کے کان وآنکھ کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعہ کو سن کر عبرت ونصیحت حاصل کرتے ہیں اور نہ ان کا دل کسی کی خیر خواہی ونصیحت کی باتوں کو قبول کرتا ہے بلکہ عقل ایسی الٹی ہوجاتی ہے کہ اسے دوست دشمن اور

دشمن دوست معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کا کتنا ہی قریبی مخلص ومحسن دوست ہو مگر اب حق گوئی کی وجہ سے وہ اسے اپنا دشمن دکھائی دینا شروع ہوجاتا ہے بالفاظ مختصر یہ کہ مسخ الوجوہ تو نہیں لیکن مسخ القلوب کا نقد عذاب اس دنیا میں دے دیا جاتا ہے اور وہ زبانِ حال سے اپنے ہر مخلص خیر خواہ دوست کو یہ کہنے لگتا ہے کہ ؎

ناصحا! مت کر نصیحت دل میرا گھبرائے ہے

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

ان آیات کو پیش کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ حضرت والا نے اس شعر میں جس بصیرت قلب کا تذکرہ فرمایا ہے وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے اور اس کا کسی کو مل جانا بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہے اور جتنا قیمتی تحفہ ہوتا ہے اس کی حفاظت بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے بصیرت کی حفاظت کا اہم ہونا بھی ظاہر ہے جو زبان وکان اور قلب ونظر کی حفاظت پر موقوف ہے۔

بصیرتِ قلبی جملہ مسائل کا حل ہے

ان شاءاللہ اس بصیرتِ قلبی کی برکت سے مشکل سے مشکل مسائل آسان ہوجاتے ہیں اور کیسے ہی پیچیدہ اور نازک مسائل ہوں بڑی آسانی سے صحیح وغلط میں امتیاز ہوجاتا ہے اور دوست ودشمن کی صحیح پہچان ہوجاتی ہے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نفس وشیطان ہمارے دشمن ہیں ان کی اتباع وپیروی باعثِ خسران وموجبِ حرمان ہے اور اللہ ورسول ہمارے دوست ہیں ان کی اطاعت واتباع ہماری سعادتِ ابدی اور فلاحِ دنیوی واخروی کی ضامن ہے اس کے لیے اللہ ورسول کے احکام واوامر پر امتثال والتزام اور نفس وشیطان کے مکر وفریب سے اجتناب واحتراز آسان ہوجاتا ہے۔

اسی لیے مجدد تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک جگہ پر ارشاد فرمایا کہ اس قلبی بصیرت کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ دل پر ایسے علوم اور اسرار وحکم وارد فرماتے ہیں اور ایسے حقائق علمیہ وکونیہ عطا ہوتے ہیں کہ حاملینِ علومِ ظاہرہ ان کو سن کر حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور وہ کتابوں سے اخذ کیے ہوئے یا علماء سے سن کر حاصل کیے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت فیاضِ حقیقی علیم ذات کا فیضان ہوا کرتے ہیں جیسا کہ بہت سے اسلاف ان علوم کے حاملین گذرے ہیں۔

جامع شریعت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کھلا ہوا معجزہ ہے

انہیں میں سے ایک امت کے جلیل القدر عالم اور محدث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلبِ بینا پر ایسے اسرار ومعارف اور علوم وخزائن عطا فرمائے کہ انہوں نے پوری مفصل کتاب بنام ''حجۃ اللہ البالغہ'' تصنیف فرمادی یہ کتاب علم اسرار الشریعۃ وحکمہا پر ایسی مفصل وجامع اور بے مثال کتاب ہے کہ یکجا

طور پر بمشکل ایسی کوئی دوسری کتاب ہوگی اور گویا اس کتاب کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ شریعت خود اپنی جگہ آپ کا ایک عظیم معجزہ ہے کیونکہ ایک انسان جو کہ امی لقب ہو اور کسی جامعہ ومدرسہ اور کسی یونیورسٹی اور کالج میں زیرِ تعلیم نہ رہا ہو اور اجتماعی وانفرادی طور پر کوئی اس کا معلم استاذ بھی نہ ہو لیکن اس کے باوجود اس نے ایسی جامع ومکمل شریعت اور اسرار وحکم سے لبریز مکمل نظامِ حیات عطا کر دیا ہو یہ بدون اس کے ممکن نہیں ہے کہ وہ مرسل من اللہ اور مؤید من اللہ ہیں، اسی سے ہر منصف وعادل انسان یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ واقعی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم بلاشک اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپ کا دین وشریعت اس علیم وخبیر ذات کی دین ہے تو غرض یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے یہ سارے علوم اسی قلب بیناء اور بصیرت خاصہ سے نکلے ہوئے ہیں اسی لیے یہ بڑی عظیم نعمت خداوندی ہے اور اس کا عطا ہوجانا اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔

تسلیم ورضا کا عظیم فائدہ

درِ تسلیم و خونِ تمنا
ہے نہاں عشق کی داستاں میں

بندۂ مومن کے کمال ایمان کے اہم ترین وصف کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ اپنے مولیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنا اور جس حال میں وہ رکھیں اسی حال کو اپنے لئے نافع اور مفید سمجھنا اور اپنی تمام تجویزوں کو چھوڑ کر اپنے جملہ امور ومسائل اللہ تبارک وتعالیٰ کو سونپ دینا اسی کو تسلیم ورضا کہتے ہیں اور یہی تفویض وتوکل ہے جس کے متعلق اتنی بات کافی ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندہ کو کسی طرح کی بدنی ومالی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تو اگر وہ اس پر راضی وخوش رہتا ہے تو پھر حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہوجاتے ہیں اور جو وہ اظہار ناراضگی کرتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس پر ناراض ہوجاتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزھد، باب الصبر علی البلاء، ج:۲، ص:۶۵)

تو حضرت والا اس شعر میں تسلیم ورضا اور تفویض وتوکل کی تعلیم دے رہے ہیں۔

تکمیلِ عشق اور خونِ تمنا

اور دوسری بات کہ عشق ومحبت کی تکمیل بغیر حسرتوں کی پامالی اور تمناؤں کا خون کئے ہوئے ممکن نہیں ہے جب تک کہ انسان تمام حرام وممنوع کاموں سے پوری ہمت کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات اور آرزوؤں اور ناجائز تعلقات ودوستیوں کو پامال نہیں کرتا ہے تب تک وہ سچا خدا کا عاشق نہیں کہلائے گا اور محبت خداوندی کی داستاں بغیر

خون حسرت پیے ہوئے مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ گناہ اور حرام لذتیں انسان کو طبعی طور پر مرغوب رکھی گئی ہیں اور ان سے وقتی لذت ولطف ملنا یہ اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن ایک عاشق کیلئے جب حکم الٰہی سامنے آتا ہے تو اس پر کتنا ہی زور پڑے مگر وہ اسی وقت سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی عقلی دلیل

اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تسلیم ورضا کے مضمون کو بڑے پیارے معقول انداز سے پیش فرمایا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں تو جب وہ حاکم اور ہم محکوم ہیں اور وہ مالک اور ہم مملوک ہیں تو اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار ہے کہ وہ جیسے چاہیں تصرف کریں، ہمیں کسی بھی طرح کا کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی پریشان اور حیران ہونے کی ضرورت ہے اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں تو ان کی حکمت کاملہ وبالغہ کا مقتضاء یہ ہے کہ ضرور اس پیش آمدہ حالت میں ہمارے لئے کوئی بھلائی اور خیر پوشیدہ ہوگی ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی شانِ حکیمی کے خلاف ہوگا اور پھر حضرت تھانوی نے اسی کو بڑے معقول ومنطقی انداز سے مدلل طور پر ثابت کیا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ دیکھو! جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کوئی حالت پیش آتی ہے تو عقلی طور پر اس میں چار احتمال ہوتے ہیں۔(۱) یا تو یہ کہ ہمیں کسی مصیبت اور تکلیف وپریشانی میں ڈال کر اللہ تعالیٰ سو فیصد اس سے متنفع ہونا چاہتے ہیں۔(۲) یا بندہ کو سو فیصد نفع پہنچانا مقصود ہے۔(۳) یا پھر اس میں آدھا بندہ کا اور آدھا اللہ تعالیٰ کا نفع ہے۔(۴) اور یا تو کسی کا بھی کوئی نفع نہیں ہے۔ تو اس میں عقلی طور پر یہی چار احتمال ہیں۔

اب ہر ایک احتمال پر نظر ڈالیں سو اول تو اس لئے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اِنتفاع باحدٍ سے بالکل پاک ہے ورنہ احتیاج الی الغیر لازم آتی ہے، جو باطل ہے۔ صورتِ ثالثہ بھی اسی دلیل سے باطل وممنوع ہے اور صورتِ رابعہ اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا لغو عمل کیا کہ جس میں کسی کا بھی نفع نہیں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کے منافی ہے۔ لہٰذا دوسری صورت ہی مقرر ومتعین ہے کہ ضرور اس میں صرف بندہ ہی کا نفع ہے۔ تو عقلی طور پر بھی ثابت ہوتا ہے کہ مصیبت میں بندہ کو اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا چاہیے اور یہی عقیدہ رکھے کہ ضرور میرے مولیٰ کی طرف سے اس کے اندر میرے لئے کوئی خیر ونفع ہے، خواہ مجھے معلوم ہو یا نہ ہو۔ اسی کو حضرت شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی بڑے پیارے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

بے کیفی میں بھی ہم نے تو اک کیف مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اثقل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے چلتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھنے کی حکمت

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس موقعہ پر بڑی ہی پیاری اور عمدہ تعلیم دی ہے اور نہایت صبر و تسلی اور سکون و اطمینان کا جملہ ہمیں عنایت کیا ہے کہ جب کوئی حادثہ پیش آئے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھو کیونکہ اس جملہ کے مفہوم میں تسلیم و رضا کا درس ہے کہ جیسے میرے ساتھ یہ حالت پیش آئی ہے تو یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔اور چونکہ ہم سب حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہیں تو مولیٰ کو کامل اختیار ہے کہ وہ جو چاہے تصرف کرے اس لئے اے خدا میں تیرے فیصلے پر کوئی چوں و چراں نہیں کرتا ہوں بلکہ مکمل طور پر راضی اور خوش ہوں اور اسی پر یہ بھی انعام ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ مَاذَا قَالَ عَبْدِیْ میرے بندے نے اس مصیبت کے موقعہ پر کیا کہا تو فرشتے کہتے ہیں کہ حَمِدَ وَ اسْتَرْجَعَ کہ اے اللہ! آپ کی تعریف بیان کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا تو اس پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔اسی طرح تسلیم و رضا کے مضمون پر مشتمل کلمہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہے۔جب بندۂ مومن زمین پر رہتے ہوئے اس کو پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ آسمان میں اس کے تذکرے کرتے ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اسلم عبدی واستسلم ای انقاد و ترک العناد ... وفوض امور الکائنات الی اللہ﴾

(المرقاۃ، ج ۵، ص ۱۰۵، المطبعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

یعنی میرا بندہ میرے سامنے جھک گیا۔اور مخالفت ترک کرکے میرا مطیع ہوگیا۔اور اپنے تمام امور میرے حوالے کردیئے۔اور یہی تسلیم و رضا کی حقیقت ہے اور اگر بحیثیت بندہ ہونے کے عقلاً اس پر غور کیا جائے تو اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ جو مالک و آقا ہمیں عمر بھر عزت و راحت چین و سکون کے حالات میں رکھتا ہو اگر وہ کبھی ناموافق حالات لے آئے تو بندگی کا تقاضہ ہے کہ ہم اس پر بھی راضی رہیں۔جیسے میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ایک واقعہ سنایا کہ ایک غلام تھا اس کے آقا نے ایک دن اسے کڑوی ککڑی کھانے کیلئے پیش کی اس غلام نے بڑے شوق و ذوق کے ساتھ اس کڑوی ککڑی کو کھالیا۔تو آقا نے بڑے تعجب سے دریافت کیا کہ یہ ککڑی کڑوی تھی تم نے بڑے اطمینان اور شوق و ذوق سے اس کو کیسے کھالیا؟ تو اس غلام نے بڑا دانشمندانہ جواب دیا کہ جو آقا مجھے ہمیشہ میٹھی ککڑی کھلاتا رہا ہو۔اور ایک دن وہ کڑوی ککڑی پیش کردے اور میں اس پر منہ بناؤں تو یہ غلامی اور وفاداری کے خلاف ہے۔

اس لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے غلام سے دریافت کیا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ اور تم کیا کھانا پینا پہننا پسند کروگے۔اس پر غلام نے جواب دیا کہ آقا! غلاموں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔جس نام سے ان کا آقا ان کو پکارے وہی ان کا نام ہے اور جو کھانا پینا دیدے، وہی ان کا کھانا ہے۔ان کی اپنی کوئی تجویز نہیں ہوتی۔تو حضرت حسن بصری بے ہوش ہوگئے اور جب ہوش آیا تو کہنے لگے کہ اے غلام! تو نے مجھے آج غلامی اور بندگی سکھادی۔

صاحبو! ان سب واقعات اور دلائل سے میرا مقصود یہ ہے کہ بندہ اگر یہ سوچ کہ مجھ پر جو بھی حالات آئے موافق ہوں یا ناموافق وہ خود نہیں آئے بلکہ وہ میرے محبوب علیم وحکیم اللہ کی طرف سے لائے گئے ہیں۔

تو خود اس کا دل تسلیم و رضاء کے جوہر سے مالا مال ہوجائے گا اور وہ ہر حال میں نہایت فرحاں وشاداں رہے گا نہ وہ کسی طرح کی مایوسی واداسی کا شکار ہوگا اور نہ وہ کسی طرح کے ٹینشن (Tension) اور ڈیپریشن (Depression) میں بیمار ہوگا اور وہ زبان حال سے ہر گھڑی یوں کہے گا جس کو حضرت والا نے اس شعر میں بیان فرمایا۔

کیف تسلیم و رضاء سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختر روح رنجیدہ نہیں

کیوں کہ مومن کا کام ہر گھڑی باری تعالیٰ کے سامنے سرنگوں رہنا ہے اور اپنے ہر معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے اور ہر خوشی اور غم میں اسی کو پکارنا اور اسی کے در پر حاضری دینا ہے خواہ در کھلتا ہوا نظر آئے یا نہ آئے خواہ ہماری فہم وسمجھ ان واقعات وحالات کی حکمتوں سے باخبر ہو یا نہ ہو جیسا کہ اسی مضمون کو خواجہ صاحب نے یوں بیان کیا ہے۔

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پہ ہو کیوں تیری نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

اور تمام انبیاء کرام اور اولیاء عظام کا یہی دستور حیات رہا ہے۔

لذت قرب بے انتہاء کو
کس طرح لائے اختر زباں میں

ساری کائنات کی لذتیں اور سارے عالم کے حسن وجمال بلکہ دونوں جہان کی حسیناؤں کے حسن کی چمک دمک کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی راہ طے کر کے اللہ کو پاتا ہے اور اس کے قرب کی لذت سے آشنا ہوتا ہے تو دن بدن اسے اس میں ترقی اور اضافہ نظر آتا رہتا ہے اور جب وہ پہلے کے مقابلے میں دوسرے مقام قرب کی لذت چکھتا ہے تو اس سے پہلا مقام اسے بے کیف محسوس ہونے لگتا ہے اور یہ سلسلہ الی النہایہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ انسان دنیا سے اسی حال میں رخصت ہوتا ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اس لیے حضرت والا نے قرب بے انتہا کا لفظ استعمال فرمایا یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ جو اللہ کے قرب کی اعلیٰ منازل طے

کیے ہوئے تھے وہ بھی اپنی مناجات اور دعاؤں میں اللہ کے سامنے یونہی فریاد کناں ہوتے ہیں کہ خدایا ساری عمر غفلت میں گزری اور مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ کہہ کر اپنے عجز وقصور کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جن مقامات قرب پر رہتے ہیں ان کی لذتوں میں وہ ایسے محو اور کھوئے رہتے ہیں کہ دنیا انہیں ایک ویران خانہ معلوم ہوتی ہے یہ اس کیف وسرور اور لذت وفرحت کے سمندر میں تیرتے ہیں کہ لغتیں ان کی تعبیر سے تنگ اور قاصر ہیں، لغت میں یہ دم نہیں کہ وہ ان کے لذتِ قرب کو بیان کرسکے اور زبان وقلم سے اس کو سمجھایا جاسکے۔ اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا کہ میری زبان اس قرب بے انتہا کی لذت کے بیان سے قاصر وعاجز ہے۔

آپ کو پا گیا اپنی جاں میں

ذکر سے جب ملا نور جاں میں — سینکڑوں جاں ملی میری جاں میں
چار سو ان کی نسبت کی خوشبو — پھیل جاتی ہے سارے جہاں میں
کس طرح سے چھپاؤں محبت — راز ظاہر ہے آہ و فغاں میں
چشم غماز ہے درد نسبت — عشق مجبور ہے گو بیاں میں
نیم جاں کر دیا حسرتوں نے — رہ کے صحرا میں ہوں گلستاں میں
آپ کی راہ میں جان دے کر — آپ کو پا گیا اپنی جاں میں
یوں تو دنیا سے جانا ہے مجھ کو — کام کچھ نیک کرلوں جہاں میں
تیری توفیق کا آسرا ہے — ورنہ رکھا ہے کیا خاکداں میں
مثلِ خورشید چمکا دے یاربّ — درد مخفی ہے جو میری جاں میں
تیری رحمت کے صدقے میں اخترؔ — کیا عجب ہوگا باغ جناں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ نسبت: اللہ تعالیٰ کو بندے سے اور بندے کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہوجانا۔ آہ وفغاں: اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا اپنے گناہوں پر ندامت سے رونا۔ چشمِ غمّاز: ......۔ نیم جان: آدھی جاں۔ خاکدان: ......۔ مثلِ خورشید: سورج کی طرح۔ مخفی: پوشید۔ باغ جناں: ......۔

ذکر قلبی حیاتِ حقیقی کا ضامن ہے

ذکر سے جب ملا نور جاں میں
سینکڑوں جاں ملی میری جاں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی حیات کا بقاء جسم اور روح کی سلامتی پر رکھا ہے اگر ان دونوں میں سے کسی ایک میں بگاڑ اور خرابی پیدا ہو جائے تو وہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جس طرح جسم کی بقاء اور سلامتی کے لیے اس کا امراضِ جسمانی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے اسی طرح قلب اور روح کی سلامتی اور صحت کے لیے ان کو بھی امراضِ روحانی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے پھر جسم کی طاقت اور قوت کے لیے جس طرح غذائے جسمانی کی ضرورت ہے اسی طرح روح کی قوت اور طاقت اور صفائی ستھرائی کے لیے روحانی غذا کی ضرورت ہے حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ صَقَالَةٌ وَصَقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللهِ﴾

(المشکوٰۃ، باب ذکر اللہ عزّوجلّ والتقرّب الیہ، ص: ۱۹۹)

ہر چیز کے لیے اس کو صاف کرنے اور زنگ دور کرنے کے لیے کوئی چیز ہوتی ہے اسی طرح دل کا زنگ اور میل کچیل دور کرنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے اور دل سے ظلمت وتاریکی دور کر کے اسے منور اور روشن کرنے کے لیے اللہ کی یاد اور اس کا ذکر لازم اور ضروری ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کے دل پر چپکا اور جما رہتا ہے لیکن جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلشَّيْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَكَرَ اللهَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ﴾

(المشکوٰۃ، باب ذکر اللہ عزّوجلّ والتقرّب الیہ، ص: ۱۹۹)

اسی مضمون کو مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ خود جسم کی صحت وقوت کا دار و مدار روح کے نشاط اور سرور پر ہے تو جب اللہ کی یاد سے روح منور اور روشن ہوتی ہے اور دل مسرور رہتا ہے تو اس کے اثرات دل و دماغ کے ساتھ ساتھ بدنی ظاہری صحت پر بھی پڑتے ہیں۔

گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذکر جس طرح قلبی نشاط و سرور اور روحانی قوت وطاقت کا سبب ہے ٹھیک اسی طرح جسمانی قوت وطاقت کے لیے بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اسی لیے آج کل ڈاکٹرز اور اطباء ذہنی ٹینشن (Tension) اور دماغی الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے ڈیپریشن (Depression) اور اداسی ومایوسی کو

بڑی تعداد میں جسمانی مہلک امراض کا سبب قرار دے رہے ہیں اور دنیا بھر میں ایسے مریضوں کی تعداد بے شمار پائی جاتی ہے جن کو لاحق ہونے والی خطرناک نوعیت کی بیماریوں کا سبب صرف اور صرف ذہنی ٹینشن (Tension) اور ڈیپریشن (Depression) ہے جو کہ قلب وروح کو اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دلوں کے چین وسکون کو اور دنیوی واخروی بالطف زندگی کو صرف اپنی یاد میں منحصر کیا ہے بس اسی مضمون کو حضرت والا اس شعر میں بیان فرما رہے ہیں کہ جب اللہ کی یاد سے میرے قلب وجگر روشن ہوئے اور بدن کے رگ وریشے میں انوار ذکر سرایت کر گئے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے ہر ہر آن ہر ہر گھڑی ایک نئی زندگی کا لطف محسوس ہو رہا ہے اور نئی حیات عطا ہو رہی ہے اور ہر ملنے والی حیات پہلی حیات سے زیادہ بالطف اور لذیذ تر ہے۔

نسبت کی خوشبو خود مہک اٹھتی ہے

چار سو ان کی نسبت کی خوشبو
پھیل جاتی ہے سارے جہاں میں

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو اپنا خصوصی قرب اور نسبت ولایت خاصہ عطا فرما کر اپنا محبوب بناتے ہیں تو اس بندے کی خلوت وجلوت یادِ الٰہی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور اس کی ایک گھڑی بھی اللہ سے غفلت میں نہیں گزرتی اور وہ زندگی کی تمام خواہشات اور آرزوؤں کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کر ڈالتا ہے اور اس کے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کی یاد رچ بس جاتی ہے اور اس کے قلب وجگر اللہ تعالیٰ کی نسبتِ خاصہ کی خوشبو سے معطر ہو جاتے ہیں اور اس کی خلوتیں جلوتوں کی طرح یادِ الٰہی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ٹھیک اسی طرح اس کی نسبت کی خوشبو سارے عالم میں پھیلا دیتے ہیں اور ہر چہار اطراف عالم میں رہنے اور بسنے والے اس کی اس خوشبو سے معطر ہو جاتے ہیں جیسا کہ ظاہری خوشبو اپنے اردگرد رہنے والوں کو معطر کرنے میں کسی تقریر و بیان اور ایڈورٹائز (Advertise) کی محتاج نہیں ہوتی۔

ہائے جس دل نے پیا خون تمنا برسوں
اس کی خوشبو سے یہ کافر بھی مسلماں ہوں گے

مقبولیتِ اہل اللہ کا راز

اسی مضمون کو حضرت نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَیُحِبُّهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللهَ یُحِبُّ فُلَانًا

فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِى الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَيَقُوْلُ اِنِّىْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَيُبْغِضُهُ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يُنَادِىْ فِىْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَيُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِى الْاَرْضِ ۞

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة الادب، باب اذا احب اللہ عبدا، ج ۲، ص ۳۳۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم فلاں شخص سے محبت رکھتے ہیں تم بھی اس شخص سے محبت رکھو پس جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر جبرئیل علیہ السلام آسمان میں نداء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو چاہتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو سو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اہل زمین میں اس شخص کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص سے بغض ہوتا ہے تو اسی ترتیبِ مذکور سے اہلِ زمین کے قلوب تک اس کی مبغوضیت آ جاتی ہے روایت کیا اس کو مسلم نے اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ جب بندے کو اللہ تعالیٰ کا قرب اور رضاء وقبول مل جاتا ہے تو پھر اہلِ زمین کے قلوب میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اور پھر لوگ بلاتفریق قوم ووطن اور بلا امتیاز رنگ ونسل اس سے اللہ کی محبت سیکھتے ہیں اور یہ صفت بدرجہ اتم واکمل سب سے پہلے ہمارے پیغمبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی کہ آپ کی خوشبو مکہ سے مدینہ اور پھر وہاں سے مشرق ومغرب، شمال وجنوب تک پھیل گئی۔

محبت کی ترجمانی آہ وفغاں کی زبانی

کس طرح سے چھپاؤں محبت
راز ظاہر ہے آہ و فغاں میں

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل کو اپنا دردِ محبت عطا فرماتے ہیں تو پھر اس کی آہ وبکاء اور گریہ وزاری کی صورت میں دل میں چھپا ہوا دردِ محبت ظاہر فرما دیتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جب بیمار کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور ڈاکٹر اس سے اس کا حال پوچھتا ہے تو اسے اپنا حال بتانے کے لیے کسی تقریر وبیان کی مشق اور پریکٹس (Practice) کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کا درد اور تکلیف خود اسے درد کا بیان سکھا دیتا ہے اور اس کی آہ وبکاء اور رنج وغم دیکھنے والے پر اس کی حالت کی ترجمانی کرتا ہے تو اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت کا غم جس دل میں ہوتا ہے تو وہ اس کی آہ وفغاں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے حضرت والا نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم جب دل میں راسخ ہوتا ہے اور اس کا دل قرب ومعرفت کی تجلیات وانوار سے معمور ہوتا ہے تو یہ انوارات چہرے پر چمکنے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتے ہیں خود چھپانے سے بھی چھپتے نہیں بقول سید جگر مرادآبادی مرحوم ؎

لاکھوں میں جگر اس نے پہچان لیا تم کو
چھپتی ہے چھپائے سے کب آنکھ محبت کی

جن کے دلوں میں قساوت اور سختی پائی جاتی ہے اور وہ دردِ محبت خداوندی سے آشنا نہیں ہوتے وہ آہ وفغاں اور گریہ وزاری کی حلاوت سے بھی محروم رہتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور اس سے محرومی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مقام مذمت میں ذکر فرمایا ہے۔

آنکھوں کا خشک ہونا قساوتِ قلبی کی علامت ہے

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ﴾

(سورة البقرة، آیت ۷۴)

ترجمہ: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد، سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہے نہریں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے۔

حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں جن سے مخلوق خدا فائدہ اٹھاتی ہے اور ان یہودیوں کے دل ایسے بھی نہیں کہ مخلوق خدا کی مصیبت وتکلیف میں پگھل جائیں اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے یہ پتھر بنسبت اول کے کم نرم ہوا اور ان کے قلوب درجہ دوم کے ان پتھروں سے بھی سخت ہیں اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے کہ خوف خدا سے نیچے گر آتے ہیں گو درجہ میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہے مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذب وانفعال بھی نہیں۔ (معارف القرآن، ج:۱،ص:۲۴۸)

اور مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ج:۱،ص:۹۷ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہودیوں کے دلوں کی قساوت کو ذکر فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو منع فرماتے ہیں کہ کہیں تمہاری حالت ان کی طرح نہ ہو جائے اور پھر آگے ایک روایت مرفوعاً نقل کی ہے:

﴿اَرْبَعَةٌ مِّنَ الشَّقَآءِ: جُمُوْدُ الْعَيْنِ، وَقَسْوَةُ الْقَلْبِ، وَطُوْلُ الْاَمَلِ، وَالْحِرْصُ عَلَى الدُّنْيَا﴾

(فتح الباري، كتاب الرقاق، باب في الأمل وطوله، ج:۱۱، ص:۲۳۷، دار المعرفة، بيروت)

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت ہے کہ چار چیزیں شقاوت سے ہیں (۱) آنکھوں کا خشک

ہو جانا یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنکھوں سے آنسو نہ نکلے (۲) دل کا سخت ہو جانا یعنی کسی کی کیسی ہی مصیبت وتکلیف دیکھ کر دل میں کوئی اثر نہ ہو اور کوئی وعظ ونصیحت دل پر اثر انداز نہ ہو (۳) امیدوں کا لمبا ہو جانا یعنی دنیا سے متعلق طویل منصوبے اور مختلف نوع کی لمبی امیدیں اور پلاننگ (Planning) میں لگے رہنا مال ودولت جاہ ومنصب کے فروغ اور ترقی کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام بنانا (۴) دنیا کی حرص وطمع یعنی ہر وقت اس کی حرص و ہوس اور فکر ولگن اور دھن اور دھیان میں لگے رہنا۔

صاحبو! ان آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ رقتِ قلبی اور آہ وزاری گریہ وبکاء بارگاہِ الٰہی میں بندۂ مومن کی سعادت اور نیک بختی کی علامت اور نشانی ہے اور دل میں محبتِ الٰہی کے رچ بس جانے اور نسبت مع اللہ کے راسخ ہو جانے کی پہچان ہے۔

محبت کی غماز آنکھیں

چشمِ غماز ہے دردِ نسبت
عشق مجبور ہے گو بیاں میں

ارشاد فرماتے ہیں کہ آنکھوں سے نکلنے والا آنسو دل میں چھپے ہوئے دردِ محبت کا ترجمان ہے اور جب دنیا میں بھی کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو وہ اس کی یاد اور اس کے تذکرے عنوان بعنوان کرنے پر مجبور ہوتا ہے اسی لیے عربی کا مقولہ ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ یعنی جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کے تذکرے کے لیے بے قرار اور مجبور ہوتا ہے اور بہانے ڈھونڈتا ہے تا کہ بار بار میں اپنے محبوب کا تذکرہ کروں ٹھیک اسی طرح وہ لوگ جو اپنے سینوں میں اللہ کی محبت سے لبریز دل رکھتے ہیں وہ کسی بھی طرح کی محفل ومجلس میں ہوں اور کیسی ہی حالت اور موقعہ ہو وہ اپنے محبوب اللہ کا تذکرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور کسی نہ کسی عنوان سے محفل کے رنگ کو وہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں اور پوری محفل کو اپنے محبوب کے تذکرے کی خوشبو سے مہکا دیتے ہیں اسی کو عارف ہندی حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کہا ہے ؎

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگ محفل دیکھ لیتے ہیں

صحرا میں گلستان کا مزہ

نیم جاں کر دیا حسرتوں نے
رہ کے صحرا میں ہوں گلستاں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ کو غفلتوں کے ساتھ جینا اور بے خوف ہو کر دنیا کے عیش وعشرت میں پڑ جانا پسند نہیں ہے۔ ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿ان اللہ لا یحب الحبر السمین﴾

(المرقاۃ، باب صلوٰۃ اللیل، ج ۲، ص ۱۰۱، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے عالم کو جو خوفِ آخرت سے بے خوف اور فکرِ عقبیٰ سے بے فکر ہو کر زندگی گزارتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے بدن پر موٹاپا آتا ہے تو ایسا عالم خدا کو محبوب نہیں کیوں کہ جب انسان ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے احکام کا خیال رکھ کر اور اپنی حرام آرزوؤں اور ناجائز تمناؤں کا خون کر کے چلتا ہے تو گو کہ اس کے بدن پر موٹاپا نہ ہو لیکن اس کی روح نہایت طاقتور اور مضبوط ہوتی ہے تو ظاہری طور پر تو وہ شخص نیم جان ہوتا ہے مگر اپنے باطن سے وہ سیکڑوں جان والوں سے زیادہ قوی اور مضبوط رہتا ہے اسی لیے وہ صحرا و جنگل میں رہ کر گلستاں کے مزے پاتا ہے اور اس کے مشامِ جاں حق تعالیٰ کی محبت و نسبت کی خوشبو سے معطر رہتے ہیں اور اس کے دل و دماغ کو اللہ تعالیٰ ایسا گلستاں بنا دیتے ہیں جس میں اس کی یادوں کی بہاریں ہر وقت آتی رہتی ہیں اور اسے کبھی خزاں لاحق نہیں ہوتی بظاہر ایسے شخص کے پاس جسمانی عیش و عشرت کے سامان فراوانی کے ساتھ موجود نہیں ہوتے اور صورتاً اہلِ دنیا کی نگاہوں میں وہ غموں اور حسرتوں والی زندگی گذارتا ہے لیکن اہلِ حقیقت کی نگاہ میں وہ بڑی پر کیف زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔

قلبِ مومن کی تجلیاتِ الٰہیہ

آپ کی راہ میں جان دے کر
آپ کو پاگیا اپنی جاں میں

حدیثِ قدسی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا وَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ﴾

(المرقاۃ، ج ۱، ص ۳۹۹، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

مجھ کو نہ میری زمین سمو سکی اور نہ میرا آسمان لیکن مجھے میرے مومن بندے کے دل نے سما لیا۔ جب بندہ مومن اپنی نفسانی خواہشات اور حرام آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنے مالک کی مرضی پر فدا کرتا ہے اور اپنے دلی جذبات اللہ تعالیٰ کے حکم سے دباتا ہے اور دل کی اُمنگوں کو شریعت و سنت کے سانچے میں ڈھال کر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے دل میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی اور کو جگہ نہیں دیتا نہ وہاں دنیا کے مال و متاع کی رغبت و حاجت باقی رہتی ہے اور نہ نام و نمود کی خواہش و تمنا دل میں باقی رہتی ہے بلکہ صرف اپنے مولیٰ کو راضی کرنے کی فکر لگی رہتی ہے اور غیر سے کسی نوع کا کوئی تعلق قائم نہیں رہتا تو پھر اللہ اس دل کو اپنا مسکن بناتے ہیں اور مسکن اس طرح بناتے ہیں کہ وہ اپنی جان میں اپنے مولیٰ کو ٹھیک اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں ذکر کیا۔

اللہ تعالیٰ کے کان اور آنکھ بن جانے کا مطلب

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ج ۲، ص ۹۶۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص میرے مقبول بندے سے عداوت کرے میں اس کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں اور میرا بندہ مجھ سے کسی ایسے ذریعے سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک اداء فرائض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں پھر جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اس کا پاؤں ہوجاتا ہوں جس وہ چلتا ہے مطلب یہ کہ اکثر اس کے ان جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا اِلَّا بِعَارِضٍ لَا یَدُوْمُ۔

درحقیقت ان اعضا و جوارح کا اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہوجانا اور منشاءِ خداوندی اور مرضی الٰہی کے خلاف کچھ ہوجانے سے دل کا بے چین اور پریشان ہوجانا یہی حقیقت ہے اس درجہ ولایت کی کہ جس کو صوفیاء اپنی اصطلاح میں نسبت سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی حدیث سے ہم اس مسئلے پر بھی استدلال کرسکتے ہیں کہ اولیاء اللہ اگرچہ معصوم نہیں ہوتے لیکن محفوظ ہوتے ہیں یعنی عصمت تو انبیاء کے ساتھ خاص ہے لیکن حفاظت کا وعدہ اولیاء اللہ سے بھی ہے جیسا کہ اس حدیث کے ترجمہ وتشریح سے ظاہر ہوا اور اسی کی تعبیر حضرت والا نے اپنے دوسرے ایک شعر میں یوں فرمائی ہے ؎

وہ شاہِ جہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے پائے

اور جب سر سے پیر تک تمام اعضاء بدنیہ ظاہرہ و باطنہ اللہ تعالیٰ کی عظمت واطاعت میں ڈوب جائیں اور پلک جھپکنے کے برابر بھی غفلت و معصیت کا شکار نہ ہوں اور یا ہوتے بھی ہوں تو معاً ندامت وتوبہ کا مزاج بن جائے تو سمجھ لو کہ مولیٰ دل میں آچکے ہیں اسی کو حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شعر میں فرمایا ؎

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

دنیا ایک مسافر خانہ ہے

یوں تو دنیا سے جانا ہے مجھ کو
کام کچھ نیک کر لوں جہاں میں

اس شعر میں حضرت والا یہ مضمون بیان فرمارہے ہیں کہ دنیا سے ایک دن مر کے جانا ہے اور یہ دنیا درحقیقت مسافر خانہ ہے یہاں کوئی مستقل ٹھہرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ یہاں جو بھی آیا ہے وہ اگلی زندگی کے لیے کچھ عبادات وطاعات اور معرفت ومحبت خداوندی کا ذخیرہ لے کر ساتھ جانے کے لیے آیا ہے ہر دم ہم دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہورہے ہیں اور دنیا عمل کا گھر ہے حساب کا نہیں اور آخرت حساب کا گھر ہے عمل کا نہیں اس لیے دنیا میں انسان رہتے ہوئے آخرت کے لیے کچھ نیک کام کرلے یہی اس کی سمجھداری اور عقلمندی ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا میں نیک کاموں میں اسی کو وابستہ کرتے اور لگاتے ہیں جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت سے پہلے دنیا میں بندے کو نیک کاموں کی توفیق ملنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بندہ بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا اسْتَعْمَلَہٗ فَقِیْلَ کَیْفَ یَسْتَعْمِلُہٗ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ یُوَفِّقُہٗ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان اللہ کتب کتابا...، ج ۲، ص ۳۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے بھلائی کے کام کراتا ہے۔ پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ بھلائی کے کام کیسے کراتا ہے یارسول اللہ۔ فرمایا موت سے پہلے اس کو عمل نیک کی توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

تو حضرت والا کے اس شعر میں جہاں دنیا کے زوال اور فنائیت کے استحضار کی تعلیم ہے وہیں دوسرے مصرعے میں دنیا کا صحیح مصرف اور اس دنیوی حیات کو گذارنے کی صحیح صورت بھی مذکور ہے کہ دنیا کو صرف نیک کاموں کی کھیتی بنانا چاہیے جو لوگ دنیا میں رہ کر صرف اپنی دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت کی ایک مثال

ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کراچی کے شہر کا سفر کرنے والا مسافر دوران سفر ہی زیب وزینت اور آرائش وزیبائش کی چیزوں میں اپنا سارا راس المال خرچ کر کے سعودی عرب پہنچے اور وہاں رہنے کے لیے اس نے پیشگی کوئی انتظام نہ کیا ہو اور نہ کچھ اپنے ساتھ لے گیا اور نہ وہاں اس کا کوئی یار ومددگار ہو نہ رشتہ دار موجود ہو تو ظاہر ہے ایسے شخص کی مشکلات اور پریشانیوں کا کوئی علاج ممکن نہ ہوگا ٹھیک اسی طرح جو شخص دنیا میں رہ کر صرف دنیا کی فکر

میں لگا رہا ہو اور آخرت کے لیے پیشگی کچھ نہ بھیجا ہو تو پھر اس شخص کی حسرت و افسوس اور تکلیف و پریشانی کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور وہاں پہنچ کر وہ یوں کہے گا کہ کاش میں اعمال کا ایک عظیم توشہ یہاں لایا ہوتا وہ ایسے وقت میں بہت کچھ تمنا کرے گا جبکہ وہ تمنا اس کو نافع نہ ہوگی جیسا کہ قرآن انسانوں کی حسرت و افسوس کو یوں نقل کرتا ہے یٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ ہائے افسوس! میں نے اللہ کے حقوق میں کیوں کوتاہی برتی اور دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا یَا لَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ اے کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی بھیجا ہوتا۔ حضرت والا کے اس شعر میں ایسی تعلیم ہے جس پر عمل کر کے انسان آخرت کی اس حسرت و ندامت سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

انسان بلا ایمان ایک خاکدان ہے

تیری توفیق کا آسرا ہے
ورنہ رکھا ہے کیا خاکداں میں

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا﴾

(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا۔

(معارف القرآن، جلد: ۶، ص: ۳۶۹)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری ایک آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اسی لیے حضرت والا اس شعر میں یہی مضمون ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں اس کی طاقت ہے کہ بغیر تیری توفیق شاملِ حال ہوئے میں کوئی نیک کام کر سکوں یا تیری محبت کی راہ میں قدم رکھ سکوں اور جو کچھ بھی مجھے حاصل ہے وہ صرف تیری عطا ہے اور میری حیات تیرے فضل و کرم کے سہارے پر قائم ہے اسی کو حضرت والا دوسرے موقعہ پر یوں ارشاد فرماتے ہیں ؂

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

اور ارشاد فرمایا ؂

کام بنتا ہے فضل سے اختؔر
فضل کا آسرا لگائے ہیں

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی معرفت و محبت سے دل خالی ہو اور ایمان و عمل زندگی میں نہ ہو اور اطاعت و اتباع کی توفیق شامل نہ ہو تو پھر یہ انسان محض مٹی کا ایک ڈھیر ہے جس کو عارضی طور پر احساس و ادراک اور عقل

وشعور دے کر دوسرے مٹی کے ڈھیر سے ممتاز اور علیحدہ کیا گیا ہے۔

اور یہ عارضی مدت ختم ہوتے ہی یہ اپنی حقیقت کی طرف لوٹ کر پھر مٹی میں مل جائے گا یہی تو وجہ ہے کہ جب انسان اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا اور کفر وشرک کی راہ اختیار کرتا ہے تو حق تعالیٰ کی نگاہ میں اس کا درجہ نہ صرف یہ کہ انسانیت سے گر جاتا ہے بلکہ حیوانوں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

مثل خورشید چمکا دے یارب
درد مخفی ہے جو میری جاں میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے تعلق ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہاں کرتی تھیں ۔

لَنَا شَمْسٌ وَ لِلْاُفَاقِ شَمْسٌ
وَ شَمْسِیْ اَفْضَلُ مِنْ شَمْسِ السَّمَاءِ
فَاِنَّ الشَّمْسَ تَطْلَعُ بَعْدَ فَجْرٍ
وَ شَمْسِیْ تَطْلَعُ بَعْدَ الْعِشَآءِ

ہمارا ایک سورج ہے اور دنیا جہاں والوں کا ایک سورج ہے اور میرا سورج آسمان کے سورج سے افضل ہے کیوں کہ آسمان کا سورج فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے اور میرا سورج عشاء کے بعد طلوع ہوتا ہے۔

صاحبو! جس طرح یہ آسمان کا سورج دنیا جہاں کے ظاہر کو روشن کرتا ہے اور اس کی روشنی سے کائنات کی اشیاء اشجار ونباتات اور نوع بنوع بری اور بحری مخلوقات مستفید ہوتی ہیں اور بہت سی اشیاء کی صحت وسلامتی اور ان کا بقاء اس روشنی پر منحصر اور محدود ہے اس سے کہیں زیادہ آفتاب وماہتاب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی کرنوں سے اس عالم کا وجود اور پوری کائنات کی بقاء وابستہ اور جڑی ہوئی ہے اور اس سورج کی روشنی سے کہیں زیادہ اہل دنیا کے ظاہر وباطن اور ان کے حال اور مستقبل اور ان کی صورت وسیرت کو منور اور روشن کرنے والی وہ روشنی ہے جو ڈائریکٹ (Direct) حق سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں آفتابِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں عطا کی ہے کیوں کہ جس دن روئے زمین پر کوئی اللہ اللہ کرنے والا نہ رہے گا تو اس کائنات کے سارے نظام کو درہم وبرہم کر کے قیامت کو قائم کر دیا جائے گا۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں یہی دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح تو نے محض اپنی توفیق سے میری جان میں اپنا دردِ محبت مخفی فرمایا تو مجھے یہ توفیق بھی دے دے کہ ان معرفت ومحبت کے انوار سے اور

تیری یادوں اور ترے تذکروں سے مثل آفتاب دنیا کے پورے عالم کو روشن کردوں اور یہ چھپا ہوا دردایسا نورِ معرفت ومحبت بن کر میرے سینے سے نکلے کہ جو بھی میرے قریب ہو اس کا دل چمک اٹھے اور وہ خود بھی حاملِ دردِ محبت ہو جائے اور مجھے اس شعر کا مصداق بنادے ؎

جو بشر بھی سن لے میری آہ کو
بس تڑپ جائے وہ تری چاہ کو

اور حضرت والا نے یارب کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اے خدا! جبکہ میرے ظاہر وباطن کی تربیت آپ ہی کے قبضے میں ہے اور جو بھی کچھ ملتا ہے یا ملا ہے سب آپ کی دین ہے، تو میرے بندہ ہونے اور آپ کے رب ہونے کا مقتضیٰ بھی یہ ہے کہ آپ میری یہ مراد بھی پوری فرمادیں۔

دخولِ جنت محض رحمتِ خداوندی سے ہوگا

تیری رحمت کے صدقے میں اختر
کیا عجب ہو گا باغِ جناں میں

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی کی بھی مغفرت اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں محض اعمال کی بنیاد پر کسی کی مغفرت نہ ہوگی۔

اس پر صحابہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ کی بخشش بھی اس بنیاد پر نہیں ہوگی؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں نہ میری بخشش اس بنیاد پر ہوگی الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سائے میں ڈھانپ لے۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید قائم کر کے یہ عرض کررہے ہیں کہ اگرچہ میں اس کا مستحق نہیں ہوں لیکن میں اپنے اللہ سے پوری امید رکھتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں جگہ عطا کردیں گے ایک حدیث قدسی ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان قائم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے ہر مومن کو یہی گمان رکھنا چاہیے کہ جب اس نے دنیا میں بلا استحقاق وبلا سوال اہل ایمان اور اہل اسلام کے گھر میں پیدا فرما کر نعمت ایمان واسلام سے مشرف کیا ہے تو ان شاء اللہ مرنے کے بعد آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ فضل فرما کر اہل جنت کا ساتھ عطا فرمادیں گے۔

جنتی اور جہنمی ہونے کا فیصلہ جائز نہیں

اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی کے جنتی اور جہنمی ہونے کا حتمی اور قطعی علم صرف اللہ کو ہے اگر کوئی انسان فسق وفجور کی آخری سرحدوں کو پار کر چکا ہو اور ظلم وزیادتی میں بہت آگے جاچکا ہو تب بھی اس کے لیے جہنمی

ہونے یا جنتی ہونے یا بد بخت ہونے وغیرہ کا فیصلہ کرنا یا اس کو ان الفاظ سے پکارنا جائز نہیں اسی طرح اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی دوستی اور للہیت اور معرفت ومحبت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا ہو اور بظاہر وقت کا بہت اونچا شیخ، مصلح، عالم، داعی، مجاہد غرض یہ کہ جملہ صفات بندگی اس میں اعلیٰ درجے پر پائی جاتی ہوں مگر اس کے لیے بھی حتمی اور قطعی طور پر جنتی ہونے کی بات کرنا جائز نہیں ہاں بے شک وہ لوگ کہ زبان نبوت سے جن کے متعلق جنتی اور جہنمی ہونے کی خبر دی جا چکی ہے وہ اس اصول سے مستثنیٰ ہیں دنیا میں رہتے ہوئے صرف حسن ظن قائم کیا جا سکتا ہے قطعی علم صرف عالم الغیب اللہ کے پاس ہے اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی کے مزکّی اور مجلّی ہونے یا ولایت اور بزرگی کے مقامات میں کسی خاص مقام پر فائز ہونے کی بات کرنے کو ممنوع قرار دیا جیسا کہ التکشف، ص:۳۸۶ پر حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے حدیث شریف نقل کی ہے اور اس سے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ مَادِحًا اَخَاہُ فَلْیَقُلْ اَحْسَبُ فُلَانًا وَ اللّٰہُ حَسِیْبُہٗ وَلَا یُزَکّٰی عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا اَحْسَبُ فُلَانًا کَذَا وَ کَذَا اِنْ کَانَ یَعْلَمُ مِنْہُ ذٰلِکَ اخرجه الشیخان وابو داؤد﴾

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنے مسلمان بھائی کی ضرور ہی مدح کرنا ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ہے آگے خدا کافی جاننے والا ہے اور خدا کے نزدیک کسی کے پاک ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور یہ جو کہے گا کہ فلاں شیخ میرے گمان میں ایسا ایسا ہے وہ بھی اس شرط سے کہ اس کے علم میں بھی وہ شخص ایسا ہو۔ (ورنہ اس عنوان سے بھی مدح جائز نہیں) روایت کیا ہے اس کو بخاری ومسلم وابوداؤد نے۔

جیسا کہ اکثر اس میں بے احتیاطی ہے البتہ اگر ظناً کہہ دے تو مضائقہ نہیں اور بہتر یہ ہے کہ اس کی ظنیت کی تصریح بھی کردے لیکن اگر اعتماداً علی قرینۃ المقام والکلام تصریح نہ بھی کرے تب بھی مضائقہ نہیں ہاں شیخ کہنا کسی کو جزم سے بھی جائز ہے کیونکہ مشیخیت امر مشاہد ہے یعنی طریق تربیت کا جاننا بخلاف ولایت کے کہ امر غیبی ہے یعنی مقبول عنداللہ ہونا۔ (التکشف، ص:۳۸۶، مطبوعہ: کتب خانہ مظہری)

ترے در پر ترا بندہ بہ امید کرم آیا

کرم سے ان کے میرے سامنے ان کا حرم آیا
ہماری زندگی کا وقتِ مغتنم آیا
کرم سے ربِ کعبہ کے دعا یاں رد نہیں ہوتی
نظر کے سامنے قسمت سے میری ملتزم آیا
یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ انوارِ کعبہ ہے
یہ مالک کا کرم ہے اس پہ جو اس کے حرم آیا
اگرچہ پُرخطاء ہے پر کہاں جائے ترا بندہ
ترے در پر ترا بندہ بہ امید کرم آیا
زبانِ شکر قاصر ہے لغت میں دم نہیں اختؔر
مری اُمید سے زیادہ نظر ان کا کرم آیا

مُشکل الفاظ کے معنی:۔وقتِ مغتنم: قدر کے قابل وقت۔ ردّ: نامقبول۔ مظھر: ظاہر ہونے کی جگہ۔ پُر خطاء: گنہگار۔ قاصِر: معذور۔ دم: سانس۔

حاضریٔ حرمین، غنیمت جانیں

کرم سے ان کے میرے سامنے ان کا حرم آیا
ہماری زندگی کا وقتِ مغتنم آیا

اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے بیت اللہ کا حج وعمرہ اور اللہ کے گھر کی حاضری ہے اور دنیا بھر کی تمام مساجد میں سب سے افضل مسجد مسجدِ حرام پہنچنا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو یہ سعادت عطا فرمائے اسے اس وقت کو غنیمت جان کر اس کی قدر کرنی چاہیے کیوں کہ یہ لمحات زندگی میں گنے چنے ہوتے ہیں اور یہ قیمتی فرصتیں ہمیشہ آسانی سے میسر نہیں ہوتیں۔ اس لیے حضرت والا کے اس شعر میں ایک نصیحت تو یہ ہے کہ وہاں کی حاضری کو اپنے مال و دولت اور سعی و کوشش کی طرف منسوب نہ کرے کیوں کہ کتنے بڑے بڑے اغنیائ بیت اللہ کی حاضری سے محروم رہتے ہیں اور کتنے ہی خالی ہاتھ تنگ دست فضلِ الٰہی کے نتیجے میں وہاں کی حاضری سے بار بار مشرف ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح دوسری نصیحت اس شعر میں یہ ہے کہ اپنے ان اوقات کی قدر کرے اور ان کو غنیمت جانے لایعنی اور بے فائدہ کاموں میں بلاوجہ ضائع نہ کرے حتی کہ کوشش یہ کی جائے کہ دنیوی مباح کاموں میں بھی نہ پڑے

تا کہ یہ اوقات حرم کے اندر رہ کر زیادہ سے زیادہ ذکر و عبادت میں خرچ کیے جائیں یوں تو حدیث شریف میں مذکور ہے کہ ساری ہی عمر موت سے پہلے غنیمت ہے مگر خاص طور پر حرم کی ساعتیں اور بھی زیادہ اہم ہیں کیوں کہ وہاں نیکیوں کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔

شعائر اللہ کی اہمیت

کرم سے رب کعبہ کے دعا یاں رد نہیں ہوتی
نظر کے سامنے قسمت سے میری ملتزم آیا

حضرت والا ان اشعار میں حرم محترم کے مقدس مقامات میں دعاؤں کی قبولیت کا تذکرہ فرما رہے ہیں چنانچہ ملتزم، مقام ابراھیم، صفا و مروہ یہ سارے ہی مواقع دعاؤں کی مقبولیت کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور اسی لیے ان شعائر اسلام کا احترام قرآن کی مختلف آیات اور مختلف احادیث میں مذکور ہے مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْاُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوْا هٰذِهِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِيْمِهَا فَاِذَا ضَيَّعُوْا ذٰلِكَ هَلَكُوْا﴾

(المشكوة، باب حرم مكة حرسها الله تعالى، ص: ۲۳۸)

ترجمہ: یہ امت جب تک مکہ کی حرمت کا پورا پورا احترام اور عظمت کرتی رہے گی تب تک خیر پر قائم رہے گی لیکن جب قوم اس کو ضائع کرے گی تو ہلاک ہو جائے گی۔

ایک اور روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ اَلْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللهِ اِنْ دَعَوْهُ اَجَابَهُمْ وَاِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَلَهُمْ﴾

(المشكوة، كتاب المناسك، ص: ۲۲۲)

ارشاد فرمایا کہ حج و عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اگر وہ اللہ سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول کرتے ہیں اور اگر وہ خاص طور سے مغفرت کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ ربِّ کعبہ، کعبہ پر اسی کو بلاتا ہے جس کو کچھ نوازنا ہوتا ہے ہاں جو خود ہی لینا نہ چاہے تو بات اور ہے۔ اس لیے یہ سب اللہ تعالیٰ نے نوازنے اور عطا کرنے کے بہانے رکھے ہیں۔

مالِ حرام اور حج و عمرہ

صاحبو! حرم کے مقدس مقامات میں دعاؤں کا مقبول ہونا اس میں تو کوئی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ دعاؤں کی قبولیت حرام مال کھانے کے ساتھ ممکن نہیں اگرچہ کوئی انسان ملتزم سے چمٹ کر اور بیت

اللہ کے دروازے سے لپٹ کر بھی دعا کرتا رہے حدیث پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بعض ایسے لوگ جو بالکل پراگندہ حال اور گرد آلود ہوتے ہیں دور دراز کا سفر کئے ہوئے (یعنی جن کی ظاہری حالت ایسی ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر مخلوق کو بھی رحم آجائے) آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں یارب یارب لیکن چونکہ ان کا کھانا حرام پینا حرام لباس حرام اور ان کا نشو ونما حرام سے ہوا ہے تو بھلا ایسے شخص کی دعا کیوں کر قبول کی جاسکتی ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مال حرام کی نحوست اور عند اللہ اس کی شناعت وقباحت کس قدر شدید ہے کہ ارحم الرحمین کی رحمت کو اس کی وجہ سے روک دیا گیا اس لیے اس مقدس سفر کو طے کرتے وقت اپنے مصارف سفر اور اخراجات اہل خانہ اور پورے اپنے معیشت کے نظام کو حرام سے پاک کرنے کی فکر کرنی چاہیے اور اگر کہیں کسی طرح کی کوئی کمی پائی جائے یا مالی حقوق ذمے ہوں تو پہلے ان کی ادائیگی کرنی چاہیے نہ کہ سفر حج وعمرہ اس لیے کہ اصل عبادت اور بندہ مومن کا مقصود رضاء الٰہی ہے اور بس۔ اور مال حرام کے ساتھ سفر حج کرنے پر حضور اکرم ﷺ نے اس کے مقبول نہ ہونے کی وعید سنائی ہے تو بھلا ایسے سفر سے سوائے اپنے جی خوش کرنے کے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔

قبولیت دعا کا مطلب اور غلط فہمی کا ازالہ

دوستو! بارگاہِ الٰہی سے دعا کا رد نہ ہونا یہ امر یقینی ہے کیوں کہ اللہ اور اس کے وعدے بالکل حق اور سچ ہیں لیکن قبولیت کا معنیٰ اور مطلب سمجھ لینا چاہیے سو اس سلسلے میں علماء نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کبھی بندے کو وہی چیز عنایت کر دی جاتی ہے اور کبھی بندے کے مصالح کے پیش نظر اس کی دعا آخرت میں اس کے لیے جمع کر دی جاتی ہے اور کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ آنے والے حوادث سے اس کو بچالیتے ہیں اس لیے قبولیت کا صرف یہی معنیٰ نہیں ہوتا کہ ہم جو مانگ رہے ہیں ہم کو بعینہ وہی چیز دے دی جائے بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور بالآخر جب وہ یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں ہمارا مانگا ہوا مطلب نہیں مل رہا ہے تو وہ دعا چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لیے کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یُسْتَجَابُ لِاَحَدِکُمْ مَالَمْ یَعْجَلْ یَقُوْلُ دَعَوْتُ فَلَمْ یُسْتَجَبْ لِیْ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب یستجاب لعبد ما لم یعجل، ج:۲، ص:۹۳۸)

کہ دعا قبول ہوتی رہتی ہے جب تک کہ بندہ عجلت بازی نہ کرے صحابہ نے پوچھا یہ عجلت بازی کیا ہے ارشاد فرمایا کہ دعا کرتا رہے اور جب یہ دیکھے کہ قبول نہیں ہے تو چھوڑ بیٹھے۔

پھر بندہ مومن کے لیے دعا کی حیثیت ایک مستقل عبادت کی ہے اور گویا دعا کرنے کا معنیٰ اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹانا ہے اور بندے کی شان یہ ہے کہ وہ دروازہ برابر کھٹکھٹاتا رہے اگر کھلے تو بھی اور اگر نہ کھلے تو بھی، کیوں کہ وہ بہر دو صورت اپنا فریضہ بندگی ادا کر رہا ہے یعنی اللہ کا قرب اور اس کی رضا والے عمل میں مشغول ہے جس کو حضرت مولانا رومی یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں
جز سخن گفتن بآں شیریں دہاں

دعا کرنے سے عاشقوں کی مراد یہ بھی ہوتی ہے کہ میری حاجت پوری ہو جائے مگر مولانا رومی فرماتے ہیں کہ ان کی ایک اور بڑی پیاری نیت ہوتی ہے کہ اسی بہانے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کا موقعہ ملتا ہے، عاشقوں کی مراد دعاؤں سے صرف حاجت روائی نہیں ہے بلکہ ایک مقصد اور ہے ؎

جز سخن گفتن بآں شیریں دہاں

کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی اور بات چیت کا شرف مل جائے عاشقوں سے پوچھو اس کا مزہ کہ اپنے محبوب سے گفتگو میں کیا مزہ آتا ہے۔ (درسِ مثنوی، ص: ۲۰۸)

دوسرے مصرعے میں حضرت نے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے کہ میری خوش نصیبی ہے اور سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری نگاہوں کے سامنے بیت اللہ کیا ہوا ہے اور میں ان قیمتی لمحات زندگی کو اللہ کے گھر کے سامنے حدودِ حرم میں گزار رہا ہوں کیوں کہ بیت اللہ کے سامنے صرف بیٹھنے والا اور عظمت و محبت کے ساتھ بیت اللہ کا دیدار کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارشوں سے سیراب ہوتا رہتا ہے ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُنْزِلُ اللهُ کُلَّ یَوْمٍ عَلٰی حُجَّاجِ بَیْتِ الْحَرَامِ عِشْرِیْنَ وَمِأَةَ رَحْمَةٍ سِتِّیْنَ لِلطَّائِفِیْنَ وَاَرْبَعِیْنَ لِلْمُصَلِّیْنَ وَعِشْرِیْنَ لِلنَّاظِرِیْنَ رَوَاهُ ابْنُ حَبَّانَ فِی الضُّعَفَآءِ وَالْبَیْهَقِیُّ فِی الشُّعَبِ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ وَالطَّبْرَانِیُّ فِیْ مَعَاجِمِ الثَّلٰثَةِ وَاَبُوْ ذَرٍ الْهَرَوِیُّ وَالْاَزْرُقِیُّ﴾

(الترغیب والترھیب، ج: ۳، ص: ۶۴)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے گھر کا حج کرنے والوں پر روزانہ ایک سو بیس رحمتیں نازل کرتا ہے ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں کے لیے اور چالیس نماز پڑھنے والوں کے لیے اور بیس کعبہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے والوں کے لیے۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ محض بیت اللہ پر نظر ڈالنے والے پر بھی اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے یعنی جو محبت و شوق سے بیٹھا ہوا کعبہ کو صرف دیکھ رہا ہو رحمتوں میں سے حصہ اسے بھی ملتا ہے کیونکہ کعبہ کو محبت کی نظر سے دیکھنا درحقیقت خدا ہی سے محبت کا نتیجہ ہے دوسرے کسی چیز کا دیکھنا خود اس کی محبت پیدا کرنے کا ایک موثر کامیاب طریقہ ہے کسی چیز کو محبت کی نظر سے جتنا زیادہ بار بار دیکھا جاتا ہے اس قدر اس کی محبت دل میں گھر کرتی ہے اور دل اس طرف کھنچتا ہے اور کعبۃ اللہ کو چونکہ خدا کا گھر ہونے کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اس لیے اسے دیکھنا

گویا خدا ہی کی تجلیات کا مشاہدہ کرنا ہے ؎

آں زماں کہ آرزوئے دیدن جانم باشد
در نظر نقش رخ خوب تو تصویر کنم

حرم کا ذرّہ ذرّہ تجلّیاتِ الٰہی کا مظہر ہے

یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ انوارِ کعبہ ہے
یہ مالک کا کرم ہے اس پہ جو اس کے حرم آیا

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ حرم مکی کے ذرہ ذرہ میں کعبہ معظّمہ کے انوارات نمایاں نظر آتے ہیں اور یہاں کا ہر ہر ذرہ تجلیاتِ الٰہیہ کا مظہر ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے بھی کعبۃ اللہ کے اردگرد قبائل عرب کا آپس میں قتل وقتال باہمی معاہدوں کے تحت ممنوع تھا یہ درحقیقت اس عظمتِ خداوندی کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ بیت اللہ کے اوپر ہر آن نازل فرماتے رہتے ہیں اسی لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاللهِ اِنَّکِ لَخَیْرُ اَرْضِ اللهِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللهِ اِلَی اللهِ وَلَوْلَا اَنِّیْ اُخْرِجْتُ مِنْکِ مَاخَرَجْتُ ﴾

(المشکوٰۃ، باب حرم مکۃ حرسها اللہ تعالیٰ، ص: ۲۳۸)

خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے زیادہ بہترین اور اللہ کی سب سے زیادہ پسندیدہ زمین ہے اور اگر میں تجھ سے نہ نکالا جاتا تو میں نہیں نکلتا اس لیے درحقیقت یہ پوری ہی سرزمین مقدس اور محترم ہے۔

گناہ گاروں کا ایک ہی در ہے

اگرچہ پرخطاء ہے پر کہاں جائے ترا بندہ
ترا بندہ ترے در پر بہ اُمید کرم آیا

اللہ کے گھر پہنچ کر انسان اپنے عجز، احتیاج، فقر، اور درماندگی کو پیش کرتا ہے اور اپنے گناہوں اور غفلتوں میں ڈوبے ہوئے ہونے کا اقرار کرتا ہے اور تائب و نادم ہو کر اپنے رب کے حضور پیش ہوتا ہے اور تمام سہاروں اور اعتمادوں کی نفی کر کے ایک اللہ کی ذاتِ عالی کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر رحمتِ الٰہی جوش میں آتی ہے اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حج وعمرے والا اللہ کے گھر سے لوٹ کر جاتا ہے تو وہ ایسے ہی گناہوں سے صاف ستھرا ہوتا جاتا ہے جیسے کہ آج ہی اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی روایت ہے کہ:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ وَقَالَ الْعُمْرَةُ اِلَی الْعُمْرَةِ کَفَّارَةٌ لِمَا بَیْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَیْسَ لَهٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب المناسک، ص: ۲۲۱)

خلاصہ یہ ہوا کہ جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور بے حیائی اور فسق وفجور کے کاموں سے بچا تو وہ ایسے

لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے اسکو آج ہی جنا اور ایک عمرے سے لے کر دوسرے عمرے تک انسان سے جتنی خطائیں صادر ہوتی ہیں وہ ان سب کا کفارہ ہوتا ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔

صاحبو! انسان کتنا ہی گناہ گار ہو لیکن اسے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس کا صراحۃً حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾

(سورۃ الزمر، آیت:۵۳)

ترجمہ: کہہ دیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتی کی ہے اپنی جان پر آس مت توڑو اللہ کی مہربانی سے۔

(معارف القرآن، جلد:۷، ص:۵۶۷)

ایک دوسری جگہ پر ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾

(سورۃ یوسف، آیت:۸۷)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو بے شک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

(معارف القرآن: جلد:۵، ص:۱۱۵)

حضرت والا کے اس شعر میں دونوں باتوں کو یکجا کرلیا گیا ایک طرف اپنے قصور کا اقرار اور دوسری طرف اللہ کے کرم کی بھرپور امید اور ان دونوں باتوں کو پیش کرنے کا انداز ایسا جاذبِ رحمتِ الٰہی ہے کہ اس میں پوری عبدیت اور عاجزی کے ساتھ عفو ودرگزر کی درخواست پیش ہے کہ الٰہی میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ میں نے گناہ نہیں کیے بے شک میں قصوروار مجرم ہوں اور میں جرم کر کے تیرے در سے بھاگنا بھی نہیں چاہتا بلکہ خود مجرم بن کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تو کریم ہے جس کا معنی ہے اَلَّذِیْ یُعْطِیْ بِدُوْنِ الْاِسْتِحْقَاقِ وَالْمِنَّۃِ اس لیے مجھے اپنے استحقاق کا دعویٰ نہیں مگر تیری شانِ کریمی اور رحیمی سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھ کو معاف کردیں گے کیوں کہ دنیوی حکومتوں کے نظام وقوانین میں بھی یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اگر مجرم خود عدالت میں پیش ہو تو اس کے اوپر سے بہت سی سزائیں اٹھالی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ خصوصی سلوک اور برتاؤ کیا جاتا ہے۔

اقرارِ قصور اور ادائے شکر

زبانِ شکر قاصر ہے لغت میں دم نہیں اختؔر
مری اُمید سے زیادہ نظر ان کا کرم آیا

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی بے شمار نعمتوں کا شکریہ بڑے ہی بلیغ انداز میں ادا کر رہے ہیں کہ الٰہی مجھے تیرے در پہ آ کے جو کچھ ملا اور جو نعمتیں حاصل ہوئیں اور جس طرح کی آپ کے رحم وکرم کی بارش میرے اوپر برسی وہ اتنی زیادہ ہے کہ جس کی میں نے امید بھی قائم نہ کی تھی اس پر

میں جتنا شکر ادا کروں کم ہے، لغتیں اس شکر کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں جو میرے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے اور زبان تعبیرِ شکر کے لیے جن لغات والفاظ کی محتاج ہے وہ لغتیں میری ادائیگی شکر کی اس سطح کو نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے بعد میں خیال کرسکوں کہ میں نے آپ کی طرف سے ملنے والی بے حساب نعمتوں کا شکر ادا کرلیا کیوں کہ لغات محدود ہوتی ہیں ان کے معانی ومطالب ایک حد پر جا کے ختم ہو جاتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں رچی بسی ہوئی کیفیاتِ تشکر وعبدیت اتنی اونچی ہوتی ہے کہ وہاں تک لغت نہیں پہنچ سکتی اور بالاخر انسان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے مَاشَکَرْتُکَ حَقَّ شُکْرِکَ.

صاحبو! کمالِ عبدیت یہی ہے کہ انسان کرتا رہے اور ڈرتا رہے اپنی پوری ہمت واستطاعت کے مطابق بھر پور انداز سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بعد بھی بارگاہِ ربُّ العزت میں یونہی اپنے جذباتِ بندگی پیش کرنے چاہیے کہ اے میرے مولیٰ! مجھے تیرا جیسا شکر ادا کرنا چاہیے ویسا میں تیرا شکر ادا نہ کرسکا اور نہ معلوم میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی بارگاہ میں قبول ہے یا نہیں حضرات صحابہ کرام کی قرآن نے یہی حالت پیش کی ہے اور اسی صفت پر اللہ تعالیٰ کی دریائے رحمت کو جوش آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش برسنے لگتی ہے۔

اے مرے خالقِ حیات

اے میرے خالق حیات! تیری خوشی ہے صد حیات
آپ کی ناخوشی سے ہے میری حیات صد ممات

ذکر سے تیرے مل گئی دل کو ہمارے صد حیات
بلکہ ترے ہی نام سے زندہ ہے ساری کائنات

تیرے بغیر میں ہی کیا مردہ ہے ساری کائنات
تیرے کرم سے حشر تک زندہ ہے ساری کائنات

عارضی حسنِ گل پہ ہیں بلبل کی ساری ہزلیات
فانی بتوں کو دل نہ دے یہ ہیں ہماری غزلیات

شمس و قمر کی روشنی ادنیٰ سی بھیک ہے تری
روح میں تیرے نور سے کتنے ہیں ماہِ کائنات

نفس کا جو غلام ہے غرق ہے وہ گناہ میں
کیوں نہ کہوں کہ زندگی کتنی ہے اس کی واہیات

اُس کا سکون چھن گیا کتنی ہے تلخیٔ حیات
جس نے چکھے ہیں دوستو فانی بتوں کے نمکیات

توبہ کریں گناہ سے لیکن ہو صدقِ دل سے بھی
حشر میں ہوں گے فائزوں بیبیاں ہوں گی فائزات

ہیں تو خدا سے دور دور لیکن زباں پہ ہے ضرور
دعویٰ علمِ ارضیات دعویٰ علمِ فلکیات

جس کو خدا نے بخش دی لذتِ ذکر فضل سے
اخترؔ وہ پاگیا ہے بس حاصلِ لطفِ کائنات

مشکل الفاظ کے معنی: خالقِ حیات: زندگی دینے والا۔ صدحیات: سینکڑوں جان۔ صدممات: سینکڑوں اموات۔ گل: پھول۔ ہزلیات:...... فانی بتوں: مرنے والی نامحرم عورتیں اور حسین لڑکے۔ شمس وقمر: چاند وسورج۔ ماہ: چاند۔ واھیات:...... تلخیٔ حیات: زندگی کی کڑواہٹ۔ صدقِ دل: سچے دل سے۔ فائزوں: کامیاب مرد۔ فائزات: کامیاب عورتیں۔

رضائے مولیٰ کے ساتھ زندگی زندگی ہے

اے میرے خالقِ حیات! تیری خوشی ہے صد حیات
آپ کی ناخوشی سے ہے میری حیات صد ممات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا ہے اگر انسان اس مقصد کو پورا کررہا ہو تو گویا وہ اپنے خالق ومالک کو راضی کررہا ہے اور اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر عمل کی غرض وغایت مرضی الٰہی ہونی چاہیے اور وہ عمل جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو اس سے بچنا چاہیے اور اگر ایسا نہ تو پھر وہ زندگی زندگی کہلانے کے قابل نہیں اس کو یوں سمجھئے کہ کسی کے پاس بہترین عمدہ قسم کی گن (Gun) ہو اور اس کا مالک اسے دشمنوں کے مقابلے میں اس کی اصل وضع کے مطابق استعمال نہ کرتا ہو مثلاً خدا اور رسول کے دشمن کے وجود سے زمین کو پاک کرنے کے لیے تو پھر وہ گن (Gun) اس لائق نہیں ہے کہ اس کو گن (Gun) کہا جائے بلکہ مثل لاٹھی اور ڈنڈے کے ہے بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی بدتر ہے کیوں کہ لاٹھی کے ماہرین اس سے جو مقاصد حاصل کرسکتے ہیں وہ اس گن (Gun) سے نہیں ہوسکتے۔ ٹھیک اسی طرح جس زندگی کا رخ اپنے مولیٰ کی رضا کی طرف نہ ہو حیات ننگِ صد ممات ہے کیوں کہ وہ زندگی نہ صرف یہ کہ رضائے الٰہی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے غضب وعقاب کی موجب ہے اور اس کی سخط اور ناراضگی کا باعث ہے اسی لیے حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اے میرے مولیٰ! اگر تو مجھ سے راضی ہے پھر تو میری حیات رشکِ صد حیات ہے اور اگر آپ ناخوش ہوں تو پھر سینکڑوں موت سے بدتر ہے۔

ذکر سے تیرے مل گئی دل کو ہمارے صد حیات
بلکہ ترے ہی نام سے زندہ ہے ساری کائنات

آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس طرح بدن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں سے کچھ غذائیں اتاری ہیں اسی طرح روح اور قلب کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف النوع اذکار کی شکل میں غذاؤں کا انتظام کیا ہے اور دل کی حقیقی حیات ذکر کے ساتھ وابستہ اور جڑی ہوئی ہے اسی لیے مردہ اور زندہ دل کی تعبیرات کا استعمال کیا جاتا ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے **اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا** کی آیت میں احیائے زمین سے مراد دلوں کا زندہ کرنا لیا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے التکشف، ص: ۲۸۸ پر اس آیت کو ذکر کرکے ارشاد فرمایا:

﴿فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی (اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یُلَیِّنُ الْقُلُوْبَ بَعْدَ قَسْوَتِھَا فَیَجْعَلُھَا مُخْبِتَۃً مُنِیْبَۃً وَکَذٰلِکَ یُحْیِ الْقُلُوْبَ الْمَیِّتَۃَ بِالْعِلْمِ وَالْحِکْمَۃِ وَاِلَّا فَقَدْ عُلِمَ اِحْیَاءُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ مُشَاھَدَۃً﴾

(تفسیرُ الخازن، ج: ۴، ص: ۲۳۰، دارُ المعرفۃ، بیروت)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کہ اللہ تعالیٰ قلوب کوان کی قساوت کے بعد نرم کردیتا ہے پھران کوخشوع وانابت کے ساتھ موصوف کردیتا ہے یعنی مردہ دلوں کوعلم وحکمت کے ساتھ زندہ کردیتا ہے ورنہ زمین کا بارش سے تروتازہ ہونا تو مشاہدہ سے معلوم ہے اس عنوان پرابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک شعر ذکر کیا ہے ۔

رَأَیْتُ الذُّنُوْبَ تُمِیْتُ الْقُلُوْبَ

وَ قَدْ یُوْرِثُ الذِّلَّ اِکْثَارُهَا

ترجمہ شعر: میں نے دیکھا کہ گناہ دلوں کومردہ کردیتے ہیں اوران کی کثرت کبھی ذلت کا باعث بھی ہوتی ہے۔

اگلے مصرعہ میں حضرت والا ارشادفرماتے ہیں کہ اگرحقیقت میں دیکھا جائے تو ساری کائنات کی حیات اور بقاہی اللہ کے نام سے جڑی ہوئی ہے جس طرح ذکراللہ سے دل کوحقیقی لطف وحیات حاصل ہوتا ہے اس طرح اس دنیا جہاں کے بقاء وبقا کا سامان بھی ذکراللہ ہے اسی لیے ایک روایت میں حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

﴿لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذهاب الایمان فی آخر الزمان، ج: ۱، ص: ۸۴)

قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ روئے زمین پرکوئی ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی رہے گا۔ اسی مضمون کومزید وضاحت کے ساتھ حضرت والا اگلے شعرمیں بیان فرماتے ہیں۔

ہرشے کی تسبیح اس کے مناسب حال ہے

تیرے بغیر میں ہی کیا مردہ ہے ساری کائنات

تیرے کرم سے حشر تک زندہ ہے ساری کائنات

ارشادفرمایا کہ اے خدا! تیرے بغیر نہ میں زندہ رہ سکتا ہوں نہ ساری کائنات زندہ رہ سکتی ہے اس لیے کہ درحقیقت کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول رہتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾

(سورۂ بنی اسرآئیل، آیت: ۴۴)

ترجمہ: کوئی چیزایسی نہیں جوتعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہولیکن تم لوگ ان کی تسبیح (پاکی بیان کرنے) کوسمجھتے نہیں ہو۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، ص: ۴۷۴)

دوسرے مقام پرارشادِ باری تعالیٰ ہے: كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ کہ ہرشی نے اپنی نمازوتسبیح کوجان لیا حضرت حکیم الاسلام قاری محمدطیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک وعظ میں ذکرفرمایا کہ

حضرت شاہ رفیع الدین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ درخت بھی اپنی نماز میں مشغول ہیں اور ان کی نماز ان کا قیام کی حالت میں کھڑا رہنا ہے چوپائے بھی اپنی نماز میں مشغول ہیں ان کی نماز ہر وقت رکوع میں رہنا ہے اسی طرح حشرات الارض کی نماز ہر وقت حالتِ سجدہ میں رہنا ہے اور پہاڑوں کی نماز ہر وقت قاعدے کی حالت میں رہنا ہے اور حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے مومنین کو ان ساری مخلوقات کی صلوات کی جامع صلاۃ عطا فرئی ہے اگرچہ ہم باقی مخلوقات کی صلوٰۃ وتسبیح کی کیفیت حتمی اور یقینی طور سے ذکر نہیں کرسکتے اور نہ ہی ہم اس کے مکلّف ہیں لیکن ان آیات سے اتنا ثابت ہوجاتا ہے کہ ہر ذرۂ کائنات مختلف انداز سے باری تعالیٰ کے ذکر و یاد میں مشغول ہے اور اسی ذکر سے اس کائنات کی زندگی اور حیات ہے۔

حیاتِ نباتات وجمادات اور شبہے کا ازالہ

رہ گیا ذہن میں آنے والا یہ شبہ کہ کیا شجر وحجر وغیرہ جمادات ونباتات کو ایسا ادراک واحساس عطا ہوا ہے کہ وہ ذکر اللہ کرسکیں سو اس سلسلے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہر شی کا ادراک اس کے مناسب جدا جدا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا جس کو مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے التکشف، ص: ۳۷۰ پر ارشاد فرمایا ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ قَالَ نَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی اُحُدٍ فَقَالَ اِنَّ اُحُدًا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل احد، ج: ۱، ص: ۴۴۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ احد ایسا پہاڑ ہے کہ اس کو ہم سے محبت ہے اور ہم کو اس سے محبت ہے۔

فائدہ: چونکہ کوئی دلیل حقیقت سے متصرف کرنے کی نہیں ہے اس لیے حدیث میں لفظ یُحِبُّنَا کو حقیقت پر محمول کرکے اس سے اس مسئلہ کشفیہ پر استدلال کریں گے کہ جمادات میں بھی ایک گونہ شعور ہے کیونکہ حب موقوف ہے شعور پر جیسا کہ نُحِبُّہٗ بالاتفاق حقیقت پر محمول ہے باقی مسئلہ ظنیہ ہے داخلِ عقائد نہیں۔ (التکشف، ص: ۳۷۰)

اسی طرح اس روایت سے بھی اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے:

﴿عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ کَانَ جِذْعٌ یَقُوْمُ عَلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا وُضِعَ لَہُ الْمِنْبَرُ سَمِعْنَا لِلْجِذْعِ مِثْلَ اَصْوَاتِ الْعِشَارِ حَتّٰی نَزَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ یَدَہٗ عَلَیْہِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ، باب الخطبۃ علی المنبر، ج: ۱، ص: ۱۲۵)

جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے تنے سے علیحدگی اختیار کی، منبر پر تشریف فرما ہونے کے بعد تو کھجور کا وہ تنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی سے رونے لگا تھا اور اسی لیے قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پر ہے ایمان سے محروم شخص کو مردہ اور مومن کو زندہ قرار دیا ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ کہ جو مردہ تھا ہم

نے اس کو زندہ کیا یعنی ایمان عطا کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ تعالی ج: ۲، ص: ۹۴۸)

اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کو یاد نہ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے مردہ اور زندہ۔

غرض یہ کہ اس مضمون سے ثابت ہو گیا کہ اللہ کی یاد کے ساتھ کائنات کے ذرے ذرے کو گہرا ربط ہے اسی لیے جب اس نظامِ عالم کو درہم برہم کرنا ہوگا تو اس عالم سے اللہ اللہ کہنے والوں کو مکمل طور پر اٹھالیا جائے گا اور پھر قیامت قائم کردی جائے گی اور اس وقت اس روئے زمین پر شرارِ خلق (بدترین) مخلوق موجود ہوگی جو معاصی اور نافرمانیوں میں انتہائی درجہ کو پہنچے ہوں گے اور گدھوں کی طرح دھنگا مستی میں لگے ہوں گے تو ان پر قیامت قائم کردی جائے گی۔

بلبل کی چشمِ غمناک اور ایک سبق

عارضی حسنِ گل پہ ہیں بلبل کی ساری ہزلیات
فانی بتوں کو دل دیے یہ ہیں ہماری غزلیات

حقیقت تو یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر شے خوبصورت ہو یا بدصورت ادنیٰ ہو یا اعلیٰ چھوٹی ہو یا بڑی پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ غرض کہ ہر ذرۂ کائنات اور حکومت وسلطنت کو پائیداری ہے نہ رونقِ محفل، حسینوں اور جوانی کے نشے میں چور لڑکے لڑکیوں اور دیوانہ اور مست کر دینے والی حسیناؤں کو کوئی گردشِ ایام سے بچا سکا ہے اور نہ بچا سکے گا۔ بالآخر چند دن کی عارضی رنگت ورونق کچھ ہی ایام گزرنے پر ڈھل کر ننگِ دشت ودمن ہو جاتی ہے کل تک دل وجان فدا کرنے والے کو ایک نظر جھانکنا بھی گوارا نہیں، ساری محبت وفدائیت کا دعویٰ کرنے والے اور حسن وجمال کی تعریف میں غزلیں اور واہ واہ کہنے والے اور مدحِ محبوب اور محبوبہ میں شب وروز دیوانے رہنے والے بڑی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ کفِ افسوس ملتے نظر آتے ہیں، ساری دیوانگی کا نشہ جھڑ چکا ہوتا ہے اور ٹھیک اس بلبل کی طرح مایوس اور اداس پھرتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں کہ جس طرح بلبل موسمِ بہار میں آنے والی درختوں کی بہار اور شادابی اور گلشن مہکنے والے پھولوں کی تر وتازگی پر فدا اور مست ہو کر جھومتی اور چہچہاتی پھرتی ہے اور اسے اس کے مستقبل کی اس وقت کوئی خبر نہیں ہوتی کہ عنقریب موسمِ خزاں آ کر اس چمن کی ساری رنگت اور تازگی کو اور اس کی پر فضاء بہاروں اور خوشنما ودلکش حسین نظاروں کو ختم کر کے رکھ دے گا اور ان حسین مناظر کو دل دینے پر حسرت وافسوس کے ساتھ روتی پھرتی ہے اور اس وقت اس کی حالت حضرت والا کے اس شعر کا مصداق ہوتی ہے ؎

درسِ عبرت ہے چشمِ عنادل
کس طرح نم ہے غم سے خزاں میں

اسی طرح حضرت والا کا ایک دوسرا سبق آموز شعر ہے جس کو ایک مرتبہ حضرت والا دامت برکاتہم نے حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا جبکہ حضرت والا مفتی صاحب کے ساتھ رکشے میں سوار تھے مفتی صاحب نے شعر پسند فرمایا۔

جو چمن سے گزرے تو اے صبا! تو یہ کہنا بلبلِ زار سے
کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے

درحقیقت ان مثالوں کا مقصد کسی مضمون کو سمجھانے میں تفہیم اور تقریب الی الفہم ہوتا ہے یعنی آسانی سے اور جلد بات سمجھ میں آجائے تو حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ جس طرح حسرت وافسوس اور ندامت اور پشیمانی بلبل کو ہوتی ہے اور اس کی یہ ساری داستان فرحت ومسرت رنج وغم کی شکلوں میں تبدیل ہوجاتی ہے اور بالآخر اسے اپنے کیے پر پچھتانا پڑتا ہے تو اے وہ انسان! جوان فنا ہونے والے بتوں یعنی نامحرم حسین لڑکیاں اور امردبے ریش لڑکوں پر دل دے کر اپنے دل کو تباہ وبرباد کرنے والے اور ان کے عشق ومحبت میں گھل گھل کر اپنے عمرِ عزیز کو ضائع کرنے والے تو بلبل کی اس حالتِ زار سے سبق لے اور عبرت حاصل کر کہ ان حسینوں کو دل دینے سے کل تجھے بھی اسی طرح ندامت وشرمندگی کے آنسو بہانا پڑیں گے مرض زیادہ بڑھنے سے خدا نہ کرے کہ آخرت میں خون کے آنسو گرانا پڑے جو چمک دمک اور رونق وتازگی تجھے ان کی صورتوں پر دکھائی دے رہی ہے یہ بظاہر بانداز بہار آئی ہے مگر درپردہ یہ خزاں لیے ہوئے ہے اسی کو عارفِ ہندی حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ لکھنو کے سفر میں شہر لکھنو سے گزرتے ہوئے (جبکہ لکھنو کو دلہن کی طرح وائسرے کی آمد پر خوب بجلیوں اور قمقموں سے سجایا گیا تھا) ساتھیوں سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بہ اندازِ بہار آئی ہے

نورِ شمس وقمر کی حقیقت

شمس و قمر کی روشنی ادنیٰ سی بھیک ہے تری
روح میں تیرے نور سے کتنے ہیں ماہِ کائنات

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اور اس میں ہونے والے واقعات اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کا مظہر ہے۔ شمس وقمر کی روشنی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ نور کا مظہر ہے اور ساری کائنات کا حسن و جمال اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمیل کا مظہر ہے اور مخلوقات کی باہمی رحمتیں ومہربانیاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مظہر ہے۔
حضرت والا اس شعر میں فرمارہے ہیں کہ شمس وقمر کو جو روشنی عطا ہوئی ہے اس کو اس روشنی سے کچھ نسبت

نہیں ہو سکتی جو خالقِ شمس و قمر کے دل میں آنے سے حاصل ہوتی ہے اور جس طرح دل و جان منور اور روشن ہو جاتے ہیں اور قلب و روح میں انوارات و تجلیاتِ الٰہیہ کی کرنیں پڑتی ہیں۔

یہ دنیا کا ظاہری چاند و سورج اگر سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو کر روشنی ڈالے تو بھی ان انوارِ الٰہیہ کے سامنے وہ پھیکی اور ماند پڑ جائے گی۔ اسی کو حضرتِ والا نے اپنے ایک دوسرے شعر میں یوں ارشاد فرمایا۔

خالقِ شمس و قمر جس دل میں بھی آجائے ہے
اس کے نورِ قلب سے شمس و قمر شرمائے ہے

گناہ کرنا نفس دُشمن کی غلامی ہے

نفس کا جو غلام ہے غرق ہے وہ گناہ میں
کیوں نہ کہوں کہ زندگی کتنی ہے اس کی واہیات

حضرت والا دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو انسان دنیا میں خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کر کے زندگی گزارتا ہے اور گناہوں میں مستغرق رہتا ہے، اس کی زندگی انتہائی بے کار اور واہیات گزرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نہ اسے دنیا کا کوئی لطف آتا ہے اور نہ وہ آخرت کی نعمتوں اور راحتوں سے مستفید ہو سکے گا۔

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا سب سے بڑا دُشمن تمہارا نفس ہے جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل و خوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ اور کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلا اور مصیبت میں ڈال دے اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔

دوزخ میں جنت کی خواب گاہیں ڈھونڈنا

اُس کا سکون چھن گیا کتنی ہے تلخیٔ حیات
جس نے چکھے ہیں دوستو! فانی بتوں کے نمکیات

جو انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ سے دل لگاتا ہے، بالخصوص نامحرم عورتوں یا حسین امرد لڑکوں کے ساتھ عشق و محبت لڑاتا ہے، وہ کبھی چین اور سکون سے زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کا سکونِ دو جہاں چھین لیا جاتا ہے اور اس کی زندگی اس پر تلخ کر دی جاتی ہے کیونکہ سکون کو اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد کے ساتھ منحصر کر دیا ہے جبکہ اللہ کا

عاصی اور نافرمان اللہ تعالیٰ کا ذاکر نہیں کہلا سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اللہ کی یاد میں مشغول سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے کُلُّ مُطِیْعِ اللّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ ہر اللہ کی اطاعت کرنے والا اللہ کا ذاکر ہے۔

حدیث شریف میں مضمون آیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی ناراضگی اور غصہ اُترتا ہے، اس لئے خدا کو ناراض کر کے کسی کو چین اور سکون مل جائے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لطفِ حیات کی ضمانت اللہ کی یاد اور ایمان وعملِ صالح میں منحصر ہے۔ حضرت والا نے اپنی کتاب ''روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج'' صفحہ: ۲۸ میں ایسے لوگوں کے واقعات ذکر کیے ہیں جن سے ان کی زندگی کی کڑواہت اور تلخی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

چنانچہ واقعہ نمبر تین میں ہے کہ ایک ڈاکٹر کا لڑکا انجینئرنگ کی ڈگری لندن سے لے کر احقر کے پاس آیا اور بتایا کہ میں لندن میں عشقِ مجازی کا شکار ہوا اور بالکل نامرد ہو چکا ہوں، علاج کیا مگر نفع نہیں ہوا۔ باپ نے شادی کی، عورت نے ایک ہفتہ کے اندر میری نامردی سے مایوس ہو کر طلاق لے لی اور اب منہ چھپائے گھر کے اندر رہتا ہوں، ہر طرف سے موت نظر آرہی ہے، مگر موت بھی نہیں آتی۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ دوزخی کو ہر طرف سے موت نظر آئے گی مگر وہ مرنے نہیں پائے گا۔

توبہ نصوح پر جنت کا وعدہ

توبہ کریں گناہ سے یعنی بہ صدقِ دل سے بھی
حشر میں ہوں گے فائزوں بیبیاں بھی کی فائزات

حضرتِ والا دامت برکاتہم گناہوں کے بحرِ ظلمات میں ڈوبے ہوئے اور حلاوتِ زندگی سے محروم فانی بتوں کے عشاق کے لئے راہِ عافیت وراحت اور ان ظلمات سے بچ نکلنے کا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں اور وہ طریقہ بارگاہِ الٰہیہ میں صدقِ دل سے توبہ کرنا ہے جس کی برکت سے حیاتِ دنیویہ بھی بالطف ہو جاتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ پر یہ توبہ صدقِ دل سے ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾

(سورۃ التحریم، آیت: ۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، ص: ۵۰۴)

یعنی دل میں گناہ پر کامل ندامت ہو اور آئندہ اس کے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو۔ اس میں تمام احکامِ دین، فرائض وواجبات بھی داخل ہو گئے کہ ان کا چھوڑنا گناہ ہے اور تمام محرمات اور مکروہات بھی آگئے کہ ان کا کرنا گناہ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ آدمی اپنے گزشتہ عمل پر نادم ہو اور پھر اس کی طرف نہ لوٹنے کا پختہ ارادہ اور عزم رکھتا ہو اور کلبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ زبان سے استغفار کرے اور دل میں نادم ہو اور اپنے بدن اور اعضا کو آئندہ اس گناہ سے روکے۔ (معارف القرآن، ج: ۸، ص: ۵۰۵)

ایسی توبہ پر اللہ تعالیٰ جنت دینے کا وعدہ فرما رہے ہیں اور ایسی توبہ پر نعمتوں کا ملنا قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے۔

حقیقتِ علم اور جدید علوم

ہیں تو خدا سے دور دور لیکن زباں پہ ہے ضرور
دعوئ علمِ ارضیات دعوئ علمِ فلکیات

صاحبو! اصل حقیقی علم وہ ہوتا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف راہ دکھلائے اور جس کو حاصل کر کے مرضیات و نامرضیاتِ مولیٰ کا علم حاصل ہوتا کہ جن باتوں سے خدا راضی ہو ان پر عمل کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی نامرضی والے اعمال سے بچا جائے اور یہی ہمارا حقیقی مقصدِ تخلیق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہمیں بھیجنے کے بعد اور ہمیں ایک مقصد کی تکمیل کا حکم دے کر اس کی صورتیں اور شکلیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائیں اور ہر دور میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قوموں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے رہے اور ان کو خدا کی مرضی و نامرضی سے مطلع کرتے رہے۔ یہی حقیقت ہے علم وحی کی اور حقیقت میں علم اسی کو کہتے ہیں ؎

علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت ست

جو علم اللہ کی راہ نہ دکھلائے وہ درحقیقت جہالت ہے اور خدا سے دوری اور بُعد کا سبب ہے۔ اسی لئے اس علم پر قرآن وحدیث میں مذکور فضائل مرتب کرنا اور ان کو اس کا مصداق قرار دینا یا اس کے لئے احادیث اور آیات استدلال میں پیش کرنا یہ سراسر دین میں تحریف کے مترادف ہے۔

چنانچہ آج کل سائنس کی جدید معلومات اور ترقیات کے حصول کے خاطر اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنا بلاشبہ جائز بلکہ بعض اوقات مستحب اور مزید آگے بڑھ کر بعض احوال میں فرض ہو جاتا ہے جیسا کہ مثلاً کسی اسلامی ملک کو خود کفیل بننے کے لئے اور کفار کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے لئے ایسی جدید مشینری (Machinery)، اسلحہ اور نئی قسم کی دفاعی نوعیت کی چیزیں درکار ہوں تو پھر اس ملک کے کچھ افراد پر اس ضرورت کو پورا کرنا فرض ہے تاکہ کفار کی غلامی سے رہائی اور چھٹکارا حاصل ہو، اس لئے ایسے علوم کی علی الاطلاق مخالفت کرنا یا اُن کے سیکھنے اور پڑھنے پڑھانے سے روکنا درست نہیں ہے۔

ہاں! البتہ ان علومِ فلکیات وارضیات اور جدید نوعیت کے دیگر فنون کے سیکھنے، سکھانے اور پڑھنے پڑھانے پر علمِ دین کے فضائل منطبق کرنا یا ان علوم کو سیکھ کر علمِ دین سیکھنے کی ضرورت سے انکار کرنا قطعاً غلط اور تحریف کے مترادف ہے۔

مسلمان بحیثیت مسلمان کے اولاً قرآن وسنت کے علوم سیکھنے کا مکلّف ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت اور بارگاہِ الٰہی میں مقرب ومقبول ہونے کا واحد راستہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر علم سیکھے دنیا وآخرت کی فلاح ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے قرآن پاک کی آیت:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾

(سورۃ التحریم، آیت:۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۵۰۱)

اس کی تفسیر کے ضمن میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا کہ حضراتِ فقہا نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری زکوٰۃ، تمہارا مسکین، تمہارا یتیم، تمہارے پڑوسی۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔

تمہاری نماز، تمہارا روزہ وغیرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں، ان کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل اور غافل ہوں۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۵۰۲)

حاصلِ لطفِ کائنات

جس کو خدا نے بخش دی لذتِ ذکر فضل سے
اخترؔ وہ پا گیا ہے بس حاصلِ لطفِ کائنات

اللہ تعالیٰ کے قرب اور فلاحِ دنیوی واخروی کے لئے علمِ دین کا سیکھنا کتنا اہم ضروری ہے؟ اس پر اوپر کے شعر میں کچھ عرض کیا گیا۔ اب حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں علم کے ساتھ ذکر کی اہمیت کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور گویا دونوں شعروں کے مجموعے سے بات مکمل اور پوری ہوگئی کہ علم وذکر جب یہ دونوں اکٹھے ہوں گے۔ تو پھر انسان کی دین ودنیا دونوں ہی بالطف ہوجائیں گی۔ اگر کسی کے پاس صرف علم ہو لیکن اس کے ساتھ ذکروفکر، خوف وخشیت، تقویٰ للّٰہیت نہ ہو تو درحقیقت بظاہر وہ علم ہے، مگر اصلاً نہ تو وہ قرآن وسنت کے علم کا مصداق ہے نہ ہی مقصود کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:

﴿مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ تَجَمَّعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَكَمَّلَ﴾

ترجمہ: جس کے پاس صرف ظاہری علم ہو اور تقویٰ وپرہیزگاری سے عاری ہو، تو فسق وفجور کی وادی میں جاگرے گا اور جس کے پاس بغیر دین کے علم کے طریقت وتصوف ہو تو وہ زندیق، بے دین ہوجائے گا، ہاں جو دونوں کا جامع ہو وہ کامل اور بامراد ہوگا۔

اس تشریح کی روشنی میں کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح حضرت کے یہ دونوں شعر علم وذکر کے باہمی ارتباط اور

تعلق کی اہمیت پر باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ٹھیک اسی طرح ان دونوں اخیری شعروں میں گویا کہ پوری نظم میں بیان کردہ مضامین کی تحصیل کے طریقے کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے سالک! علم وذکر کو مضبوطی سے پکڑ لو! تو دنیا وآخرت کے جملہ مقاصد بحسن وخوبی اور بعافیت وراحت حاصل ہوسکیں گے۔باقی ذکر کی حلاوت ولطف کے مضامین کتاب میں دوسرے مواقع پر مذکور ہے اوراسی کو شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر اور جامع لفظوں میں یوں ارشادفرمایا ذکر ذاکر کو مذکور تک پہنچادیتا ہے۔

کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تری چوکھٹ پہ سر اپنا

الٰہی اپنی رحمت سے تو کر دے باخبر اپنا
نہ انجم ہیں ہمارے اور نہ یہ شمس و قمر اپنا

سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا سنگِ در اپنا
کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تری چوکھٹ پہ سر اپنا

خداوندا محبت ایسی دے دے اپنی رحمت سے
کرے اخترؔ فدا تجھ پر یہ دل اپنا جگر اپنا

میں کب تک نفس دُشمن کی غلامی سے رہوں رُسوا
تو کرلے ایسے ناکارہ کو پھر بارِدگر اپنا

چھڑا کر غیر سے دل کو تو اپنا خاص کر ہم کو
تو فضلِ خاص کو ہم سب پہ یاربّ عام کر اپنا

بہ فیضِ مرشدِ کامل تو کردے ہنس زاغوں کو
کہ وقفِ خانقاہِ شیخ ہے قلب و جگر اپنا

تغافل سے جو کی توبہ تو ان کی راہ میں اخترؔ
ہمہ تن مشغلہ ہے ذکر کا شام و سحر اپنا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ انجم: ستارہ۔شمس وقمر: سورج وچاند۔ھنس: چڑیا۔زاغوں: کوے۔
تغافل: غفلت۔ھمہ تن:......۔

اپنے خالق کی معرفت مقصدِ حیات ہے

الٰہی اپنی رحمت سے تو کردے باخبر اپنا
نہ انجم ہیں ہمارے اور نہ یہ شمس و قمر اپنا

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِہٖ خَبِیْرًا کہ رحمٰن کے متعلق کسی باخبر بندے سے پوچھ لو۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾
(سورۃ الذّاریات، آیت: ۵۶)

ترجمہ: اور میں نے جن وانس کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۱۷۱)

بعض مفسرین جیسے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لِیَعْبُدُوْنِ یہاں لِیَعْرِفُوْنِ کے معنی میں ہے تو گویا دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے باخبر ہونا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہر مؤمن کے لئے لازم اور ضروری ہے۔ رہ گیا قرآن میں عبادت سے تعبیر کرنا تو وہ اس لئے ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں وہی معرفت معتبر ہے جو عبادت کی راہ میں ہو اور سنت وشریعت پر عمل کر کے ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ممکن ہے۔ محض عقلی دلیلوں اور فلسفی بحثوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ تک رسائی ممکن نہیں۔

حضرتِ والا نے اس شعر میں یہی دعا کی ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنے باخبر بندوں میں شامل کرلے اور اپنی معرفت دے دے۔ پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے صاف لفظوں میں گویا کہ یہ اعلان فرمادیا ہے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ کو جاننا چاہتے ہو تو پھر اس کے لئے سہل اور آسان صورت یہ ہے کہ کسی باخبر بندے سے اپنا جوڑ پیدا کرلو اور اس سے معلوم کرلو اور پھر اگلی آیت میں باخبر بندوں اور عباد الرحمٰن کی صفات بھی بتادی گئی ہیں تاکہ اللہ کے باخبر، نیک صالح بندوں کے معیار اور کسوٹی کا علم ہوجائے اور اپنی دینی رہنمائی کے لئے غلط ہاتھ نہ بڑھائے اور گمراہی سے محفوظ ہوجائے۔

سائنسی تحقیقات وایجادات ضرورت ہے مقصد نہیں

صاحبو! آج کل اگر ہم اپنی حالت پر غور کریں تو پتہ چل جائے گا کہ اب ہمارا مبلغِ علم ومعرفت، محورِ سعی وکوشش اور منتہاءِ جدوجہد بس صرف ماہ وانجم اور شمس وقمر کی تحقیقات میں پڑ جانا اور نوع بنوع دنیوی اشیا کی کھوج اور جستجو میں بالکل محو ہونا اور مٹ جانا اور اس میں لگ کر ایسا کھو جانا اور گم ہوجانا ہے کہ اپنے خالق وربّ سے بالکل ناواقف اور اس کی مرضیات ونامرضیات سے بالکل بےخبر اور ناآشنا رہنا۔

چنانچہ اکثر صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے اردگرد اور ماحول کی جملہ اشیا کے متعلق بڑی تفصیلی

معلومات اور بڑی گہری جزئیات کی معرفت رکھتے ہیں اور نئی ایجادات اور مشینوں کا علم اور سائنسی دنیوی علم میں مہارت کی جستجو رکھتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سب علوم پر فخر کرنا ایک کمال سمجھتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں دنیا و آخرت کے کسی موڑ پر کام آنے والی نہیں ہیں۔ جیسا کہ اپنے جملہ نوع کے متعلقین کے تعلق اور اس کے تقاضے اور ان کی تفصیلات کا بڑی حد تک علم رکھتے ہیں اور ان تعلقات اور تقاضوں کو پورا کرنے پر ہم اپنے تعلقِ خداوندی کو قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا عبدیت کا تعلق ہے۔ باپ، بیٹا، شوہر، بیوی، ڈاکٹر، مریض، چچا، تایا، خالو، پھوپھا، پھوپھی، ماموں، ممانی وغیرہ وغیرہ ان سب رشتوں کو ہم بخوبی سمجھتے اور جانتے ہیں اور ان میں باہمی نسبتوں کا پاس و لحاظ بھی رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ سے ہمارا مالک و مملوک، حاکم و محکوم، خالق و مخلوق، آقا و بندہ ہونے کا جو تعلق ہے، کیا ہم نے کبھی اس تعلق اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی؟ اور پھر اس پر عمل پیرا ہوئے یا نہیں ہوئے؟

تمام انبیائے کرام علیہم السلام انسانوں کو ان کے خالق سے یہ رشتہ بتانے اور پھر اس کے تقاضوں کی تفصیلات سے آگاہ کرکے بندہ کو اللہ سے جوڑنے کے لئے آئے۔ اس لئے جن قوموں نے خدا کے باخبر بندے یعنی نبیوں کی اطاعت و اتباع اختیار کی وہ فلاح اور کامیابی پا گئے۔ جنہوں نے روگردانی کی اور منہ موڑا وہ ناکام و نامراد ہوئے۔ اب جبکہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ باقی نہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ سے قوی تعلق اور نسبتِ خاصہ حاصل کرنے اور اُس ذاتِ عالی کی معرفت کے لئے اس دور کے باخبر بندوں یعنی علماءِ صالحین کاملین کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنے اور ان کے ساتھ رہ پڑنے کی ضرورت ہے تبھی انسان اللہ تعالیٰ کا باخبر بندہ بن سکتا ہے۔

یک در گیر محکم گیر

سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا سنگِ در اپنا
کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تری چوکھٹ پہ سر اپنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اپنی معرفت اور قرب کی دولت اس لئے بھی عطا کردے کہ نہ دنیا کے ماہ و انجم میرے کام کے ہیں اور نہ چاند و سورج سے مجھے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی پوری کائنات میں کوئی در میرے جذباتِ نیازمندی پیش کرنے کا مرکز ہے اور نہ سوائے تیرے کسی در سے میری حاجت روائی اور مشکل کشائی کا امکان ہے۔ اے میرے اللہ! میرا سر صرف تیرے در پر جھکتا ہے اور میں صرف تیرے سامنے سربسجود ہو کر اپنی حاجت و ضرورت پیش کرتا ہوں۔ میں نے سوائے تیرے کسی کو اپنا نہیں بنایا کیونکہ تیری ہی ذات سے میری تمام اُمیدیں وابستہ ہیں۔ جب بھی مجھے دنیوی یا اخروی کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے۔ رنج و غم اور حزن و ملال پیش آتا ہے تو میں تیری ہی بارگاہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ﴾
(مناجات مقبول)

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے برادرانِ یوسف سے کہا تھا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ اور جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾
(سورۃ الانعام، آیت: ۱۶۲)

ترجمہ: فرمادیجئے! کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لیے ہے جو مالک ہے سارے جہاں کا۔ (معارف القرآن، ج:۳، ص:۵۰۷)

غرض یہ کہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی موت و حیات اور خوشی اور غم اور اپنی ہر نوع کی حاجت اور ضرورت کو ہر گھڑی بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا اور عبدیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جیسی بھی حالت ہو ہم خدا کی طرف رجوع رہیں۔

اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے در کو اس مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اس پر جمتا ہے اور کسی بھی حال میں اللہ کا در چھوڑ کر غیر اللہ کی طرف نظرِ التفات بھی نہیں کرتا اور نہ غیر سے کوئی اُمید و خوف وابستہ رکھتا ہے تو پھر یاد رکھئے کہ وہ خدا اتنی غیرت اور اتنی رحمت والا ہے اور ایسی قدر دانی کرنے والا ہے کہ جب کوئی شخص اس کے در پر روتا رہتا ہے اور اس کے در پر ذلیل ہوتا ہے اور صرف اُسی کے در پہ جھکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے مخلوق کے در پہ رونے اور جھکنے اور ان کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ کر دیتے ہیں۔

اسی لیے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو سارے غموں کو چھوڑ کر اپنا ایک غم بناتا ہے یعنی آخرت کا غم اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے تمام غموں کی طرف سے کافی ہو جاتے ہیں اور جس کو مختلف غموں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو تو پھر اللہ کو پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کون سی وادی میں ہلاک ہو جائے۔

اسی مضمون کو فارسی کے مقولے میں بزرگوں نے یوں ذکر کیا ہے" یک در گیر محکم گیر" یعنی ایک اللہ کے در کو پکڑو اور مضبوطی سے پکڑو تو یہ باقی سارے دروں سے چھٹکارا پانے کا آسان راستہ ہے۔

اللہ کی محبتِ اشد ہونا اہلِ ایمان کی نشانی ہے

خداوندا محبت ایسی دے دے اپنی رحمت سے
کرے اختر فدا تجھ پر یہ دل اپنا جگر اپنا

اس سے پہلے شعر میں ارشاد فرمایا تھا مجھے جو بھی حاجت ہوتی ہے تو میں آپ کی ذات ہی سے مانگتا ہوں۔ اے میرے خدا! میری جملہ حاجات میں سب سے بڑی حاجت تیری محبت ہے، میں تجھ سے اس کی بھیک مانگتا

ہوں، تُو مجھ پر خصوصی فضل فرما کر مجھے اپنی ایسی محبت عطا فرما کہ میرے لئے میری سب سے قیمتی چیز یعنی میرا جان و دل تجھ پر قربان کرنا آسان ہو جائے۔ اے اللہ! صرف تیری رحمت ہی سے مجھے ایسی محبت حاصل ہو سکتی ہے اور بس صرف تیرے فضل و کرم ہی سے میں اس کی بھیک مانگتا ہوں، اس لئے نہیں کہ اختر کو اس کے استحقاق کا دعویٰ ہے اور یہ تیری عظیم ترین نعمت ہے جو بھی نعمت بندے کو حاصل ہوتی ہے محض تیرے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری ہے وَمَا بِکُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ کہ تمہیں جو بھی نعمت پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ تم کو جو بھی خیر اور خوبی پہنچی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اللہ کی محبت کا مانگنا سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

چنانچہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ کی محبت کو مانگا۔ دعا میں ہے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ کہ اے اللہ! مجھ کو اپنی محبت دے دیجیے! اور پھر وہ محبت بھی ایسی ہو کہ میں اپنا جاں و دل تجھ پر قربان کر دوں یعنی تو مجھے ہر شئے سے زیادہ محبوب ہو۔ حتیٰ کہ میری جان و دل سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

چنانچہ اسی طرح کی دعا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں مانگی ہے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَآءِ اِلَیَّ اے اللہ! مجھے اپنی محبت تمام چیزوں میں زیادہ محبوب کر دے۔ اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ دوسری چیزوں کی محبت بُری نہیں بلکہ اتنی محبت بُری ہے کہ جو ہمیں اپنا جان و مال اللہ کے راستے میں قربان کرنے سے روک دے۔

چنانچہ حضرتِ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ سے استدلال کر کے ارشاد فرمایا کہ اہلِ ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ سے اشد ہوتی ہے تو دوسری چیزوں کی محبت انچاس اور اللہ کی محبت اکیاون فیصد بھی ہو تو بھی اللہ کی محبت غالب اور اشد ہوئی اور جب بندے کے قلب میں اللہ کی محبت اشد ہو تو پھر اپنی جان و مال اور اہل و عیال سب کچھ اللہ کے لئے قربان کرنا اس کو آسان ہو جاتا ہے اور جب ان چیزوں کی محبت زیادہ ہو تو پھر اللہ و رسول کے احکام کو چھوڑ دینا اور ان سے بے اعتنائی اور لاپرواہی برتنا مشکل معلوم نہیں ہوتا اور نہ دل پر گراں اور دشوار گزرتا ہے بلکہ شدہ شدہ اس کے گناہ ہونے کا شعور اور احساس ہی دل سے نکل جاتا ہے۔ غیر اللہ کی محبت اللہ و رسول کی محبت کے مقابلے میں زیادہ ہونے پر ہی قرآنِ کریم کی یہ وعید مذکور ہے فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ایسے لوگ دنیا و آخرت کے چین و سکون سے محروم کر دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب و عقاب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اس لئے اللہ و رسول کی ایسی محبت اور خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کر دینے کا جذبۂ صادقہ ہی حضرتِ والا کے اس شعر میں مذکور دعا کا مصداق ہے۔

نفس و شیطان کی فرمانبرداری رسوائی کا باعث ہے

میں کب تک نفس دُشمن کی غلامی سے رہوں رُسوا
تُو کرلے ایسے ناکارہ کو پھر یارِدِگر اپنا

نفس و شیطان کے دُشمن ہونے کا احساس وشعور ہونا اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ قرآنِ پاک میں ارشادفرماتے ہیں اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا کہ شیطان تمہارا دُشمن ہے، اس کو ہمیشہ دُشمن سمجھ کے رہنا اور فرمانِ نبوت ہے اِنَّ أَعْدٰی عَدُوِّکَ بَیْنَ جَنْبَیْکَ تمہارا سب سے خطرناک دُشمن تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان میں ہے اور نفس و شیطان بُرائی اور بے حیائی اور معصیت ونافرمانی کی دلدل میں انسان کو پھنسا کر اس کو ذلیل وخوار کر کے جنت کی نعمتوں سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایسی خصلت و عادت سے ہمیں آگاہ کیا اور ارشادفرمایا اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْن اور ارشادفرمایا وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا

خلاصہ یہ کہ شیطان تمہارا صریح دُشمن ہے اور اس کے سب وعدے مکروفریب اور دھوکہ ہیں اور نفس بُرائی کی طرف ہانک کر لے جانے والا ہے۔ یہی نفس امارہ کہلاتا ہے، اس لئے جونفس کا غلام بن کر رہے اور خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کرتا رہے تو اس کی رسوائی اور ذلت وتباہی میں کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے متعلق یہ عرض پیش کررہے ہیں کہ اے خدا! میں نفس دُشمن کی غلامی سے نکلنا چاہتا ہوں اور پھر تیرا بننا چاہتا ہوں، اب تک جو کچھ ہوا سو ہو چکا، اب تجھ سے جدا رہنا برداشت وہمت سے باہر ہے اور اب حال یہ ہے ؎

دردِ فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں ایک ماہیٔ بے آب ہے
تلخ تراز فرقتِ تو ہیچ نیست
بے پناہت غیر پیچا پیچ نیست

اصلاحِ قلب ہی اصل تزکیہ ہے

چھڑا کر غیر سے دل کو تو اپنا خاص کر ہم کو
تو فضلِ خاص کو ہم سب پہ یارب عام کر اپنا

ارشادفرماتے ہیں کہ اے اللہ! میرے دل سے اپنے غیر کو نکال کر صاف ستھرا کردے اور مجھے اپنے خاص بندوں میں شامل کرلے چونکہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے:

﴿اللّٰهُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَا ... وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا﴾

اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں اور اعضاء وجوارح آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔آپ نے ہمیں ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں بنایا۔

اس لئے آپ ہی سے یہ التجاء ہے کہ میرے دل سے سارے غیر اللہ کو نکال کے باہر کردے اور علائقِ دنیویہ سے میرے قلب کو بے تعلق کردے کہ دل میں سوائے آپ کے اور کوئی نہ رہے اور اس طرح میں آپ کے خاص بندوں میں شامل ہو جاؤں اور یہ چیز بغیر آپ کے فضلِ خاص اور رحم وکرم کے ممکن نہیں ہے، اس لئے آپ جبکہ میرے ربّ ہیں، میرے ظاہر و باطن کی تربیت کرنے والے ہیں تو مجھ پر اور میرے دوستوں پر اپنے فضل کو عام فرما کر سب کو تزکیہ عطا فرمادے، آمین۔

اس شعر میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دل غیر سے وابستہ نہ رہے۔اگرچہ دل سے باہر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں اور آسائش کی چیزوں سے مستفید ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایک حد تک یہ ضروری ہیں جیسا کہ پانی کشتی کے چلنے کے لئے لازم اور ضروری ہے لیکن اگر پانی کشتی کے اندر جائے تو پھر وہ پانی اُس کشتی کو غرق کر کے تمام مسافروں کی تباہی اور بربادی کا سبب ہوگا، اس لئے حضرتِ والا نے دل کو غیر اللہ سے چھڑانے کی دعا کی ہے۔جب تک دل میں غیر ہوتا ہے تو باقی جسم پر بھی غیر کی حکومت چلتی ہے لیکن جب دل میں صرف اللہ ہو تو پھر پورے بدن کا ہر ہر عضو حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔اسی لئے حضرتِ والا کے کلام میں اکثر دل کو مخاطب بنایا گیا اور حضرت کی محنت کا میدان بھی زیادہ تر یہی دل ہے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کلامِ مبارک سے ہوتا ہے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، ج:۱، ص:۱۳)

بلاشبہ انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔سنو! وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔

معلوم ہوا سارے جسم کی اصلاح اور فساد کا مدار دل کی اصلاح اور فساد پر ہے، اس لئے دل کی پاکیزگی اور صفائی سارے جسم کی پاکیزگی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تاثیرِ صحبت ایک امرِ فطری ہے

بہ فیضِ مرشدِ کامل تو کردے ہنس زاغوں کو
کہ وقفِ خانقاہِ شیخ ہے قلب و جگر اپنا

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت جاری ہے کہ انسان جس طرح کی صحبت میں رہتا ہے اسی نوع کے اخلاق و عادات اس میں آنے لگتی ہیں۔ اگر صالحین کی صحبت میں رہے تو طبیعت میں صلاح کا اثر محسوس ہونے لگتا ہے اور اگر بُرے لوگوں کی صحبت میں رہے تو طبیعت کا میلان اور رغبت برائیوں اور معصیتوں کی طرف ہونے لگتی ہے۔ دنیا بھر کی تقریروں، تحریروں اور وعظ و بیان کی بنسبت صحبت کی تاثیر کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ فارسی میں ایک شعر ہے ۔

صحبتِ صالح ترا صالح کنند
صحبتِ طالح ترا طالح کنند

یعنی نیک کی صحبت تجھ کو نیک بنادے گی اور بُرے کی صحبت بُرا بنادے گی۔

قدرتُ اللہ اور سنتُ اللہ کا فرق

صاحبو! قدرتُ اللہ اور سنتُ اللہ میں بہت فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں اور ناممکن نہیں، اسی لئے حق تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی حجت تام کرنے اور اپنی قدرتِ کاملہ کو بیان کرنے کے لئے قرآنِ کریم میں انسانوں کی چار طرح کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی قدرتِ کاملہ کا مظہرِ تام بنایا۔ چنانچہ بغیر ماں اور باپ کے صرف مٹی سے پیدا کیا گیا۔

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾

(سورۃ النسآء، آیت: ۱)

ترجمہ: اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی نے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۲، ص: ۲۷۷)

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرتِ حوا کو پیدا کیا تو بغیر والدہ کے صرف والد سے اولاد کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی دلیل ہے اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے صرف حضرتِ مریم سے پیدا کیا۔ یہ بغیر باپ کے تخلیق کی مثال ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ ۝ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝﴾

(سورۃ مریم، آیت: ۳۴-۳۵)

ترجمہ: یہ ہے مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ جھگڑتے ہیں، اللہ ایسا نہیں ہے کہ رکھے اولاد، وہ پاک ذات ہے۔ جب ٹھہرا لیتا ہے کسی کام کا کرنا، سو یہی کہتا ہے وہ اس کو کہ ہو سو وہ ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۲۹)

جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں تو ارادہ کرتے ہی مراد وجود میں آجاتی ہے۔ یہ سب انواعِ تخلیق پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے پیدا کر سکتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کسی عورت کو بغیر شوہر کے اور شوہر کو بغیر عورت کے اولاد حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ اس پر قادر ہے۔ اس طرح کی سوچ غیر اسلامی ہے، بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کی باہمی طور پر خصوصی ملاقات کے نتیجے میں اولاد وجود میں آتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں آتی اور ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی سنت کو دیکھنے ہی کے مکلّف ہیں کیونکہ وہی ہمارے لئے خدائی شریعت اور ضابطہ حیات ہے۔ اُس سے بال برابر ہٹنا حدودِ شریعت سے تجاوز کرنا اور انحراف ہے۔ جیسے کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور توکل اختیار کرے مگر حدودِ توکل سے تجاوز کر جائے اور اپنے اونٹ اور جانوروں کو باندھ کر محفوظ جگہ میں رکھنے کے بجائے ایسا ہی کھلا چھوڑ دے اور یوں کہے کہ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے تو یہ توکل نہیں بلکہ سراسر تعطل ہے جس کی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔

چنانچہ ایک صحابی کو حکم دیا قَیِّدْ وَتَوَکَّلْ پہلے اونٹ کو باندھو، پھر بھروسہ کرو! یعنی پہلے سببِ حفاظت اختیار کرو، پھر اس کا نتیجہ اللہ کو سونپ دو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر اونٹ کو باندھے ہوئے اس کی حفاظت پر قادر ہے، مگر ہم دنیا میں رہتے ہوئے قدرتُ اللہ کی طرف دیکھنے کے مکلّف نہیں بلکہ سنتُ اللہ کے مکلّف ہیں۔

صحبتِ شیخ سے متعلق ایک سوال کا جواب

صاحبو! اس طرح کی تمہید سے میرا مقصود اصل میں بعضوں کے ذہن میں اُبھرنے والے اس سوال کا یہ جواب دینا ہے کہ ہمیں شیخ اور دینی مشیر اور مصلح اور مرشد کی ضرورت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ بغیر شیخ کے ہماری اصلاح فرما دیں۔ بس کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ پڑھ کر ہم اپنے مقصود کو پا سکتے ہیں۔ کسی شیخ سے تعلقِ اصلاحی کی کوئی حاجت نہیں۔

درحقیقت اس سوال کا منشاء وہی مضمون ہے جو اوپر عرض کیا گیا کہ سنت اللہ اور قدرتُ اللہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی سنت قوموں کی رشد و ہدایت اور ان کی اصلاحِ حال کے لئے یہی جاری ہے کہ کتابُ اللہ کے ساتھ رجالُ اللہ بھی بھیجے گئے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کتابیں نازل فرمائیں۔ تو اُن کتابوں پر عمل کرانے اور ان کو زندگیوں میں معمول بنانے کے

لئے رجالُ اللہ یعنی انبیاء بھی بھیجے ورنہ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھے کہ صرف اپنی کتاب آسمان سے نازل کر کے قوموں کو اس کے پڑھنے کا مکلّف بنایا جاتا اور پھر وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کو پالیتے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اور آگے بڑھ کر یہ عرض ہے کہ اگر سائل کے سوال کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیا جائے تو پھر اس پر اُن سے پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھے؟ کہ بغیر نبیوں کے اور بغیر کتابوں کے اور بغیر احکام کا مکلّف بنائے اور بغیر دنیا میں نوع بنوع مصائب و آلام کی تکلیف دیے، اپنا قرب دیتے اور جنت میں بھیج دیتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اس بات سے ہرگز صرفِ نظر نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نظام، قانون اور سنت و شریعت کے تحت پیدا کیا ہے۔ اُسی کی اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے لہٰذا اس گفتگو کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ زندگیوں میں تبدیلی اور قوموں کی اصلاح و تربیت جس طرح بغیر انبیاء علیہم السلام کے ممکن نہ تھی۔ آج کے دور میں بغیر انبیاء کے وارثین کی صحبت اور تعلق کے ممکن نہیں جس طرح انبیاء زندگیوں میں نمونہ بنتے اور ان سے ان کی قوم دین سیکھا کرتی تھی، آج کے دور میں بھی اسی طرح اولیاءِ کاملین اور علماءِ ربانیین کی صحبتوں میں رہ کر دین سیکھا اور سمجھا اور اپنایا جاتا ہے۔

صحبتِ شیخ سے متعلق حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد

اصلاح وتزکیہ کی یہ صورت گویا کہ عین سنتِ انبیاء ٹھہری اور یہی وجہ ہے کہ حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے کامل متبع شریعت اولیاء اللہ کی صحبت اور ان سے تعلق کو فرضِ عین قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اصلاحِ نفس اور تزکیہ فرض ہے اور اس دور میں بغیر اہلُ اللہ کی صحبت کے یہ ممکن نہیں۔

حضرتِ والا اس شعر میں یہی دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے میرے شیخ کی دعاؤں اور توجہات اور ان کی تعلیمات و ارشادات پر عمل و اتباع کی برکت سے نیک اور صالح بنادے۔ میری حالت تو اس وقت مثل زاغ یعنی کوّے کے ہے، تُو اس حالت کو بدل کر مجھے ہنس کی طرح کردے۔ کوّا مردار پر گرتا اور مرتا ہے جبکہ ہنس پرندہ قیمتی موتی اُٹھاتا پھرتا ہے تو اے میرے اللہ! اس دنیاءِ فانی و مردار کی محبت کو مرے دل سے نکال اور اس کے شوق و رغبت سے مرے دل کو خالی کردے اور مجھے اس مردار اور فانی دنیا پر مرنے کی بجائے اپنی ذاتِ حی و قیوم کی خاطر مرنا نصیب کردے۔ سوائے تیری محبت و معرفت اور تیرے تذکروں اور تیری یادوں کے سب کچھ فانی ہے اور مردار ہے۔ تیری یادیں اور تیرے تذکرے، میرے لئے گویا کہ موتی بلکہ اُس سے بڑھ کر ہیں اور اے خدا! اگرچہ میں کسی لائق نہ سہی لیکن میں نے جس ولیٔ کامل کے قدموں میں اپنے کو ڈالا ہے۔ تیری محبت و رضاء کے حصول کی خاطر جس خانقاہِ شیخ میں میں نے اپنے دل و جان کو وقف کیا ہے اور جس کی آہ وزاری سے مجھے آہ وزاری کا مزہ ملا ہے۔ اس کی برکت سے میری حالت کو بدل دے کیونکہ تیرا وعدہ ہے۔

﴿وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَالْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ﴾

(المشکوٰۃ، باب الحب فی اللہ ومن اللہ، ص:۴۲۶)

میری محبت ان کے لیے واجب ہو جاتی ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے میرے لئے محبت کرتے اور میری خاطر ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور میرے لئے آپس میں ملتے اور میرے لئے مال خرچ کرتے ہیں، الٰہی میری اس محبت کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے، اس لئے تو مجھے اپنے محبوبین میں شامل کر دے۔

تکمیلِ توبہ استقامت علی الطاعۃ سے ہے

تغافل سے جو کی توبہ تو ان کی راہ میں اخترؔ
ہمہ تن مشغلہ ہے ذکر کا شام و سحر اپنا

اولیاء اللہ کسی مقام پر پہنچ کر بھی اپنے آپ کو یہ نہیں سمجھتے کہ میں قرب اور ولایت کے انتہائی مقام پر پہنچ چکا ہوں اور غفلت کے تمام حجابات اُٹھائے جا چکے ہیں، اب میری عبادت و معرفت درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے بلکہ ہر گھڑی وہ اپنے پہلے حال کو اگلے حال کے مقابلے میں غفلتوں میں ڈوبا ہوا سمجھتے ہیں اور مرتے دم تک یہی حالت چلتی رہتی ہے، اسی لئے توبہ و استغفار میں دوسرے لوگوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنی طاعات پر بھی وہ لرزاں اور ترساں ہوتے ہیں اور ہر نئے لمحہ حیات کو پچھلے لمحاتِ زندگی سے زیادہ قیمتی بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا منتہاء اس پر ہوتا ہے کہ وہ بزبانِ حال یہ کہتے ہوئے ہوتے ہیں:

﴿مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ﴾

اور یہی کمال درجے کی عبدیت اور بندگی ہے جو کہ انبیاء و اولیاء کا سب سے بڑا کمال ہے کہ پورے تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود وہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان رہتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں عاجزی اور تواضع کے جذبات پیش کرتے رہتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کچھ نہ کر سکے اور ہم نے عمر غفلتوں میں گزار دی۔ ہمارے پاس تیری رحمت کی اُمید کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ ان کے لیل و نہار اور شب و روز اللہ کے تذکروں اور یادوں میں اور اس کی عظمت و محبت کی باتوں میں گزرتے ہیں، مگر اُن کا بھروسہ اس پر نہیں ہوتا وہ اس پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اپنی مغفرت کی اُمید اور بخشش کا سہارا رحمتِ الٰہی پر رکھتے ہیں۔ جیسے کہ حضرتِ والا کا ایک دوسرا شعر اسی مضمون پر ہے ؎

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

صاحبو! توبہ کی توفیق کی شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ جن غفلتوں اور معصیتوں کا صدور ہوا، ان پر ندامت کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا عزم ہو۔ اس لئے حضرتِ والا فرماتے ہیں کہ اب میرا حال یہ ہے کہ میرے

بدن کا ہر ہر عضو صبح و شام یادِ خدا میں مصروف ہے، اس لئے کہ ذکر صرف زبان سے اللہ اللہ کرنے کا نام نہیں بلکہ اعضاءِ بدن کو اللہ کے حکم کے سامنے جھکا دینا اور پورے قلب و قالب سے اللہ کا مطیع ہو جانا یہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔

اس لئے فرمایا گیا کُلُّ مُطِیْعِ اللہِ ذَاکِرٌ اس لئے ذکر کا معنی یاد کرنا ہے تو جب ہمارے اعضاءِ بدن ہاتھ، پیر، آنکھ، کان، زبان کسی بھی عمل کے لیے حرکت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کو یاد کریں تو یہ دلیل ہے کہ یہ اعضاء ذکرِ الٰہی میں مشغول ہیں۔

مفسرین نے ذکر کی چار تفسیریں کی ہیں: (۱) ذکرِ لسانی (۲) ذکرِ فکری (۳) ذکرِ قلبی (۴) ذکرِ عملی۔

زبان سے اللہ کا ذکر اور دل ہی دل میں اللہ کی یاد اور پوری کائنات اور اللہ کی مخلوق میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کو پہچاننا اور ذرّے ذرّے میں فکر و تدبر سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا، یہ ذکرِ فکری ہے اور طاعاتِ الٰہیہ پر عامل ہونا یہ ذکرِ عملی ہے۔

اس لئے حضرت والا نے اپنے کلام میں یہ لفظ استعمال فرمایا کہ میں نے جب سے توبہ کی ہے تو اب ہمہ تن اللہ کی یاد میں صبح و شام مشغول رہتا ہوں۔ کبھی اللہ اللہ زبان پر ہوتا ہے، کبھی وعظ و تقریر اور درس و بیان کے ذریعے عظمت و معرفتِ خداوندی کے تذکرے ہوتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور معصیتوں کے سمندر سے اُمتِ مسلمہ کو نکالنے کی تجاویز اور نسخے پیش کرنے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ صبح و شام خدا کو یاد کرنا ہے۔

تجھے مشکل ہے کیا غم کو میرے زیروزبر کرنا

تجھے مشکل ہے کیا غم کو میرے زیر و زبر کرنا
ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کرنا

تری قدرت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہوگا اے مالک
کہ ہم سے دُور اُفتادوں کو پھر نزدیک تر کرنا

ترے دستِ کرم کی کیمیا تاثیر کیا کہیے
کسی ذرّے کو تیرا دم میں خورشید و قمر کرنا

جو تیری راہ میں روباہ خصلت سے ہیں پسماندہ
تجھے مشکل نہیں ایسوں کو رشکِ شیرِنر کرنا

یہی ہے راستہ اپنے گناہوں کی تلافی کا
تری سرکار میں بندوں کا ہر دم چشم تر کرنا

تجھے مشکل نہیں مسکیں کو سلطانِ جہاں کر دے
کرم سے اپنے اختر کو ترا شمس و قمر کرنا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **زیروزبر کرنا**: ختم کرنا۔ **رشکِ سحر**: صبح کا رشک کرنا۔ **ادنیٰ کرشمہ**: ......۔ **دُور اُفتادوں**: دور پڑے ہوئے یعنی گنہگار۔ **دستِ کرم**: فضل وکرم کا ہاتھ۔ **کیمیاتاثیر**: ......۔ **خورشیدوقمر**: سورج اور چاند۔ **رُوباہ خصلت**: لومڑیانہ عادت۔ **پسماندہ**: گرے ہوئے، نااہل۔ **رشکِ شیرنر**: شیروں کا رشک کرنا۔ **تلافی**: تدارک یعنی معافی۔ **چشم تر کرنا**: آنسوں بہانا۔

راہِ خداوندی کے غموں میں خوشیاں مضمر ہیں

تجھے مشکل ہے کیا غم کو میرے زیر و زبر کرنا
ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کرنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں بظاہر غم زدہ اور دل ٹوٹا ہوا ہوں اور تیرے غموں کو دل پر اُٹھائے ہوئے ہوں، لیکن چونکہ یہ غم تیرے راستے کے غم ہیں اور حرام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون پینے اور حسرتوں کا غم ہے، اس لئے میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ میرے اس غم کو حقیقی غم کی شکل میں تبدیل کردے جو انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام کی وراثت ہے اور جس غم پر دونوں جہاں کی ہزار خوشیاں قربان ہیں کیونکہ اس غم میں مجھے آپ کے قرب کا مزہ اور جینے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اے میرے اللہ! میرے شامِ غم کو رشکِ سحر بنادے کیونکہ دنیا کی خوشیوں

والے اور لذاتِ حیات میں مست اور دنیا کے دھوکوں میں پڑ کر دیوانے ہونے والے ساحل پہ پہنچ کر بھی طغیانی کے عالم میں رہتے ہیں اور میں تیرے لئے اُٹھائے ہوئے غموں کے سمندر کی موجوں کی طغیانی میں بھی ساحل کا مزہ پاتا ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ راہِ الٰہی میں کسی طرح کا مجاہدہ کرتا ہے اور من چاہی کو چھوڑ کر ربّ چاہی پر چلنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اسے ہر قدم پر منزلیں ملتی جاتی ہیں یعنی اللہ کے وہ وعدے جن کا خلاصہ دنیا و آخرت کی زندگی کو بالطف بنانا ہے اور حیاتِ طیبہ کا ملنا ہے تو وہ ہر قدم پر اپنی زندگی میں لطف اور حلاوت پاتا ہے۔

جیسا کہ مثلاً حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام حسن سے نظر بچانے پر حلاوتِ ایمانی حاصل ہونے کا وعدہ فرمایا تو جب ہمت و جرأت کے ساتھ اپنی نگاہ کو بچانے کا غم اُٹھائے گا تو اسی وقت اُسے حلاوتِ ایمانی نصیب ہوکر گویا اُس کی منزل مل جائے گی اور اسی طرح ہوتے ہوتے ایک دن وہ اپنی آخری منزل جنت میں پہنچ جائے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاء کا مستحق قرار پائے گا۔

جذب ہی دلیلِ قبولیت ہے

تری قدرت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہوگا اے مالک
کہ ہم سے دُور اُفتادوں کو پھر نزدیک تر کرنا

حضرتِ والا اپنی مناجات میں ارشاد فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! آپ قادرِ مطلق ہیں، میں تو غفلتوں کی دلدلوں میں پھنسا ہوا ہوں لیکن آپ کی قدرت سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا قرب عطا فرمادیں گے۔ میں اپنی غفلتوں کی وجہ سے تیرے قرب کی منزل سے بہت دُور ہوں، مگر تو جب کسی کو چاہتا ہے تو اس قابل بنادیتا ہے۔جیسا کہ فارسی میں ایک شعر ہے ؎

دادِ اُو را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد اوست

اے اللہ! تیرے دینے کے لئے اور تیری عطاء کے لئے قابل ہونا شرط نہیں بلکہ اے خدا! تیری عطاء ہی دلیلِ قابلیت ہے، اسی لئے قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾
(سورۃ الشوریٰ، آیت:۱۳)

ترجمہ: اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے (یعنی دینِ حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۷، ص:۶۷۵)

قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اور اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتے ہیں خاص فرماتے ہیں۔

شعر کا خلاصہ یہ نکلا کہ بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی نالائقی اور اپنے نااہل اور ناکارہ ہونے کو پیش کرکے بدونِ استحقاق اللہ تعالیٰ کے فضل کی بھیک مانگے اور دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کا قرب مانگا جائے کیونکہ کسی عاشق کے لئے اپنے محبوب سے دوری ایک عذاب ہے۔ راہِ خدا کی کتنی ہی منازل طے کرلینے کے باوجود پھر بھی اولیاء اللہ اپنے کو دور اُفتادہ ہی میں شمار کرتے ہیں کیونکہ بقول حضرت اقدس: ''یہ سمندر ہے وہ جس کا ساحل نہیں''

اللہ کی ایک نظرِ کرم رشکِ خورشید وقمر بنا دیتی ہے

ترے دست کرم کی کیمیا تاثیر کیا کہیے
کسی ذرّے کو تیرا دم میں خورشید و قمر کرنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے خدا! تیرے لئے مجھے اپنا قرب دے دینا اور دولتِ معرفت ومحبت سے مجھے مالا مال کردینا اور مجھ ذرّۂ ناتواں کو اپنی ایک نظرِ کرم سے رشکِ خورشید وقمر بنا دینا، بہت ہی آسان اور سہل ہے۔ تیرے کرم کی نگاہ جس ذرّے پر پڑ جاتی ہے وہ یکدم میں خورشید وقمر بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

(سورۃ یٰس، آیت: ۸۲)

ترجمہ: جب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے ہوجا بس وہ ہوجاتی ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، ص: ۴۱۱)

جب کسی کی قسمت کا خورشید چمکنا ہوتا ہے تو یکدم میں وہ شقاوتوں کی تنگ وتاریک وادیوں سے نکال کر ہدایت کا خورشید وقمر بنا دیا جاتا ہے اور شقاوت وبدبختی کی ظلمتوں سے نکال کر سعادت ونیک بختی کی منزل پر پہنچا دیا جاتا ہے ؎

جوش میں آئے جو دریا رحم کا
گبرِ صد سالہ ہو فخرِ اولیاء

چنانچہ تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات منقول ہیں کہ کفر وفسق میں نہایت شدید وسخت اور اسلامی دُشمنی و دینی عداوت میں پیش پیش اور دنیا جہاں کی برائیوں اور معائب سے بھرا ہوا انسان ہوتا ہے، لیکن اللہ کی ایک نظرِ کرم سے کوئی معمولی سا واقعہ اور معمولی سی بات اس کے دل پر چوٹ مار دیتی ہے اور اس کی دینی ہدایت کا سامان بن جاتا ہے۔ پھر وہ قربِ الٰہی کی اونچی منازل طے کرکے آفتاب وماہتاب کی طرح چمکنے لگتا ہے اور اپنی زندگی میں دینِ اسلام کے لئے ایسی قربانیاں پیش کرتا ہے، مجاہدات وریاضات کی چکی میں اپنے کو ایسا پیستا ہے کہ جس کا اس سے تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سکونِ قلبی کے متعلق ایک عبرت آموز واقعہ

چنانچہ ایک مرتبہ احقر دعوت وتبلیغ کے کام پر عرب جماعت کے ساتھ ساؤتھ افریقہ میں وقت لگا رہا تھا۔ مغرب کے بعد اپنے ایک عرب ساتھی کی ترجمانی کے لئے احقر گشت میں ساتھ گیا تو اس موقعہ پر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امریکا میں گزرا ہوا ایک واقعہ یوں سنایا:

''ایک عرب ساتھی مع اپنے چند احباب گشت کرنے کے لئے امریکہ میں کسی پارک (Park) میں نکلا۔ ساتھیوں نے مختلف حضرات سے وہیں ملاقاتیں کیں لیکن وہ کہنے لگا کہ میں ذرا تھکا ہوا ہوں، کچھ دیر یہیں بینچ (Bench) کے اوپر لیٹ کر سوجاتا ہوں۔ چنانچہ وہ لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ دوسری جانب یہ ہوا کہ ایک انگریز عیسائی اپنے فلیٹ (Flat) سے اُس کو دیکھ رہا تھا۔ جب اُسے یہ لگا کہ یہ شخص پارک میں شور شرابے کے باوجود آرام سے سویا ہوا ہے تو وہ اُتر کر اس کے پاس پہنچا اور اُس کے بیدار ہونے پر اُس سے یوں پوچھا: ''آخر اتنے شور میں اور لوگوں کی بھیڑ میں تمہیں لیٹ کر نیند کیسے آگئی اور تم نے اُس کے لئے کون سی ٹیبلیٹ (Tablet) لی ہے جس سے تمہیں اتنی آرام سے نیند آگئی کیونکہ میں اپنے شاندار ایئر کنڈیشنڈ (Airconditioned) کمرے میں دوائی لینے کے باوجود مشکل سے سو پاتا ہوں۔'' مگر وہ باہم ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ جب دوسرے ساتھی گشت سے واپس ہورہے تھے تو اس ساتھی کے پاس آئے اور پھر ایک دوسرے کی ترجمانی کی اور جواب ان کو یوں دیا کہ ہم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے ماننے والے ہیں اور اس کلمہ کا ماننے والا بالکل مطمئن اور پُرسکون ہوتا ہے۔ ذہنی ٹینشن (Mental Stress) اور ڈیپریشن (Depression) کا مریض نہیں ہوتا، اس لئے اُسے بغیر کوئی دوائی کھائے ہر جگہ نیند آتی ہے۔

چنانچہ اُس انگریز کو اس وقت اس بات سے بہت حیرت ہوئی اور تعجب سے اس نے پوچھا کہ کیا میں بھی اس کو پڑھ سکتا ہوں اور سیکھ سکتا ہوں؟ تو ساتھیوں نے بتایا کہ کیوں نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ مسجد چلیں۔ چنانچہ اس نے نظم بنایا اور ان کے ساتھ مسجد میں گیا۔ وہاں پر تعلیم ہورہی تھی، ساتھیوں نے اُس کو وہاں بٹھادیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کو نیند آنی شروع ہوگئی تو امیر صاحب نے کہا کہ ان کو لے جاکر آرام سے کمرے میں سلادو، وہ کمرے میں لیٹ کر پانچ چھ گھنٹے آرام سے سوتا رہا جب سو کے اُٹھا تو بہت خوش نہایت مطمئن تھا۔ پھر اُسے غسل کرا کر کلمہ پڑھایا اور حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ اُسے اتنی خوشی اور اتنی فرحت ومسرت ہوئی کہ مارے خوشی کے وہ جماعت کے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ میں تم لوگوں کے لئے کتنے ڈالر کا چیک (Cheque) کاٹ کر پیش کروں؟ تو ساتھیوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ کام پیسوں وغیرہ کے لئے نہیں ہے اور اس شخص نے پھر بہت سے مساجد اور مکاتبِ دینیہ قائم کیے اور جید مسلمان بن گیا۔

سن لے اے دوست! جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

کسی کی تحقیر جائز نہ ہونے کی دلیل

صاحبو! اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ اجتباء واصطفاء کا یہی معاملہ ہے کہ جب وہ کسی کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں تو اس کو ظلمات سے نور کی طرف اور کفر سے اسلام کی طرف اور فسق وفجور سے طاعت ونیکی کی طرف اور غفلتوں سے اپنی یادوں کی طرف یکدم میں نکال کر اُس کو ہدایت کا آفتاب وماہتاب بنادیتے ہیں۔

یہی تو وہ راز ہے جس کو اُمت کے تمام اولیاء اللہ نے بخوبی سمجھا اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم کی تحقیر فی الحال اور کافر کی تحقیر کو فی المآل حرام قرار دیا ہے۔ قرآن میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مردہ سے زندہ یعنی کافر سے مؤمن اور زندہ سے مردہ یعنی مؤمن سے کافر کو پیدا کیا اور اپنی مشیتِ تامہ اور قدرتِ کاملہ کا ظہور فرما کر ان امور میں کسی انسان کے کسی درجے کے اختیار کو کلی طور پر بے اصل وبے معنی قرار دے دیا۔ نہ کسی نبی کو ان معاملات میں کوئی قدرت واختیار عطا ہوا اور نہ ہی کسی ولی کو بلکہ قرآن نے یہ اعلان کردیا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ صرف میرے ہی لئے پیدا کرنا اور حکم دینا ہے۔

جیسا کہ حضرتِ والا کبھی ان اشعار کو پڑھتے ہیں جو گلزارِ ابراہیم کے ہیں ؎

کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو	لاوے بت خانہ سے وہ صدیق کو
اہلیہ لوط نبی ہو کافرہ	زوجۂ فرعون ہووے طاہرہ
زادۂ آزر خلیل اللہ ہو	اور کنعاں نوح کا گمراہ ہو
دیر کو مسجد کرے مسجد کو دیر	غیر کو اپنا کرے اپنے کو غیر
فہم سے بالا خدائی ہے تری	عقل سے برتر خدائی ہے تری

سلوک ہمت سے طے ہوتا ہے محض آرزوؤں سے نہیں

جو تیری راہ میں روباہ خصلت سے ہیں پسماندہ
تجھے مشکل نہیں ایسوں کو رشکِ شیرِ نر کرنا

حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ پورے تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ مامورات کے اوپر ہمت وقوت کو استعمال کرکے عمل کرنا اور منہیات اور معاصی سے پوری ہمت کے ساتھ اجتناب اور دوری اختیار کرنا۔

اسی کو حضرتِ والا نے یوں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر تقویٰ فرض کیا ہے تو تقویٰ کی ہمت بھی دی

ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ہمیں تقویٰ کی ہمت نہ دیتے تو پھر ہم پر تقویٰ بھی فرض نہ کرتے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ قدرت و وسعت سے زیادہ بندے کو احکام کا مکلّف نہیں بناتے۔

ان اشعار میں درحقیقت گناہوں سے بچنے اور طاعات پر جمنے کے سلسلے میں ہمت و جرأت، قوت و طاعت اور شجاعت و دلیری کی ضرورت ہے کہ جب خواہشاتِ نفس سے ٹکراؤ اور مقابلہ ہو تو ہمت سے، جرأت سے اس کا مقابلہ کرے اور اس کو پچھاڑ دے۔ یہی ہے شیرِ نر کی خصلت کہ وہ اپنی جرأت و دلیری سے اپنے ہر مدِّ مقابل کو پچھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ اور جو خواہشاتِ نفسانیہ کے تقاضوں کے مقابلے میں جرأتمندانہ اور دلیرانہ قدم نہیں اُٹھاتا بلکہ بے ہمتی اور بزدلی دکھاکر ان کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے اور لومڑیانہ خصلت کا شکار ہوجاتا ہے تو ایسا انسان اللہ کی راہ کو طے نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ راہ دلیری اور جرأت مندی سے طے ہوتی ہے، اسی لئے حقیقی بہادر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں وہ شخص ہے کہ جب حالت غضب میں ہو تو وہ اپنے اوپر قابو پالے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

﴿لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِىْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب، ج: ۲، ص: ۹۰۳)

بہادر اور پہلوان وہ شخص نہیں ہوتا جو اپنی جسمانی قوت سے کسی کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر اور پہلوان وہ شخص ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پالے اور اس کو کنٹرول (Control) میں رکھے۔

حضرت والا دامت برکاتہم اس شعر میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! جو تیری راہ کے مجاہدات اور ریاضتیں اختیار کرنے کے سلسلے میں کمزور اور بے حوصلہ ہیں اور نفس وشیطان کے مقابلے میں بزدل اور روباہ خصلت ہیں۔ تیری ذاتِ عالی سے یہ عرض ہے کہ ایسوں کو جرأت و ہمت کا پہاڑ بنادے اور ایسی جرأت مندی اور دلیری عطا کردے کہ ان کی بہادری اور جرأت رشکِ شیرِ نر بن جائے اور اے خدا! تیرے لئے ایسا کردینا کوئی مشکل نہیں حضرتِ والا کے اس شعر میں سالکین کے لئے ایک سبق یہ ہے کہ ہر سالک کو چاہئے کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں اپنی عاجزی ہی پیش کرتا رہے، اپنے کو نہ تو شیر سمجھے اور نہ ایسا سمجھ کر بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو تو یہ صفتِ فقر واحتیاج اور اپنے کو عاجز اور درماندہ بناکر پیش کرنا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت و ہمت عطا ہونے کا ذریعہ ہے۔ اگر کبھی کبھی کوئی لومڑیانہ حرکت ہوجائے تو نہ اُس سے دلگیر ہو اور نہ مایوس ہو بلکہ برابر نفس سے ٹکر لیتا رہے اور اس پر غالب آنے کی فکر کرتا رہے جیسا کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

نہ چت کرسکے نفس کے پہلواں کو
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے کشتی تو ہے عمر بھر کی
کبھی وہ دبا لے کبھی تُو دبا لے

اللہ کی شانِ مغفرت

یہی ہے راستہ اپنے گناہوں کی تلافی کا
تری سرکار میں بندوں کا ہر دم چشم تر کرنا

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لئے غَافِر، غَفُوْر اور غَفَّار تینوں الفاظ کا استعمال فرمایا۔ جیسا کہ بندے کے لئے ظَالِم، ظَلُوْم اور ظَلَّام بندے کے ظلم کی ان تینوں حالتوں کے مقابلے میں ویسے ہی تین الفاظ توبہ ومغفرت کے مضمون کے ارشاد فرمائے۔

صاحبو! آہ! ہمارا اللہ کیسا پیارا ہے اور کس قدر بندوں پر رحم کرنے والا ہے کہ بندے کو کسی بھی حالت میں اپنے در سے مایوس نہیں کیا بلکہ اعلان کر دیا کہ اے بندے! اگر تو ظَالِم ہے تو میں غَافِر ہوں۔ اگر تو ظَلُوْم ہے تو میں غَفُوْر ہوں اور اگر تو ظَلَّام ہے تو میں غَفَّار ہوں۔ کسی بھی حال میں میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ کیسے ہی بڑے بڑے گناہ کئے ہوں اور تو میری بارگاہ میں توبہ وندامت اور آہ وزاری کے ساتھ حاضر ہو تو میں صرف اتنا ہی نہیں کہ تیری ساری خطاؤں کو مٹا کر ختم کر دوں گا بلکہ ان کو حسنات سے مبدل کر دوں گا۔ خاص طور پر جبکہ توبہ کے ساتھ گریہ وزاری اور اشکِ ندامت بھی شامل ہو جائیں، اس لئے اللہ کے خوف سے اپنے گناہوں پر رونے کی احادیثِ مبارکہ میں بڑی فضیلت آئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوْعٌ وَاِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ ثُمَّ يُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حَرِّ وَجْهِهٖ اِلَّا حَرَّمَ اللهُ عَلَى النَّارِ﴾

(المشکوۃ، باب البکاء والخوف، ص: ۴۵۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آنکھ سے اللہ کے خوف سے آنسو نکل کر اس کے چہرے پر گرتا ہے، اگرچہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اس چہرے پر آگ کو حرام کر دیتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ حرم شریف میں آخرِ شب استغفار میں اس طرح روتے تھے کہ کلیجہ سننے والوں کا پھٹا جاتا تھا اور ایک رات صرف اس شعر کو سجدے میں پڑھتے رہے اور روتے رہے ؎

اے خدا! ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم من سرِّ من پیدا مکن

اے خدا! اس بندے کو میدانِ محشر میں رسوا مت فرمانا۔ اگرچہ ہم بُرے اور گناہ گار ہیں، آپ ہمارے عیوب کو مخلوق پر ظاہر نہ فرمائیے گا۔

چار گواہوں کی گواہی

صاحبو! اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ کے ذریعے گناہوں کی ایسی تلافی فرماتے ہیں کہ گناہ کرتے وقت جو چار گواہ قائم ہوئے تھے ان سب کی گواہیوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس وقت اس کی حرکت پر قرآن کی روشنی میں چار گواہ ہو جاتے ہیں۔

(۱) یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَاo اس روز زمین اپنی سب (اچھی، بری) خبریں بیان کرنے لگے گی۔ (سورۂ زلزال، پارہ:۳۰)

صحابہ کرام نے سوال کیا کہ زمین کیا خبریں بیان کرے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زمین پر جو اعمال کئے جاتے ہیں زمین اس کی گواہی دے گی۔

حضرت علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ نے اپنے وصایا میں فرمایا کہ جس جگہ کوئی گناہ ہو جائے وہاں کچھ استغفار اور نیک عمل کر لو تا کہ وہ زمین تمہارے لئے نیکی کی بھی گواہ بن جائے۔

(۲) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْo اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ (سورۂ تکویر، پارہ:۳۰)

(۳) کِرَامًا کَاتِبِیْنَo یَعْلَمُوْنَ مَاتَفْعَلُوْنَo عزت والے، عمل لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ (سورۂ انفطار، پارہ:۳۰)

(۴) چوتھی گواہی جن اعضاء سے اعمال ہوتے ہیں یہ اعضاء بھی قیامت کے دن اپنا عمل بیان کریں گے۔ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَo آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے ان کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے۔ (سورۂ یٰسین، پارہ:۲۲)

تاثیرِ توبہ کا کرشمہ

اب توبہ کی برکت دیکھئے! صدقِ دل اور ندامت سے توبہ کر لینے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کے عزمِ مصمم سے یہ انعام ملتا ہے کہ گناہوں کے پہاڑ کے پہاڑ توبہ کی برکت سے اُڑ جاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی بارود جو مخلوق ہے پہاڑوں کو اُڑا دیتی ہے تو حق تعالیٰ کی رحمت کی کیا شان ہوگی۔ گناہوں کے پہاڑ کیوں نہ اُڑا دے گی۔ توبہ کی برکت اور اس کی تاثیر کا کرشمہ دیکھئے کہ حق تعالیٰ جس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں تو اس کے تمام گناہوں کی شہادتوں کو مٹا دیتے ہیں۔

اس مضمون کے ذیل میں اپنے وعظ کے اندر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں جس کو التشرف فی احادیث التصوف میں بھی تحریر فرمایا:

﴿اِذَا تَابَ الْعَبْدُ اَنْسَی اللّٰهُ تَعَالٰی الْحَفَظَةَ ذُنُوْبَهٗ وَاَنْسٰی ذٰلِکَ جَوَارِحَهٗ وَ مَعَالِمَهٗ مِنَ الْاَرْضِ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰهَ تَعَالٰی وَلَیْسَ عَلَیْهِ شَاهِدٌ مِّنَ اللّٰهِ بِذَنْبٍ﴾

(المرقاة، ج:۵، ص:۹، المکتبة الحقانیة)

ترجمہ: جب بندہ توبہ خالص کرتا ہے جو مقبول ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو ملائکہ حافظین اور کاتبینِ اعمال کو بھی بھلا دیتا ہے اور اس زمین سے بھی اس کے نشانات بھلا دیتا ہے جس جگہ اس نے وہ گناہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس پر اس کے گناہ کا کوئی گواہی دینے والا نہیں ہوتا۔

مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر کیا شانِ رحمت ہے؟ دنیا کے سلاطین مجرموں کو معاف کرنے کے باوجود ان کے جرائم کے کاغذات کو عدالتوں میں محفوظ رکھتے ہیں لیکن وہ ارحم الراحمین اپنے مجرمین کو اس طرح معاف فرماتے ہیں کہ ان کے جرائم کی تمام یادداشتوں کو بالکلیہ محو اور فنا کرا دیتے ہیں۔ فرمایا کہ فرشتوں سے یہ کام نہیں لیتے، براہِ راست خود اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ کام کرتے ہیں تاکہ بروزِ محشر فرشتے ہمارے گناہ گار بندوں کو طعنہ نہ دیں کہ نامۂ اعمال تو تمہارے خراب تھے، ہم نے تمہارے سیئات اور برائیوں کو مٹا دیا۔ حق تعالیٰ کی ان رحمتوں پر قربان جائیے۔ (روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج ،صفحہ:۴۴)

میرے دوستو! اس مذکورہ بالا گفتگو سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کیسے ہی بڑے سے بڑے گنہگار کے لئے بھی جائز نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مایوس ہونے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔

چنانچہ ایسا وعظ و بیان اور تقریر جس سے لوگوں میں مایوسی اور نا اُمیدی کی کیفیت پیدا ہو مناسب نہیں ہے۔ اس لئے حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی رحمہ اللہ نے غالب کے اس شعر کی اصلاح کی، جس میں رحمتِ خداوندی سے مایوسی کا مضمون تھا۔ اور وہ شعر یہ ہے ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

حضرت شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کا شعر یہ ہے ؎

میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا
شرم کو خاک میں ملاؤں گا
روؤں گا خوب گڑ گڑاؤں گا
توبہ کر کے انہیں مناؤں گا
ان کی مرضی پہ اب چلوں گا میں
منہ کو اپنے منہ بناؤں گا

(عرفانِ محبت)

قدرتِ الٰہی کے سامنے کوئی ناممکن ناممکن نہیں

تجھے مشکل نہیں مسکیں کو سلطانِ جہاں کردے
کرم سے اپنے اخترؔ کو ترا شمس و قمر کرنا

ارشادفرماتے ہیں کہ اے اللہ! جب تو کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر بظاہر ناممکن دکھائی دینے والی چیز بھی ممکن ہی نہیں بلکہ موجود نظر آتی ہے۔ جب تو چاہتا ہے تو یتیم و مسکین کو دنیا کا بادشاہ بنا ڈالتا ہے اور جب چاہتا ہے تو بے کس و بے بس یتیم و لاوارث انسان کو عزت و عظمت کا تاج پہنا کر سربلندی دے دیتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب کنویں میں بظاہر بے یارو مددگار پڑے ہوئے تھے اور مصر کے بازاروں میں بیچے جارہے تھے۔ ایک معصوم لاوارث، بے سہارا اور یتیم بچے کی شکل میں آپ کا وجود متعارف تھا، مگر جب نظامِ قدرتِ خداوندی حرکت میں آیا تو مشیتِ باری تعالیٰ سے مصر کی حکومت آپ کو حاصل ہوئی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپ نے شاہی انداز سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا استقبال کیا۔

جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی خبر کی وجہ سے اور انہی کو قتل کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے تمام بچوں کے قتل کا حکم دیا، مگر جب مشیتِ باری تعالیٰ نے چاہا تو خود فرعون ہی کے گھر میں حضرت موسیٰ کی تربیت ہوگئی اور وہ قتلِ فرعون سے محفوظ رہے۔ اسی کو ایک شاعر نے بڑے پیارے انداز سے تعبیر کیا۔

فَمُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاہُ جِبْرَئِیْلُ کَافِرٌ
وَ مُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاہُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

جس موسیٰ (اس دور کا ایک شخص جس کا نام موسیٰ تھا) کو خدا نے ڈائریکٹ (Direct) بغیر کسی انسان کے واسطے کے پالا وہ تو کافر بنا، اور جو خود اپنے دُشمن فرعون کے زیرِ سایہ پلے وہ پیغمبر بنے تو حضرت والا دامت برکاتہم دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں تو اخترؔ (ستارہ) ہوں تو جیسے تو مسکین کو سلطانِ جہاں بنا سکتا ہے، ایسے ہی اخترؔ کو بھی شمس و قمر یعنی علم و ہدایت کا آفتاب و ماہتاب بنا دے۔

ہمارے درد کو یاربّ تو دردِ معتبر کردے

ہمارے درد کو یاربّ تو دردِ معتبر کردے
ہمارے سر کو ہر لمحہ تو وقفِ سنگِ در کردے

مری آہوں کو لطفِ خاص سے تو باثر کردے
کرم سے میری جانِ بے خبر کو باخبر کردے

اور اپنی راہ میں ہم سالکوں کو تیزتر کردے
مزاجِ روبہی کو تو مزاجِ شیرِ نر کردے

ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کردے
شبِ دیجور کو تو رشکِ خورشید و قمر کردے

ہماری خشک آنکھوں کو خدایا چشمِ تر کردے
مرے اشکوں میں شامل خونِ دل خونِ جگر کردے

ہماری غفلتوں کی نیند کو آہِ سحر کردے
ہماری سرد آہوں کو تو آہِ گرم تر کردے

اور ہم سے دور اُفتادوں کو تو نزدیک تر کردے
ہمارے وسوسوں کو دردِ دل دردِ جگر کردے

کرم سے نفسِ امارہ کو میرے بے ضرر کردے
تقاضائے گنہ کو فضل سے زیر و زبر کردے

عطاء نسبتِ عالی سے شاہِ بحر و بر کردے
ثریا سے مرے ذرّے کو مالک فوق تر کردے

ثنائے خلق کی نعمت سے مجھ کو بہرہ ور کردے
ذلیل و خوار کو تو دم میں شاہِ کرّوفر کردے

منور نورِ تقویٰ سے مری شام و سحر کردے
دلِ گم کردۂ منزل کو شمعِ رہ گذر کردے

ہمارے ذرّۂ خاکی کو تو رشکِ گُہر کردے
مری توبہ سے میرے شر کو تو رشکِ بشر کردے

مرے ہر شعر میں شامل مری آہِ سحر کردے
قیامت تک تو ان کو یادگارِ بحر و بر کردے

زمینِ سجدہ کو اشکِ ندامت سے تو تر کردے
فلک کی کہکشاں کو خاک پر زیرِ نظر کردے

سرِ محشر بھی اختر پر کرم کی اک نظر کردے
اور اپنے فضل سے وہ آخری مشکل بھی سر کردے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ دردِ معتبر: اللہ تعالیٰ کی محبت کا مقبول درد۔ وقفِ سنگِ در: اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ پر پڑ جانا۔ لطفِ خاص: خاص رحمت۔ سالکوں: اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھنے والے۔ مزاجِ رُوبھی: لومڑیانہ مزاج۔ مزاجِ شیرِ نر: شیرانہ مزاج۔ شبِ دیجور: اندھیری رات۔ آہِ سحر: تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور فریاد کرنا۔ سرد آہوں: بغیر آنسوؤں کے رونا۔ آہِ گرم تر:...... اللہ تعالیٰ کی محبت میں درد وغم کے ساتھ رونا۔ دور اُفتادوں: دور پڑے ہوئے۔ نفسِ امارہ: نفس کی وہ حالت جس میں وہ گناہوں کا بہت زیادہ تقاضہ کرتا ہے۔ بے ضرر: جس سے نقصان نہ پہنچے۔ عطاءِ نسبتِ عالی: اللہ تعالیٰ کا خاص تعلق مل جانا۔ شاہِ بحر و بر: خشکی اور سمندر کا بادشاہ۔ ثریا: ستاروں کا جھرمٹ۔ فوق تر: بلند۔ ثنائے خلق: مخلوق کا تعریف کرنا۔ بہرہ ور:...... شاہِ کرّوفر:...... منوّر: روشن۔ دلِ گم کردۂ منزل: یعنی اللہ تعالیٰ کو کھویا ہوا دل۔ شمعِ رہ گذر: اللہ تعالیٰ کے راستے کی روشنی۔ ذرّۂ خاکی: مٹی کا ذرہ۔ رشکِ گُہر: جس پر موتی رشک کرے۔ یادگارِ بحر و بر: یعنی پوری دنیا اس سے فائدہ اٹھائے۔ اشکِ ندامت: ندامت کے آنسو۔ فلک: آسمان۔ کہکشاں: ستارے۔ خاک: مٹی۔ زیرِ نظر:...... سرِ محشر: قیامت کے دن۔ سر کردے: پار کردے۔

وقفِ سنگِ در ہونے کی حقیقت

ہمارے درد کو یارب تو دردِ معتبر کردے
ہمارے سر کو ہر لحظہ تو وقفِ سنگِ در کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ یوں تو دنیا میں جسے دیکھو وہ خدا سے محبت کا دعویدار ملے گا اور اپنے زعم اور گمان میں وہ اپنے کو خدا پر صحیح یقین و ایمان رکھنے والا شمار کررہا ہوگا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے دردِ محبت اور تقویٰ اور للّٰہیت کا کچھ معیار مقرر فرمایا ہے۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اُترے تب تو وہ بارگاہِ الٰہی میں معتبر ہے ورنہ تو رد ہے۔
اس کا معیار قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے ہر قدم پر اتباعِ سنت وشریعت پیشِ نظر ہو اور بال برابر

بھی طریقۂ نبوت سے خارج نہ ہو ورنہ نہ وہ ایمان ایمان ہے اور نہ وہ محبت محبت ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے:

ایک شخص اپنے ذہن میں تقویٰ کا اونچا معیار مقرر کرتے ہوئے اپنی حلال بیوی کا بھی حق ادا نہیں کرتا ہے اور اُسے حقوقِ زوجیت سے محروم کر کے بڑے جوش و خروش کے ساتھ خانقاہوں یا جماعتوں یا جہادی تنظیموں میں اپنی زندگی وقف کئے ہوئے ہے جبکہ کوئی نفیرِ عام (جس کی مختلف صورتیں ہیں) بھی نہ ہو اور بڑی تکلیفوں اور مشقتوں کو سہتا ہوا پھر رہا ہو یا مثال کے طور پر حاجی بڑے خشوع و خضوع اور گریہ و زاری اور آہ و بکا کے ساتھ یومِ عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں جانے کے بجائے بیت اللہ سے چمٹا ہوا ہو تو اس کا یہ دردِ محبت بارگاہِ الٰہی میں مقبول و معتبر نہیں۔ اسی لئے حضرت والا دامت برکاتہم یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے ایسا درد عطا فرما جو تیرے نزدیک معتبر ہو اور جس سے مجھے تیرا قرب اور رضا حاصل ہو۔ جس کا خلاصہ اور نچوڑ اگلے مصرعہ میں یوں مانگ رہے ہیں کہ میں ہر گھڑی تیرے حکم کے سامنے سرنگوں رہوں اور جس وقت جس حال میں جو حکم ہو میں اس کو بجالاؤں، یہی حقیقت ہے ہر لحہ سر کو وقفِ سنگِ در کرنے کی۔

آہوں کی کیمیا تاثیر

مری آہوں کو لطفِ خاص سے تو با اثر کردے
کرم سے میری جانِ بے خبر کو باخبر کردے

جب بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی محبت میں اور آخرت کے خوف سے آہیں بھرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُن آہوں کو بہت با اثر کر دیتے ہیں، اسی لئے ایک ایسے شخص کا وعظ کہ جس کی زبان آہوں سے اور اُس کی آنکھ آنسوؤں سے آشنا نہ ہو تو اس کے وعظ کے درمیان اور اس شخص کے وعظ کے درمیان جو منبر پر آہ و زاری سے بیان کرتا ہو۔ تاثیر اور نفع رسانی میں بہت ہی بیّن اور واضح فرق ہوتا ہے۔ اسی کو حضرتِ والا نے ایک شعر میں یوں فرمایا ہے ؎

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

بہت مرتبہ کا یہ تجربہ ہے کہ وہ اولیاء اللہ جو اپنے سینوں میں قلبِ منیب اور قلبِ سلیم کی دولت رکھتے ہیں۔ جب وہ زبان سے آہ و فغاں کرتے ہیں اور ان کی آنکھیں خوفِ خداوندی سے اشک بار ہوتی ہیں تو باوجود یہ کہ ان کا بیان اور تقریر نہ تو بہت فصیح و بلیغ اور نہ ہی اتنی مفصل و مدلل اور نہ ایسے علوم و معارف پر حاوی ہوتی ہے نہ ہی انداز ایسا فصیحانہ و بلیغانہ۔ مگر تاثیر ایسی ہوتی ہے کہ سامعین کو اپنے دلوں سے غیر اللہ کی محبت نکلتی اور اللہ کی محبت داخل ہوتی نظر آتی ہے اور گناہوں سے وحشت و نفرت اور طاعات سے اُنس و محبت پیدا ہونے لگتی ہے۔ دل اپنے کئے ہوئے پر پشیمانی و ندامت کے جذبات سے بھر آتا ہے۔

اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ بغیر آہ وزاری کے اور بغیر گریہ وتضرع اور خوف وخشیتِ خداوندی کے کوئی کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، مگر اس کے جان ودل لذتِ قربِ خداوندی سے نا آشنا ہوتے ہیں اور وہ خود عباد الرحمٰن کا فرد بننے سے محروم رہتا ہے۔

اس لئے حضرتِ والا نے دعا مانگی کہ خدایا! میری آہوں میں اپنے فضل وکرم سے تاثیر دے کر میری جانِ نا آشنا کو اپنی آشنائی ومعرفت کی دولت دے دے۔

سلوک طے کرنے کے لئے ہمتِ مردانہ چاہیے

اور اپنی راہ میں ہم سالکوں کو تیزتر کردے
مزاجِ روبہی کو تو مزاجِ شیرِ نر کردے

اس شعر کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! ہم پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں، ہمیں اپنی راہ اس طرح طے کرادے کہ ہم جلد واصل منزل ہوجائیں اور خواہشاتِ نفسانیہ کے مقابلے میں ہماری لومڑیانہ طبیعت اور بزدلانہ مزاج کو مزاجِ شیرِ نر کردے کہ جب بھی حرام آرزوؤں اور نفسانی خواہشات سے مقابلہ ہوتو ہم جرأتمندانہ اور دلیرانہ مقابلہ کر کے اُس پر غالب آجائیں اور خواہشاتِ نفسانیہ پر کنٹرول (Control) کرلیں تاکہ احکامِ الٰہیہ کی اتباع اور منہیاتِ الٰہیہ سے اجتناب آسان ہوجائے اور یہی حقیقی صورت ہے جس سے راہِ سلوک طے ہوتی ہے ورنہ جو بعض لوگ یوں سوال کرتے ہیں کہ فلاں گناہ چھوڑنے کے لئے کوئی وظیفہ بتادو تو اس پر حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے کہ اگر پھر وہ وظیفہ ہمت کر کے نہ پڑھا جائے تو اس کے لئے مزید ایک وظیفہ کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ چلتا رہے گا۔ بالآخر بات یہیں آکے ٹھہرے گی کہ بلا ہمت وجرأت کے استعمال کے اللہ والا بننا ممکن نہیں۔

اس لئے حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ پورے تصوف کا نچوڑ اور خلاصہ ہمت کو استعمال کر کے طاعات پر عمل اور معاصی سے اجتناب ہے۔

قلوبِ اولیاء رشکِ خورشید وقمر ہیں

ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کردے
شبِ دیجور کو تو رشکِ خورشید و قمر کردے

اللہ تعالیٰ کے لئے اُٹھائے ہوئے اس کے راستے کے رنج وغم ضرور رنگ لاتے ہیں۔ بظاہر غموں کا مارا ہوا، چاک گریباں معمولی پوشاک میں ملبوس دنیا کے رنگ ومحفل سے الگ تھلگ خدا کی محبت سے سرشار اور راہِ خدا کا دیوانہ گوکہ صورتاً اس کے یہاں خوشیاں اور رونقیں نظر نہیں آتی اور ظاہری رونقیں اور چمک دمک دکھائی نہیں دیتی۔

لیکن خداوند قدوس اپنے وعدوں کے مطابق ایسے اپنے تمام بندوں کے دل میں وہ کیف و سرور اور زندگی میں وہ چین و سکون عطا فرماتے ہیں اور ان کے فیوض و برکات سے دنیا کو ایسا منور اور روشن کرتے ہیں اور رات کے اندھیروں میں تڑپنے والے دل کو ایسا روشن اور چمک دار بناتے ہیں کہ اُن کی یہ شامِ غم رشکِ سحر بن جاتی ہے اور ان کے یہ راتوں کے اندھیرے رشکِ خورشید وقمر ہو جاتے ہیں کیونکہ خورشید وقمر سے دنیا کا ظاہر روشن ہوتا ہے لیکن ایسے حضرات سے اہلِ جہاں کے قلوب منور اور روشن ہوتے ہیں۔

آنسوؤں کے ساتھ خونِ جگر کا شامل کرنا

ہماری خشک آنکھوں کو خدایا چشمِ تر کردے
مرے اشکوں میں شامل خونِ دل خونِ جگر کردے

حضرت والاؒ کی یہ دعا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے ماخوذ اور مستنبط ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا مانگی اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ ھَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ اے اللہ! عطا فرمادے ایسی آنکھیں جو موسلا دھار بارش کی طرح آنسو بہانے والی ہوں جو میرے دل کو سیراب کردے خوف وخشیت کے آنسو بہا کر اور حضرت والا نے ساتھ ساتھ یہ بھی دعا فرمائی کہ اے خدا! میرے ان آنسوؤں کے ساتھ میری حسرتوں اور آرزوؤں کا خون بھی شامل کرلے کہ میں نے تیری ہی توفیق سے حرام کی ہوئی تمام خوشیوں سے بچ کر اور ناجائز تمناؤں اور آرزوؤں کو چھوڑ کر دل پر جو غم اُٹھائے ہیں اور ضبطِ غم کی تکلیفیں سہہ کر دل کا خون کیا ہے اور ہر نوع کے حرام تقاضوں پر تیرے حکم کو غالب رکھتے ہوئے ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں کی راہ سے گزرا ہوں۔

اے اللہ! میرے آنسوؤں میں میرا خونِ دل شامل ہو۔ یہی اشک معتبر ہے اور یہی آنسو اللہ کی رحمت کو کھینچنے والے ہیں۔ اگر صرف آنسو تو ہوں مگر گناہوں اور معصیتوں سے بچ کر آرزوؤں کا خون اُن میں شامل نہ ہو تو اس کو سوائے ایک کیفیت عارضہ مفیدہ کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص دعاؤں، مناجات وغیرہ میں خوب روتا دھوتا ہو لیکن نہ اسے شرعی پردہ کا اہتمام ہو نہ نامحرم عورتوں سے اختلاط میں کوئی کمی ہو اور نہ ٹی وی (T.V)، وی سی آر (V.C.R) اور حرام سودی مال کے استعمال سے اجتناب ہو تو پھر گو کہ وہ آنسو مفید تو ہیں مگر بارگاہِ الٰہی میں ان کا وہ مقام نہیں کہ جو مقام وحیثیت ان اشکِ ندامت کی ہے کہ جن میں خونِ دل خونِ جگر شامل ہو۔ یعنی تمام حرام کاموں سے کلی اجتناب ہو اور اس کا سبب یہ ہے کہ دراصل توبہ وندامت اللہ تعالیٰ کے یہاں جبھی معتبر ہوتی ہے جبکہ ندامت کے ساتھ گناہوں کا ترک بھی ہو۔

اس لئے حضرتِ والا کے شعر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ کے سامنے آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ تمام حرام

کاموں کو کلی طور پر ترک کر دیا جائے خواہ دل پر کتنا ہی گراں اور دشوار کیوں نہ ہو۔

آہِ سحر گاہی اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

ہماری غفلتوں کی نیند کو آہِ سحر کر دے
ہماری سرد آہوں کو تو آہِ گرم تر کر دے

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاء عظام اور جملہ سلفِ صالحین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے رات کے اخیری حصوں کو انابت اور تضرع الی اللہ کے لئے خاص رکھتے تھے۔ اپنی غفلت کی نیندوں کو اللہ کی یاد میں بیداری سے بدل دیتے تھے۔

اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دابُ الصَّالِحِیْن ہے صالحین اور نیک لوگوں کی عادت ہے۔ اسی کے تحت ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے ایک وعظ میں یہ نکتہ ارشاد فرمایا کہ رات کے اخیری حصہ میں اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہونے والے زبانِ نبوت سے صالحین کا مصداق قرار پاتے ہیں۔ یہ حضرات پوری اُمت کی اُس دعا میں شامل ہو جاتے ہیں جو نمازی اپنی ہر نماز میں قعدۂ اخیرہ میں پڑھتا ہے اور جس کو معراج کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا اور وہ دعا یہ ہے اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔

اسی پر ایک واقعہ یاد آیا جو مکتوباتِ مجدد الف ثانی میں نقل ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور اُن سے حال دریافت کیا تو ارشاد فرمایا:

﴿طَاحَتْ تِلْکَ الْاِشَارَاتُ وَغَابَتْ تِلْکَ الْعِبَارَاتُ وَفَنِیَتْ تِلْکَ الْعُلُوْمُ وَنَفِرَتْ تِلْکَ الرُّسُوْمُ وَمَا نَفَعَنَا اِلَّا رَکْعَاتٌ کُنَّا نَرْکَعُھَا فِی الْاَسْحَارِ﴾

سب تقریریں بیکار ہوگئیں اور سب نکات و لطائف جاتے رہے بس جو چند رکعتیں رات کے درمیانے حصے میں پڑھی تھیں وہی کام آ گئیں۔

اور واقعہ یہی ہے کہ آہِ سحر گاہی کے بغیر مقاماتِ ولایت طے نہیں کئے جا سکتے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

عطؔار ہو رومؔی ہو رازؔی ہو غزاؔلی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

استغفارِ سحری پر جنت کا وعدہ ہے

اور قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے سحر میں استغفار کرنے والے حضرات کو متقین کی فہرست میں شامل کیا ہے اور ان کے لئے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ اس لئے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اُمت کے تمام سلف صالحین کا عام معمول رہا ہے کہ وہ رات کے اس حصے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ و استغفار اور ذکر و مناجات میں گزارتے ہیں۔

احادیث میں اس وقت کی بہت فضیلتیں مذکور ہیں۔ خود قرآن پاک میں ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے جس میں جنتیوں کی صفات کا تذکرہ ہے:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

(سورۃ الذّٰریٰت، آیت: ۱۸-۱۷)

ترجمہ: وہ رات میں بہت کم سوتے تھے اور اوقاتِ صبح میں استغفار کرتے تھے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، ص: ۱۵۷)

''اسحار'' سحر کی جمع ہے۔ رات کے آخری چھٹے حصے کو سحر کہا جاتا ہے اور اس آخری حصۂ شب میں استغفار کرنے کی فضیلت اس آیت میں بھی ہے۔ دوسری آیت وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ میں بھی۔

صحاحِ حدیث کی سب کتابوں میں یہ حدیث مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کو آخری تہائی حصے میں آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں (جو ان کی شان کے مناسب ہے) اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں اور اعلان فرماتے ہیں ہے کوئی توبہ کرنے والا جس کی میں توبہ قبول کروں، ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اُس کی مغفرت کروں۔ (ابن کثیر)

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس استغفارِ سحری میں ان متقین کا بیان ہو رہا ہے جن کا حال اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بہت کم سوتے ہیں۔ ان حالات میں استغفار کرنے کا بظاہر کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ طلبِ مغفرت تو گناہ سے کی جاتی ہے جن لوگوں نے ساری رات عبادت میں گزار دی وہ آخر میں استغفار کس گناہ سے کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو چونکہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کو پہچانتے ہیں اور اپنی ساری عبادت کو اس کے شایانِ شان نہیں دیکھتے اس لئے اپنی اس تقصیر و کوتاہی سے استغفار کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، ج: ۸، ص: ۱۶۰)

یہی دعا حضرتِ والا نے اس شعر میں مانگی کہ اے اللہ! میری غفلت کی نیند کو آہِ سحر میں تبدیل کر دے اور میرے سینے میں اپنی محبت کی ایسی حرارت عطا کر دے کہ جو میری سرد آہوں کو گرم تر آہوں میں بدل دے۔ صاحبِ کیفیات زکی کیفی صاحب بن مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ خوب کہتے ہیں ؎

ستارۂ سحری دیکھ کر نہ جانے کیوں
ہماری آنکھ میں آنسو مچلنے لگتے ہیں

وساوس اور راہِ سلوک

اور ہم سے دُور اُفتادوں کو تو نزدیک تر کردے
ہمارے وسوسوں کو دردِ دل دردِ جگر کردے

اے اللہ! اپنے قرب ومعرفت کے وہ مقامات جو تو نے اپنے خاص مقربینِ بارگاہ کو عطا کئے ہیں ہم جیسے ابھی تک ان سے بہت دور ہیں اور اس دوری اور بُعد کا دل میں بڑا احساس ہے اور اب دل تیرے فراق میں بے تاب ہے۔ اے خدا! میرے دل میں گزرنے والے جذباتِ محبت کو اور خیالاتِ لذتِ الفت ومحبت کو دردِ دل اور دردِ جگر میں تبدیل کردے کیونکہ اب میری جدائی بہت شاق گزر رہی ہے اور تیرے بغیر میرا جینا مشکل ہو رہا ہے۔ انہیں احساسات اور جذبات کی بھرپور ترجمانی حضرتِ والا کے اس شعر (جو زندگی کا پہلا شعر ہے) سے بھی ہوتی ہے۔

دردِ فرقت سے میرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں اِک ماہئ بے آب ہے

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ طے کرتے وقت اور منازلِ سلوک سے گزرتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے اور محبتِ کاملہ راسخہ کے حصول اور نسبت خاصہ کے ملنے سے پہلے انواع واقسام کے وساوس وخیالات سے سالک گزرتا ہے۔ اب اگر وہ ان وساوس کے مقابلے میں ڈٹا اور جمارہے تو پھر اگلی منزل رسوخِ نسبتِ کاملہ اور حصولِ محبت تامّہ کی ہوتی ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کو حضرتِ والا دردِ دل دردِ جگر سے تعبیر کرتے ہیں اور بقول حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ جسے اللہ تعالیٰ اعلیٰ مقام دینا چاہتے ہیں اُسے ان راہوں سے گزارتے ہیں۔

جیسا کہ اشرف السوانح میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خود اپنے احوال دیکھنے اور مطالعے سے یہ معلوم ہوگا کہ حضرت خود ان مراحل سے گزرے ہیں۔

اولیاء معصوم تو نہیں محفوظ ہیں

کرم سے نفسِ امارہ کو میرے بے ضرر کردے
تقاضائے گنہ کو فضل سے زیر و زبر کردے

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں اَلنَّفْسُ هِيَ الْمَرْغُوْبَاتُ الطَّبْعِيَّةُ غَيْرُ الشَّرْعِيَّةِ یعنی نفس ''مرغوبات طبعیہ غیر شرعیہ'' کا نام ہے۔ نفسِ امارہ جو بہت زیادہ برائی کی طرف اُبھارنے والا اور حکم کرنے والا ہو۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ کا سایہ ہوتا ہے۔ وہ نفس کی شرارت و خباثت سے محفوظ رہتے ہیں۔

چنانچہ حضرت تھانوی نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ انبیائے کرام کے نفوسِ قدسیہ اس سے مستثنیٰ ہیں

اور وہ معصوم ہیں چونکہ اولیاء اللہ پر بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا خاص سایہ ہوتا ہے، اس لئے وہ نفس کے شرور سے محفوظ رہتے ہیں۔ احیاناً صدور ِخطاء پر ان کو فوراً توبہ کی توفیق نصیب ہوجاتی ہے۔ (کشکول معرفت، صفحہ:۵۵۱)

اس لئے اولیاء اللہ معصوم تو نہیں محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی مسئلے کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ یوں تحریر فرماتے ہیں کہ اولیاء کے محفوظ ہونے کی دلیل یہ حدیث قدسی ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے:

﴿فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرّقاق، باب التواضع، ج:۲، ص:۹۶۳)

اللہ تعالیٰ کے کان اور آنکھ بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ان جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔ **الالعارضٍ لایدوم** یعنی کسی عارض سے ہوجاتا ہے تو وہ پھر تائب ہوجاتے ہیں۔ اس سے مسئلہ محفوظیتِ اولیاء ثابت ہوگیا۔ (التکشف، ص:۳۷۱)

حضرت والا نے جو ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! میرا نفسِ امارہ بے ضرر ہوجائے تو اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری خاص حفاظت ہو اور میں اولیاء اللہ کے زمرہ میں شامل ہوجاؤں اور میری حالت یہ ہوجائے کہ تمام گناہوں کے تقاضے مغلوب ہو کر رہ جائیں اور جملہ اعضاءِ ظاہرہ و باطنہ سے اللہ تعالیٰ کے رضاء والے اعمال صادر ہورہے ہوں۔ یہی صورت نفسِ امارہ کے ضرر سے بچنے کی ہے۔ یاد رکھیں گناہوں کے تقاضے کو ختم کردینا مطلوب نہیں ہے بلکہ تقاضائے معصیت رہتے ہوئے معصیت نہ کرنا، کمالِ ایمان ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب انسان خوف کی وجہ سے باوجود تقاضے کے گناہ نہیں کرتا تو وہ ملائکہ سے درجے میں بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ملائکہ میں تقاضائے گناہ ہی نہیں۔

چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ خواصِ مؤمنین خواصِ ملائکہ سے اور عوام مؤمنین عام ملائکہ سے افضل ہیں۔

مقامِ بندگی کی رفعتیں

عطائے نسبتِ عالی سے شاہِ بحر و بر کردے
ثریا سے مرے ذرّے کو مالک فوق تر کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے میرے اللہ! تو میرے قلب کو ایسی نسبتِ عالیہ عطا کردے کہ کائنات کی قیمتی سے قیمتی چیز بھی اس کے برابر نہ ہوسکے اور برّ و بحر ارض و سماء غرض یہ کہ دونوں جہاں اس کے برابر نہیں ہوسکتے۔ یہ وہی دولت ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین اور جانشین علمائے عظام کو عطا ہوئی۔ حق تعالیٰ نے ان کو اپنے قربِ خاص کا وہ مقام عطا فرمایا اور اپنے ساتھ وہ نسبتِ عالی بخشی کہ جس کے نتیجے میں انسان کو خود بخود ساری

کائنات کی بادشاہت مل جاتی ہے۔ پھر اس ذرّۂ خاک کو اللہ تعالیٰ وہ مقام عروج عطا کرتے ہیں کہ اس کی پہنچ اور رسائی ثریا سے مافوق عرشِ ربّ کریم اور عظیم ملک الملوک کی بارگاہِ عالی تک ڈائریکٹ (Direct) ہوجاتی ہے۔ یہی مقام عروجِ انسانیت ہے جس کا مادی ترقی اور ظاہری عروج ورفعت سے کوئی تعلق وربط نہیں بلکہ اس کا مدار دل کی اس نسبتِ خاصہ پر ہے جو انسان کو زمین پر رہتے ہوئے آسمان کی بلندیوں سے آگے اور فرش پر رہتے ہوئے عرش کے سامنے کردیتی ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ مقامِ قرب وبندگی یعنی سجدے کے وقت اپنے کو عرشِ الٰہی کے سامنے پاتا ہے۔

صاحبو! اگر غور سے دیکھو تو یہ پتہ چلے گا کہ جسے اللہ اپنا بناتے ہیں اور علوم نبوت عطا فرما کر اپنی تجلیاتِ جذب سے اُسے اپنا خصوصی قرب عطا کرتے ہیں تو ان کو کائنات کی حقیقی بادشاہت مل جاتی ہے۔ انسان تو انسان جانور، چرند پرند حتیٰ کہ سمندر میں مچھلیاں ان کے لئے دعائیں کرتی ہیں۔ شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

مچھلیاں پانی میں ذرّے خاک میں برگ و شجر
نیک عالم کو دعا دیتے ہیں ہر شام و سحر

اندازہ لگائیے! نہ صرف انسان بلکہ دوسری مخلوقات تک ان کے لئے دعا گو ہیں، اس لئے اصل کمال انسانی اور ترقیِ مؤمن کا راز حق تعالیٰ کے ساتھ اس قوی تعلق پر ہے ؎

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اِک تو نہیں میرا تو کوئی شے نہیں میری

لوگوں میں نیک نامی نعمتِ خداوندی ہے

ثنائے خلق کی نعمت سے مجھ کو بہرہ ور کردے
ذلیل و خوار کو تو دم میں شاہِ کرّوفر کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے مخلوق میں نیک نامی عطا فرما اور خلق میں میری ذلت کو عزت سے بدل دے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَیْرِ وَیَحْمَدُہُ النَّاسُ عَلَیْہِ قَالَ تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب اذا اثنی علی الصالح فھی بشری، ج: ۲، ص: ۳۳۲)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ ایسے آدمی کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ذرا مجھ کو بتا دیجیے کہ ایک شخص عملِ خیر کرتا ہے اور اس پر لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا۔ ارشاد فرمایا یہ تو مؤمن کے لئے جلد یعنی دنیا میں بشارت ہے۔

تو معلوم ہوئی یہ بات کہ لوگوں میں نیک نامی اور مدح وثناء یہ بُری چیز نہیں بلکہ اس پہلو سے اچھی ہے کہ

لوگوں کی زبان و دل کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حسنِ ظن اور مدح وتعریف میں لگا دیا جس سے اُمید ہے کہ ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی آپ کا نام نیکوں اور اچھوں میں لکھا ہوگا۔

اس لئے قرآن کریم کی آیت لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ کا ایک معنیٰ یہی ہے کہ دنیا میں بشارت سے مراد ثناءِ حسن اور لوگوں میں نیک نامی ہے۔

اسی لئے حضرتِ والا یہ دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے لوگوں میں نیک نامی دے دے اور میری ذلت کو عزت سے بدل دے اور مجھے دلوں پر ایسی بادشاہت عطا کردے کہ پھر میں ترا نام بڑی عظمتوں کے ساتھ سناتا پھروں اور لوگ عزت وعظمت کے ساتھ ترا نام سننے کے لئے ارد گرد جمع ہوں۔

دو باتوں کا فرق

صاحبو! دو باتوں میں بہت فرق ہے۔ اپنی طاعات وعبادات کے ذریعے سے لوگوں میں اپنا نام ومقام اور جاہ وشہرت کا طالب ہونا اور لوگوں سے اپنی تعریفیں چاہنا اور بُرائی وعیب سامنے آنے پر منہ بنانا، یہ انتہائی مذموم اور بُرا ہے اور حبطِ عمل کا سبب ہے لیکن یہی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور چاہنا یہ عبادت ہے، بارگاہِ الٰہی میں مطلوب ہے۔

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں یہ دعا مانگی ہے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا کہ اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں چھوٹا بنا دے اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دے۔

اور دوسرے موقعہ پر یوں دعا کی ہے وَفِيْ نَفْسِيْ لَكَ فَذَلِّلْنِيْ وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِيْ کہ اے میرے ربّ! تو مجھے میری نگاہوں میں اپنے لئے ذلیل کردے اور لوگوں کی نگاہوں میں مجھے عظمت دے دے۔

تقویٰ بصیرتِ قلبی کا ضامن ہے

منور نورِ تقویٰ سے مری شام و سحر کردے
دلِ گم کردۂ منزل کو تو شمعِ رہ گذر کردے

ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! میری شام وسحر کو تقویٰ والے اعمال سے مزین کر کے مرے ظاہر و باطن کو منور اور روشن کردے کہ میرا ہر عضوِ بدن تیرے حکم کو بجالانے میں مصروف ہو۔ ایک لمحہ بھی کسی عضو سے کوئی معصیت صادر نہ ہو۔ اس طرح میں سراپا طاعت بن جاؤں اور میرا دل بھی ایسا منور اور روشن ہو کہ اس کے ظلمات اور اندھیرے چھٹ جائیں۔ وہ گم شدہ راہ سے راہِ حق کی طرف لوٹ جائے اور جہاں خود روشنی حاصل کرے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کے لئے بھی روشنی فراہم کر کے مشعلِ راہ ثابت ہو۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہر عضو کو منور و روشن کرنے کے لئے یوں دعا فرمائی ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَّفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّمِيْنِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّسَارِيْ

نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا انتبہ باللیل، ج: ۲، ص: ۹۳۵)

اس دعا کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! میرے جملہ اعضاءِ ظاہرہ و باطنہ کو اپنے خاص نور سے منور کردے یہاں تک کہ سراپا مجھے نور بنادے۔ اس نورِ تقویٰ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس کو راہِ نجات اور راہِ حق صاف اور واضح دکھائی دیتی ہے۔ اسی کو حضرتِ والا نے اپنے ایک شعر میں یوں ارشاد فرمایا۔

برکتِ تقویٰ سے جس کے ساتھ ہے فضلِ خدا
اُس کے پیچیدہ مسائل کوئی پیچیدہ نہیں

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں تقویٰ کے اور فضائل بیان فرمائے۔ ان میں ایک مبارک اہم فائدہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فہم میں ایک ایسی بصیرت اور نور عطا فرماتے ہیں کہ جس سے حق و باطل میں امتیاز کرنا سہل اور آسان ہوجاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا کہ اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا فہم اور بصیرت عطا فرمائیں گے کہ جس سے حق و باطل میں فرق کرسکو گے اور صحیح اور غلط کو سمجھ سکو گے۔ آج لوگوں نے اپنے اپنے ذہنوں میں اپنی منزلیں طے کررکھی ہیں اور ان کے دل و دماغ عیشِ آب وگل کے حصول میں گم کردۂ منزل ہیں اور اپنی حقیقی منزل دل و دماغ سے غائب کیے ہوئے ہیں جبکہ مؤمن کی حقیقی منزل ہر قدم پر رضائے مولیٰ ہے جس کو پالینے کے بعد وہ دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں۔

انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اپنی قوموں کو آکر ان کے دلوں کے رُخ کو دنیا کے جھمیلوں سے اور مٹی کے کھلونوں اور گورکھ دھندوں سے نکلواکر ان کا رُخ خالقِ کائنات کی طرف جوڑا اور یہی سب نبیوں کا مشترکہ مشن (Mission) اور کام رہا۔

توبہ اور یہ ذرّۂ خاکی

ہمارے ذرّۂ خاکی کو تو رشکِ گہر کردے
مری توبہ سے میرے شر کو تو رشکِ بشر کردے

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بشر کو حقیقی ایمان عطا فرماتے ہیں تو پھر یہ ذرۂ خاکی بارگاہِ الٰہی میں کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے چھٹکارے کے لئے اگر کفار ساری زمین اور اس میں بھرے ہوئے خزانوں کو کئی گنا کرکے بھی پیش کریں گے تو بھی ان کو چھٹکارا حاصل نہ ہوگا جبکہ ایک مؤمن اپنے ایمان کی وجہ سے جہنم سے چھٹکارا پاکر جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے گا۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ باری تعالیٰ کی نگاہ میں اس ایمان والے ذرۂ خاکی کی قیمت پوری کائنات اور اس کے خزانے بھی نہیں ہوسکتے لیکن یہ اُسی وقت ہے کہ جب اس ذرۂ خاکی میں ایمان صحیح اور معتبر موجود ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ مخلوق میں سب

سے بدتر اور جہنم کا ایندھن ہے۔ کائنات کی ہر شئے سے زیادہ اللہ کی نگاہ میں حقیر و ذلیل اور بے وقعت ہو جاتا ہے ہاں مگر اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں کتنا ہی بڑا کافر اور مشرک اور فاسق و فاجر جب تائبانہ اور نادمانہ حاضر ہو تو پھر اللہ تعالیٰ توبہ صادقہ کے طفیل ہر شر کو معاف فرما کر اس کو رشکِ بشر بنا دیتے ہیں۔ پھر بالفاظِ نبوت یہ خدا کا محبوب اور چہیتا ہو جاتا ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ کہ توبہ کرنے والا خدا کا محبوب ہوتا ہے۔ پھر وہ خدا کے اس اعلان کا بھی مستحق قرار پاتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ کہ بلاشک اللہ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔

حضرتِ والا کی ایک دعا اور آثارِ قبولیت

مرے ہر شعر میں شامل مری آہِ سحر کر دے
قیامت تک تو ان کو یادگارِ بحر و بر کر دے

حضرتِ والا اپنے اشعار کے لئے دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میرے اشعار محض شعر و شاعری بن کر نہ رہیں بلکہ ان میں ایسا درد پیدا کر دے اور ایسی تاثیر عطا کر دے جو دلوں کے اندر سے غفلتوں کو نکال کر تیری یاد دلانے والے ہوں اور جس کے ہر ہر شعر میں آہِ سحر گاہی کا رنگ شامل ہو۔ اس کو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے نافع بنا کر میرے لئے صدقۂ جاریہ بنا دے اور اے اللہ! کوئی صورت پیدا کر دے کہ بحر و بر کے تمام مقامات پر تیری محبت والفت کی داستانیں پیش کر رہے ہوں۔ ہر چہار سو اطرافِ عالم میں مرے اشعار میرے دردِ دل کی ترجمانی کر رہے ہوں اور اہلِ ایمان کے دِلوں کو حیاتِ ایمانی بخش رہے ہوں۔

اسی طرح کی دعا حضرتِ والا نے دوسرے مقام پر یوں فرمائی ہے ؎

جو بشر بھی سن لے میری آہ کو
بس تڑپ جائے وہ تیری چاہ کو

اپنے کلام کے متعلق خود حضرتِ والا کا ایک اور جگہ ارشاد ہے ؎

تم اصلاح کی اس میں کوشش نہ کرنا
یہ ہے داستاں دردِ دل کی ہماری
مری شاعری بس مرا دردِ دل ہے
لغت پا سکے گی اسے کیا تمہاری

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حضرتِ والا کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعا پوری پوری قبول ہوئی کہ دنیا بھر سے لوگ حضرت کی خدمت میں مسلسل حاضری دے کر اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھتے ہیں اور ہر چہار اطرافِ عالم میں ان اشعار اور

حضرت والا کی دوسری کتب سے جو انقلاب برپا ہو رہا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔

چنانچہ بے شمار ممالک میں مختلف زبانوں میں حضرتِ والا کی کتابوں کے تراجم مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک سعودی النسل عالم شیخ خالد مرغوب صاحب نے جو کہ حضرت سے مجازِ بیعت ہیں اور ماشاء اللہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الحدیث کے سینئر (Senior) استاد ہیں۔ انہوں نے حضرت کی کتابوں اور مواعظ سے متاثر ہو کر حضرت کے کچھ حالاتِ زندگی کو ایک کتاب میں جمع فرمایا اور مختصر سی سوانح مرتب کی جس کا نام ہے:

"عبقات العنبر و نسمات المسک الأذفر

فی التعریف بالشیخ محمد اختر

ومقتطّفات من مواعظ لهٗ حول حلاوة الایمان"

حضرت والا کے مختصر حالات پر تالیف کی ہے۔ عرب وعجم کے مختلف ملکوں میں حضرت کی کتابیں اور اشعار کی تشریحات کو پڑھ کر استفادے کے لئے کثیر مجالس منعقد ہو رہی ہیں۔

اور بحمد اللہ! آج کل حضرتِ والا کی مجالس انٹرنیٹ (Internet) کے ذریعے دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے مقامات پر روزانہ سنتے ہیں اور اس کی افادیت کے متعلق مختلف ملکوں سے بذریعہ فون (Phone) وخطوط اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ گویا اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیوی آلے اور ذریعے کو حضرتِ والا کی تعلیمات کے دور دراز تک پھیلنے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

کہکشاں کو اشکوں سے کیا نسبت؟

زمینِ سجدہ کو اشکِ ندامت سے تو تر کردے
فلک کی کہکشاں کو خاک پر زیرِ نظر کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے ایسے سجدے عطا فرما دے کہ میں تیرے سامنے زمین پر گر کر زمین کو ندامت کے آنسوؤں سے تر کردوں اور اس زمین پر اتنے آنسو گراؤں کہ جیسے آسمان ستاروں سے چمک رہا ہے۔ یہ زمین میرے آنسوؤں سے چمک اُٹھے اور میرا ستارۂ بندگی ویسا ہی زمین پر چمک جائے جیسے آسمان پر ستارے چمکتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ زمین پر گرنے والے ندامت کے آنسوؤں کو آسمان کے ستاروں سے تشبیہ دینا تقریب الی الفہم کے لئے ہے ورنہ ستاروں کو ان آنسوؤں کی قیمت سے کیا نسبت؟ اس لئے کہ ستارے چمکتے اور روشن ہوتے ہیں اور آسمان کی زینت بنتے ہیں۔ لیکن یہ ندامت کے آنسو جہنم کی شدید شعلہ زن آگ کو بجھا کر جنت میں ایسے محلات ملنے کا ذریعہ ہوتے ہیں کہ جن کی چمک دمک اور زیب وزینت اور آسائش وآرائش بے مثل

ہوگی۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ ان آنسوؤں کی چمک اور روشنی سے دونوں جہان کا خالق و مالک راضی اور خوش ہوجاتا ہے اور ان آنسوؤں کے عوض اللہ تعالیٰ کی محبوبیت نصیب ہوجاتی ہے۔

جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے کہ دو قطرے اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ (۱) ایک تو وہ قطرہ خون کا جو اللہ کے راستے میں بہتا ہے۔ (۲) اور دوسرا آنسوؤں کا قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلتا ہے۔ اسی کو حضرت نے ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا ؎

جو گرے ادھر زمیں پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اُٹھا فلک پر مری بندگی کا تارہ

اولیاء کا خوفِ روزِ جزاء

سرِ محشر بھی اختر پر کرم کی اک نظر کردے
اور اپنے فضل سے وہ آخری مشکل بھی سر کردے

حضرت والا کا مقطعہ ہے، اس میں دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! انسان کی منازلِ حیاتِ اخرویہ میں سب سے آخری منزل میدانِ محشر میں حساب و کتاب کے لئے پیش ہونا ہے۔ جس کی ہولناکیاں اور سنگینیاں آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ میں جابجا مذکور ہیں۔ یہ ایسا دن ہے کہ جس کے خوف سے اولیاء اللہ لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔

چنانچہ قرآنِ کریم کی یہ آیت وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ پڑھ کر ایک مرتبہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پوری رات روتے رہے اور یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جب اللہ اس دن مجرمین و مؤمنین کو الگ الگ کردیں گے تو میں نہیں جانتا کہ میرا شمار مجرمین میں ہوگا یا مؤمنین میں؟ اور حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ اسی دن کے خوف سے ایک رات پوری سجدے میں رو رو کر یہ شعر پڑھتے رہے ؎

اے خدا! ایں بندہ را رسوا مکُن
گر بدم من سرّ من پیدا مکُن

خود قرآن کریم میں جگہ جگہ اس دن کی سنگینی اور ہولناکی کو جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے اس دن کی احوال کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس دن بھائی بھائی سے، بیٹا اپنے ماں اور باپ سے، دوست دوست سے، باپ اپنے بیٹوں سے غرض یہ کہ ہر ایک تعلق والا دوسرے تعلق والے سے دور بھاگ رہا ہوگا۔ باپ بیٹے کے کام نہ آئے گا اور بیٹا باپ کے کام نہ آئے گا۔ بجز خدا کے نیک صالح بندوں کے اور اولیاء اللہ کے، ان کو یوں کہہ دیا جائے گا يَاعِبَادِ لَاخَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ کہ اے میرے بندو! آج نہ تمہیں ڈرنے کی ضرورت

ہے نہ غمگین ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اُمت کے تمام اولیاء اس دن سے بہت ڈرتے کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔ یہی دعا حضرت نے ایک دوسرے شعر میں یوں کی ہے ؎

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

دعا

ایسی صورت جو مجھے آپ سے غافل کردے
اے خدا! اس سے بہت دُور مرا دل کردے
اپنی رحمت سے تو طوفان کو ساحل کردے
ہر قدم پر تو مرے ساتھ میں منزل کردے
اے خدا! دل پہ مرے فضل وہ نازل کردے
جو مرے دردِ محبت کو بھی کامل کردے

حقیقتِ غفلت

ایسی صورت جو مجھے آپ سے غافل کردے
اے خدا! اس سے بہت دور مرا دل کردے

اس دعا کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! اس دنیائے فانی کے ظاہری نقش ونگار اور رنگ وبو میں پڑ کر دل کے غافل ہونے سے میری حفاظت کردے کیونکہ انسان کے لئے وہ گھڑی جو یادِ الٰہی سے خالی ہو، آخرت میں باعثِ حسرت وافسوس ہوگی۔ اسی لئے اولیاء اللہ دل سے ایک لحظہ بھی اللہ سے غافل نہیں رہتے اور ولایت وتقویٰ کا یہی آخری مقام ہے کہ جو چیز تمہیں اللہ کی یاد سے غافل کردے۔ اس سے احتراز واجتناب کیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس کا تعلق قلب سے ہے۔ اگر جسم دنیا کے عیش وآرام میں ہو، مگر دل غافل نہ ہو تو یہ حالت مضر نہیں، اسی لئے حضرتِ والا نے غفلت سے پناہ مانگ کر دل کو اُس سے محفوظ رکھنے کی دعا کی۔

مومن کے لیے ہر قدم پر منزل ہے

اپنی رحمت سے تو طوفان کو ساحل کردے
ہر قدم پر تو میرے ساتھ میں منزل کردے

حضرتِ والا دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! زندگی کے ہر موڑ پر خواہ کیسے ہی حالات ہوں، موافق ہوں یا

ناموافق، خوشی ہو یا غم، مشکل ہو یا کہ آساں، راحت ہو یا مصیبت غرض یہ کہ جملہ احوال میں مجھے اپنی رضا پر قائم رہنے کی توفیق دے کیونکہ یہی میرا ساحل اور یہی میری منزلِ مقصود ہے۔ خوشی اور مسرت کے حالات میں شکر کے راستے سے اور مصیبت و پریشانی کے حالات میں صبر کے راستے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف میں یہ مضمون اس طرح وارد ہوا ہے کہ حضورِ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَنْ صُهَيْبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزهد، ج: ۲، ص: ۴۱۳)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کی شان عجیب ہے۔ اس کے تمام کام اس کے لئے خیر ہیں اور یہ شان صرف مؤمن کے ساتھ مخصوص ہے کہ اگر اس کو خوشی حاصل ہو (یعنی فراخیٔ رزق، خوشحالی، چین اور توفیق طاعت وغیرہ نعمتیں) شکر کرتا ہے۔ پس یہ شکر اس کے لئے خیر ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچے (یعنی فقر، مرض اور رنج) صبر کرتا ہے۔ پس یہ صبر بھی اس کے لئے خیر ہے۔ (دنیا کی حقیقت صفحہ: ۱۷۹)

اس لئے حضرتِ والا نے جو ہر قدم پر منزل ملنے کی دعا کی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خوشی کے حالات میں اللہ کو بھولنے نہ پاؤں اور تکبر اور خلافِ شرع چیزوں سے بچا رہوں۔ ضرر اور غم کی حالت میں شکوہ اور شکایت نہ ہو۔

اخص الخاص ولایت

اے خدا! دل پہ مرے فضل وہ نازل کردے
جو مرے دردِ محبت کو بھی کامل کردے

اللہ تعالیٰ کی ولایت کے تین درجات ہیں ایک درجۂ ولایت جملہ مؤمنین کو حاصل ہے جو ''ولایت عامہ'' کہلاتی ہے۔ اسی کو قرآن پاک نے یوں ارشاد فرمایا وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ کہ اللہ مؤمنین کا ولی اور دوست ہے۔ اس میں سب اہلِ ایمان شامل ہیں۔ کفار مشرکین اور منافقین اس ولایت سے خارج ہیں۔ دوسری ولایت ولایتِ خاصہ ہے کہ جو مؤمنین تمام گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں اور تمام طاعات پر عمل کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی ولایتِ خاصہ میں شامل ہیں۔ اور تیسری ولایت ''اخص الخاص'' ہے، یہ وہ اہلِ ایمان ہیں جو خاص مقربین بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں اور جو ہر اُس چیز سے بچتے ہیں کہ جو ان کو یادِ الٰہی سے غافل کردینے والی ہو اور وہ کسی آن اور کسی لحظہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ اسی کو حضرت شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی نے یوں فرمایا ہے کہ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہو گیا

حضرتِ والا اس شعر میں اپنے لئے اسی درجہ کی دعا فرما رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ ولایتِ خاصہ اور قربِ کامل کا مقام کسی بھی انسان کو اپنے عمل سے نہیں مل سکتا۔ اس کا راستہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہی ہے۔

جیسا کہ قرآنِ کریم میں آیت موجود ہے وَاللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ جسے اللہ چاہتے ہیں اپنے فضل سے یہ مقام عطا فرماتے ہیں اور ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد و نصرت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دنیا کی مختلف فکروں اور غموں اور انواع و اقسام کے جھمیلوں سے دور رکھتے ہیں اور ان کو نفس و شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ فرماتے ہیں جس حفاظت کا تذکرہ قرآنِ کریم کی مختلف آیاتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ میں کیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ مگر اللہ کے مخلص بندے اغوائے شیطانی سے محفوظ رہیں گے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد اور حمایت و حفاظت اللہ کے متقی اور مخلص و نیک صالح بندوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

یا ربّ کرم سے اپنے تو دونوں جہان دے

یا رب کرم سے اپنے تو دونوں جہان دے
جو مستحق غضب کا ہے اس کو امان دے

اور اپنے فضل سے مجھے صدقِ لسان دے
اور اپنی محبت کی بھی اک خاص شان دے

یا رب مجھے زمان اور ایسا مکان دے
جس میں تری ہی یاد ہو ایسی ہر آن دے

کوئی ہمارے کان میں ایسی فغان دے
جس سے ہمارا ہر بنِ مو تجھ پہ جان دے

اور اپنی معرفت کی مجھے ایسی شان دے
ہر ذرّہ کائنات کا تیرا نشان دے

اپنا پتہ دے مجھ کو یوں اپنا نشان دے
جاؤں جہاں بھی دل مرا بس تجھ پہ جان دے

آہوں کو میرے درد کا وہ ترجمان دے
تیرا بیان ہر زماں جس سے زبان دے

ہمت کی میری خاک کو وہ آن بان دے
دل کو جو میرے شوکت ہفت آسمان دے

توفیق کا کرم سے وہ تیر و کمان دے
جو ہر عدو سے ہر زماں مجھ کو امان دے

مالک مری زباں کو وہ سحرِ بیان دے
جو میری بات سن لے وہ بھی تجھ پہ جان دے

اختؔر کو اپنے غم کی وہ مخمور جان دے
جو تیرے درد و غم کا ہمہ سُو بیان دے

مشکل الفاظ کے معنی: مستحقِ غضب: غصہ کے لائق۔ امان: سلامتی۔ صدقِ لسان: سچی زبان۔ ہر آن: ہر لحہ۔ فُغان: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آواز۔ ہر بنِ مو: بال بال۔ معرفت: پہچان۔ آن بان: شان وشوکت۔ شوکت ہفت آسمان: ساتوں آسمان کی شان۔ عدو: دشمن۔ سحرِ بیان: جادو کی تاثیر۔ مخمور جان: اللہ تعالیٰ کی محبت کے نشہ میں مست جان۔ ھمہ سُو: ہر طرف۔

دنیا کی عافیت مانگنا زہد کے خلاف نہیں

یا ربّ کرم سے اپنے تو دونوں جہان دے
جو مستحق غضب کا ہے اس کو امان دے

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوں کو دعا مانگنا بھی سکھایا اور دعا کے غلط طریقے پر تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا وَمَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ۝ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۰-۲۰۱)

ترجمہ: پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔

(معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۷۹)

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت یہاں فرما کر بجائے اس کے خیرِ دارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں۔ سو بعضے آدمی جو کہ کافر ہیں ایسے ہیں جو دعا میں یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں جو کچھ دینا ہو دنیا میں دے دیجیے۔ بس! سو ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل جائے گا اور ایسے شخص کو آخرت میں بوجہ انکارِ آخرت کے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ بعضے آدمی جو کہ مؤمن ہیں ایسے ہیں جو کہ دعا میں یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بہتری دیجیے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے۔ سو یہ لوگ اوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو دونوں جہان میں بڑا حصہ ملے گا۔ (معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۷۹)

آگے صفحہ: ۴۹۱ پر حضرت مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسمِ حج اور مقاماتِ مقدسہ میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراضِ دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے صرف کرتے ہیں۔ اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولتمند لوگ یہاں بھی جو وظائف و اوراد کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت، اغراضِ دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے۔ وہ بہت سے وظائف اور نوافل پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے۔ بہت سے حضرات زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے۔ دنیا کی

آفات دور ہوں گی۔ مال میں برکت ہوگی ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہے۔ معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ علیم وخبیر ہے۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے کہ وظائف، نوافل اور دعا و درود سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے؟ اس آیت کے آخری حصے میں کم نصیب محروم القسمت لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۰)

یعنی دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس میں لفظ حسنۃ تمام ظاہری و باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔ مثلاً دنیا کی حسنۃ میں بدن کی صحت، اہل وعیال کی صحت، رزقِ حلال میں وسعت و برکت، دنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ، علمِ نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستگی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادت میں اخلاصِ کامل سب داخل ہیں اور آخرت کی حسنۃ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں جہاں میں سکون و راحت میسر آتا ہے۔ آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعا مانگا کرتے تھے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اور حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مسنون ہے۔ اس آیت میں اُن جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا کرنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے۔ انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت و طاعت سب میں ضروریاتِ دنیوی کا محتاج ہے۔ وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعا مانگنے کو زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے۔ وہ مقامِ انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے۔ ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے۔ اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔ (معارف القرآن، ج:۱، ص:۴۹۲)

اگر ہم غور سے دیکھیں تو حضرتِ والا کی یہ دعا جس میں دونوں جہان کی بھلائی اور خیر مانگی گئی۔ قرآنِ کریم کی اسی دعا سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس سے دنیا و آخرت دونوں مانگی جائے، اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُمت کو یہ تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ سے دونوں جہان کی عافیت

اور خیر مانگے اور ارشاد فرمایا سَلُوا اللهَ الْعَافِيَةَ۔

حقیقتِ دنیا اور علی گڑھ کا ایک واقعہ

صاحبو! بعض حضرات فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً سے یہ دھوکہ کھاتے ہیں کہ دنیا بھی مانگی گئی اور آخرت بھی مانگی گئی، اس لئے جس درجے اور جتنی فیصد آخرت مطلوب ہے اتنے ہی درجے دنیا بھی مطلوب ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ احقر کے ساتھ پیش آیا کہ ایک مرتبہ علماء کی جماعت کے ساتھ چلّے میں علی گڑھ یونیورسٹی جانا ہوا تو وہاں کی ایک مسجد میں ایک شخص نے ہم تبلیغی ساتھیوں پر بھی اعتراض کیا کہ آپ لوگ ہر وقت تبلیغ تبلیغ کی بات کرتے ہو حالانکہ قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے دنیا آخرت دونوں کی مانگنے کی بات کہی ہے تو تم صرف کیوں آخرت ہی کی بات کرتے ہو؟ تو اس کا ایک الزامی جواب تو اس وقت ان کو دیا گیا کہ تبلیغ میں نکلنے کے لئے تو صرف مہینے میں تین دن کی بات کی جاتی ہے اور سال میں چلّے کی بات ہوتی ہے جبکہ یہ تو آدھا بھی نہیں چوتھائی بھی نہیں ہے۔ تو پھر یہ کہنا کہ ہر وقت آخرت آخرت کی بات کرتے ہو، درست نہیں۔

اور اس کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے مانگنے کی بات نہیں کی بلکہ دنیا میں حسنہ مانگنے کی بات کہی ہے۔ یعنی دنیا ظرف ہے اور حسنہ مظروف جیسے کوئی یوں کہے کہ مجھے ایک گلاس (Glass) میں دودھ دے دو تو اس کا معنی گلاس مانگنا نہیں بلکہ گلاس میں دودھ مانگنا ہے۔ سو اسی طرح یہاں دنیا کا سوال نہیں ہے بلکہ دنیا کے اندر حسنہ کا سوال ہے اور یہ دو الگ الگ شئے ہیں۔ دنیا تو کہتے ہی اللہ سے غافل ہونے کو ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

جبکہ دنیا میں حسنہ الگ شئے ہے جیسا کہ اوپر گزرا اور اس کا مانگنا ہی مطلوب ہے نہ کہ دنیا کا۔ پھر اگلے مصرعے میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! ایسے اعمال ہو جانے کے باوجود کہ جو تیرے غصے اور غضب کے داعی ہیں اور جن سے تیرا عذاب اُترتا ہے تُو اپنے فضل و کرم سے ہمیں امن دے دے اور اپنے غضب سے محفوظ فرما۔ کوئی کتنا ہی مستحقِ غضب ہو جب وہ اپنے جرم کا اقرار کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس کے عفو و کرم اور سلامتی و عافیت کی بھیک مانگتا ہے تو وہ اس کو ضرور عطا ہوتی ہے۔

سب سے بڑی صدق اللسانی

اور اپنے فضل سے مجھے صدقِ لسان دے
اور اپنی محبت کی بھی اک خاص شان دے

اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم بدنِ انسانی کے دو اہم اعضاء یعنی قلب ولسان کے متعلق دعا کررہے ہیں۔ دل کے متعلق تو یہ دعا کہ اے اللہ! مجھے اپنی محبت کی ایک خاص شان عطا فرما اور زبان کے متعلق یہ دعا کہ میری زبان کو سچائی کی صفت عطا فرما۔

قرآن وسنت کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دل کو انسانی بدن میں بادشاہت کا مقام حاصل ہے۔ اسی کے حکم کے مطابق باقی اعضاء سے اعمال وافعال صادر ہوتے ہیں۔ اور زبان بھی درحقیقت ترجمانِ حالِ دل ہوتی ہے، اس لئے جو کچھ انسان کے دل میں ہوتا ہے، اسی کی ترجمانی اُس کی زبان کرتی ہے تو جب دل اللہ تعالیٰ کی خاص محبت سے بھرپور ہوگا تو پھر زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت ورحمت کی باتیں اور عشق و محبت کی سچی داستانیں بیان ہوں گی کیونکہ دنیا میں سب سے بڑی سچائی ایمان واسلام اور اطاعت وانقیادِ باری تعالیٰ کی دعوت میں منحصر ہے۔ یہی راز ہے کہ علمِ وحی خلافِ حقیقت باتوں پر مشتمل نہیں ہوسکتا تو جو زبان ترجمانِ ایمان و اسلام ہوگی وہ سب سے زیادہ سچی اور صادق ہوگی اور وہ شخص صادق اللسان ہوگا۔ اگرچہ صدقِ لسانی اور بھی بہت سارے معاملات وواقعات کے سلسلے میں مطلوب ہے، لیکن خاص طور پر یہ بیان محبتِ الٰہی اور معرفت وقربِ خداوندی سب سے بڑی صداقت ہے کیونکہ دنیا کی محبتیں اور تعلقات حقیقت میں ایک دھوکہ ہے کہ بظاہر تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ دنیا ہماری وفادار دوست ہے، مگر یکدم ہمیں اپنے اندر سے نکال کر پھینک دیتی ہے، اس لئے کائنات کی سب سے بڑی سچائی باری تعالیٰ کا وجود اور رسالتِ رسول کی حقانیت ہے اور پھر اس کی دعوت میں زبان کا استعمال سب سے بڑی صدق اللسانی ہے۔

یا ربّ مجھے زمان اور ایسا مکان دے
جس میں تری ہی یاد ہو ایسی ہر آن دے

حضرتِ والا نے اس شعر میں بڑی ہی قیمتی دعا فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنی یاد کے لئے ایسے فرصت کے ایام عطا کردے اور دنیا کے جھمیلوں اور رنگ رلیوں سے محفوظ ایسی جگہ جس میں رہ کر میرے شب وروز تیری یادوں میں گزر رہے ہوں۔ جیسا کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا ہے ؎

تمنا ہے کہ اب ایسی جگہ کوئی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے رہتے یاد ان کی دلنشیں ہوتی

کیونکہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو دی ہوئی عمر کے متعلق باز پرس اور سوال کریں گے کہ کس چیز میں عمر گزاری اور جو گھڑی اللہ کی یاد سے غفلت میں گزری ہوگی، اس پر ان کو حد درجہ افسوس ہوگا۔ اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہے:

﴿عَنْ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ﴾

(صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب قول النبي لا عيش الا عيش الآخرة، ج: ۲، ص: ۹۴۹)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو نعمتیں ہیں جن کے معاملے میں بہت سے لوگ (ان کی قدر کماحقہٗ نہ کرنے کے سبب) خسارہ اور نقصان میں ہیں (۱) ایک صحت اور (۲) دوسری فراغ۔

پھر جب آدمی صحت اور تندرستی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کو خالی اوقات بھی میسر آتے ہیں تو اس وقت تو ان کو لہو ولعب اور بیکار کاموں میں گزار دیتا ہے لیکن جب وہ اوقات گزر چکے ہوتے ہیں تب وہ حسرت وافسوس کے ساتھ کفِ افسوس ملتا ہے، لیکن اس وقت افسوس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح کچھ لوگ لہو ولعب میں تو نہیں لیکن دنیا کے فانی اور بے سود مشاغل میں اس قدر منہمک اور مصروف ہوتے ہیں کہ انہیں اللہ کی یاد اور دینی مشاغل کے لئے وقت خالی نہیں ملتا، بلکہ جب بھی کوئی دینی کام سامنے آتا ہے اور اس کے لئے وقت درکار ہو تو ان کی طرف سے یہی جواب ہوتا ہے کہ ابھی میں بہت بزی (Busy) ہوں پھر بعد میں دیکھوں گا، مگر وہ ''بعد'' کبھی آتا نہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کا آخری وقتِ موعود آ پہنچتا ہے اور پھر وہ زبانِ حال سے یوں کہتے ہوئے ہوتے ہیں:

﴿لَوْلَا اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾

(سورۃ المنافقین، آیت: ۱۰)

اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے دیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، مگر اس وقت اس کی یہ تمنا اور حسرت اس کے لئے مفید نہ ہوگی، کیونکہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ موت کے آ جانے کے بعد کسی کو مہلت نہیں ملتی، یہ تمنائیں سب لغو اور فضول ہیں۔

(معارف القرآن، ج:۸، ص:۴۵۹)

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی ایک جامع نصیحت

اسی لیے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کو حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ حضرت کوئی ایسی جامع نصیحت ارشاد فرما دیں کہ جو میں اپنے احباب اور متعلقین کو خاص طور پر بتا سکوں جو کہ مختصر ہو مگر جامع ہو تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا ہے کہ زندگی کے ہر لمحہ کو آخری لمحہ اور ہر گھڑی کو آخری

گھڑی سمجھو کہ اگر ملک الموت آ جائے تو اس وقت حسرت وافسوس سے ہم یہ نہ کہتے ہوئے ہوں کہ لَوْلَا اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ کاش! اگر ذرا سا اور وقت مل جاتا اور مہلت عطا کردی جاتی تو میں بہت سے نیکی کے کام کرتا۔ اس وقت اس حسرت وافسوس سے کوئی نفع نہ ہوگا، اس لئے اس تصور کے ساتھ زندگی گزارے کہ ؎

شاید ہمیں نفس نفسِ آخری بود
شاید زندگی کا یہی سانس آخری ہو

صاحبو! یہ حسرت وافسوس کے جملے تو کفار ومشرکین بھی مرنے کے بعد بولیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات میں ان کی طرف سے نقل کیا ہے۔ ایک موقعہ پر ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظَالِمُوْنَ﴾

(سورۃ المؤمنون، آیت: ۱۰۷)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے (اور دوبارہ دنیا میں بھیج دیجئے) پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا) کریں تو ہم بے شک پورے قصوروار ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۶،ص:۳۳۳)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ﴾

(سورۃ السجدۃ، آیت: ۱۲)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو بھیج دے کہ ہم کریں بھلے کام، ہم کو یقین آ گیا۔
(معارف القرآن، ج:۷،ص:۶۳)

اور کہیں پر اس حسرت وافسوس کو اللہ تعالیٰ نے یوں تعبیر کیا:

﴿یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ﴾

(سورۃ الانبیاء، آیت: ۹۷)

ترجمہ: ہائے کمبختی ہماری! ہم بے خبر رہے اس سے نہیں، پر ہم تھے گنہگار۔ (معارف القرآن، ج:۶،ص:۲۲۶)

اور کسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ○﴾

(سورۃ الفرقان، آیت: ۲۸-۲۹)

ترجمہ: ہائے خرابی میری! کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست، اس نے تو بہکا دیا مجھ کو نصیحت سے مجھ تک پہنچ چکنے کے بعد، اور ہے شیطان آدمی کو وقت پر دغا دینے والا۔ (معارف القرآن،۶،ص:۴۶۸)

غرض یہ کہ اس وقت تو کافر اور مشرک بھی افسوس کریں گے، لیکن ان کی حسرت وافسوس اس وقت ان کو نفع نہ دے گی اور بالآخر عذاب کی شدت کو دیکھ کر یوں کہہ اُٹھے گا یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا اے کاش! کہ میں مٹی ہوتا۔

اس لئے زندگی کی ہر گھڑی آخرت کے اُن حالات کو سامنے رکھ کر گزارنی چاہیے تاکہ پھر اس حسرت و افسوس سے بچا جاسکے اور گویا حضرت کا یہ شعر اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ اس دعا میں یہی چیز مانگی گئی ہے کہ میں جس جگہ بھی رہوں اور جو بھی وقت ہو، فضاؤں میں ہوں تو، اور زمین پر ہوں تو، اور سمندر میں ہوں تو، اور شہروں میں ہوں تو، پہاڑوں اور جنگلوں میں ہوں تو، ہر جگہ اور ہر قدم تیری ہی یادوں میں مست رہوں، تیری یاد ہی میری رضا ہو۔

جی چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں
جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لئے ہوئے

چھوٹی سی اسلامی حکومت اور ہم

کوئی ہمارے کان میں ایسی فغان دے
جس سے ہمارا ہر بنِ مو تجھ پہ جان دے

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً اے ایمان والو! تم پورے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ پورا بدن سر سے پیر تک اور بدن کا ہر ہر عضو اللہ کے حکم کے تابع ہو اور اس کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، وہ اُسی مقصد کے لئے استعمال ہو رہا ہو۔ زبان صرف وہاں اُٹھے جہاں بولنے کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

جب غیبت اور گالی، لعنت اور ملامت، چغل خوری اور بیہودہ گوئی، فحش و بے حیائی کی گفتگو کے مواقع سامنے آئیں تو فوراً زبان کو بند کردے۔ دنیا کا کیسا ہی حسین، حسینہ سامنے آئے، مختلف میگزین (Magazines) اور رسالوں، وی سی آر (V.C.R) اور ٹیلی ویژن (Television)، انٹرنیٹ (Internet) اور موبائل فون (Mobile phone) پر عریاں اور ننگی تصاویر سامنے آئیں تو فوراً اپنی نگاہوں کو بند کرلے۔ غرض کہ جملہ اعضائے بدن پر حکمِ الٰہی نافذ ہو رہا ہو، زبان و کان، آنکھ و دل اور تمام حواسِ ظاہرہ و باطنہ باری تعالیٰ کی اطاعت میں لگے ہوں۔ یہی حقیقت ہے ہر بنِ مو کے اللہ پر جان دینے کی۔ اس پہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ احقر نے ایک مرتبہ اپنے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ سے خط میں سوال پوچھا کہ حضرت! میں عشقِ الٰہی چاہتا ہوں جس سے میں اللہ تعالیٰ کا کامل ولی بن جاؤں۔ اس پر حضرت والا نے جواب تحریر فرمایا تھا۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

یعنی اپنی آنکھ، کان اور ہونٹوں کو بند کرلو! اگر تم خدا کا نور نہ دیکھو تو تم ہمارے اوپر ہنسنا یعنی ہمارا مذاق بنانا، منشاء یہ ہے کہ ان سب اعضاء کو حرام اور گناہوں سے بند کردو۔

تو پھر قلب میں اللہ تعالیٰ کا نور ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارا یہ جسم ہم کو ایک چھوٹی سی حکومت کی شکل میں عطا کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں دیکھیں گے کہ ہم نے اس حکومت پر اللہ تعالیٰ کے احکام جاری و نافذ کئے ہیں یا نہیں؟ اور اس کو ایک اسلامی حکومت بنایا ہے کہ نہیں، سر سے پیر تک کے تمام اعضاء پر حکمِ الٰہی جاری وساری ہے یا نہیں؟ اور اس میں ان لوگوں کے لئے بڑا درسِ عبرت ہے کہ جو مختلف ملکوں میں رہ کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ اسلامی حکومت بنانے کے نعرے لگاتے ہیں اور اس کا شور مچاتے رہتے ہیں جبکہ خود ان کی زندگی کا ہر باب اور ان کا ہر قول وفعل اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہوتا، وہ اپنے اس چھوٹے سے بدن پر احکامِ اسلامی نافذ کر کے اس پر حکومت اسلامی قائم نہیں کر پاتے تو بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ کہ وہ خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ کہ جو حکومت ان کے قبضے میں ہے اور اس پر اسلام کے نفاذ سے ان کو کوئی روکنے والا نہیں تو جو غیر اختیاری ہے اس پر اسلامی حکومت کا دعویٰ مکر اور فریب ہے۔

اس گفتگو سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ جس شخص نے سر سے پیر تک اسلامی احکام اپنے اوپر نافذ نہ کئے ہوں تو اسے اللہ کی راہ میں اپنی جان دینے کی باتیں کرنا یا کسی اسلامی حکومت کے قیام اور بقاء کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینا یہ اچھی بات نہیں۔ ایسا ہرگز نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جس دن وہ اس اچھی نیت سے راہِ خدا میں نکلتا ہے تو اسی وقت اس کی برکت سے اس کی ماضی کی زندگی کی تمام ظلمت اور تاریکیاں روشنی سے بدل جاتی ہیں، کیونکہ اس غرض سے اللہ کی راہ میں قدم اُٹھا کے چلنا اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اب تائب ہو کر اپنا پورا جسم سر سے پیر تک اللہ تعالیٰ کو پیش کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے اس گفتگو سے دھوکہ کھا کر یہ نہ کہنا چاہیے کہ جب اس کا ایمان نہیں بنا اور اس کی اصلاح نہیں ہوئی تو اسکا جان دینے کے لئے نکلنا درست نہیں۔

فغانِ غیبی اور صدائے قلبی

حضرتِ والا کا یہ فرمان کہ ہمارے کان میں کوئی ایسی فغان دے یعنی دل میں کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو اور ایسی غیبی آواز کانوں کو سنائی دے کہ جس سے میں سب کچھ تجھ پر قربان کر دوں۔ خیر کے ایسے جذبات کا دل میں آنا اور دل پر کسی ایسی چوٹ کا لگنا کہ جو زندگی کی کایا پلٹ دے اس کے متعلق حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ فرشتے کی طرف سے دل میں ڈالا جاتا ہے:

﴿وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً فَاَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَاِيْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَكْذِيْبٌ بِالْحَقِّ وَاَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ فَاِيْعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ فَلْيَعْلَمْ اَنَّهُ مِنَ اللّٰهِ فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ الْاُخْرٰى فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ قَرَأَ (اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾

(المشكوة، باب في الوسوسه، ص:١٩)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کے دل میں کچھ تصرف کرتا ہے اور فرشتہ بھی کچھ تصرف کرتا اور شیطان کا تصرف شر پر وعدہ دلانا اور ابھارنا اور حق کی تکذیب کرانا ہے اور فرشتے کا تصرف خیر پر وعدہ دلانا اور ابھارنا اور حق کی تصدیق کرانا ہے پس جو اس کو پائے تو سمجھ لے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور جو دوسرے کو پائے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور پھر یہ آیت پڑھی: ''شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی اور بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے اور اس کے لیے اکساتا ہے۔''

تو دل میں یہ جذبات اور دواعی کہ میرا بال بال اللہ پر فدا ہو۔ درحقیقت یہی لَمَّۃُ مَلَکٍ ہے (فرشتے کا تصرف) اور اس کی قدر کرتے ہوئے فوراً اس پر عمل کرنا چاہیے۔ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ اس کو ایک بڑی پیاری مثال سے بیان کرتے تھے کہ اگر تمہارے در پر کوئی مہمان آئے اور تم اس کی اچھی مہمان نوازی کرو، اس کا خوب خیال رکھو تو پھر وہ بار بار آتا ہے۔ اس طرح یہ نیکی کا داعیہ دل میں آتے ہی اس پر عمل کرنا اس کی قدردانی کرنا ہے تو پھر یہ مہمان بھی بار بار آئے گا اور اگر التفات نہ کیا تو پھر وہ سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔

اور اپنی معرفت کی مجھے ایسی شان دے
ہر ذرّہ کائنات کا تیرا نشان دے

حضرتِ والا اس شعر میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے جو دعا مانگ رہے ہیں۔ یہ اُس چیز کی دعا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی ذی عقل وشعور اور سمجھدار لوگوں کی صفات میں ذکر کیا ہے کہ سمجھدار لوگ وہ ہوتے ہیں جو چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے غرض کہ ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں۔ زمین وآسمان کی تخلیق میں غور کر کے یوں پکار اُٹھتے ہیں کہ اے خدا! تو نے اس نظامِ عالم کو بیکار اور عبث پیدا نہیں کیا اور آپ کی ذات اس سے پاک ہے۔ وہ دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق میں تدبر اور غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور ذرہ ذرہ ان کو اللہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کا قول ہے ؎

وَ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

اور ہر چیز میں ان کی نشانی ہے جو اس بات پر رہنمائی کر رہی ہے کہ وہ خالقِ کائنات ایک ہے اور فارسی میں یہ شعر بھی اسی حقیقت کا ترجمان ہے ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ گوید

جو گھاس زمین سے اُگتی ہے اس کے اُگنے کی حالت بتا دیتی ہے کہ وہ بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ اللہ آپ اکیلے ہیں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

صاحبو! کائنات میں اس طرح غور وفکر کرنا اس کو ''ذکرِ فکری'' کہتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں یہ بھی بڑی عبادتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس شعر میں حضرتِ والا نے اسی ذکرِ فکری کو مانگا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان مؤمنانہ نظر سے غور کرے نہ کہ معاندانہ ومشرکانہ تو پھر ہر شئے اُسے خدا کا پتہ بتادیتی ہے۔ جیسا کہ عارفِ ہندی حضرت خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اسی کو اپنے اشعار میں یوں تعبیر کرتے ہیں ۔

جہاں میں ہر سو ہے اس کا جلوہ کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے
وہ ذرّہ ذرّہ میں جلوہ گر ہے مگر کوئی دیدہ ور نہیں ہے

وجودِ ربّ کائنات پر ایک الہامی دلیل

اسی لئے غور وتدبر کے نتیجے میں حق تعالیٰ کی طرف سے احقر کو عطا ہونے والا ایک مضمون پیشِ خدمت ہے۔ جسے بہت سے مواقع پر بیانات میں بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کے سوا کائنات میں بے شمار مخلوقات بستی ہیں۔ کیڑے، مکوڑے، پرندے درندے، چرندے، بری بحری مخلوق، پھر الگ الگ نوع کی مخلوقات جن کے پاس باقاعدہ مال ودولت جمع کرنے یا اپنی روزی کو کسی معین قابلِ اعتماد جگہ سے وقتِ مقرر پر لینے اور حاصل کرنے کا کوئی نظم وانتظام نہیں ہوتا بلکہ رات کے کھانے کے بعد صبح کے کھانے اور صبح کے کھانے کے بعد رات کے کھانے کے لئے ان کے پاس کوئی مخصوص ذخیرہ نہیں ہوتا اور نہ ان کے بینک بیلنس (Bank balance) نہ ذخیرہ اندوزی اور نہ ہی اور کوئی حتمی اور قطعی ان کی غذاء اور روزی کا نظام ہوتا ہے۔

تو دوستو! احقر عرض کرتا ہے کہ اگر اس کائنات کا کوئی خدا، کوئی خالق ومالک، کوئی ربّ اور پالنے والا نہ ہوتا اور اپنی ہر مخلوق کی حاجت کو جان کر اُسے پوری کرنے والا نہ ہوتا تو مجھے اور آپ کو راستوں اور سڑکوں پر، پہاڑوں اور جنگلوں میں کتنے ہی پرندے اور درندے اور کتنی ہی مخلوقات مردہ پڑی ہوئی ملا کرتیں کہ کھانا میسر نہ آنے کے سبب شدتِ بھوک سے ان کی موت واقع ہوجایا کرتی۔ مگر آپ بھی غور کریں اور احقر نے بھی بہت غور کیا لیکن پوری عمر گزر جانے کے باوجود کوئی ایک واقعہ بھی ایسا آج تک نظر نہیں آیا چہ جائیکہ روزانہ واقعاتِ کثیرہ سامنے آتے۔

تو کیا یہ بات اسی حقیقت کی ترجمان نہیں ہے کہ یہ سارا نظامِ عالم خود رواں دواں نہیں اور اپنے طور پر جاری وساری نہیں بلکہ اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ ایک ربِّ عظیم کی عظیم حکومت وبادشاہت کے ماتحت ہے اور وہی اس کے پورے نظام کو چلانے والا ہے اور اسی کے فیصلوں سے موت وحیات وبقاء فنا وجود وعدم، عزت ودولت، غناء وفقر، خوشی وغم، راحت ومصیبت، وابستہ اور جڑی ہوئی ہے۔ یہی وہ تدبر اور غور ہے کہ جس کے نتیجے میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ توحیدِ باری تعالیٰ کا نشان بن جاتا ہے۔ یہی وہ ذکرِ فکری ہے جس کی قرآن میں جگہ جگہ تعریف مذکور ہے۔

اس کے برعکس صورتحال کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ﴾

(سورۃ یوسف، آیت:۱۰۵)

ترجمہ: اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر گذر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے۔

(معارف القرآن، ج:۵، ص:۱۴۰)

خالق کا ذکر اور مخلوق میں فکر کیجئے!

میرے دوستو! کائنات میں غور کر کے اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور ہر ذرّہ کائنات پر عبرت کی نگاہ ڈالنا تو مطلوب و محمود ہے، لیکن خود خالق کے اندر غور کرنا جائز نہیں۔ اسی لئے قرآن میں ہے يَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آیا ہے یعنی مخلوقات میں غور کرنے کا حکم ہے، لیکن ذاتِ خالق میں غور کرنا منع ہے، خالق کا ذکر کرنا ہے اور مخلوق میں فکر کرنا ہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے تَفَكَّرُوْا فِیْ اٰلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوْا فِی اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو، اللہ میں غور و فکر نہ کرو! اور اس کی حکمت واضح ہے کہ اللہ کی ذات لامحدود ہے اور ہماری عقل محدود ہے۔ اسی لئے فلسفیوں کو آج تک راہِ حق نصیب نہ ہوسکی، کیونکہ انہوں نے عقل کی راہ سے خدا کو جاننا چاہا۔ اسی کو شاعر نے یوں کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

اور یہ خود خدا کے ایک خدا ہونے کی دلیل ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تری پہچان یہی ہے

ذاتِ خداوندی پر اعتماد ہر مسئلے کا حل ہے

آہ! اے انسان! اس مذکورہ بالا تقریر کی روشنی میں اے انسان! کیا تیرا یہ فریضہ نہیں کہ تو بھی اپنے ربّ پر بھرپور اعتماد اور بھروسہ کرنے والا ہو اور صبح و شام، رات و دن اور آج و کل کی جملہ حاجات اور ضروریات کے سلسلے میں اُسی اللہ کو کافی سمجھنے والا ہو کہ پھر نہ تو کسی حرام کی طرف میلان ہوگا اور نہ حق و باطل اور حلال و حرام، صحیح اور غلط، جائز و ناجائز سے بےفکری اور لاپرواہی ہوسکے گی نہ تو کسی کے حقوق ضائع کرنے والا ہوگا اور نہ ہی کسی کے مال و دولت پر ناجائز اور غاصبانہ قبضہ کر کے اُسے اپنی ملک قرار دینے والا ہوگا۔ پھر تیرا اعتماد بینک بیلنس (Bank balance) اور مال و دولت کے ذخیروں پر ہوگا اور نہ ہی تو کسبِ مال کو حرصِ مال میں تبدیل کرے گا، نہ ہی بخل و

اسراف کا وبال اپنے کندھے پر اُٹھانے والا ہوگا، نہ بینک (Bank) کے سودی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوگا، نہ ہی مشاغلِ کثیرہ کے ہجوم میں پھنس کر حقوقِ اہل وعیال اور اقربا واعزا خدمتِ والدین ومشائخ کی سعادتوں سے محروم رہے گا، نہ ٹینشن (Tension)، ڈیپریشن (Depression)، مایوسی، اُداسی، ذہنی تناؤ اور کھچاؤ اور تفرق، وتشتت کی تلخ اور کڑوی زندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بلکہ میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ پھر اُس کی زندگی زندگی ہوگی اور اس کا عیش عیش ہوگا۔ اس کی راحت راحت ہوگی اور اس کو وہ پُر کیف پُر بہار بالطف زندگی ملے گی کہ جس کے سکون اور اطمینان کے سامنے وہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہے گا۔ مگر اس گفتگو سے ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح کائنات کی دوسری مخلوقات کو اللہ تبارک وتعالیٰ بغیر کسب ومحنت رزق عطا کرتے ہے تو ہم بھی اسی طرح کمانے کے لئے جدوجہد کرنا چھوڑ دیں اور اللہ پر بھروسہ کرلیں۔

اوپر کی گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حدیثِ پاک میں ارشاد فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ویسا توکل کرنے لگو جیسا حق ہے تو تمہیں اس طرح رزق دیا جائے جس طرح پرندوں کو کہ وہ صبح سویرے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھونسلوں میں جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنے مناسب حال محنت کرتے ہیں کہ صبح کو چلتے ہیں۔

﴿عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْاَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا﴾

(سنن الترمذی، ابواب الزھد، ج: ۲، ص: ۶۰)

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص توکل کا مفہوم یہ سمجھے کہ بس زمین پر پڑا رہے اور تدابیر اور کسبِ معاش نہ کرے تو وہ جاہل ہے۔ اس لئے حدیثِ پاک سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تدبیر نہ کریں کیونکہ چڑیوں کا باہر نکلنا بھی تدبیر ہے اور ہر انسان کے لئے اس کے مناسب تدبیر ہوگی۔ البتہ بھروسہ تدبیر پر نہ کرے، تدبیر صرف بھیک کا پیالہ ہے اور دینے والے حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔''

اس لئے احقر کی گفتگو کا منشاء یہ نکلا کہ ہر خیر کے اور اچھے کام کے لئے اور کسبِ معاش وغیرہ کے لئے مناسب تدابیر اختیار کر کے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں چھوڑ دے اور نہ اختیارِ تدابیر میں بہت حرص اور مبالغہ سے کام لے اور نہ خلافِ تدبیر نتیجہ آنے سے رنج وغم میں مبتلا ہو۔ بس یہی توکل کی جان اور روح ہے۔

پھر مزید برآں یہ بھی ایک بات ہے جو احقر کو ایک خط کے جواب میں شیخ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمائی تھی کہ ''ان جانوروں وغیرہ کا رزق نظامِ تکوینی کے ساتھ وابستہ ہے اور ہم تشریع کے مکلّف ہیں۔ اس میں کمانے کا حکم بھی موجود ہے۔ اس لئے ہرگز ان کو سامنے رکھ ترکِ اسباب وتدابیر جائز نہیں۔

میری جان آپ پر نثار

اپنا پتہ دے مجھ کو یوں اپنا نشان دے
جاؤں جہاں بھی دل مرا بس تجھ پہ جان دے

حضرتِ والا اس شعر میں کمالِ معرفتِ خداوندی اور تقربِ بارگاہِ الٰہی کی دعا کر رہے ہیں کہ مجھے اتنا قربِ خصوصی عطا کر دیجیے کہ میں جس سمت میں بھی نکلوں بس تیرے ہی گیت گاؤں اور میرے قلب و جان تیرے اوپر فدا ہوں نہ شہروں کے پُر کیف بنگلے نہ گلشنوں کی پُر کیف فضائیں اور نہ قصور و محلات کی بارونق در و دیوار نہ سیر گاہوں اور تفریح گاہوں کی پُر کشش مناظر کوئی بھی میرے دل کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ نہ مال و دولت کی صورت میں طغیانی اور سرکشی میں مبتلا ہوں اور نہ فقر و فاقہ اور رنج و مرض میں تجھے بھولوں۔ میں جس حال میں بھی اور جہاں بھی ہوں بس تیرے ہی حکم پہ جان دوں۔

ماشاء اللہ! حضرتِ والا کو اللہ تعالیٰ نے یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جہاں بھی تشریف لے جاتے ہیں۔ ہر وقت تبلیغِ احکامِ خداوندی امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں اس طرح مشغول رہتے ہیں کہ خلوتیں ہوں یا جلوتیں بس بیانِ محبتِ الٰہی ہی شغل رہتا ہے اور عشقِ مجازی کی تباہ کاریاں اور بربادیاں اور اس کے مضراتِ دنیویہ اور دینیہ اپنے پُر کشش اور خاص انداز میں پیش فرماتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی کی کوئی رعایت نہیں فرماتے اور نہ ذرا بھی مداہنت سے کام لیتے ہیں بلکہ مختلف انداز اور طریقوں سے عشقِ مجازی کے نقصانات اور محبتِ خداوندی کے انعامات پیش فرماتے رہتے ہیں اور یہی حقیقت ہر جگہ اللہ پر جان دینے کی ہے۔ اسی کو دوسرے شعر میں حضرتِ والا نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

میں جہاں بھی رہوں جس فضاء میں رہوں
میرا تقویٰ ہمیشہ سلامت رہے

دردِ دل اور زبانِ ترجمانِ دردِ دل

آہوں کو میرے درد کا وہ ترجمان دے
تیرا بیان ہر زماں جس سے زبان دے

حضرتِ والا اس شعر میں یوں دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح آپ نے میرے قلب میں اپنی محبت کا درد و غم عطا کیا ہے۔ تو میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں کہ اے اللہ! مجھے اُس دردِ محبت کی ترجمانی کے لئے ایسی زبان عطا فرما دے کہ جس کے ذریعے میں ایسا بیان دوں کہ جو آہ و فغاں سے پُر ہو اور بااثر ہو اور میری زبان اس دردِ محبت اور آہ و فغاں کی ترجمانی کے لئے ہر وقت مصروفِ عمل رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کسی کے دل کو دنیا کی محبت سے پاک و صاف کرتے ہیں اور اُس میں اپنے علوم اور حکمتیں عطا فرماتے ہیں۔ پھر ان کے

بیان کے لئے زبان بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ جسمانی مرض کی صورتحال ایسی ہی ہے کہ جب کوئی انسان کسی درد و تکلیف میں مبتلا ہو اور پھر ڈاکٹر (Doctor) سے اس کو اپنا درد بتانا ہو تو اس کے لئے کسی تقریر و بیان کی پریکٹس (Practice) اور مشق نہیں کرنی پڑتی بلکہ وہ خود ہی اس کی پوری پوری اور صاف ترجمانی کر دیتا ہے۔ تو اسی طرح اللہ کی محبت کے درد و غم کا بھی حال ہے۔

چنانچہ اسی مضمون کو ایک روایت میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَازَھِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلاَّ اَنْبَتَ اللہُ الْحِکْمَۃَ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَنْطَقَ بِھَا لِسَانَہٗ وَبَصَّرَہٗ عَیْبَ الدُّنْیَا وَدَائَھَا وَدَوَائَھَا وَاَخْرَجَہٗ مِنْھَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب الرقاق، ص: ۴۴۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بندہ نے دنیا میں زہد اختیار کیا (یعنی دنیا سے بے رغبتی کی) اللہ تعالیٰ نے اس کی دل میں حکمت پیدا کی اور حکمت کے ساتھ اس کی زبان کو گویا کیا اور دنیا کے عیوب اور اس کی بیماریاں اور اُن بیماریوں کا علاج اس کو دکھایا اور نکالا اُس کو حق تعالیٰ نے دنیا سے سالم دار السلام کی طرف۔ (دنیا کی حقیقت، صفحہ: ۷۰)

اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ جب بندہ کا دل غیر اللہ کی محبت سے صاف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کے قلب میں اپنے علوم اور حکم عطا فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زبانِ ترجمانِ درد دِل بھی عطا ہوتی ہے جس سے وہ ان علوم اور حکم کو ظاہر کرتا ہے۔ اُس درد و محبت کو بیان کرتا ہے جبکہ یہ ڈائریکٹ (Direct) اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے تو پھر اس کی تاثیر عام خطیبوں کی خطابت اور مقررین کی تقریر اور واعظین کے وعظ و بیان سے کچھ الگ ہی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کچھ ایسی جادو بیانی عطا کرتے ہیں کہ جو دوسروں کے دلوں کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔

ہر عضو کو اس کے صحیح مقصد میں لگانا ہی اس کا شکریہ ہے

جب کسی بندے کو اللہ تعالیٰ نے زبان عطا فرما کر قوتِ گویائی نصیب کی ہو تو اُس کا صحیح شکریہ یہی ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اُس کی عظمت و محبت کے بیان میں خرچ کرے جو کہ زبان کے ملنے کا حقیقی مقصد ہے اور جب انسان اپنے اعضاء کو حقیقی مقصد میں صرف کرتا ہے تو وہ اس عضو کا حق ادا کر رہا ہے۔ ورنہ ان کے غلط استعمال کی صورت میں قیامت کے دن اس سے مواخذہ ہوگا۔ اسی لئے قرآنِ پاک میں مختلف آیتوں میں مضمون موجود ہے کہ انسان کے اعضائے بدن جب خدا کی نافرمانی میں استعمال ہوئے ہوں تو وہ قیامت کے دن اُس عاصی کے خلاف گواہی دیں گے اور ان کو اللہ اپنے قدرتِ خصوصی سے گویائی عطا فرما دیں گے۔ اس طرح اُن پر حجت قائم کریں گے، اس لئے حضرت والا اللہ تعالیٰ سے ان اعضاء کے صحیح استعمال کی دعاء کر رہے ہیں۔

دعائے ہمت اور عطائے ہمت

ہمت کی میری خاک کو وہ آن بان دے
دل کو جو میرے شوکتِ ہفت آسمان دے

حضرتِ والا یوں دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں ایک خاکدان ہوں تو مجھے اپنے دین پر چلنے کے لئے ایسی ہمت عطا فرمادے کہ جس کے نتیجے میں مجھے ساتوں آسمانوں کی بادشاہت عطا ہوجائے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر اتنی مضبوطی اور ہمت سے عمل کرنے والا ہوں کہ جس سے تیرے نزدیک محبوب بن جاؤں اور پھر ساتوں آسمانوں کے فرشتے اور اہلِ زمین مجھ سے محبت اور الفت کرنے لگیں۔ جیسا کہ یہ مضمون ایک روایت کے اندر بھی مذکور ہے۔

صاحبو! ہمت اور قوت کا استعمال اس راہِ سلوک میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ جیسا کہ حضرت قاری امیر حسن صاحب دامت برکاتہم خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں مجلس میں ایک حاضری کے موقعہ پر یوں ارشاد فرمایا اَلْاِنْسَانُ یَطِیْرُ بِھِمَّتِہٖ کَالطَّیْرِ یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ کہ انسان اپنی ہمت سے اس طرح اُڑتا ہے جس طرح کہ پرندہ اپنے بازوؤں سے اُڑتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سالک کو اس راہ میں ترقی کے لئے قویّ الہمت ہونا ضروری ہے۔ سست بن کر کچھ نہ کرنا اور محض بزرگوں سے بیعت ہوجانے اور تعلق کرلینے کو کافی سمجھنا بے حقیقت اور بے بنیاد سوچ ہے۔

جیسا کہ حضرتِ والا کے وعظ میں خود یہ مضمون ہے کہ اگر پچاس سال بھی کوئی خانقاہ میں رہے اور اپنے شیخ کی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہو تو اُسے کوئی ترقی نہ ہوگی بلکہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ عطائے ہمت بھی توفیقِ باری تعالیٰ ہی سے ہوتی ہے، اس لئے حضرتِ والا نے ہمت کی دعا فرمائی ہے۔

توفیقِ الٰہی بڑی شے ہے

توفیق کا کرم سے وہ تیر و کمان دے
جو ہر عدو سے ہر زماں مجھ کو امان دے

اس شعر میں حضرتِ والا نے بہت اہم دعا فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے میں ہر قسم کے دُشمنوں سے محفوظ رہ سکتا ہوں اور مجھے امن مل سکتا ہے۔ نفس و شیطان جو ہمیشہ کے دُشمن ہیں اور مرتے دم تک ہر وقت ساتھ ہیں، ان کی دُشمنی کی سازشوں اور پلاننگ (Planning) کو فیل (Fail) کرکے ان سے حفاظت دے دینا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ممکن ہے، اسی کے ضمن میں بہت اہم بات سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ جو لوگ نفس دُشمن کے تقاضوں پر عمل کرتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہیں وہ دراصل توفیقِ الٰہی سے محرومی کا نتیجہ

ہے۔ اس لئے جب ہم ان پر نظر ڈالیں تو ذرہ برابر بھی تحقیر دل میں نہیں لانی چاہیے۔ یا ان کو بے وقوف، گدھا، احمق، پاگل، خبیث نہ کہنا چاہیے بلکہ مثل دنیوی بیمار کے ان کو بیمار سمجھ کر ان پر رحم کھانا چاہیے۔ اسی مضمون کو مولانا رومی نے یوں ارشاد فرمایا۔

ہیچ کافر را بخواری سنگرید
کہ مسلماں بودنش باشد اُمید

کسی کافر کی بھی تحقیر جائز نہیں کہ ابھی موت سے پہلے پہلے اس کے مسلمان ہونے کی اُمید ہے۔ اسی لئے کتنے ہی بڑی بڑی عقل وفہم والے اور دنیوی امور میں نہایت ہشیار اور عقل منداور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں نئی نئی ایجادات کے موجد مگر ایمان سے خالی اور عاری اور مزید برآں یہ کہ اپنے ہی ہاتھوں سے بتوں کو تراش کر پوجنے والے اپنی عقل کو صحیح رُخ پر استعمال کر کے اتنا نہیں سمجھ پاتے کہ بھلا جو خود عاجز محتاج کہ ایک مکھی بیٹھے تو نہ اُڑا سکے تو اس کے پوجنے اور عبادت سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔

تاثیرِ بیان عظیم نعمت ہے

مالک میری زباں کو وہ سحرِ بیان دے
جو میری بات سن لے وہ بھی تجھ پہ جان دے

اس شعر میں کی گئی دعا کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! جس طرح زبانِ ترجمانِ دردِ دل کا عطا کرنا تیرا کام ہے، ٹھیک اسی طرح اس ترجمانی کی تاثیر بھی تیری ہی جانب سے آتی ہے۔ اس لئے مجھے اپنے اوپر کوئی اعتماد نہیں اور مجھے اپنے بیان اپنی مدح وتعریف یا اپنی بڑائی اور بزرگی یا اور کسی نوع کے مالی یا جاہی فوائد مقصود نہ ہو بلکہ خلق کو خالق سے جوڑنا اور عباد کا رخ ربّ العباد کی طرف پھیرنا مقصود ہے کہ اُس وعظ و بیان کو سن کر ہر شخص تیرے احکام کو ماننے والا تیری نافرمانیوں سے بچنے والا اور تجھ پر اپنی جان قربان کرنے والا ہو۔

گویا اس شعر میں حضرتِ والا نے اپنی زندگی بھر کے بیانات کے لئے تاثیر اور پھر ان میں اخلاص کی دعا کی ہے کیونکہ جو علم اور وعظ و بیان لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے یا اپنا مقام لوگوں میں پیدا کرنے کے لئے ہو یا اپنی عظمت و بڑائی اور علمی صلاحیت و قابلیت کو لوگوں سے منوانے کے لئے ہو تو پھر یہ جنت کے بجائے دوزخ اور رضائے مولیٰ کی بجائے ناراضگیٔ خداوندی کا سبب ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! یہ تاثیر جبھی پیدا ہوتی ہے اور لوگ وعظ و بیان سن کر اللہ تعالیٰ کے ہر ہر حکم پر عمل پیرا اسی وقت ہو سکتے ہیں کہ جب واعظ خود بھی گناہوں سے بچنے میں جان کی بازی لگا دیتا ہو۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کی خصوصیات میں سے یہ ہے جس بات کی آپ دعوت دیتے ہیں اُس پر اس سے زیادہ خود عامل ہوتے ہیں۔

اسی لئے حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا بیان سن کر تم یوسف کے ہوئے تو یہ مفید نہیں بیکار رہا اور اگر اللہ کے ہوئے تو یہ مفید ہے اور یہی بیان کا حاصل ہے۔

شرابِ خداوندی اور اس کا نشہ

اخترؔ کو اپنے غم کی وہ مخمور جان دے
جو تیرے درد و غم کا ہمہ سُو بیان دے

اس مناجات کا یہ آخری شعر ہے جس میں حضرتِ والا یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اپنی شرابِ محبت اتنی پلا کہ میرا قلب وجگر اور خون کا قطرہ قطرہ اُس محبت کی شراب سے ایسے نشے میں ہو اور میں اُس کے اثر سے ایسا تر ادیوانہ بن جاؤں کہ بس میری زبان پر ہر چہار سو تیری ہی محبت کا نعرہ ہو۔

میں جدھر بھی جاؤں تو میرا محورِ گفتگو محض تیرے درد وغم کے اندر دائر رہے جس طرح جب کوئی کسی کا دیوانہ ہوتا ہے تو وہ ہر گھڑی اُسی کے گیت گاتا ہے۔ ہر وقت عنوان بہ عنوان مختلف پہلوؤں اور مختلف طریقوں سے اپنے محبوب کا تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔ اسی کو عارف ہندی حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یوں فرمایا ؎

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل دیکھ لیتے ہیں

تو اسی طرح جب انسان اللہ کی محبت کے نشے میں مست ہوتا ہے تو پھر وہ بھی جدھر کا رُخ کرتا ہے اور جہاں ہوتا ہے تو کسی نہ کسی عنوان سے اپنی اللہ کی محبت پیش کرتا رہتا ہے۔ یہ مخمور جان جبھی انسان کو ملتی ہے جبکہ وہ اس شرابِ محبت کو بھرپور اور وافر مقدار میں پیئے۔ گویا سر سے پیر تک مجسم عبدیت بنا ہوا ہو اور سارا غیر دل سے نکال کر بس اس کا ہُو رہے اور یہی تقویٰ و ولایت کا آخری درجہ ہے کہ جس میں انسان کو مقامِ حضوری رہتا ہے۔

پورے عالم میں حضرت والا کی کتابوں کے پھیلنے اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم کے شائع ہونے اور اطرافِ عالم سے جوق در جوق لوگوں کے حضرت والا سے اصلاح و استفادے کے تعلق سے بالخصوص علماءِ اہلِ حق کے رجوعِ عام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا کی یہ تمنا اور اس شعر میں مذکور دعا قبول فرمالی ہے۔ اسی دعا سے ملتی جلتی حضرتِ والا کی یہ تمنا بھی ہے جس کو دوسرے شعر میں یوں پیش کیا گیا ہے ؎

سارے عالم میں پھر پھر کے یاربّ
تیرا دردِ محبت سنائیں
تیرا دردِ محبت سنا کر
سارے عالم کو مجنوں بنائیں

سارے عالم کو مجنوں بنا کر
میرے مولیٰ ترے گیت گائیں

توحید وسنت......کمالِ بندگی

آپ کے نام پر جان دے کر زندگی زندگی پاگئی ہے
چل کے نقشِ قدم پر نبی کے بندگی بندگی پاگئی ہے

ارشاد فرماتے ہیں کہ پورے دینِ اسلام کا خلاصہ اور نچوڑ دو باتوں میں منحصر ہے۔ اگر اُن میں سے کسی ایک میں بھی خلل ہو تو پھر اُس کا ایمان ایمان نہیں، اس کی بندگی بندگی نہیں۔ یعنی بارگاہِ الٰہی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ماننا اور اللہ کی ذات پر ایمان لانا، اُسی صورت میں معتبر ہے جبکہ اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بھی صحیح ایمان ہو۔ اس لئے اسلام کی سواری دو پہیوں پر چلتی ہے۔ (۱) توحیدِ خداوندی اور (۲) رسالتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ماننا انہی طریقوں کے ساتھ اور اسی طرزِ زندگی کے ساتھ معتبر ہے جو نبی کی زندگی سے بطورِ نمونہ ہم کو ملیں ہیں اور اللہ پر یقین ویسا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو ملا۔

اسی لیے قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہ جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں یوں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾
(سورۃ آل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو۔ (معارف القرآن، ج:۲،ص:۵۳)

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی شخص کا یہ کہنا کہ میں خدا سے بہت محبت کرتا ہوں اور مجھے اللہ کا بہت خوف ہے اور میں اللہ پر بہت پختہ ایمان رکھتا ہوں اور میں خدا تعالیٰ کو ہر وقت یاد کرتا ہوں جبکہ اس کی زندگی کے تمام طور طریقے اور رہن سہن، معاشرت، معاملات، اخلاق و عادات، اتباعِ سنت سے عاری اور مغربیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو تو اُس کا یہ دعویٰ فضول اور عنداللہ غیر معتبر ہے۔ اس لئے کمالِ بندگی توحید وسنت دونوں کا جامع ہونا ہے۔ اگر ان میں کسی ایک چیز میں بھی خلل ہو تو نجات کے لئے کافی نہیں۔ جہاں توحیدِ خداوندی پر ایمان لازم اور ضروری ہے وہیں رسالتِ رسول پر بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اسی لئے دنیا میں اللہ کے وجود کے منکرین لوگ بہت ہی کم تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اکثریت خدا کے ماننے والوں کی ہے لیکن چونکہ وہ رسول کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے اس لئے وہ کافر قرار دیئے گئے ہیں۔

اسی کو حضرتِ والا اپنے خاص انداز میں یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں آپ کے نام پر اپنی زندگی کو قربان کر کے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چل کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی واقعی زندگی ہے اور

میری عبدیت و بندگی واقعی معنی میں عبدیت و بندگی ہے۔ اسی کو ایک دوسرے مقام پر حضرتِ والا نے بڑے پیارے انداز سے یوں ذکر فرمایا۔

نقشِ قدم نبی ﷺ کے ہیں جنت کے راستے

اللہ جل جلالہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

اور اسی کو فارسی کے ایک شاعر یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے کے خلاف جس نے کوئی راہ اختیار کی وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا، اس لئے قرآنِ پاک میں ایک دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۶)

ترجمہ: اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا (گو وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو وجوبا) حکم دے دیں کہ (پھر) ان (مومنین) کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار (باقی) رہے اور جو شخص (بعد حکم وجوبی کے) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۱۴۹)

اس لئے ہر مؤمن کو زندگی کے تمام شعبوں میں اعتقادیات ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا معاشرت و اخلاق ہوں، ہر لائن میں اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع لازم اور ضروری ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت میں کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا۔ اس امر کی وضاحت کر دی گئی کہ اب کوئی طریقہ اور راستہ دینِ اسلام کے خلاف معتبر نہیں۔

جیسا کہ حدیث شریف میں یہ مضمون ان الفاظ میں وارد ہوا ہے۔

﴿مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فهو ردّ، ج:۱، ص:۳۷۱)

کہ جو ہمارے اس دین کے معاملے میں کوئی بھی ایسی نئی بات پیدا کرے جو کہ اس دین میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے، اس لئے کہ اگر کوئی اور طریقہ بارگاہِ الٰہی میں پسند ہوتا تو ضرور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا کیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء والرسل ہیں اور احبُّ الخلائق ہیں۔ ظاہر ہے جو دستورِ حیات اور نظامِ زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے، وہ بھی افضل الطرق ہونا چاہیے۔ یعنی زندگی گزارنے کے

تمام طریقوں میں سب سے افضل اور محبوب طریقہ۔

اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے سے ذرا بھی ہٹ جانا اسلام میں بدعت اور گمراہی قرار دیا گیا ہے جو کہ انسان کو جہنم تک کھینچ کے لے جانے والا ہے۔

یہ صبح مدینہ یہ شام مدینہ

یہ صبح مدینہ یہ شام مدینہ مبارک تجھے یہ قیام مدینہ
بھلا جانے کیا جام و مینائے عالم ترا کیف اے خوش خرام مدینہ
مدینہ کی گلیوں میں ہر اک قدم پر ہو مدِ نظر احترام مدینہ
مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ بڑا لطف دیتا ہے نام مدینہ
نگاہوں میں سلطانیت ہیچ ہوگی جو پائے گا دل میں پیام مدینہ
سکون جہاں تم کہاں ڈھونڈتے ہو سکون جہاں ہے نظام مدینہ
ہو آزاد اختؔر غم دوجہاں سے جو ہو جائے دل سے غلام مدینہ

مشکل الفاظ کے معنی:۔جام و مینائے عالم: دنیاوی شراب کے مٹکے۔کیف: مزا۔ خوش خرام:......۔ہیچ ہو گی: گر جائے گی۔ پیامِ مدینہ: مدینہ کا پیغام، مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اتباع کے ساتھ۔غمِ دو جہاں: دنیاوآخرت کا غم۔

قیام مدینہ ایک نعمت عظمیٰ

یہ صبح مدینہ یہ شامِ مدینہ
مبارک تجھے یہ قیامِ مدینہ

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاً وعظمةً) میں گذرنے والے شب وروز کی رونقیں اور برکتیں اور قیامِ مدینہ کے دوران صبح وشام میں روضہ پاک کی حاضری اور صلاۃ وسلام پیش کرنے کی سعادتیں اور اپنے محبوب سے قربِ قلبی کے ساتھ ساتھ ملنے والے قربِ جسمانی کی فرحتیں اور لذتیں ان چند اشعار میں پیش فرمارہے ہیں اور قیامِ مدینہ کے لمحاتِ بابرکات کو مغتنم سمجھنے کی نصیحت پیش فرمارہے ہیں اور یہ بات محض کوئی شوق ومحبت اور جذبہ ولگن کی نہیں ہے بلکہ اس کی مستقل فضیلتوں کا ذکر حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿اَلْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ لَا يَدَعُهَا اَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا اِلَّا اَبْدَلَ اللهُ فِيْهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ وَلَا يَثْبُتُ اَحَدٌ عَلٰى لَأْوَائِهَا وَجَهْدِهَا اِلَّا كُنْتُ لَهٗ شَفِيْعًا اَوْ شَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینۃ، ج: ۱، ص: ۴۴۰)

مفہوم وخلاصہ یہ ہے کہ مدینہ ان لوگوں کے لیے جو مدینہ میں رہتے ہیں بہتر ہے یعنی مدینہ کا قیام دنیا وعقبیٰ کی بھلائی کا ضامن ہے بشرطیکہ وہ اس کی بھلائی وبہتری کو جانیں تو اس شہر کی اقامت کو ترک نہ کریں اور دنیا کے آرام وراحت کے لیے اس کو چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں جو بھی شخص بے رغبتی کے ساتھ یعنی بلاضرورت اس شہر کو چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ایسے شخص کو مقیم کردے گا جو اس سے بہتر ہوگا یعنی بے رغبتی کے ساتھ مدینہ کو چھوڑنا مدینہ کے لیے نقصان دہ نہ ہوگا بلکہ خود اس کے لیے نقصان دہ ہوگا کہ اس شخص کی جگہ کوئی اس سے بہتر شخص آکر مقیم ہوگا ہاں ضرورت ومجبوری کے تحت مدینہ کو چھوڑنا اس حکم میں داخل نہیں اور جو بھی شخص مدینہ میں سختیوں اور بھوک پر ثابت قدم رہے گا یعنی وہاں کی ہر تنگی وپریشانی پر صبر کرے گا تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس کی اطاعت کا گواہ بنوں گا۔

مغرب زدہ ایک سعودی کا حال

حدیث شریف کے اس ٹکڑے سے جہاں مدینہ میں رہنے والوں کے لیے خاتمہ بالخیر کی سعادتِ عظمیٰ کی بشارت ہے وہیں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ بعض ظاہری پریشانیوں کی وجہ سے مدینہ کو چھوڑ کر دوسری جگہوں کی عیش وعشرت والی رہائش گاہوں کو ترجیح نہ دے اور وہاں سے ترکِ مدینہ کر کے مال ودولت اور عیش وعشرت کی بنا پر دوسرے ملکوں میں سکونت اختیار نہ کرے جیسا کہ آج کل بعض مغربیت زدہ نادان بھائی مکہ معظمہ مدینہ منورہ کی سکونت کو چھوڑ کر امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کی طرف رخ کر رہے ہیں اور ان کے پیشِ نظر صرف اپنے معاشی اور دنیوی مفادات اور مال ودولت کی بہتات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سکون وچین اور اطمینان وراحت کی زندگی کا دولت کی کثرت وبہتات سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سکون واطمینان غنائے نفس کے حاصل ہونے سے میسر ہوتا ہے اور یہ دولت اللہ تعالیٰ صرف اولیاء اللہ کو عطا فرماتے ہیں۔

اس پر ایک عبرتناک واقعہ یاد آیا چنانچہ احقر رمضان المبارک میں ایک ٹیکسی ڈرائیور (Taxi dirver) کے ساتھ مکۃ المکرّمۃ سے جدہ سفر کر رہا تھا تو اس ڈرائیور (Driver) سے کچھ دینی گفتگو شروع کی اور اسی گفتگو کے ضمن میں احقر نے اس سے دریافت کیا کہ تم تو عربی اور انگلش دونوں زبانیں بول رہے ہو اس لیے تم مجھے بتاؤ کہ تمہاری نیشنلٹی (Nationality) کہاں کی ہے تو اس نے جواب دیا کہ سعودی بریطانی یعنی اصلاً سعودی کا رہنے والا ہوں مگر میری نیشنلٹی (Nationality) برطانیہ کی ہے تو پھر احقر نے اس سے یہ پوچھا کہ تمہیں سعودی زیادہ پسند ہے یا برطانیہ تو اس پر اس نے بڑے فخر سے جواب دیا کہ اَنَا اُحِبُّ بَرِیْطَانِیَّۃَ کہ مجھے سعودی کے مقابلے میں برطانیہ زیادہ محبوب ہے تو احقر اس جواب پر متعجب وحیران رہ گیا۔

مدنیہ قربِ محبوب کی دولت

بھلا جانے کیا جام و مینائے عالم
ترا کیف اے خوش خرامِ مدینہ

حضرت والا دامت برکاتہم مدینہ منورہ میں رہنے والے کیلیے ارشاد فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ظاہری و باطنی خوبیوں اور برکتوں سے مالا مال فرمایا ہے اور یہاں کی پر بہار فضاؤں اور دلکش نظاروں اور مسرت آمیز محفلوں اور پر رونق مجلسوں کا کیا ہی کہنا ہے اور لوگ دنیا کے جام و مینا کی مستیوں اور لذتوں سے اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے کچھ کیف و سرور حاصل کرتے ہیں مگر وہ اس لذت ونشاط اور فرحت و مسرت کو کیا سمجھ سکتے ہیں جو مدینہ منورہ میں رہنے والوں کو حاصل ہے۔ اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے ظاہری و باطنی ہر نوع کی برکتوں، راحتوں، مسرتوں اور خوشیوں کی دعا فرمائی ہے حتیٰ کہ مدینہ کی آب و ہوا کی اصلاح اور بہتری کیلیے بھی دعا فرمائی ہے جیسا کہ روایت عائشہ رضی اللہ عنہا میں موجود ہے کہ:

﴿اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْمَدِیْنَۃَ کَحُبِّنَا مَکَّۃَ اَوْ اَشَدَّ حُبًّا وَصَحِّحْھَا وَ بَارِکْ لَنَا فِیْ صَاعِھَا وَمُدِّھَا وَانْقُلْ حُمَّاھَا فَاجْعَلْھَا بِالْجُحْفَۃِ﴾

(صحیح البخاری، باب مقدم النبیا واصحابہ المدینۃ،ج:۱،ص:۵۵۸)

اے اللہ! مدینہ کو ہمارا محبوب بنادے جس طرح تو نے مکہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ اور مدینہ کی آب وہوا درست فرمادے اور مدینہ کے صاع و مد میں ہمارے لیے برکت عطا فرما نیز مدینہ کے بخار کو یعنی بخار کی کثرت اور وباء کو یہاں سے نکال کر جحفہ میں منتقل کردے۔

پھر محبت کے اصول سے اگر اس پر یوں غور کیا جائے کہ ایک عاشقِ رسول مسلمان کے لیے اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ اس کو قیامِ مدینہ کی صورت میں اپنے محبوب کا قرب نصیب ہوتا ہے جب دنیا کے ناپاک و ناپائدار عشق میں یہ چیز بڑی لذت بخش تصور کی جاتی ہے تو بھلا محبوبِ حقیقی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق کے لیے قیامِ مدینہ سے بڑی اور کیا دولت ہوسکتی ہے اور دل کے باغ و بہار ہونے کے لیے اپنے محبوب کے قرب کا تصور ہی ایک عظیم ترین دولت و نعمت ہے اس لیے سچے عشاقِ رسول جب مدینہ میں رہتے ہیں تو وہ اپنے محبوب کی یادوں میں ایسے گم اور کھوئے رہتے ہیں کہ جیسے کہ وہ کسی دوسرے عالم میں رہتے ہوں اور ان کو مدینہ کا چھوڑنا انتہائی دشوار ہوتا ہے مگر خود اپنے محبوب نبی کے دین وشریعت کی تبلیغ وتعلیم کے لیے ظاہری دوری مجبوراً اختیار کرتے ہیں اور جسماً اگرچہ مدینہ سے دور رہتے ہوں مگر قلب و روح سے ہر وقت مدینہ منورہ کی پر کیف بہاروں میں گھومتے رہتے ہیں جیسا کہ حضرت والا نے ایک مقام پر اپنے شعر میں یوں ارشاد فرمایا ہے ؎

اے اخترؔ مرے قلب و جاں ہیں وہاں
مدینے سے گو دور رہتے ہیں ہم

احترامِ مدینہ اور اس کے تقاضے

مدینہ کی گلیوں میں ہر اک قدم پر
ہو مد نظر احترامِ مدینہ

مدینہ منورہ کوئی سیر و سیاحت کا شہر نہیں ہے کہ جس میں محض سیر و تفریح کے لیے سفر کر کے ہوٹلوں (Holtels) میں کچھ شب و روز عیش و عشرت کے ساتھ گذار لیے جائیں اور بس مقصود پورا ہو جائے بلکہ یہ مقدس و پاکیزہ شہر ہے کہ جس کی حرمت کے لیے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے دعائیں نکلیں اور جس کی عظمت او احترام کے لیے آپ نے بہت سی ہدایت جاری فرمائی ہیں۔ چنانچہ ایک دعا آپ نے یہ فرمائی ہے جو اس حدیثِ پاک میں مذکور ہے۔

﴿اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَمًا وَ اِنِّىْ حَرَّمْتُ الْمَدِيْنَةَ حَرَامًا مَابَيْنَ مَأْزِمَيْهَا اَنْ لَّايُهْرَاقَ فِيْهَا دَمٌ وَلَا يُحْمَلَ فِيْهَا سِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَلَا تُخْبَطَ فِيْهَا شَجَرَةٌ اِلَّا لِعَلْفٍ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینة ودعاء النبی، ج ۱، ص ۴۴۳)

ارشادِ نبوی ہے کہ حضرت ابراہیم نے مکہ کو بزرگی دی اور اس کو حرم قرار دیا یعنی انہوں نے مکہ کی بزرگی اور حرمت کو ظاہر کیا اور میں نے مدینہ کو بزرگی دی ہے اور مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان کی بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تو اس میں خون ریزی کی جائے اور نہ وہاں جنگ کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں اور نہ اس کے درخت کے پتے جھاڑے جائیں البتہ جانوروں کے کھانے کے لیے جھاڑے جا سکتے ہیں۔

اگرچہ مدینہ منورہ کی حرمت و تعظیم سے متعلق وہ تمام احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں جو کہ مکۃ المکرّمۃ کے لیے ثابت ہیں لیکن باقی بہت ساری چیزوں میں مدینہ منورہ کا احترام بھی اسی طرح واجب و ضروری ہے جیسا کہ مکۃ المکرّمۃ کے لیے ہے اور خاص طور پر ایک مردِ مومن کے لیے بس اتنی بات عظمتِ مدینہ کے لیے کافی دلیل ہے اس کے محبوب کا شہر ہے اور یہاں محبوبِ ربّ العالمین آرام فرما ہیں اور اس کی گلیوں میں حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمِ مبارک پڑے ہیں اور اس زمینِ مدینہ سے آپ کے جسدِ اطہر کا تعلق ہے اور اس کو آپ کے شہر ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ مدینہ پاک کا وہ خاص حصہ کہ جہاں آپ کا بدنِ مبارک مس کر رہا ہے وہ کائنات کے ذرہ ذرہ حتیٰ کہ کعبہ و عرش و کرسی سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے اس لیے قدم قدم پر مدینہ منورہ کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔

صاحبِ مظاہر حق ج:۲ ص:۸۰۰ پر حرمت مدینہ کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ فضائل مدینہ کے سلسلہ

میں یہ بات بھی بطور خاص قابلِ لحاظ ہے کہ اس مقدس شہر کی عظمت و بزرگی ہی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس شہر کے رہنے والوں کی تعظیم وتکریم کی یہ وصیت کی تھی میری امت کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ میرے ہمسایوں یعنی اہل مدینہ کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں ان سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ کریں اور اس وقت تک ان کی خطاؤں سے درگذر کریں جب تک کہ وہ کبائر سے اجتناب کریں۔ یادرکھو! جو شخص ان کے احترام وحرمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے گا میں قیامت کے دن اس کا گواہ اور شفاعت کرنے والا ہوں گا اور جو شخص اہلِ مدینہ کے احترام وحرمت کو ملحوظ نہیں رکھے گا اسے طینۃ الخبال کے سیال سے پلایا جائے گا (دوزخیوں کا ایک حوض ہے جس میں دوزخیوں کی پیپ اور لہو جمع ہوتا ہے)

چنانچہ اولیاء اللہ سے اس نوع کے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے مدینہ منورہ کا بے حد احترام کیا اور پھر اس کی برکات حاصل کیں۔

لطف نامِ مدینہ اور اس کی حکمت

مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ

بڑا لطف دیتا ہے نامِ مدینہ

حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت اس بستی کا نام یثرب تھا مگر بعد ہجرت نبی علیہ السلام نے اس کا نام مدینہ رکھا۔

﴿عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرٰى يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ تَنْفِى النَّاسَ كَمَا يَنْفِى الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ﴾

(صحيح البخاری، كتاب المناسك، باب فضل المدينة وانها تنفی الناس، ج:۱، ص:۲۵۲)

تو معلوم ہوا کہ یہ نام بھی پیارا ہے اور معنیٰ خیز ہے اور خود نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو بڑا محبوب تھا اسی لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ یثرب کہے تو اسے چاہیے کہ وہ دس مرتبہ مدینہ کہے تاکہ اس مقدس شہر کا ممنوع نام لینے کا تدارک اور اس کی تلافی ہو جائے نیز ایک روایت یہ بھی ہے کہ جو شخص یثرب کہے وہ استغفار کرے۔ (مظاہرحق، ج:۲، ص:۷۹۱)

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اصل اصولی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا عاشق ہوتا ہے تو اس کا نام لینا اور سننا اور اس کا تذکرہ کرنا ہی ایک بہترین محبوب مشغلہ ہوتا ہے اسی لیے ریت پر بیٹھا ہوا جب مجنوں لیلیٰ کا نام لکھ رہا تھا اور اس سے سوال کیا گیا کہ کیا کرتے ہو تو اس نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا کہ ؎

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم

خاطرِ خود را تسلی می دہم

کہ میں لیلیٰ کے نام کی مشق کررہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں اس لیے ظاہر ہے کہ ایک سچا عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کا نام لینے میں جو لذت محسوس کرے گا اور جو لطف ومسرت اس کو حاصل ہوگی اس کی لفظوں میں تعبیر بھی مشکل بلکہ محال ہے اس لطیف وپرنور محبت کا مزہ اس راہ سے گذرنے والے کو ہی ہوسکتا ہے اس لیے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ مدینہ کا نام لینا بڑا لطف ومزہ دیتا ہے۔

سچے عاشق کے لیے پیامِ مدینہ

نگاہوں میں سلطانیت ہیچ ہوگی
جو پائے گا دل میں پیامِ مدینہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی غلامی اور تابعداری میں دونوں جہاں کی حکومت وبادشاہت سے بڑھ کر لطف ومزہ رکھا ہے کہ جب انسان اس حقیقت کو سمجھتا ہے تو پھر وہ ہی ہوتا ہے جو حضرت والا نے دوسرے مقام پر بڑے موثر ودل سوز انداز میں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ ؎

بہت سے سلاطیں ہوئے گھر سے بے گھر
دلوں میں جب ان کے کیا عشق نے گھر
مزہ ان کو آیا جو اس سنگ در پر
تو پایا فقیری کو شاہی سے بہتر
وہ دل جس میں جلوہ تمہارا نہیں ہے
وہ دل سب کا ہو پر تمہارا نہیں ہے

اور مجلس میں ایک روز احقر نے جب یہ شعر پڑھا تو اس پر حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے حضرت والا کا یہ ملفوظ سنایا کہ ایسی تو سینکڑوں مثالیں ہیں کہ دنیا کے ملوک وسلاطین نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اپنی حکومت وسلطنت کو چھوڑ دیا لیکن اس کی ایک بھی مثال نہیں ہے کہ کسی صاحبِ نسبت، ولی کامل نے دنیا کی حکومت و بادشاہت کی خاطر اپنی ولایت کو چھوڑ دیا ہو اور وہ اس کے بدلے حکومت لینے پر راضی ہوا ہو۔

بس یہی وہ پیامِ مدینہ تھا کہ جو صحابہ کے دلوں میں گھر کرگیا تھا اور جس کی بدولت پھر ان کا نعرہ یہ ہوتا تھا کہ نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ جن کی تمام تر عزت اور سربلندی صرف اسلام میں رکھی گئی ہے اور دنیا کی حکومتیں اور بادشاہتیں صحابہ کے ایمان ومعرفت کا سودا نہ کرسکتی تھیں حضرت والا فرماتے ہیں کہ سچے عاشقِ رسول ہونے کے نتیجہ میں دنیا کی سلطنتیں اور حکومتیں بے حیثیت ہوجاتی ہیں پھر تو مرنا اور جینا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے ہوا کرتا ہے اور یہی حقیقی پیامِ مدینہ ہے۔

نظامِ مدینہ میں سکون کی حکمت

سکونِ جہاں تم کہاں ڈھونڈتے ہو
سکونِ جہاں ہے نظامِ مدینہ

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ عطا ہوا اور جو دین دیا گیا وہ قیامت تک کی تمام قوموں اور نسلوں کی فلاح وکامیابی کا ضامن ہے اور جس طرح اس دین کا ماننے والا آخرت میں کامیاب وکامران قرار پائے گا اسی طرح اس کو اس دنیا میں جینے کا حقیقی لطف اور زندگی کا حقیقی چین وسکون بھی حاصل ہو کر رہے گا۔

کیونکہ یہ دین خدا تعالیٰ کا دیا ہوا نظامِ زندگی اور دستورِ حیات ہے اس میں کسی انسانی عقل وفہم کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ عالم الغیب والشہادۃ، علیم وخبیر اور حکیمِ مطلق کی عطاء ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی حکمِ الٰہی ایسا موجود ہے اسی لیے اس دین کو کامل اور مکمل دین کہا جاتا ہے جب حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنی مدنی زندگی میں پورے مدینہ منورہ میں اس کو نافذ اور جاری فرمایا تو یہ مدینہ چین وسکون کا گہوارہ بن گیا جان ومال عزت وآبرو اور دین وایمان غرض کہ سب کچھ محفوظ ومامون ہو گیا اور دنیا کے جس خطہ میں اس نظامِ مدینہ کی جھلک دیکھنے کو ملی اور کسی درجہ میں یہ نظام زندہ ہوا تو وہاں فوراً ایسی سکون واطمینان کی فضائیں قائم ہو گئیں اور پورا ملک امن کا گہوارہ بن گیا کیونکہ یہ نظام افراط وتفریط کی بے اعتدالیوں سے بالکل پاک اور محفوظ ہے اور حکیمِ مطلق کی طرف سے حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرا ہوا ہے اور ہر طرح کے نقص وکمی سے خالی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا نے اپنے ذہن سے اختراع کیے ہوئے نظاموں کو دنیا میں رائج کر رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں بھی امن واطمینان اور چین وسکون میسر نہیں ہے بلکہ ہر جگہ بے اطمینانی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے اور نہ جان ومال محفوظ ہے اور نہ عزت وآبرو محفوظ ہے۔

مدینہ کی غلامی غمہائے دوجہاں سے آزادی

ہو آزاد اختر غمِ دو جہاں سے
جو ہو جائے دل سے غلامِ مدینہ

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اختر! اگر تو دونوں جہاں میں سرخروئی اور عزت وسکون اور عافیت وراحت چاہتا ہے تو دل وجان سے مدینہ کا غلام ہو جا اور مدینہ والے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے نمونہ حیات کو پورے طور پر زندگی کے ہر گوشہ میں اختیار کرلے اور حقیقی غلامی اپنا لے کہ جس طرح غلام اپنی تمام چاہتوں کو اپنے مولیٰ کے تابع کر کے زندگی گذارتا ہے تو تو بھی اسی طرح اپنے محبوب کے دین وشریعت کے مطابق اپنی تمام چاہتوں کو ڈھال لے اور تابع بنا دے تو پھر یہ سعادتیں دنیا وآخرت میں مقدر ہو کر رہیں گی اس پر ایک واقعہ یاد

آیا جس کو حضرت والا نے اپنے ایک بیان میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک غلام تھا اس سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام پوچھا تو اس پر اس نے جواب دیا کہ غلاموں کا کیا نام ہوگا جس نام سے ان کو آقا پکارے وہی ان کا نام ہوتا ہے پھر انہوں نے یہ پوچھا کہ تم کیا کھاتے اور کیا پیتے ہو تو اس پر غلام نے یہ عرض کی کہ غلاموں کا کیا کھانا اور پینا ان کو جو کچھ آقا کھلا دے وہی ان کا کھانا ہوتا ہے۔

بس اس غلام کے یہ جوابات سن کر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو یہ ارشاد فرمایا کہ اے غلام تو نے تو آج ہمیں غلامی اور بندگی کی حقیقت سمجھا دی ہے کیونکہ آج ہم لوگ حکمِ الٰہی اور سنتِ نبوی کے مقابلے میں اپنی تجویزیں اور اپنی پسند کو رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، جب کہ اصل غلامی کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ہماری اپنی کیا تجویز ورائے بس جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اس پر ہماری جان ودل فدا ہے یہی پوری غلامی کی حقیقت ہے، جب یہ حالت ہو جائے تو پھر غمِ دوجہاں سے آزادی کا وعدہ ہے اور یہ بات قرآن وحدیث میں مختلف مواقع پر مذکور ہے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر یوں مذکور ہے کہ:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾
(سورۃ الاعراف، آیت: ۹۶)

ترجمہ: اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے۔
(معارف القرآن، ج:۴، ص:۱۱)

اور ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾
(سورۃ النحل، آیت: ۹۷)

ترجمہ: جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو (کیوں کہ کافر کے اعمال صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ (معارف القرآن، ج:۵، ص:۳۸۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ جس حیات میں راحت وحلاوت نہ ہو گو صورتاً موت نہ ہو مگر معنًی حیات بھی نہیں ہے جیسا کہ آخرت میں جہنمی کی حالت قرآن نے یہی ذکر کی ہے کہ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کہ باوجود حسی زندگی کے پھر بھی فرمایا گیا کہ اس زندگی کو زندگی نہیں کہا جا سکتا ہے اور موت بھی نہیں ہے کہ عذاب ومصیبت سے نجات ہو تو غرض یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی فلاح وکامیابی کے لیے احادیثِ مبارکہ میں اپنے افعال واقوال کے ذریعہ جو راستہ بتایا ہے صرف اور صرف وہی راہ راہِ نجات ہے اور آپ کی سچی غلامی ہی دنیا و آخرت کی فلاح وکامیابی کی ضامن ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اس مضمون پر حیاتُ المسلمین کے حاشیہ میں ایک بڑی تعداد آیاتِ قرآنیہ کی پیش فرمائی ہے کہ جن پر دونوں جہاں میں مصائب و آلام سے حفاظت او رنصرت و مدد کے وعدہ کا مضمون ہے اور سکون و راحت کی بشارتیں ہیں۔

رنگ لائیں گی کب میری آہیں

رنگ لائیں گی کب میری آہیں ۔۔۔ پھر مدینہ کی جانب کو جائیں
جب نظر آئے وہ سبز گنبد ۔۔۔ کہہ کے صل علیٰ جھوم جائیں
جب حضوری کا عالم عطا ہو ۔۔۔ ان کو افسانۂ غم سنائیں
اب نہ جانا ہو گھر ہم کو واپس ۔۔۔ چپکے چپکے یہ مانگیں دعائیں
تیرے در پر مرا سر ہو یارب ۔۔۔ جان اس طرح تجھ پر لٹائیں
مجھ کو اپنا بنالو کرم سے ۔۔۔ ملتزم پر یہ مانگیں دعائیں
دونوں عالم کی کیا ہے حقیقت ۔۔۔ جتنے عالم ہوں تجھ پر لٹائیں
سارے عالم میں پھر پھر کے یارب ۔۔۔ تیرا دردِ محبت سنائیں
تیرا دردِ محبت سنا کر ۔۔۔ سارے عالم کو مجنوں بنائیں
سارے عالم کو مجنوں بنا کر ۔۔۔ میرے مولیٰ ترے گیت گائیں
لذتِ قرب پا کر تری ہم ۔۔۔ لذتِ دوجہاں بھول جائیں
دربدر ڈھونڈتا ہے یہ اخترؔ ۔۔۔ اہلِ دردِ محبت کو پائیں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ افسانۂ غم: داستانِ غم۔ مجنوں: اللہ تعالیٰ کا دیوانہ۔ دربدر: ہر جگہ۔ اہلِ دردِ محبت: اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد رکھنے والے۔

مدینے میں جینے اور مرنے کی فضیلت

رنگ لائیں گی کب میری آہیں
پھر مدینہ کی جانب کو جائیں

دنیا میں کسی بھی خطہ اور سرزمین پر بسنے والا مسلمان ہو اور کسی بھی رنگ و نسل اور کسی بھی قوم اور گروہ سے وابستہ ہو لیکن قلبی طور پر وہ مدنی اور حجازی ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں اپنے اسلامی اور ایمانی مرکز سے ایسی محبت اور ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے وہ پوری عمر کوشش اور دعائیں کرتا رہتا ہے اور آہ وزاری کے ساتھ اپنا مطلوب بارگاہِ رب العزت میں پیش کرتا رہتا ہے اور وہاں جینے مرنے کے لیے کوئی صورت نکلتی ہے تو اپنی

قسمت پر نازاں ہوتا ہے اور فرحت و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے کیونکہ وہ ہمارے دل و جان سے زیادہ محبوب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے اور آپ کا مسکن اور دار الھجرۃ ہے اور یہ محض شوق و جذبات کی بات نہیں بلکہ خود لسانِ نبوت کے ذریعہ مدینہ منورہ میں جینے اور مرنے کے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں موجود ہے کہ:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَّمُوْتَ بِالْمَدِیْنَۃِ فَلْیَمُتْ بِھَا فَاِنِّیْ اَشْفَعُ لِمَنْ یَّمُوْتُ بِھَا﴾

(سنن الترمذی، باب ماجآء فی فضل المدینۃ، ج: ۲، ص: ۲۲۹)

خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہ سکے تو اسے چاہیے کہ وہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہے تا آنکہ اس کی موت اسی مقدس شہر میں واقع ہو اور میں اس کی شفاعت کروں بایں طور کہ اگر وہ گنہگار ہوگا تو میں اسے بخشواؤں گا اور اگر نیکوکار ہوگا تو اس کے درجات بلند کراؤں گا واضح رہے کہ یہاں شفاعت سے مراد وہ خاص شفاعت ہے جو صرف مدینہ میں رہنے والوں ہی کو حاصل ہوگی اور کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوگی البتہ شفاعتِ عام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر مسلمان کو حاصل ہوگی۔ لہٰذا افضل یہ ہے کہ جس کی عمر زیادہ ہو جائے یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ مدینہ منورہ میں جا رہے تا کہ وہاں مرنے کی وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ خاصہ کی اس سعادتِ عظمیٰ کا حق دار ہو جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ دعا کیا ہی خوب ہے کہ:

﴿عَنْ عُمَرَ قَالَ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب کراھیۃ النبی ان تعری المدینۃ، ج: ۱، ص: ۲۵۳)

اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب کر اور اپنے رسول کے شہر میں مجھے موت دے۔ (مظاہر حق، ج:۲، ص:۷۹۷)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا کے دونوں جز بارگاہِ الٰہی میں کیسے قبول ہوئے کہ نہ صرف مدینہ بلکہ مدینہ کے بھی سب سے مقدس حصہ روضۂ اقدس کے ساتھ حضور کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت میسر ہوئی اسی کے ساتھ ساتھ احادیثِ مبارکہ میں دوسرا مضمون یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جو میرے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد میری قبر کی زیارت کرے گا تو وہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی اور پھر اس کے لیے شفاعت کا استحقاق ہو گیا۔ چنانچہ روایات میں ہے:

﴿عَنْ حَاطِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ﴾

(سنن الدارقطنی، باب المواقیت)

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ﴾

(سنن الدارقطنی، باب المواقیت)

﴿مَنْ زَارَنِیْ بِالْمَدِیْنَۃِ مُحْتَسِبًا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا اَوْ شَھِیْدًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾

(الترغیب والترھیب مع تعلیق مصطفٰی محمد عمارۃ، ج: ۲، ص: ۲۳۵)

ان مجموعہ روایات کو الترغیب والترہیب کے حاشیہ میں نقل کیا گیا ہے اور ان کے مجموعہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بعد الوفات آپ کی زیارت فی الحیات کی طرح ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی شفاعت حاصل ہوگی اس لیے حضرت والا اس شعر میں جو مضمون پیش کر رہے ہیں وہ درحقیقت ہر مومن کا مطلوب و مقصود ہونا چاہیے اور مدینہ کی حاضری کے لیے ہر مومن کو تڑپنا اور بے قرار رہنا چاہیے یہ اس کی ایمانی حالت کا اثر ہے۔

ایک عاشقِ مدینہ کی کرامت

جب نظر آئے وہ سبز گنبد
کہہ کے صلِ علیٰ جھوم جائیں

چونکہ سبز گنبد پر نظر پڑتے ہی مکینِ سبز گنبد کی یادیں تیز ہو جاتی ہیں اور حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے حضوری پر تحفۂ درود و سلام پیش کرنے کے تصور سے روح مست ہو جاتی ہے اور دل و دماغ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیے اس لیے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زیارت آپ کی حیات میں زیارت کی طرح ہے کیونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں جیسا کہ روایت میں موجود ہے کہ اَلۡاَنۡبِیَاءُ اَحۡیَاءٌ فِیۡ قُبُوۡرِھِمۡ امام بیہقی نے اس کی تصحیح حاشیہ ترغیب منذری، ص: ۲۳۵ پر کی ہے۔

اسی لیے ایک واقعہ مختصر تفسیر ابن کثیر للصابونی میں بھی مذکور ہے اور حاشیہ ترغیب منذری، ص: ۲۴۰ پر بھی ہے کہ عتبی کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس تھا تو ایک اعرابی آیا اور عرض کیا کہ:

اَلسَّلَامُ عَلَیۡکَ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ سَمِعۡتُ اللّٰہَ یَقُوۡلُ وَلَوۡ اَنَّھُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَھُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا وَقَدۡ جِئۡتُکَ مُسۡتَغۡفِرًا مِّنۡ ذَنۡبِیۡ مُسۡتَشۡفِعًا بِکَ اِلٰی رَبِّیۡ ثُمَّ اَنۡشَاَ یَقُوۡلُ۔

یَاخَیۡرَ مَنۡ دُفِنَتۡ بِالۡقَاعِ اَعۡظُمُہٗ
فَطَابَ مِنۡ طِیۡبِھِنَّ الۡقَاعُ وَالۡاَکَمُ
نَفۡسِی الۡفِدَاءُ لِقَبۡرٍ اَنۡتَ سَاکِنُہٗ
فِیۡہِ الۡعَفَافُ وَفِیۡہِ الۡجُوۡدُ وَالۡکَرَمُ

(مختصر تاریخ دمشق)

پہلے صلوٰۃ وسلام پیش کیا اور اور پھر یہ آیتِ کریمہ پڑھی جس کا مضمون یہ ہے کہ یہ لوگ اگر ظلم کر کے آپ کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے خود بھی استغفار کرتے اور آپ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو تواب و رحیم پاتے۔

اے اللہ! کے رسول! میں آپ کے پاس ان دونوں صفتوں کو جمع کر کے آیا ہوں میں اللہ سے بھی اپنے گناہوں کی معافی (آپ کے وسیلہ سے) چاہتا ہوں اور آپ کے ذریعہ بھی اپنے رب کے سامنے اپنے حق میں شفاعت کا طلب گار ہوں اور پھر یہ دو شعر پڑھے (کہ اے وہ ذات! جو ان تمام انسانوں میں سب سے افضل ہے کہ جن کی ہڈیاں ہموار زمین میں دفن کی جا چکی ہیں اور جن کی خوشبو سے ہموار زمین اور ٹیلے مہک اٹھے ہیں میری ذات ایسی قبر پر فدا ہے کہ جس میں آپ سکونت پذیر ہیں اور جس میں پاکدامنی اور جود وسخاوت موجود ہے) اور یہ اشعار آج تک روضۂ اقدس کی مواجہہ والی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں۔

بس وہ اعرابی یہ سب پڑھ کر واپس ہوئے اور میری آنکھ لگ گئی تو میں نے نیند میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے عتبی! جاؤ اعرابی سے ملو اور ان کو یہ خوشخبری سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بخش دیا ہے ترغیب منذری، ص:۲۴۱ کے حاشیہ پر اور نشر الطیب، ص:۳۰۳ بحوالہ مواھب امام ابوالمنصو رصباغ ابن النجار ابن عساکر ابن الجوزی محمد بن حرب ہلال کی روایت کہ وہ قبر کے پاس بیٹھے تھے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ان محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں ہے پس حجت ہو گیا اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی مدینہ منورہ سے قریب ہو جائے اور وہاں کے در و دیوار اور شجر وحجر پر نظر پڑیں تو درود شریف کی کثرت شروع کر دے۔

حاشیہ ترغیب منذری، ص:۲۳۹ پر ہے کہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مدینہ منورہ سے ایسی محبت تھی کہ جب آپ باہر سے تشریف لاتے تھے اور مدینہ کے در و دیوار نظر آتے تو اپنی سواری کو تیز دوڑا دیا کرتے تھے ترمذی شریف میں روایت ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ اِلٰى جُدْرَانِ الْمَدِيْنَةِ اَوْضَعَ رَاحِلَتَهُ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا﴾

(سنن الترمذی، ابوابُ الدّعوات عن رسُول اللہ، ج:۲، ص:۱۸۲)

یعنی جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی سفر سے واپس ہوتے تو مدینہ منورہ کی دیواریں یعنی اس کی عمارتیں دیکھ کر اپنے اونٹ کو دوڑانے لگتے اور اگر گھوڑے یا خچر پر سوار ہوتے تو اس کو تیز کر دیتے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ کو مدینہ سے محبت تھی تو جب ہمارے محبوب حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ سے ایسی محبت تھی تو ہمیں بھی مدینہ منورہ سے والہانہ محبت ہونی چاہیے اور غایتِ محبت سے، یادِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں، آپ پر درود وسلام کی کثرت کا ہونا ایک فطری بات ہے اسی کو حضرت والا نے اپنے مخصوص انداز میں ذکر فرمایا ہے کہ جیسے ہی میرے محبوب نبی کے مسکن کی نشانی گنبد خضراء نظر آئے تو پڑھ کے صل علی جھوم جائیں۔

روضہ پر حاضری اور آپ ﷺ سے ہم کلامی

جب حضوری کا عالم عطا ہو
ان کو افسانۂ غم سنائیں

چونکہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبرِ مبارک میں زندہ ہیں اور یہ حیات بھی تحقیقی قول کے مطابق محض روحانی نہیں بلکہ جسمانی ہے کیونکہ رزق اور صلوٰۃ اجسام کے خواص ہیں اسی لیے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و السلام کے روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت آپ سے مخاطب ہوکر اپنے متعلق کوئی بات پیش کرنا اور دعا کی درخواست کرنا اقرب الی الاجابت ہے۔

چنانچہ نشر الطیب ،ص:۲۴۷ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ مشکوٰۃ روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسد کو کھاسکے پس خدا کے پیغمبر زندہ ہوتے ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے روایت کیا اس کو ابنِ ماجہ نے۔

فائدہ: پس آپ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اس عالم کے مناسب ہوتا ہے اور گو شہداء کے لیے بھی حیات اور مرزوقیت وارد ہے مگر انبیاء علیہم السلام میں حیات ان سے اکمل واقویٰ ہوتی ہے۔

اس لیے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے جاکر صلاۃ وسلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا بھی باعث سعادت ہے اور حضرت والا نے جو افسانۂ غم سنانے کی بات کی ہے اس کے سلسلہ میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے نشر الطیب میں صفحہ:۳۰۳ پر تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ابوالجوزاء سے روایت ہے کہ مدینہ میں سخت قحط ہوا لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شکایت کی آپ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کو دیکھ کر اس کے مقابل آسمان کی طرف ایک منفذ کردو یہاں تک کہ اس کے اور آسمان کے درمیان حجاب نہ رہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو بہت زور کی بارش ہوئی۔

اسی مضمون کو مجددِ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ان لذت وفرحت بخش اشعار کے ذریعہ اپنی کتاب نشر الطیب ص:۲۵۰ پر پیش فرمارہے ہیں ؎

تَا اللّٰہِ اُقْسِمُ مَا وَافَاکَ مُنْکَسِرٌ
اِلَّا وَاَصْبَحَ مِنْہُ الْکَسْرُ یَنْجَبِرُ

میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ کے پاس مزار شریف پر کوئی شکستہ حال دعا کے لیے عرض کرنے کو نہیں پہنچتا مگر اس کی شکستگی کی اصلاح ہوگئی اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا۔

وَلاَ احْتَمٰی بِحِمَاکَ الْمُحْتَمِیُ فَزِعًا
اِلَّا وَعَادَ بِأَمْنٍ مَالَهٗ خَصَرُ

اور نہ کسی پناہ چاہنے والے نے گھبرا کر آپ کے دربار میں پناہ لی مگر کہ امن دامان کے ساتھ واپس ہوا، اس حالت سے اس کو اپنی حاضری پر شرمندگی نہیں ہوئی جیسا کہ ناکام لوٹ جانے میں ہوتی ہے۔

وَلاَ أَتَاکَ فَقِیْرُ الْحَالِ ذُوْ اَمَلٍ
اِلَّا وَفَاضَ مِنَ الْاِ ثْرِ لَهٗ نَهَرُ

اور نہ آپ کے پاس مزار شریف پر کوئی فقیر حال امیدوار دعا کے لیے عرض کرنے کو حاضر ہوا مگر کہ اس کے نشانِ قدم ہی سے اس کے لیے نہر تکمیلِ حوائج کی جاری ہوگئی اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا۔

وَلاَ أَتَاکَ امْرَأٌ مِّنْ ذَنْبِهٖ وَجِلٌ
اِلَّا وَعَادَ لِعَفْوٍ وَهُوَ مُغْتَفَرُ

اور نہ آپ کے پاس مزار شریف پر کوئی شخص اپنے گناہ سے ڈرتا ہوا دعائے مغفرت کے لیے عرض کرنے کو آیا مگر کہ وہ عفو کے ساتھ بخشا ہوا گیا اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا۔

وَلاَ دَعَاکَ لَهِیْفٌ عِنْدَ نَازِلَةٍ
اِلَّا وَلَبَّاهُ مِنْکَ الْعَوْنُ وَالْیُسُرُ

اور نہ کسی مغموم نے کسی حادثہ کے وقت آپ کو مزار شریف پر حاضر ہو کر مدد کے لیے پکارا مگر آپ کی جانب سے عون اور آسانی نے اس کو جواب دیا اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا یہی وہ مضمون ہے کہ جس کو حضرت والا نے اپنے اس شعر میں ذکر کیا ہے کہ جب آپ کے پاس روضۂ اقدس پر حضوری ہو تو آپ کو اپنا سب حال درد وغم پیش کر کے آپ سے دعا کی درخواست کریں اور یہ چیزیں ہیں کہ جن سے اہل اللہ کو حظِ وافر نصیب ہوتا ہے اور یہ لمحات ان کی زندگی کے نہایت ہی قیمتی ہوتے ہیں۔

اسی سے اس بات پر تنبیہ بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ڈائریکٹ (Direct) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حاجت وضرورت کا پیش کر کے مانگنا تو جائز نہیں ہے مگر وہاں حاضر ہو کر اپنی دینی شرعی ضرورت کے لیے بارگاہِ نبوت میں دعا کی درخواست پیش کرنا گویا کہ قبولیت کے دروازہ کو کھول دینا ہے کہ ان شاء اللہ دعا رد نہ ہوگی۔

غمِ فراقِ مدینہ ایمانی مقتضیٰ

اب نہ جانا ہو گھر ہم کو واپس
چپکے چپکے یہ مانگیں دعائیں

عشاق کا وطن وہی ہوا کرتا ہے جہاں ان کا محبوب و معشوق موجود ہو اور وہاں کی ہر شئی ان کو لذیذ ہو جایا کرتی ہے وہیں جینا اور وہیں مرنا مرغوب ہوتا ہے اسی لیے تو مجنوں اپنی لیلیٰ کے کوچوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ۔

اَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَ ذَا الْجِدَارَ
وَ مَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِىْ
وَ لٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَ

مجنوں کہتا ہے کہ میں لیلیٰ کے کوچوں پر گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور میرے دل میں دراصل کوچے کے درو دیوار نے کوئی جگہ نہیں بنائی ہے بلکہ اس گلی کے رہنے والے کی محبت نے جگہ بنائی ۔ (اکابر دیوبند، ص:۱۰۱)

پورے عالم میں شاید کوئی مسلمان ہو کہ جس کی یہ تمنا نہ ہو کہ اس کی موت مدینہ میں آئے اور وہ وہاں دفن ہو اور ظاہر ہے کہ اس کی اصل صورت اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہاں کے قیام کو لازم پکڑ لے اور وہاں سے نہ نکلے جیسا کہ بہت سے مشائخ علماء اولیاء اللہ نے ایسا کیا اور اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور قیامت تک کے لیے مدینہ پاک کا حصہ بن گئے اسی کو حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ حاضر ہونے کے بعد اپنے گھر واپسی کی نہ آرزو ہے اور نہ اس کا خیال ہے بس یہی ایک تمنا ہے کہ بس مدفن بھی اور مستقل قیام کی نیشنلٹی (Nationlity) مدینہ پاک میں نصیب ہو جائے کیونکہ حرمین میں رہنے اور یہیں موت واقع ہونے پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ خاصہ کا وعدہ ہے جیسا کہ اوپر گذرا ہے اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں:

﴿اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَصْبِرُ اَحَدٌ عَلٰى لَأْوَائِهَا فَيَمُوْتُ اِلَّا كُنْتُ لَهٗ شَفِيْعًا اَوْ شَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِذَا كَانَ مُسْلِمًا﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب الترغیب فی سکنی المدینۃ، ج:۱، ص:۴۴۳)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ مدینہ میں اس کی مشقتوں اور تنگیوں پر کوئی صبر نہیں کرے گا مگر میں اس کی شفاعت یا اس کے حق میں قیامت کے دن گواہ ہوں گا جبکہ وہ مسلمان ہو۔

اس لیے ہر مومن کی دلی تمنا یہی ہوا کرتی ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے اور اس کی موت یہیں پر ہو البتہ جو لوگ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کام سے اور آپ کے دین کی اشاعت وصیانت اور تبلیغ وتعلیم کے لیے دنیا کے دوسرے کونوں میں آباد ہیں اور ان کے دل وجان دیارِ محبوب سے فراق وجدائی میں تڑپتے رہتے ہیں تو وہ بھی اپنے مرتبہ میں بڑے اونچے ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کچھ اولاد اپنے باپ سے دور ہو جائے اور وہ خود باپ ہی کے کام سے دور گئے ہوں اور اپنے والد کے حکم سے گئے ہوں تو ظاہر ہے جس طرح والد کے پاس رہنے والے والد کی نگاہوں میں محبوب ومقرب ہوں گے بالکل اسی طرح وہ بھی نہایت عزیز ومحبوب ہونگے جو کہ بکارِ والد ہی دور گئے ہوتے ہیں اور والد کی محبت میں دور رہ کر فراق کا غم اٹھا رہے ہوں۔

اپنے مولیٰ پر مرمٹنا ہی مقصدِ حیات ہے

تیرے در پر مرا سر ہو یا رب
جان اس طرح تجھ پر لٹائیں

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے جس محبوب بندے کو اپنے در پر بلاتے ہیں اور اس کو اس کی توفیق ملتی ہے تو اس کے دل کے جذبات یہی ہونے چاہیے کہ میں کس طرح ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں دررحمتِ خداوندی پر سربسجود رہوں اور اللہ کے سامنے سربسجود ہونا ہی حق تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے سجدہ کی حالت اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قرب کی حالت ہے کیونکہ اس حالت میں مومن اپنے سب سے قیمتی عضو یعنی سر کو زمین پر رکھ کر اپنے اللہ کے سامنے غایتِ تذلّل پیش کرتا ہے اور یہ عبادت کی ایسی ادا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے بھی مشروع نہیں ہے اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا اعمالِ شرک میں شمار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں اور اپنے اولیاء کو سجدہ میں وہ حلاوت نصیب کرتا ہے کہ اگر دنیوی حاجات اور بشری تقاضے ان کے ساتھ لگے ہوئے نہ ہوتے تو وہ کبھی سجدہ سے سر نہ اٹھاتے بلکہ ہر آن درمولیٰ پر ان کے سر رکھے ہوئے ہوتے چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طویل سجدے کیا کرتے تھے اور آپ کے سچے غلام اور عشاق کے حالات میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ پوری رات سجدہ میں سر رکھ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور آخرت کے خوف سے آہ وزاری کرتے رہے۔

اور غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تو درحقیقت مومن کا اصلی مقصدِ حیات ہے اور وجہِ تخلیق نوعِ بنی آدم ہے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ** کہ میں نے جنات اور انسانوں کو بس عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے اصل کامیابی جبھی ممکن ہوگی کہ انسان اپنی زندگی کی ہر ساعت اس مقصد میں صرف کرے بجز ان اوقات کے کہ جن میں انسان اپنی بشری طبعی حاجات کو بوجہ تقاضائے بشریت

بمطابق حکمِ الٰہی ادا کرتا ہے اور اس کو حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عبادت ہی میں شمار فرمایا ہے اسی لیے جب کوئی مثلاً نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بیت الخلاء جانا اور وضو کرنا سب ہی عبادت میں شمار ہوں گے اس طرح اگر کوئی شخص صبح سویرے تہجد پڑھنا چاہتا ہے اور اس مقصد سے آرام کرنے کے لیے سوتا ہے تاکہ جب اٹھوں تو طبیعت میں قوت ونشاط ہو اور پھر اللہ کے سامنے قیام وقعود اور رکوع وسجود کرسکوں تو پھر اس کا یہ سونا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔

بلکہ ہم قربان جائیں اپنے رحیم وکریم اللہ کے رحم وکرم پر کہ عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کی صورت میں جب کوئی عشاء پڑھ کر سوتا ہے اور پھر صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو پوری رات عبادت کرنے والا شمار کیا جاتا ہے۔

اور درحقیقت یہ شعر حضرت والا کے جس جذبہ کی ترجمانی کررہا ہے یہی حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں کا حال تھا کہ وہ ہر وقت اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ پر اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور بلکہ امتِ محمدیہ کی عمریں کم ہونے پر ان کو یہ افسوس لاحق تھا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پہلی امتوں کی طرح عمریں نصیب نہ ہوں گی ان کی یہ سوچ اور تمنا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خدا پر مر مٹنے کے جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا بنادے۔

مولیٰ سے مولیٰ مانگئے!

مجھ کو اپنا بنا لو کرم سے
ملتزم پر یہ مانگیں دعائیں

ملتزم پر دعاؤں کا قبول ہونا منصوص ہے اور احادیث میں اس مقام پر دعاؤں کی خاص قبولیت کا تذکرہ ہے چنانچہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ لوگ بڑی دل کی گہرائی سے اور بہت آہ وزاری سے اس جگہ پر دعا کرتے ہیں اور اپنی اپنی حاجات اپنے اپنے مخصوص انداز سے بارگاہِ رب العزت میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دل کے سوز وگداز کے ساتھ دعا کس طرح مانگی جائے یہ اللہ والوں سے سیکھنے کی چیز ہے اور دعا میں کیا مانگا جائے کہ جس سے دنیا وآخرت کی ساری نعمتیں حاصل ہوجائیں چنانچہ اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگی ہے وہ ساری دعاؤں اور مرادوں اور جملہ آرزوؤں اور تمناؤں کا حاصل اور خلاصہ ونچوڑ ہے کیونکہ اس شعر میں حضرت والا نے اللہ تعالیٰ سے اللہ کو مانگا ہے اور جب کسی کو اللہ مل جائے اور اسے خدا تعالیٰ سے محبت وتعلق عطا ہوجائے اور وہ محبوب ومقرب عنداللہ ہوجائے تو پھر وہ اس شعر کا مصداق ہے حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار ہیں ؎

ہوا محسوس جیسے مل گئی کونین کی دولت
مقدر سے تیرے پہلو میں جب میں نے جگہ پائی
میں اس پر جان ودل سب کچھ کروں قرباں نہ کیوں آخر
کرم سے جس کے میں نے اپنے دردوں کی دوا پائی

نیز یہ شعر بھی ۔

دل میں خدائے پاک کی لذت کو کیا کہوں
جیسے مری زمیں ہے اور اور ہے میرا آسماں

اور اسی نوع کی دعا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بیت اللہ پر آ کر کیا کرتے تھے کہ ۔

تو کر بے خبر ساری خبروں سے مجھ کو
الٰہی رہوں اک خبردار تیرا
کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

اور اسی مضمون پر مشتمل حضرت والا کا یہ دعائیہ شعر ہے کہ ۔

ذوق طلب بھی مختلف دہر میں دیکھتا رہا
اختؔر بے قرار نے تیرا سوال کر دیا

اور یہ ایسی جگہ ہے کہ اس پر مانگی ہوئی دعا بارگاہِ الٰہی میں رد نہیں ہوتی ہے جب کہ شرائطِ قبول متحقق ہوں جن میں سب سے اہم شرط مالِ حرام سے پرہیز ہے اور نہ ملنے پر مانگنا چھوڑ کر نہ بیٹھ جانا ہے۔ اور یہ ملتزم ایسا مقام ہے کہ جہاں پر کھڑے ہو کر کوئی شخص کتنا ہی سنگ دل کیوں نہ ہو مگر اس کی بھی گریہ وزاری شروع ہو ہی جاتی ہے اور چند منٹ کے لیے اپنے مولیٰ کے سامنے اپنے گناہوں اور غفلتوں پر اظہارِ ندامت وشرمندگی کا بڑا قیمتی موقعہ نصیب ہوتا ہے اور خوب دل کھول کر اللہ تعالیٰ سے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو مانگنے اور جھولی بھرنے کا مقام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے مانگنا سیکھئے

لیکن جیسے احقر نے عرض کیا ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے مانگنا بھی سیکھنا چاہیے جس میں سب سے پہلے تو وہ دعائیں ہیں کہ جو حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مواقع اور حالات میں اور خاص خاص مقامات میں ماثور ومنقول ہیں تو آدمی کو اولاً تو انہیں دعاؤں کو مانگنا چاہیے ان کے معانی ومطالب سمجھ کر حق تعالیٰ کی عظمت کا خیال کر کے دل کی حقیقی عاجزی وتضرع کے ساتھ دعائیں مانگیں صرف ان ماثور ومنقول دعاؤں کے زبانی پڑھنے پر

اکتفاء نہ کریں کہ رٹے رٹائے کلمات زبان سے جاری ہوں اور دل و دماغ کسی اور عالم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اسی پر احقر کو اپنے سامنے پیش آمدہ ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک شخص ملتزم پر کھڑا ہوا بجائے دعا کرنے کے خود اللہ تعالیٰ کے دربار میں آ کر اللہ کی شکایت کر رہا ہے اور احقر نے اردو زبان میں ان کو یوں کہتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! یہ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے میری ساری دنیا کو آپ نے برباد کر دیا ہے اور آپ نے کیوں مجھ سے میری ساری دنیا لے لی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اپنے طور پر انسان کو اللہ تعالیٰ سے عافیت و راحت مانگنے کے ساتھ ساتھ وہاں سے آنے والی ہر حالت پر تسلیم و رضا کا ثبوت پیش کرنا چاہیے جو کہ مومن کا شعار اور اللہ والوں کی پہچان ہے۔

اس لیے آدمی جب دیارِ محبوبِ حقیقی کے سفر کا عزم کرے تو اولاً یہ سب چیزیں علمائے ربّانیین کی صحبت میں رہ کر سیکھنی چاہییں اور پھر اپنے محبوب کے گھر اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیار کا رخ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ محبوبیت

دونوں عالم کی کیا ہے حقیقت
جتنے عالم ہوں تجھ پر لٹائیں

حضرت والا نے اس شعر میں اللہ تبارک تعالیٰ کی شانِ محبوبیت کا اپنے خاص انداز میں ذکر فرمایا ہے کہ اس پر سارے محبوب قربان ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے خدا! تیرے راضی کرنے کے لیے اور تجھے پانے کے لیے اگر ساری کائنات کی بادشاہت اور ہفت اقلیم کی سلطنت بھی چلی جائے اور اس کے بدلہ میں آپ کا قرب و رضا نصیب ہو تو سودا سستا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر صحیح مومنانہ بات تو وہ ہے جو حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ درحقیقت دونوں عالم کی نعمتیں اور عیش و آرام بھی خدا کی مرضی پر فدا اور قربان ہے اور اللہ تعالیٰ کی شانِ عجیب کا کیا کہنا کہ دو عالم ہوں یا ہزار عالم ہوں اور انسان ان کو باری تعالیٰ پر قربان کرے تو خدا تعالیٰ اس بندہ سے راضی ہوتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنا مال میری راہ میں قربان کیا تو نے اپنی جان میری راہ میں دی ہے تیرا عظیم اجر میرے پاس موجود ہے جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سارے عالم بھی تو درحقیقت عطاءِ الٰہی ہے، کیا ہی رحمت ہے میرے ربِ رحیم و کریم کی کہ خود ہی جان و مال دے کر اپنے کو ان کا خریدار فرما رہے ہیں اور پھر اس کے عوض جنتوں کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیۃ: ۱۱۱)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔

(معارف القرآن، ج:۴، ص:۴۶۵)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک جذباتی مفروضہ یا غلبۂ شوق میں کہی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے

قرب میں اوراس کو پالینے میں ایسا مزہ ہے کہ اس پر سب کچھ فدا کرنے کو جی چاہتا ہے اوراس کی ایک دلیل جو احقر کے ذہن نارسا میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شہدائے کرام بارگاہِ الٰہی میں جس عزت وسرخروئی سے ہم کنار ہوں گے اور جو عیش وعشرت اور راحت وفرحتِ ابدی ان کو حاصل ہوگی وہ اس قدر ہوگی کہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے مگر جب شہید سے شہادت کے بعد سوال ہوگا اوراس کو پوچھا جائے گا کہ کوئی تمنا رکھتے ہواور کوئی خاص آرزو دل میں ہوتو بتاؤ تو وہ کہیں گے کہ اے اللہ! آپ نے سب کچھ دے دیا ہے بس اب کوئی آرزو تمنا باقی نہیں ہے ہاں اتنی تمنا ضرور ہے کہ دوبارہ تیری راہ میں شہید کیا جاؤں اور پھر تیرے پاس آؤں تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کو جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ لذیذ اللہ کی راہ میں کٹنا اور مرنا ہے بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ شہید ذاتِ الٰہی پر جنت کی نعمتوں اور دنیا کی تمام راحتوں کو قربان کردیتا ہے اور یہی راہِ الٰہی میں شہید ہونے کی تمنا تین تین مرتبہ زبانِ نبوت سے صادر ہوئی ہے اور حضرت والا نے اس شعر کی مناسبت سے ایک بڑی قیمتی بات ارشاد فرمائی کہ اگر تم یہ نیت کرلو کہ اے خدا! اگرچہ میرے پاس اس وقت حکومتیں اور سلطنتیں نہیں ہیں لیکن اگر مجھے دونوں جہاں کی ساری نعمتیں بھی حاصل ہوں اور میں پورے عالم کا بادشاہ بنوں تو اے خدا اس ساری بادشاہت کو تیری خاطر قربان کر ڈالوں گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اسے اس کی نیت کے مطابق عند اللہ اجر ملے گا۔

شانِ دیوانگی ومقامِ دیوانہ گری

سارے عالم میں پھر پھر کے یاربّ تیرا دردِ محبت سنائیں
تیرا دردِ محبت سنا کر سارے عالم کو مجنوں بنائیں
سارے عالم کو مجنوں بنا کر میرے مولیٰ تیرے گیت گائیں

ان اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اشاعتِ حق اور تبلیغِ دین کی تمنا اوراس کے سلسلہ میں اپنی دلی تڑپ کو پیش کررہے ہیں کہ بس اب تو دل کے اندر ایک ہی فکر لگی ہے کہ میں پورے عالم میں پھر پھر کر اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کو پیش کروں اوراس کی محبت کی حلاوت ومٹھاس چکھا کر دنیا کی حرام محبتوں کی، حرام لذتوں کے نشہ سے چھڑاؤں اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت حاصل ہوجائے کہ ہم آپ کے عشق ومحبت میں مجنوں اور دیوانے بن جائیں کہ ہر وقت اور ہر گھڑی ہمارے ہر قول وفعل اور ہماری ہر نقل وحرکت میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اوراس پر ایمان واعتماد کی تعلیم وتلقین ہواور یہی وردِ زبان ہواور دنیا اوراس کی فانی لذتوں سے نہ کوئی دلچسپی ہواور نہ اس کے تذکرے زبان پر ہوں اور دنیا کی ساری فکروں سے بالکل آزاد ہوکر رضائے مولیٰ کی فکر سے سرشار ہوں اور قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمان کی ذمہ داری جس طرح اپنی اصلاح کرنا ہے اسی طرح دوسرے اپنے بھائیوں کی اصلاح کی فکر کرنا بھی اہم ترین ذمہ داری ہے اسی کو قرآن امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے اور کہیں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی فکر وہ فکر ہے کہ جو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ جماعتِ تبلیغ کے قلب پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے القاء فرمائی تھی اور انہوں نے اپنی تڑپ اور لگن اور دردِ کڑھن سے پورے عالم میں ایمان واسلام کی تبلیغ اور امتِ محمدیہ کو ان کی دینی ومذہبی ذمہ داری یاد دلانے کا کام شروع کیا اور اللہ تعالیٰ ہمارے ضعف اور کمزوری کو جانتے ہیں اس لیے اگر ہم نہ کرسکے تو بھی ہماری نیت کے مطابق ہمارے نامۂ اعمال میں اجر وثواب لکھ دیتے ہیں اور اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کی شکلیں پیدا فرما رہے ہیں۔

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بے چینی اور تڑپ

چنانچہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ کام شروع فرمایا تو کوئی ان کی بات سننے والا نظر نہ آتا تھا مگر [illegible] وہ وقت بھی آگیا اور آج ہم سب کے سامنے ہے کہ واقعی یہ کہنا خلافِ واقع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے [illegible]ے عالم میں یہ آوازِ حق وصداقت بلند فرمادی ہے اور ایسی ایسی کفر وشرک کی ظلمات میں ڈوبی ہوئی جگہیں کہ جہاں کوئی اللہ اور رسول کا نام لینے والا نہ تھا وہاں مساجد ومکاتب اور مدارس وجامعات وجود میں آچکے ہیں تو اسی طرح حضرت [illegible] نے اس شعر میں جس دلی تمنا وآرزو کا ذکر فرمایا ہے اور پورے عالم کی نیت فرمائی ہے بظاہر آثار ایسے معلوم ہورہے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت والا کے اس ارادہ کو پورا فرمادیا ہے اور یہ نیت قبول فرمائی ہے۔

چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں اسلامی ہوں یا غیر اسلامی ہوں حضرت والا کی تعلیمات اور دعوت وتبلیغِ دین کے فریضے انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور بہت سی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے شائع ہورہے ہیں اور بڑے بڑے علماء مشائخِ وقت اپنی اصلاح وتربیت کے سلسہ میں حضرت والا سے رجوع کیے ہوئے ہیں حتیٰ کہ بلادِ عربیہ میں بھی بکثرت حضرت والا کے متعلقین خلفاء ومجازین موجود ہیں اور افاضۂ باطنی میں مصروف ومشغول ہیں اور جو تعبیر شعر میں اختیار فرمائی گئی ہے اور جس دیوانگی کی دعا مانگی گئی ہے وہ درحقیقت اسلاف کرام کی سنت وعادت رہی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت میں ایک مقام پر یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ کسی نے ایک بزرگ سے ہمارے اور صحابہ کرام کے درمیان نسبت کا سوال کیا اور یہ کہا کہ ہم میں اور ان میں کیا فرق تھا؟ تو اس پر انہوں نے یوں ارشاد فرمایا کہ بس اتنا فرق تھا کہ اگر تم ان کو دیکھ لیتے تو انہیں مجنوں اور پاگل کہتے اور وہ اگر تمہیں دیکھتے تو مسلمان کہنا گوارا نہ کرتے اور نہ ہمیں سلام کرتے یعنی مطلب یہ کہ جب بندۂ مومن اپنے ایمانی تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے لگتا ہے تو پھر اہلِ دنیا کی نگاہوں میں وہ مجنوں نظر

آنے لگتا ہے کیونکہ اس کی ہر نقل وحرکت اور اس کا ہر قول وفعل دنیا سے بے رغبتی اور دنیوی عیش وعشرت سے دوری اور فکرِ آخرت اور اندیشۂ عاقبت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے کتنے ہی اہم اور ضروری دنیوی معاملات اس کی نگاہوں میں بے وقعت اور بے حیثیت ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اور وہ دنیوی زندگی میں ہر قدم اس طرح اٹھاتا ہے کہ جیسے کوئی شخص خاردار راستہ پر بہت احتیاط سے اور دیکھ بھال کر قدم رکھتا ہے کہ ذرا خطا ہونے سے اس کو نقصان پہنچ جائے گا کیونکہ اس کی فکر وسوچ کا محور اپنی آخرت اور اللہ کے سامنے حاضری اور میدانِ قیامت میں اپنے کیے کا جواب دہی جیسے امور ہوتے ہیں اسی لیے جنہوں نے یہ کہا ہے تو بجا کہا ہے کہ وہ مخلوق میں رہتے ہوئے بھی مخلوق سے فاصل اور خدا تعالیٰ سے واصل ہوتے ہیں کیونکہ ان کے قلب کا عالم بالکل الگ ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اس دل کو خالقِ دل سے آباد کیے ہوتے ہیں۔

اسبابِ سکون اور سکون میں فرق

لذتِ قربِ پاکر تیری ہم
لذتِ دو جہاں بھول جائیں

دنیا وآخرت کی تمام نعمتیں خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور ان نعمتوں سے ملنے والی لذت اور راحت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے یہ نعمتیں حاصل ہوں تو وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہو اور اسے وہ لذت وفرحت اور وہ کیف وسرور بھی مل رہا ہو کہ جو ان نعمتوں کا اصل خاصہ اور اثر ہے بلکہ ہم نے دنیا میں بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ہزاروں نعمتوں اور دولتوں میں رہتے ہوئے بے چین وبے سکون نظر آتے ہیں اور اپنی پریشانی وبے چینی کو بیان کرتے رہتے ہیں اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ درحقیقت یہ اشیائے دنیا اسبابِ لذت وراحت اور اسبابِ چین وسکون تو ہیں مگر ان کو چین وسکون سمجھنا بالکل خطا اور غلط ہے جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ چین وسکون الگ چیز ہے اور اسبابِ چین وسکون الگ ہے یہ دنیا کے ساز وسامان اسبابِ راحت تو ہیں مگر عینِ راحت نہیں ہیں چنانچہ اسبابِ راحت وسکون تو بازاروں میں بکتے ہیں مگر چین وسکون دنیا کی مارکیٹوں (Markets) اور بازاروں میں فروخت نہیں ہوتا ہے اس لیے بارہا یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اللہ والے جن کے پاس یہ سب اسبابِ راحت، دولت وثروت جمع نہیں ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ انہیں اپنے قربِ خاص کی ایسی دولت سے مالا مال کردیتے ہیں کہ پھر وہ دو جہاں کی لذت کو بھی کچھ نہیں سمجھتے ہیں اور ایسی پرسکون زندگی گزارتے ہیں کہ جو دوسروں کے لیے نمونہ اور قابلِ رشک ہوتی ہے اور ان کے پاس بیٹھنے ہی سے راحت وسکون ملنا شروع ہوجاتا ہے اس لیے یہ کہنا بالکل درست اور صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت جملہ لذاتِ عالم کی جان اور روح ہے اگر یہ نہ ہو تو ساری لذتیں بے جان ہیں صرف صورت ہے مگر روح نہیں، جیسے بلا روح کے جسم اور بلا خوشبو کے

پھول ہو تو وہ بے کار مردہ اور لاش ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس نعمت سے مالا مال فرما دیں، آمین۔

تلاشِ رجال اللہ

در بدر ڈھونڈتا ہے یہ اخترؔ
اہلِ دردِ محبت کو پائیں

یہ حضرت والا کا مقطع ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ اور رجال اللہ کی تلاش اور جستجو سالک کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے کلیدی اہمیت کی حامل ہے اس لیے اختر قربِ الٰہی کے حصول کے لیے در بدر ایسے لوگوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ جو قرب والے ہیں تاکہ ان کی صحبت و معیت اور ان کی خدمتوں اور دعاؤں کی بدولت میں بھی یہ دولت پا جاؤں اور ان کے ساتھ چل کر اس راہ کو آسانی طے کروں اور اللہ والا بن جاؤں اس کو یوں سمجھئے جیسا کہ مٹھائی مٹھائی والوں سے ملتی ہے اور کباب کباب والے سے ملتا ہے اور چائے چائے والے سے ملتی ہے بس ٹھیک اسی طرح اللہ بھی اللہ والوں سے ملتا ہے اس لیے جو لوگ راہِ قربِ خداوندی پر چل کر اس کو طے کیے ہوئے ہیں وہ اس راہ کے نشیب و فراز اور اس کے پیچ و خم سے خوب واقف ہوتے ہیں اور مکائدِ نفس و شیطان سے نمٹنے کے لیے مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ نفس و شیطان کس کس حیلہ و بہانہ سے اور کس کس عنوان سے سالک پر حملہ آور ہو کر اس کو راہِ حق سے ہٹاتا ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اس لیے جب کوئی راہ رو ایسے تجربہ کار ماہر رہبر کے ساتھ اس راہ کو طے کرتا ہے تو وہ بڑی جلدی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور صاحبِ نسبت بن جاتا ہے جس کی حقیقت بالفاظِ مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر ہے اور پھر اس کے لیے یہ دنیا ہی جنت کا سا لطف دینے لگتی ہے اور وہ صرف ولی نہیں ولی گر بن جاتا ہے اور یہ مضمون حضرت والا کے مختلف دوسرے اشعار کے ذیل میں مزید تفصیل کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔

آپ کا ذکر ہے دو جہاں میں

آپ کا مرتبہ اس جہاں میں — جیسے خورشید ہو آسماں میں
دوستو! یہ ہے شہرِ مدینہ — جس سے اسلام پھیلا جہاں میں
گر نہ صلِ علیٰ ہو زباں پر — کیا اثر ہوگا آہ و فغاں میں
وَ رَفَعْنَا کا انعام یہ ہے — آپ کا ذکر ہے دو جہاں میں
شرطِ توحید کامل یہی ہے — عشق ہو آپ کا قلب و جاں میں
کوئی سمجھے گا کیا غیر ممکن — آپ کا رُتبہ دونوں جہاں میں
سبز گنبد پہ جس کی نظر ہو — وہ بھلا جائے کس گلستاں میں
نام کیسا ہے پیارا محمد ﷺ — جن کے صدقے میں ایماں ہے جاں میں
یہ ہے فیضانِ نورِ نبوت — جو ہے اسلام سارے جہاں میں
کیا کہوں رفعتِ شانِ گنبد — کچھ نہیں دم ہے اخترؔ زباں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ خورشید: سورج۔ آہ و فغاں: رونا دھونا۔ وَ رَفَعْنَا: ہم نے بلند کیا آپ کے ذکر کو۔ (الآیۃ) توحیدِ کامل: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت۔ گلستان: باغ۔ فیضانِ نورِ نبوت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا فیض۔ رفعتِ شانِ گنبد: گنبدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کی بلندی۔

آفتابِ نبوت کو آفتابِ جہاں کے ساتھ تشبیہِ بلیغ

آپ کا مرتبہ اس جہاں میں
جیسے خورشید ہو آسماں میں

حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿کَانَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُفَخَّمًا یَتَلَأْلَأُ وَجْهُهٗ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ﴾

(شمائل الترمذی، ص: ۲)

کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بڑی عظیم اور بلند تھی اور لوگوں میں آپ عظیم المرتبت تھے اور آپ کا چہرۂ مبارک ایسے چمکتا تھا کہ جیسے چودھویں رات کا چاند چمکتا ہے۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی اور آپ کے بلند مرتبہ ہونے کو آسمانوں میں چمکتے ہوئے سورج سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

اوّل تو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ تشبیہ محض انسانوں کو نظر آنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ قریب

الی الفہم چیز کے ساتھ دی گئی ہے ورنہ درحقیقت سورج کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نسبت نہیں بلکہ آپ کا معاملہ تو یہ ہے کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور تقریب الی الفہم کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ جس طرح اس دنیا میں رفعت و بلندی کے لحاظ سے اور روئے زمین پر بسنے والی جملہ مخلوقات کے ساتھ مادی افادیت کے تعلق کے لحاظ سے سورج کو نہایت قوی اور مضبوط نسبت حاصل ہے اور اگر سورج کی روشنی مفقود ہو جائے تو کسی ذی روح کا بقاء ممکن نہ رہے گا اور ہر ذی روح اپنی حیاتِ دنیوی سے محروم ہو جائے گا کیونکہ سورج کی روشنی کو بہت سے مضر جراثیم کے خاتمہ میں اور زندگی کے لئے ضروری غذاؤں کی تیاری میں بڑا دخل ہے تو اسی طرح گویا ہر مخلوق بالواسطہ یا بلاواسطہ سورج کے فیض سے مستفیض ہے۔

بس اسی طرح حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ نبوت سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ مستفیض ہو رہا ہے جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلق ہے تو وہ تو بالکل ظاہر ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو کفار و مشرکین اور فساق و فجار بھی آپ کی نبوت کی برکات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اس لئے کہ اُمت مسلمہ میں جتنے اعمالِ خیر ہیں، وہ تمام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے اور آپ کے واسطے سے اُمت کو ملے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انسانوں اور اللہ کے درمیان واسطہ ہیں تو اس لحاظ سے یہ سب اعمالِ خیر آپ کا صدقہ ہوئے اور اعمالِ خیر کے وجود میں آنے سے روئے زمین پر طرح طرح کی برکتیں اُترتی ہیں اور آسمان و زمین سے برکتیں انڈیل دی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں برکتوں میں خود انسانوں کی حیات اور ان کو غذاء کا ملنا اور کھانا و پینا میسر ہونا بھی ہے اور آسمان سے بارشیں برستی ہیں اور زمین سے پھل اُگتے ہیں اور طرح طرح کے عذابات اور قتل و غارت گری سے اُمت محفوظ ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوائد صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی برابر درجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ جب تک دنیا قائم رہے گی تو یہ اسی طرح حاصل ہوتے رہیں گے۔ اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ساری مخلوقات ہی اس سے مستفیض ہو رہی ہے کیونکہ زمین اگر قحط سالی کا شکار ہو جائے تو کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

تشبیہ کا ایک دوسرا پہلو

اس کو دوسرے انداز سے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح سورج کی روشنی اور کرنوں سے ظاہری حیات وابستہ ہے اور حیاتِ ظاہری کے لئے وہ ضروری ہے، بس ٹھیک اسی طرح سے پوری دنیا میں جہاں بھی کوئی خدا کا بندہ ہے اور ایمانی حیات جس کسی کو بھی حاصل ہے تو وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا فیض ہے اور جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی کرنیں نہیں پہنچ سکیں اور جو ان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا تو وہ اس حقیقی حیاتِ ایمانی سے محروم ہے۔ بڑے بڑے اولیاء، اقطاب و ابدال اور صدیقین و صالحین کو جتنے مراتب قربِ بارگاہِ

ربّ العزت میں حاصل ہوتے ہیں۔انہیں خوف وخشیت اور زہد وتقویٰ اور قرب ومعرفت کی جتنی منزلیں حاصل ہوئی ہیں وہ سب کی سب آپ کے فیضانِ نبوت سے ہے۔ان میں سے کسی کا اپنا کمال نہیں اور وہ آپ سے جدا ہوکر قرب کی ادنیٰ منزل کو بھی نہیں چھوسکتا جبکہ آسمانوں میں سورج کی روشنی کے فیض سے ہی چاند کی روشنی ہے اور کواکب وسیّارات کی روشنی بھی اسی کی مرہون منت ہے۔اگر پیچھے سے سورج ہٹادیا جائے تو یہ سارے اجسام بے نور ہوکر رہ جائیں گے۔

اس لئے اس تشبیہ میں مختلف وجوہ سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور ہر وجہ سے یہ تشبیہ نہایت بلیغ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کی توضیح وتشریح کے لئے بہت ہی جامع اور مکمل ہے۔

اشاعتِ اسلام کا بنیادی مرکز

دوستو! یہ ہے شہرِ مدینہ
جس سے اسلام پھیلا جہاں میں

حضرتِ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کل عمر نبوت تئیس سال ہے جن میں تیرہ سال مکۃ المکرّمہ کی زندگی کا عرصہ ہے اور دس سالہ زندگی مدنی زندگی ہے۔مکۃ المکرّمۃ میں کفار میں ایمان کی دعوت کا سلسلہ قائم ہوا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے کفار ومشرکین حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ حالات ایسے بنتے چلے گئے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے اصحاب کو وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہوگیا۔

چنانچہ اس کے متعلق سیرت وحدیث کی کتابوں میں چھوٹے اور بڑے تمام واقعات مفصل مذکور ہیں۔بس مجھے تو شرحِ شعر کے عنوان سے یہ مضمون عرض کرنا ہے کہ جس کو حضرت نے اس میں ذکر فرمایا ہے اور وہ بہت ہی اہم ہے کہ اصل اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا کام بڑی قوت وطاقت کے ساتھ مدینہ منورہ میں شروع ہوا اور ہر طرف سے وفود کی آمد کا سلسلہ اور پھر قبولِ اسلام کی خبریں ہر سمت سنائی دینے لگی اور اللہ کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے والے اور اس امانت کو پوری اُمت تک پہنچانے کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا کر ہر طرف دُشمنانِ اسلام سے جانبازی کا عمل زور وشور کے ساتھ سنائی دینے لگا اور اللہ کے بندے اپنی جانیں راہِ خدا میں قربان کرکے اسلام کے کلمہ کو سربلند کرتے رہے۔بالفاظ دیگر یہ کہیے کہ جہاد کا عمل شروع ہوا اور دینِ اسلام بڑی سرعت وتیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہوا۔ہر طرف غزوات وسرایا کی دھوم تھی اور اللہ کے دیوانے اپنی جانوں کو لے کر اسلام یا جزیہ یا تلوار کا اعلان کرتے ہوئے کلمۂ اسلام کی سربلندی میں مصروف ہوگئے۔یہاں تک کہ مکۃ المکرّمہ میں رہ کر جو قلیل تعداد مسلمان ہوئی تھی اب وہ بڑی کثیر تعداد میں تبدیل ہوگئی۔چنانچہ کتاب ''عہدِ نبوت کے ماہ وسال'' کے مصنف حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صفحہ: ۳۵۵ پر تحریر فرماتے ہیں ''حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

رفاقت میں جو حضرات مکہ میں داخل ہوئے، ان کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ یہ تعداد ان مسلمانوں کے علاوہ تھی جو مکہ ہی میں رہائش پذیر تھے اور جو یمن سے حضرت علی اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ہمراہ آئے تھے۔''
(بحوالہ زرقانی شرح مواہب)

غرض یہ کہ مدینہ منورہ کو دینِ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ایک مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ کوئی بھی مشن (Mission) اور تحریک ہو اس کو مفید و نافع بنانے کے لئے کسی مرکز کا ہونا لازم اور ضروری ہے۔

اتباعِ سنت کی اہمیت

گر نہ صلِ علیٰ ہو زباں پر
کیا اثر ہوگا آہ و فغاں میں

دین کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی و عبادت حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری محبت و عشق ہو اور یادِ خداوندی اور ذکرِ الٰہی کے ساتھ ساتھ زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم پُرنور پر درود و سلام کی لذت سے آشنا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے یہاں محبوبیت کا معیار اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾
(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ (لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو۔ (معارف القرآن، ج:۲، ص:۵۴)

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تفسیرِ عثمانی میں اس آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ''جو شخص جس قدر حبیبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا ہے اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے۔ اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعوی میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعویٰ میں سچا ہوگا اتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔''

اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ کہ جب تک درود شریف کے ورد سے زبان آشنا نہ ہو تو اپنی دعاؤں کی قبولیت بھی معلق رہتی ہے اور جب اوّل و آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جاتا ہے تو پھر دعائیں قبول ہوتی ہیں اور آہ و فغاں بارگاہِ ربّ العزت میں پہنچ کر پُر تاثیر ہوتی ہے۔

رفعتِ نامِ محمد ﷺ

وَ رَفَعْنَا کا انعام یہ ہے
آپ کا ذکر ہے دو جہاں میں

حضرتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ عظمت و رفعت کو ذکر کرتے ہوئے حضرتِ والا قرآنِ کریم کی آیتِ شریفہ وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر عظمت و شہرت اور رفعت و بلندی عطا فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا نامِ مبارک مقرون ہوگیا ہے۔ کَذَافِی الدُّرِّ الْمَنْثُوْرِ مَرْفُوْعًا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِذَا ذُکِرْتُ ذُکِرْتَ مَعِی کہ جہاں میرا ذکر ہوگا آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ساتھ ہوگا۔ (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم وفی روح المعانی، ج:۳۰،ص:۱۶۹)

''جیسے خطبہ میں، تشہد میں، نماز میں، اذان میں، اقامت میں اور اللہ کے نام کی رفعت وشہرت ظاہر ہے، پس جو اس کے قرین ہوگا رفعت وشہرت میں وہ بھی تابع رہے گا اور تمام اسلامی شعائر میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نامِ مبارک لیا جاتا ہے تو ساری دنیا میں میناروں اور منبروں پر اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ پکارا جاتا ہے اور دنیا میں کوئی سمجھدار انسان آپ کا نام بغیر تعظیم کے نہیں لیتا ہے۔ اگر چہ وہ مسلمان نہ بھی ہو۔'' (معارف القرآن، ج:۸،ص:۷۷۲)

اس لئے اگر اللہ تعالیٰ کے بعد اس کی مخلوق میں کسی کا مرتبہ ومقام ہے تو سب سے اونچا مقام ومرتبہ دنیا و آخرت میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ آپ کا نام اور آپ کا مقام اور آپ کا کام سب عظمتوں والے ہیں۔ جہاں سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پہنچ ختم ہو جاتی ہے اس سے بھی آگے والا مقامِ قرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے اور سیرت نگاروں نے اس ذکرِ دو جہاں کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تلازمِ توحید ورسالت

شرطِ توحید کامل یہی ہے
عشق ہو آپ کا قلب و جاں میں

کلمۂ اسلام دو جزؤں پر مشتمل ہے۔ اول جزء لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور دوسرا جزء مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مانا جائے اور اسی کو خالق و مالک، نفع وضرر، عزت وذلت، خوشی وغم، نفع ونقصان غرض یہ کہ تمام حالات وانقلاباتِ زندگی کا مالک سمجھا جائے اور ہر طرح کے جذباتِ عبادت صرف اسی کے ساتھ خاص مانے جائیں۔

یہ ماننا نبی کی نبوت ورسالت کی تصدیق کے ساتھ ہو اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ

سے مانا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں میں کامیابی و کامرانی کی ضمانت اور دنیوی و اُخروی فلاح کے یقین و اعتماد کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے۔ اگر اوّل جزءِ کلمہ موجود ہو مگر ثانی نہ ہو تو قرآن صاف طریقہ پر اعلان کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان میری بارگاہ میں معتبر نہیں ہے اور ایسوں کی توحید صحیح توحید نہیں ہے۔

اس لئے تو اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کا ایمان غیر معتبر قرار پایا ہے کہ وہ خدا کے وجود کو مانتے ہیں اور اللہ کی ذات پر اپنے مفروضہ نظریات کے تحت ایمان لاتے ہیں اور جنت و جہنم کا خود کو مستحق ہونے کو (اپنے منحرف شدہ دین کے مطابق) تسلیم کرتے ہیں لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی و رسول تسلیم نہیں کرتے ہیں تو قرآن نے اعلان کر دیا ہے کہ ان کا ایمان میرے یہاں معتبر نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ اور معتبر دین اب صرف اسلام ہے اور ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۸۵)

ترجمہ: اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول (و منظور) نہ ہوگا اور (وہ شخص) آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔ (یعنی نجات نہ پائے گا۔)

(معارف القرآن، ج:۲، ص:۱۰۱)

حضرتِ والا کے اس شعر میں ان اہلِ اسلام کے لئے بھی ایک بڑی نصیحت و درسِ عبرت ہے کہ جو لوگ کلمۂ توحیدِ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کو مانتے ہیں مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا عشق مطلوب اور مامور بہ ہے وہ درجۂ عشق ان کو حاصل نہیں تو ایسے لوگ سمجھ لیں کہ ان کی توحید کامل نہیں ہے۔

بلکہ جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق دل کی گہرائیوں میں اُترتا جائے گا، اتنا ہی زیادہ ایمانی حلاوت و جلاء، رگ و ریشے میں سرایت کرتا چلا جائے گا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بغیر ایمان و اسلام اور توحید و تصدیق ناقص ہی رہتی ہے اور احادیث مبارکہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی شدید محبت ہونی چاہیے کہ وہ محبت اپنی ماں باپ اور اپنی حقیقی اولاد اور اُس کی خود اپنی جان سے بھی زیادہ بڑھ جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ج:۱، ص:۷)

کہ تم میں سے کوئی مؤمن کامل یقین والا نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ جس کی پہچان اور نشانی یہ ہے کہ جب اولاد و بیوی کی کوئی فرمائش یا والد و والدہ کا کوئی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے خلاف ہو تو بندۂ مؤمن طریقۂ نبی کو نہیں چھوڑتا

ہے خواہ یہ سارے ناراض ہو جائیں اور کتنے ہی فوائد اور منافعِ دنیویہ سے اس کو محروم رہنا پڑے اور بڑی تلخ ملامتیں سننی پڑیں۔ پھر بھی اپنے نبی کے طریقہ سے سرمو نہیں ہٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ایسی کامل اتباع عطا فرمادے۔

حضور ﷺ کا مقامِ عالی

کوئی سمجھے گا کیا غیر ممکن
آپ کا رُتبہ دونوں جہاں میں

کسی کی تعریف کی آخری حد یہی ہوتی ہے کہ میری استطاعت وقدرت سے باہر ہے کہ میں اپنے محبوب کی تعریف کرسکوں اور اس کے مقامِ عظمت و بزرگی کو سمجھ سکوں۔ جیسا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی حمدِ باری تعالیٰ میں یہ مضمون سکھایا ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ لَا نُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، ج: ۱، ص: ۱۹۲)

تو حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حقیقی اور آخری بات تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقامِ عظمت کو پہچاننا اور اس کو پورے طور پر سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے اس کو اپنے الفاظِ محدودہ، ناقصہ سے تعبیر و بیان کرنا ممکن نہیں۔

بھلا وہ ذات کہ جس کی مدح خود اس کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ کر رہا ہو تو اس کی حقیقت تک مخلوق کی رسائی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ خود ہی حضور صلی علیہ وسلم کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ اور فرمایا کہ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور ارشاد فرمایا کہ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ اے نبی! ہم نے تم کو سارے جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور ہم نے آپ کو اخلاقِ عظیمہ پر فائز کیا ہے۔

اس لئے ایک مخلوق کے ذہنِ نارسا کی پہنچ ان کمالات و اوصافِ نبوت تک کہاں ہوسکتی ہے؟ جو آپ کو عطا ہوئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ لغتیں قاصر و عاجز اور بے بس ہو کر رہ جائیں گی، مگر آپ کی توصیف و ثناء کا حق ادا نہ ہوگا۔

گلستانِ نبوت کی بہاریں

سبز گنبد پہ جس کی نظر ہو
وہ بھلا جائے کس گلستاں میں

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و تعلق اور دلی وابستگی پیدا ہونے کے بعد دنیا کا کوئی شہر اور کوئی مقامِ سیاحت اور کوئی گلستان و بوستان نظروں میں نہیں بھاتا ہے۔ پھر آپ کے دیار سے جدا ہونے کے بعد اداسی اور بے چینی اور دلی افسردگی کا خمار چھا جاتا ہے، کیونکہ وہ ایسی جگہ ہے اور وہ ایسا مقدس مقام ہے کہ جہاں

خالقِ کائنات کی رحمتیں ہر آن بارش کی طرح برستی رہتی ہیں اور ہر غم زدہ کے دل پر خوشی و مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔

یہ گلستانِ نبوت وہ گلستان ہے کہ جس کو کبھی خزاں نہیں چھوتی۔ وہاں ہر گھڑی بہار ہی بہار کا عالم رہتا ہے خواہ دنیا میں موسمِ بہار ہو یا موسمِ خزاں لیکن وہاں اس کا گذر نہیں ہے۔

حضرت والا جس عالی مضمون کی طرف اشارہ فرماتے ہیں وہ بہت ہی اونچا اور عالی مضمون ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و تعلق کے بعد دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہوں و حکمرانوں اور دولت و ثروت والوں کے در کی طرف اس کا کوئی التفات قائم نہیں رہتا ہے اور صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا والوں سے علائق بے جا ختم کرنے کے لئے انتہائی نافع اور مفید ہے۔ اس در سے پھر وہ سب کچھ ملتا ہے کہ اس کے بعد ان کو کوئی در اچھا نہیں لگتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ دربارِ نبوت میں آپ کی حیاتِ طیبہ میں حاضر ہو جایا کرتے تھے تو پھر وہ آپ کے ایسے غلام اور اسیر ہوتے تھے اور آپ پر ایسے فدا ہوتے تھے کہ ساری کائنات ان کی نظروں میں نہیں بھاتی تھی۔ دوست تو دوست دُشمنوں تک کا یہی معاملہ ہوتا تھا۔

نامِ محمد اور وجوہِ محبت

نام کیسا ہے پیارا محمد ﷺ
جن کے صدقے میں ایماں ہے جانِ ...

دوستو! یہ اصولِ فطرت ہے کہ جب کسی انسان کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس کی ہر شئے اچھی اور بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا نام بھی محبوب ہو جاتا ہے اور اس کا تذکرہ بھی لطف آمیز ہو جاتا ہے۔

غرض کہ جو بھی چیز اس سے کسی طرح وابستگی اور تعلق رکھتی ہو، وہی محبوب اور پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ اور بھلا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر مؤمن کی محبت میں کسی کو کیا شک ہوسکتا ہے کیونکہ آپ کی ذاتِ عالی میں محبت کی جملہ وجوہ جمع ہیں جمال ونوال وکمال وقرابت۔ چنانچہ آپ کو ایسا جمال عطا ہوا کہ جس کی صحیح ترجمانی سے زبان وقلم قاصر و عاجز ہیں۔ بس اس کو سمجھنے کے لئے شاعرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ شعر کافی ہے۔

وَاَحْسَنَ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنٌ
وَاَجْمَلَ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَآءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

آپ سے زیادہ خوبصورت کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ عرب وعجم کی کسی عورت نے آپ سے زیادہ خوبصورت

جنا۔ایسا لگتا ہے کہ آپ نے جس طرح خود اپنے کو چاہا اسی طرح ہر عیب و نقص سے خالی آپ کو پیدا کیا گیا۔اور جہاں تک آپ کے کمالات کا تعلق ہے تو آپ کو علمی و عملی دونوں نوع کے کمالات اعلیٰ اور اتم درجے میں عطا کئے گئے۔

اس لئے آپ کا دین اکمل الادیان، آپ کی شریعت اکمل الشرائع اور آپ کی اُمت افضل الامم قرار پائی اور آپ کا مرتبہ تمام اوّلین و آخرین میں سب سے افضل اور اعلیٰ قرار دیا گیا۔اس لئے آپ کو افضل الانبیاء والرسل کہا جاتا ہے۔اور آپ کی عطا کا یہ عالم ہے کہ قیامت تک آنے والی تمام اُمت کا ایمان و یقین صرف آپ کا صدقہ ہے اور آپ کی عطائے ظاہری کا بھی یہ عالم تھا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں آپ رمضان کے مہینے میں تیز ہواؤں سے بھی زیادہ سخاوت میں مال اُڑانے والے ہوتے تھے۔اور قرابت کے لئے اتنا سمجھنا کافی ہے کہ قرآن میں اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَاَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت:۶)

ترجمہ: نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مومنین کے ساتھ تو ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیبیاں ان (مومنین) کی مائیں ہیں۔(معارف القرآن، ج:۷،ص:۸۵)

مزید ان چاروں وجوہِ محبت کو سمجھنا ہو تو سیرت کی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔چنانچہ ایک مختصر مضمون میں علامہ عینی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:''حبِ طبعی جو میلانِ قلبی ہے وہ کبھی حسین صورت یعنی جمال اور کبھی باطنی خصائل یعنی کمال اور کبھی نوال یعنی احسان اور کبھی قرابت کی بناء پر ہوتی ہے اور یہ چاروں حبِ طبعی کا منشاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کامل طور پر والدین سے بھی بڑھ چڑھ کر متحقق ہے۔جمالِ ظاہری تو اتنا ہے کہ چہرۂ انور بدر سے بھی زیادہ چمکتا نظر آتا تھا۔لَنَا شَمۡسٌ وَلِلۡاٰفَاقِ شَمۡسٌ ،کمالِ باطنی تو یہاں تک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ اور احسان، رأفت و رحمت اس درجے میں ہے کہ آپ کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ اور ارشاد باری تعالیٰ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ اور قرابت کے متعلق قرآن کہتا ہے اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ کہ نبی کو ایمان والوں سے ان کی جان سے زیادہ تعلق ہے لہٰذا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ نبی مومنین کے حق میں بمنزلہ باپ بلکہ اس سے بھی بمراتب بڑھ کر ہے تو بے جا نہ ہوگا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قرأت میں وَھُوَ اَبٌ لَّھُمۡ کے الفاظ کے ساتھ اس کی صراحت موجود ہے:

﴿وَفِیۡ قِرَاءَ ۃِ ابۡنِ مَسۡعُوۡدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُ ''اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَھُوَ اَبٌ لَّھُمۡ وَاَزۡوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمۡ''﴾

(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج:۱۲، ص:۱۰۶، دارالاحیاء التراث العربی)

اور اسی طرح ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں ہے، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ﴾

(سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب کراھیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ، ج: ۱، ص: ۳)

یعنی میں تمہارے لیے والد کے درجے میں ہوں۔

اس مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ سمجھنا بالکل آسان ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے محبوب ہیں تو آپ کا نام بھی ہمیں محبوب اور پیارا ہوگا۔ حق تعالیٰ نے آپ کا نام محمد رکھ کر خود اس میں محبوبیت کی شان رکھ دی ہے۔ اس لئے کہ محمد وہ ذات ہوگی جس کی بہت تعریف کی گئی ہو، خالق ومخلوق دونوں نے آپ کی تعریفیں کی ہیں اور آپ خود بھی اللہ کی ایسی حمد وثناء کرنے والے ہیں کہ وہ حمد اوّلین وآخرین میں سے کسی کو عطا ہوئی اور نہ ہوگی۔ اسی لئے آپ کا دوسرا نام ''احمد'' بھی ہے اور ان ناموں کے ساتھ کتبِ سابقہ میں بھی آپ کا تذکرہ موجود ہے۔

اگرچہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی دو نام نہیں بلکہ احادیثِ شریفہ میں مختلف مواقع پر آپ کے اور بہت سارے نام مذکور ہیں جن سے متعلق حضرت مولانا موسیٰ خان صاحب روحانی بازی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''البرکاتُ المکیّۃ فی الصلوات النبویّۃ'' کافی مفصل کتاب ہے۔

دوستو! جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک اور آپ کے نام مبارک سے پیار نہ ہو خوب خوب محبت نہ ہو تو نہ کوئی ولی ولی ہے، نہ کوئی بزرگ بزرگ ہے اور اللہ تعالیٰ تک رسائی بغیر محبتِ رسول کے ممکن نہیں۔ اسی طرف حضرتِ والا نے شعر میں توجہ دلائی ہے۔

نورِ نبوت کی کرنیں

یہ ہے فیضانِ نورِ نبوت
جو ہے اسلام سارے جہاں میں

پہلے زمانے میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مخصوص قوموں اور متعین جگہوں اور محدود زمانے کے لئے دنیا میں بھیجے جاتے تھے اور جب ایک نبی دنیا سے چلے جاتے تو اللہ تعالیٰ دوسرے نبی کو بھیج دیتے جن کی تعداد کا علم صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے۔ بجز ان انبیاء ورسل کے جن کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾

(سورۃ المؤمن، آیت: ۷۸)

ترجمہ: ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعضے تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے (اجمالاً یا تفصیلاً) بیان کیا ہے اور بعضے وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔ (معارف القرآن، ج: ۷، ص: ۶۱۸)

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عالم کے لئے

قیامت تک کے واسطے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور آپ پر ایمان لائے بغیر کسی کو نجات حاصل نہیں ہوگی۔

جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ مَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا کہ ہم نے آپ کو پوری انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کہ ہم نے آپ کو دنیا جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

الغرض یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ پورے عالم میں جہاں بھی اللہ کا دین ہے اور خدا کے ماننے والے ہیں وہ سارا آپ کی نبوت کا فیض ہے اور آپ کی نورِ نبوت کی کرنوں سے سارا عالم روشن اور منور ہے۔ جس تک یہ روشنی نہ پہنچی اور وہ آپ کی نبوت پر ایمان نہ لایا اگرچہ وہ اللہ کے وجود اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو تب بھی اس کا کوئی قول و فعل اللہ کی بارگاہ میں معتبر نہیں۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ کہ معتبر دین اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف اسلام ہے۔ یعنی آپ کا لایا ہوا دین و مذہب ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ کہ جو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کو اپنا دین بنانا چاہے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اس شعر میں یہ نکتہ بھی مخفی ہے کہ پورے عالم میں جہاں بھی ایمان و اسلام کے لئے جس نوع کی بھی محنتیں ہو رہی ہیں خواہ وہ دعوت و تبلیغ کی شکل سے ہو یا تعلیم و تدریس اور اصلاح و تزکیہ کے قبیل سے اور جہاد و قتال کی لائن سے ہو یا تصنیف و تالیف اور وعظ و تقریر کی صورت میں ہو یہ تمام کی تمام محنتیں اور کوششیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ نبوت کا فیضان ہے۔

سب خدّام دین کو اُسی آفتاب و مہتابِ نبوت سے روشنی ملی ہے اور آپ ہی کی تعلیمات و ارشادات پوری اُمت کے خدّام دین کے لئے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خدمتوں سے دینِ اسلام جہاں بھی پھیلے گا تو بلاشبہ اُس سب کو آپ ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔

اسی لئے اگر کوئی سرِمو آپ کی تعلیمات و ہدایات سے روگردانی کرے تو پھر اس کا وہ عمل عنداللہ مقبول نہیں ہوتا، اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ آپ کی نبوت کے صدقے ہمیں اسلام کی دولت میسر آئی اور اپنے خالق و مالک کے یہاں سرخروئی حاصل کرنا آپ ہی کے واسطے سے نصیب ہوا۔ اس لئے حضرتِ والا نے فرمایا کہ سارے جہان کا اسلام آپ کا فیضانِ نبوت ہے۔

مدحِ نبی اور اعترافِ عجز

کیا کہوں رفعتِ شانِ گنبد
کچھ نہیں دم ہے اخترؔ زباں میں

مکان کی محبت دراصل مکین کی محبت سے ناشی ہوتی ہے۔ دراصل رفعتِ شانِ گنبد سے اُس ہستی کی رفعتِ شان کی طرف اشارہ ہے جو اس گنبدِ خضراء کا مکین ہے یعنی ہمارے محبوب نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلاصۂ شعر یہ ہے کہ میں ایک مخلوق ہوں، میری زبان مخلوق ہے، میری لغت مخلوق و محدود ہے تو بھلا اُس ذات کی مدح و ثنا میری محدود لغت اور قاصر و عاجز زبان کیا کرسکتی ہے کہ جس کی ثناء خود خالقِ جلّ وعلاء نے کی ہو، اس لئے ان مذکورہ اشعار میں جو کچھ ثناء گوئی ہوئی اُس سے آپ کی رفعتِ مقام کا بیان کماحقہٗ نہ تو ہوسکا اور نہ ہی اس کا دعویٰ ہے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کیا اثر تھا رسالت کی شاں میں

نورِ سنت ہے کون و مکاں میں — کیا تجلی تھی تیرے بیاں میں
عبد و سلطاں کھڑے ایک صف میں — کیا اثر تھا رسالت کی شاں میں
فرق کالے و گورے کا تو نے — کس طرح سے مٹایا جہاں میں
یہ تھا تیری غلامی کا صدقہ — شانِ سلطانیت شُتر باں میں
جس نے کانٹے بچھائے تھے دیکھا — گل بداماں تیرے بوستاں میں
جو چلا تیرے نقشِ قدم پر — کامراں ہے وہ دونوں جہاں میں
ہو قمر جیسے انجم میں روشن — آپ تھے محفلِ اختراں میں
آپ کی شانِ بے انتہا کو — کس طرح لائے اخترؔ بیاں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ کون ومکاں: دنیا۔ شانِ سلطانیت: بادشاہوں والا مزاج۔ شُتر باں: اونٹ چرانے والے۔ گل بداماں: ......۔ بوستاں: باغ۔ کامراں: کامیاب۔ قمر: چاند۔ انجم: ستارے۔ محفلِ اختراں: یعنی اپنے اصحاب کی محفل میں۔

تجلّی کون ومکاں کا راز

نورِ سنت ہے کون و مکاں میں
کیا تجلّی تھی تیرے بیاں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکمل نظامِ حیات دے کر دنیا میں بھیجا، اس لئے زندگی کے ہر شعبے میں آپ کے طریقے اور آپ کی سنتیں ہماری رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔

پیدا ہونے سے مرنے تک اور اس سے ماقبل اور مابعد کے لئے دینِ اسلام میں مخصوص ہدایات اور تعلیمات موجود ہیں جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ جو بندۂ خدا سنتوں کی اتباع کر کے زندگی گزارتا ہے تو اس کی زندگی نورِ سنت سے منور ہو جاتی ہے اور اس کے قلب وجگر انوارِ سنت سے روشن ہو جاتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت کے راستے کو سنت کی راہوں میں منحصر کر دیا ہے اور اپنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو سنتِ نبوی کی اتباع میں منحصر فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ کہ اے اللہ ورسول کے محبت کے دعویدارو! اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو میرے نبی کی اتباع کرو، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع معیارِ عشقِ خدا اور رسول ہے۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

دل میں لگا کے ان کی لو کر دے جہاں میں نشر ضوء
شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

ضوء سے مراد سنت کی روشنی ہے۔ اس لئے جتنا آپ کی سنتوں کا چلن ہوگا اتنے کون ومکان روشن ہوں گے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گفتگو دن ورات کی باتیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کو مزکّی ومجلّی کر دیتی تھیں جن کانوں میں آپ کی باتیں پہنچی ان کے قلوب کو ایسی تجلّی حاصل ہوئی کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو لکھ دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَکَانُوْا اَحَقَّ بِھَا وَاَھْلَھَا کہ اللہ نے کلمۂ تقویٰ کو اس پر لازم کر دیا اور وہ اس کے مستحق اور اس کے اہل تھے۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ اپنے تو اپنے غیر بھی جب آپ کی گفتگو سنتے تھے تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اسی بیان وتربیت کا اثر تھا کہ جس نے دُشمنوں کو دوست بنالیا۔ اس لئے آج بھی اہلِ ایمان اپنے قلب وجگر اور ظاہر وباطن کو روشن کرنا چاہیں تو سنتوں کی پابندی کریں۔

رسالتِ محمدی ﷺ کی ایک خاص شان

عبد و سلطاں کھڑے ایک صف میں کیا اثر تھا رسالت کی شاں میں
فرق کالے و گورے کا تو نے کس طرح سے مٹایا جہاں میں

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیماتِ سماویہ کا یہ اثرِ خاص تھا کہ جس نے غلام اور آقا کو اللہ کے سامنے بندگی پیش کرنے میں ایک صف میں لا کھڑا کیا اور فضیلت و برتری کا مدار صرف اللہ تعالیٰ کے مقرب و محبوب ہونے پر رکھا گیا جس میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق و امتیاز پیشِ نظر نہیں اور دنیا کی تمام نسبتیں محض ظاہری نظم و انتظام کے لئے تو روا رکھی گئیں۔ لیکن اللہ کے مقرب اور محبوب ہونے میں ان کو کسی طرح کا دخل نہیں، اس لئے بادشاہ اور اس کا خادم، آقا اور اُس کا غلام سب ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، یہ صرف تعلیماتِ نبویہ کا اثر ہے ورنہ دنیا میں بادشاہ اپنی برتری اور بڑائی اور عزت و عظمت میں اپنے کو غلام سے بدرجہا بڑھ کر تصور کرتا ہے۔ غلام کی تحقیر و تذلیل اور اُس کے ساتھ بے جا سلوک روا سمجھتا ہے تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ کہلائے گا کہ آپ کی تعلیمات کے اثر سے بادشاہوں کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی اور اپنی عاجزی و پستی اس درجے قائم ہو جائے کہ ان کو غلام کے برابر کھڑے ہونے میں کوئی عار محسوس نہ ہو اور نہ کسی گورے کو کالے سے نہ ہی عربی کو عجمی سے اپنی فضیلت و برتری کا احساس باقی رہے۔

جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے جانثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے عظیم مجمع میں خاص الوداعی نصیحتوں میں یہ نصیحت فرمائی کہ:

﴿الا لا فضل لعربیٍّ علی عجمیٍّ ولا لعجمیٍّ علی عربیٍّ ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الّا بالتقوٰی﴾

(مسند احمد، ج:۵، ص:۴۱۱، دار الباز للنشر والتوزیع، مکۃ المکرمۃ)

اے میرے صحابہ! نہ تو کسی عربی کو عجمی پر فضیلت، نہ عجمی کو عربی پر اور نہ گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر مگر تقویٰ کے ذریعہ۔

جو اس میں مبتلا ہو تو شانِ نبوت نے اس کو **عصبیۃ جاھلیۃ** میں سے قرار دے کر اس کے اس عمل کو ناپسندیدہ فرمایا جس عصبیت جاہلیت کا تحقق عموماً ان چار شکلوں میں ہوتا ہے۔ قوم وطن اور رنگ و زبان لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے دل و دماغ میں ایسی اُخوتِ ایمانی قائم فرما دی کہ یہ تمام عصبیتیں حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور آپ کے ماننے والوں کے دلوں سے بالکل ختم ہو گئیں۔ ایک مؤمن دوسرے مؤمن بھائی کے لئے بالکل حقیقی بھائی کی طرح بن گیا، اس لئے بلا شبہ اس کو آپ کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

حضور ﷺ کی غلامی سے صحابہ کو کیا ملا

یہ تھا تیری غلامی کا صدقہ
شانِ سلطانیت شُتر باں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ شریف کی جس قوم میں مبعوث فرمایا وہ اس قدر جاہل اور اجڈ اور تہذیب وتمدن سے عاری قوم تھی کہ اُس دور میں اس پر کوئی حکومت کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اونٹوں کو چرانے والے جنگ وجدل کے عادی اور تعلیم وتربیت سے بے بہرہ اور آدابِ زندگی سے یکسر نا آشنا لوگ تھے جن کے دستورِ حیات میں عورتوں کو جینے کا حق ہی نہ تھا اور جو معمولی معمولی باتوں پر صدیوں تک لڑتے رہتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس قوم میں بعثت ہوئی اور آپ نے ان کو تعلیماتِ الٰہیہ سے روشناس کرا کر اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی کا سبق پڑھایا اور جہالت دور فرما کر ان کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کے دلوں میں خدائے وَحْدَہٗ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ پر ایمان ویقین کی فضاء قائم کی اور ان کو رہنے سہنے، مرنے جینے اور زندگی گزارنے کے عادات و اطوار سکھائے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پورے طور پر ان کو پہنچایا تو پھر یہی قوم بارگاہِ الٰہی میں ایسی معزز ومقبول قرار پائی کہ ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا حق تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ اعلان کیا اور اپنی رضا رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ کا سرٹیفکیٹ (Certificate) ان کو عطا فرمادیا۔

صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ صحابہ کو یہ شانِ سلطانیت اور مقامِ محبوبیت کیسے اور کیونکر ملا؟ اور اُن میں ایسی بے مثال عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی حکومت کرنے والے بادشاہ وسلاطین کیسے ہوئے کہ جن کے رعب و دبدبے سے اس وقت کی حکومتوں کے مہذب اور تعلیم یافتہ کہلانے والے امراء وسلاطین کانپ اُٹھتے تھے اور اُن کے تذکرے ہی سے ان کے دلوں پر رعب قائم ہوجاتا تھا۔

بات دراصل یہی سامنے آئے گی کہ انہوں نے اللہ کی بندگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو دل و جان سے قبول کیا اور اُس کی خاطر اپنے تن، من، دھن کی بازی لگادی اور ہر طرح کی قربانیوں میں آگے آتے رہے تو حق تعالیٰ نے ان کو وہ عزت وسر بلندی عطا فرمائی جو اللہ تعالیٰ کی سنت تھی، ہے اور رہے گی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ اور جیسا کہ فرمایا گیا فَلَنۡ یَّصۡلُحَ اٰخِرُ ھٰذِہِ الۡاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا کہ اس اُمت کا آخر انہی باتوں سے درست ہوگا جن سے اس اُمت کا اوّل درست ہوا ہے ؎

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

آپ ﷺ کے خُلقِ عظیم کا اثر

جس نے کانٹے بچھائے تھے دیکھا
گل بداماں تیرے بوستاں میں

سابقہ کتبِ سماویہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں اور دُشمنوں سے دوستوں جیسا سلوک کرتے ہیں اور یہ پوری اسلامی معاشرت کی جان لبِ لباب اور نچوڑ ہے کہ ہماری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے بلکہ راحت و آرام پہنچے اور اگر کسی سے ہم کو تکلیف پہنچ جائے تو ہم اُس سے اس کا بدلہ نہ لیں بلکہ اس کو آرام پہنچانے کی فکر میں لگیں جو ہمارے راہوں میں کانٹے بچھائیں اور ہم پر پتھر برسائیں، ہم ان کی راہوں میں پھول بچھائیں اور پھول کی بارش کریں جو ہمیں گالی دیں ہم اُسے بدلہ میں دعائیں دیں۔ کیا ہی خوب کہا۔

گالیاں عمر بھر جن سے کھاتے رہے
آپ ان کے لئے دُکھ اُٹھاتے رہے

حقیقت یہ ہے کہ تمام اولیاء اللہ کے اندر یہ صفت بھرپور طریقے سے پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابرار یعنی نیک لوگوں کی تعریف ہی اس طرح کی ہے:

﴿ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَ وَلَا يَرْضَوْنَ الشَّرَّ ﴾

(عمدة القاري شرح صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون)

کہ جو خود تکلیف سہتے رہتے ہیں اور نقصان اُٹھاتے رہتے ہیں، مگر چیونٹی تک کو بھی تکلیف نہیں دیتے۔ اس حسنِ معاشرت کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کل تک ان کے دُشمن تھے وہ دوست بن جاتے ہیں جو ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے وہ آج اُن پر پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک کا اعلان:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴾

(سورة حٰم سجدة، آيت: ۳۴)

ترجمہ: آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے پھر یکایک (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جن شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔ (معارف القرآن، ج: ۷، ص: ۶۴۹)

اس پر بزرگوں کے بہت سارے واقعات ہیں کہ جن میں ان کا حسنِ سلوک اپنے دُشمنوں کے ساتھ کرنے پر وہی دُشمن تائب ہو کر زندگی بھر کے لئے ان کے غلام اور دوست بن گئے۔

اتباعِ سنت فلاحِ دو جہاں کی ضامن ہے

جو چلا تیرے نقش قدم پہ
کامراں ہے وہ دونوں جہاں میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اللہ تعالیٰ نے دونوں جہاں کی کامیابیوں کو مضمر رکھا ہے۔ بدونِ اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں چین وسکون نصیب ہوسکتا ہے اور نہ آخرت میں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں محبوبیت ومغفرت کا وعدہ اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ (لوگوں سے) فرمادیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو۔ (معارف القرآن، ج:۲، ص:۵۴)

اور ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت: ۷۱)

ترجمہ: جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۲۳۸)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى قَالُوْا وَمَنْ يَّاْبٰى قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى﴾

(صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء، ج:۲، ص:۱۰۸۱)

میری تمام اُمت جنت میں داخل ہوگی سوائے ان کے جنہوں نے اعراض کیا۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا: یارسول اللہ! اعراض کرنے والا کون ہے؟ تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی تو تحقیق اُس نے اعراض کیا۔ (اور اس اعراض کی وجہ سے وہ جہنم کا مستحق قرار پایا۔) حضرتِ والا نے کیا ہی خوب فرمایا ہے ؎

نقشِ قدم نبی ﷺ کے ہیں جنت کے راستے
اللہ ﷻ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لئے نبی بنا کے بھیجے گئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو

ایسے طریقے زندگی گزارنے کے عطا فرمائے اور ایسی سنتیں آپ کے لئے مشروع فرمائیں جو بلا تفریقِ قوم و وطن اور بلا امتیازِ رنگ و نسل ہر دور اور ہر زمانے کے لئے کامیابی و کامرانی کی ضامن ہے۔ اس لئے بعض جاہل اور نادان مسلمان اس دور میں سنتوں پر چلنے کو مشکل قرار دے کر چھوڑ بیٹھتے ہیں اور بزبانِ حال گویا کہ وہ یوں دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ اس زمانے میں سنتوں پر عمل کرنے سے کام نہیں چلے گا اور یہ تو پہلے زمانے کی چیزیں ہیں اور گویا وہ اپنے عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کو اس دور کے لئے ناکافی اور غیر ضروری قرار دیتے ہیں جو سراسر ضلال اور گمراہی اور باعثِ شقاوت و بدبختی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

اور جو اللہ و رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

ہو قمر جیسے انجم میں روشن
آپ تھے محفلِ اختراں میں

اس شعر کی تشریح سمجھنے کے لئے اس سے پہلی نظم کا شعر: ''آپ کا مرتبہ اس جہاں میں'' کے تحت مراجعت فرمالیں۔

آپ کی شانِ بے انتہا کو
کس طرح لائے اختر بیاں میں

دیکھئے گزشتہ نظم کا یہ شعر: ''کیا کہوں رفعتِ شانِ گنبد''

سوئے طیبہ چلے جب نبی ﷺ کے قدم

میری قسمت کہاں یہ طوافِ حرم
جس زمیں پر چلے تھے نبی کے قدم

جس سے چپکے تھے کل سینۂ انبیاء
میرے سینے کو حاصل ہے وہ ملتزم

معجزہ ہے کہ آلاتِ پیمانہ تھے
وسطِ دنیا میں ہے کعبۂ محترم

اور بنوایا گھر اپنا یوں مختصر
سہل ہو تاکہ سب کو طوافِ حرم

ورنہ مالک اگر گھر بناتا بڑا
کھا کے غش گرتے سب زائرانِ حرم

اپنے کعبہ کا پھیرا کیا مختصر
صاحبِ بیت کی ہے یہ شانِ کرم

گو حرم کے پہاڑوں پہ سبزہ نہیں
ہیں مگر دوستو! پاسبانِ حرم

ورنہ حاجی درختوں میں بیٹھے ہوئے
کیمرے میں لیا کرتے باغِ حرم

ربِّ کعبہ سے بھی اور کعبہ سے بھی
دور کردیتے ہم کو جبالِ حرم

ان پہاڑوں پہ بھی حفظِ توحید کا
ربّ کی جانب سے ہے انتظامِ حرم

یہ بھی ہجرت کا اک رازِ تکوین ہے
ورنہ روضہ بھی ہوتا جوارِ حرم

قلبِ عاشق کے دو ٹکڑے ہوتے یہاں
درمیانِ حرم روضۂ محترم

جاکے طیبہ میں دے سبز گنبد پہ جاں
اور مکہ میں ہوجا فدائے حرم

بت وطن کے بھی ہجرت سے سب گر گئے
سوئے طیبہ چلے جب نبی کے قدم

آپ کے گھر میں اخترؔ کی یہ حاضری
ایک نااہل پر ہے خدا کا کرم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **آلاتِ پیمانہ**: پیمائش کرنے کے آلات۔ **سہل**: آسان۔ **غش کھانا**: بے ہوش ہونا۔ **زائران**: زیارت کرنے والے۔ **صاحبِ بیت**: اللہ تعالیٰ۔ **سبزہ**: ہریالی۔ **پاسبان**: حفاظت کرنے والا۔ **جبال**: پہاڑ۔ **حفظِ توحید**: وحدانیت کی حفاظت۔ **رازِ تکوین**: یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ **جوار**: پڑوس۔ **بت وطن**: یعنی وطن کی محبت۔ **سوئے طیبہ**: مدینہ شریف کی طرف۔

اے خوشا! قسمت میری

میری قسمت کہاں یہ طوافِ حرم
جس زمیں پر چلے تھے نبی کے قدم

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ﴾
(سورۃ الحج، آیت:۲۷)

ترجمہ: اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دور سے۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۲۵۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان کا اثر ہے کہ ہر چہار اطرافِ عالم سے لوگ جوق در جوق بیت اللہ کی طرف رُخ کرتے ہیں اور گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس آواز پر جو اللہ تعالیٰ نے اُن تک پہنچائی وہ لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ ادوارِ سابقہ میں جبکہ بیت اللہ تک پہنچنا بہت ہی مشقت اور تکلیف کا باعث تھا اور لمبے لمبے سمندری سفر طے کر کے آنا پڑتا تھا مگر پھر بھی ہر زمانے میں لوگ بڑی کثرت کے ساتھ بیت اللہ پر حاضری دے کر حج بیت اللہ سے مشرف ہوتے تھے۔ یہ درحقیقت اللہ کے بندوں کی خوش نصیبی اور سعادت کا حصہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے گھر تک بلا لیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کیونکہ یہ بیت اللہ احکم الحاکمین اور ملک الملوک کا گھر ہے، اس لئے اُس احکم الحاکمین کا اپنے بے کس بے بس ماءِ مھین سے وجود میں آنے والے بندے کو اپنے در پر حاضری کی سعادت بخشنا یہ صرف اُس اللہ کے فضل ہی سے ممکن ہے اور بلاشبہ خوش نصیبی اور سعادت مندی کی ایک علامت اور پہچان ہے۔

محض روپیوں، پیسوں اور دولت کی بھر مار ہو جانے سے یہ ضروری نہیں کہ بندہ وہاں حاضری دے سکے اور اللہ کے گھر کے طواف سے مشرف ہو۔ چنانچہ کتنے ہی اغنیاء و رؤساء دنیا میں رہ کر اس حسرت کو اپنے دل میں لئے چلے جاتے ہیں مگر انہیں یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔

اس لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم پہلے ہی شعر میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل خاص کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ مجھ جیسے ناکارہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی سرزمین پر اپنے گھر بلا کر اُس کے طواف کرنے کی سعادت بخشی، یہ میری خوش قسمتی اور سعادت ہے ورنہ مجھ میں کیا استحقاق اور کون سی خوبی اور کمال کہ میں یہاں پہنچ کر اللہ کے گھر کا طواف کروں۔

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو شکر کی حقیقت یہی ہے کہ بندہ دل سے اس بات کا معترف ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو نعمتیں میسر آئی ہیں میں ان کا مستحق نہیں ہوں بلکہ بلا استحقاق اللہ نے عطا کی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ شیطان نے جب حضرتِ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور حضرتِ آدم علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے بلند و برتر ہونے کا دعویٰ اور استحقاق پیش کیا کہ آدم مٹی سے بنے ہیں اور میں آگ سے بنا ہوں اور آگ کی خصوصیت اونچا اور بلند ہونا ہے اور مٹی کی خصوصیت نیچا اور پست ہونا ہے۔ تو میں اس کا مستحق ٹھہرا کہ آدم مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ اس کو قرآن نے "استکبار" سے تعبیر کیا اور شیطان کو متکبر فرمایا۔

یاد رکھئے! تشکر اور تکبر میں تضاد ہے جو متکبر ہوگا وہ شاکر نہیں ہوسکتا اور جو شاکر ہوگا وہ متکبر نہیں ہوگا، اس لئے ہمیشہ ہر حاصل ہونے والی خیر اور بھلائی کو بلا استحقاق محض اللہ کا فضل و کرم سمجھنا چاہیے۔

جیسا کہ حضرت نے اس عظیم نعمت (طوافِ بیت اللہ) کو محض اپنے اوپر اللہ کا فضل اور احسان قرار دیا تو اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ بندے پر اپنی نعمتوں میں مزید اضافہ فرماتے ہیں جس کا وعدہ قرآن پاک میں ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ۔

مقامِ ملتزم اور آداب

جس سے چپکے تھے کل سینۂ انبیاء
میرے سینے کو حاصل ہے وہ ملتزم

بیت اللہ کا وہ حصہ کہ جو بیت اللہ کی چوکھٹ اور حجرِ اسود کے درمیان میں ہے ملتزم کہلاتا ہے اور یہ دعا کی قبولیت کے مقامات میں سے ایک اہم ترین مقام ہے۔ اس لئے حجاج اور معتمرین وہاں پر حاضر ہوکر دعا کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس میں شک بھی کیا ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ایسا مقام ہے جہاں انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام اور اُمت کے اسلاف و اکابر چمٹ کر دعائیں مانگتے تھے اور اپنی مرادوں اور مقصودوں میں کامیاب ہوتے تھے۔

البتہ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آج کل عام طور پر لوگ ملتزم پر خوشبو لگا دیتے ہیں، اس لئے احرام کی حالت میں نہ تو ملتزم کو ہاتھ لگائیں اور نہ چمٹیں بلکہ ملتزم کے سامنے جتنا قریب ممکن ہو خوب الحاو زاری سے دعا کریں۔ ہاں! اگر آپ احرام کی حالت میں نہ ہوں تو اس وقت ملتزم سے چمٹ کر خوب دعائیں مانگنی چاہیے لیکن اس میں بھی یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ کسی مسلمان بھائی کو اپنی جانب سے ایذاء پہنچانا یا کسی نامحرم عورت سے اپنے بدن کو ملانا باعثِ حرمان وخسران ہے۔ آج کل کثرت سے ایسا دیکھنے میں آرہا ہے کہ لوگ دوسرے کی تکلیف کی پرواہ کئے بغیر اور عورتوں سے دھکم پیل ہوجانے کی پرواہ کئے بغیر ملتزم سے چمٹنے کو بڑی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ ایذائے مسلم اور نامحرم عورت سے بدن کا لگانا یہ دونوں بدترین گناہ ہیں تو محض ایک مستحب پر عمل کرنے کے

لئے حرام کا ارتکاب قطعاً جائز نہیں۔ اس لئے اگر ان دو باتوں کا خیال کر کے بآسانی ملتزم سے چمٹنا میسر ہو تو اس سعادت سے ضرور بہرہ ور ہونا چاہیے جس کی آسان صورت یہی ہے کہ ایسے اوقات کا پتہ لگائیں جن میں ملتزم کے پاس زیادہ ازدحام نہیں ہوتا اور اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

کعبہ کا وسطِ دنیا میں ہونا آپ ﷺ کا معجزہ ہے

معجزہ ہے کہ آلات پیمانہ تھے
وسط دنیا میں ہے کعبۂ محترم

یہاں سے حضرتِ والا خانۂ کعبہ اور اس کے اطراف کے جائے وقوع اور اندازِ وقوع اور کیفیت وقوع کے حکم و مصالح کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جن حکم و مصالح پر غور کرنے کے بعد ہمیں یہ بات روزِ روشن کی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ واقعی یہ گھر علیم و حکیم ذاتِ عالی کا گھر ہے۔

لیکن اللہ کا طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں پر بہت سے اسرار و حکم کھول دیتے ہیں اور اپنے احکام کے مصالح و فوائد ان کے قلوب پر القا فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ مختلف احادیثِ مبارکہ میں یہ مضمون مذکور ہے۔ چنانچہ جن حکمتوں کا حضرتِ والا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ اسی طرح حضرتِ والا کے قلبِ مبارک پر اللہ تعالیٰ نے القاء فرمائی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ان مصالح و حکم کا انحصار بس انہی چند پر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ہر معاملے اور فیصلے کے پیچھے اس قدر حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں کہ جن کا علم صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرتِ والا ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ جس خانۂ کعبہ کو اہلِ اسلام کا قبلہ قرار دیا گیا اور جس کی جانب رُخ کرنا ہر نماز میں فرض اور اس کا طواف ادائیگیٔ حج کے لئے لازم قرار دیا گیا تو اس خانۂ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے پوری روئے زمین کے وسط میں بنایا ہے۔ اگر چاروں طرف سے زمین کی پیمائش کی جائے تو بیت اللہ کا جائے وقوع بالکل سینٹر (Centre) اور وسط میں ہے۔

صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں نہ تو جدید نوعیت کے آلاتِ پیمائش تھے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی تعلیمی ادارے سے پڑھ کر اس نوع کے مسائل کو باقاعدہ سیکھے ہوئے تھے بلکہ تاریخی دلائل سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سامنے رہ کر اس سے کچھ نہیں پڑھا۔ اسی لئے آپ کا لقب اُمّی ہے اور یہی اُمّی ہونا آپ کے لئے باعثِ شرف و عزت اور آپ کی نبوت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل تھا۔ جس سے ہر ذی عقل و شعور بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اُمّی ہونے کے باوجود آپ کو اس قدر علوم عطا کیا جانا کہ قیامت تک آنے والے ذہین و فطین انسان ان کی شرح و بسط کرنے میں اپنی عمریں خرچ کر ڈالیں مگر پھر

بھی حق ادا نہ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی ایک واضح دلیل ہے، زکی کیفی نے خوب کہا ہے ؎

عمر گزری ترے جلوؤں کا فسانہ کہتے
اور اب تک ترے جلوؤں کا بیاں باقی ہے

لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ وقبلہ خود آپ کی نبوت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل اور معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے ایک غیر مسلم محقق ریسرچ کرنے والے (Researcher) نے اپنی تحقیق میں یہ بات پیش کی ہے کہ پوری دنیا کا بالکل وسط اور سینٹر مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا گھر چھوٹا کیوں؟

اور بنوایا گھر اپنا یوں مختصر
سہل ہو تا کہ سب کو طوافِ حرم

اس شعر میں حضرتِ والا بیت اللہ کے مختصر ہونے کی حکمت بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خانۂ کعبہ کو اس لئے مختصر فرمایا تاکہ میرے بندوں کے لئے میرے گھر کا طواف آسان ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ دینی احکام دے کر اپنے بندوں کو حرج وتنگی میں ڈالنا نہیں چاہتے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی حرج اور تنگی نہیں رکھی اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا﴾

(سورۃُ النسآء، آیت: ۲۸)

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے، اور انسان بنا ہے کمزور۔ (معارف القرآن، ج:۲ ص:۳۷۴)

اس لئے حدیثِ پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنۡ اَمَّ قَوۡمًا فَلۡیُخَفِّفۡ فَاِنَّ فِیۡہِمُ الضَّعِیۡفَ وَالۡکَبِیۡرَ وَالۡمَرِیۡضَ وَذَا الۡحَاجَةِ﴾

(مسند احمد بن حنبل، ج:۳، ص:۲۱۶، دار النشر، مؤسسة قرطبة)

جو کسی قوم کی امامت کرے تو مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز میں تخفیف کرے، آسانی کرے کیونکہ ان میں ضعیف، عمر رسیدہ، بیمار اور ضرورت مند لوگ ہوتے ہیں۔

ورنہ مالک اگر گھر بناتا بڑا — کھا کے غش گرتے سب زائرینِ حرم
اپنے کعبہ کا پھیرا کیا مختصر — صاحبِ بیت کی ہے یہ شانِ کرم

صاحبو! میرا مقصود ان آیات اور حدیث سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑے رحیم ہیں اور مشروعیتِ احکام میں اپنے بندوں کے ضعف وکمزوری کا لحاظ فرماتے ہیں، اس لئے اس پسِ منظر میں اس حکمت کا

سمجھنا آسان ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے گھر کو بڑا بناتے تو پورا طواف تو کیا طواف کا ایک پھیرا بھی اتنا مشکل ہوتا کہ یہ ضعیف وکمزور انسان غش کھا کر گر جاتا، اس لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا فضل وکرم فرمایا کہ اپنے گھر کو مختصر بنایا تاکہ بیت اللہ کا طواف سہل اور آسان ہو جائے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرتِ والا سے یوں سوال کیا کہ حضرت! اللہ تعالیٰ کا گھر تو بہت بڑا ہونا چاہیے کیونکہ جو جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے وہ اپنا محل بھی اتنا ہی عظیم الشان اور بڑا بناتا ہے۔

چنانچہ سلاطینِ دنیا بڑے طویل وعریض رقبے میں اپنے شاہی محلات تعمیر کرتے ہیں۔ اس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا کہ میاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنا گھر بڑا بنا دیتے اور مانو کہ کراچی سے جدہ تک کے طویل وعریض رقبے میں اللہ کا گھر ہوتا تو طواف کے ایک ہی پھیرے میں تمہاری کمر ٹوٹ جاتی۔ اسی کو حضرتِ والا نے شعر میں فرمایا ؎

سادگیٔ حرم کی جغرافیائی صورتحال

گو حرم کے پہاڑوں پہ سبزہ نہیں ہیں مگر دوستو! پاسبانِ حرم
ورنہ حاجی درختوں میں کھوئے ہوئے کیمرے میں لیا کرتے باغِ حرم
ربِ کعبہ سے بھی اور کعبہ سے بھی دور کردیتے ہم کو جبالِ حرم
ان پہاڑوں پہ بھی حفظِ توحید کا رب کی جانب سے ہے انتظامِ حرم

یہاں سے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ حرم کے اردگرد کے پہاڑوں کی جغرافیائی (Geographical) صورتحال پر خاص حکیمانہ انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں جو اللہ نے حضرتِ والا کے قلبِ مبارک پر اس کی خاص حکمت ومصلحت القاء فرمائی۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پہاڑوں کو جو حرم کے اردگرد ہیں سیدھا سادہ بنایا اور سرسبز وشاداب مناظر اور حسین اشجار وانہار سے بھرپور خوبصورت، دلکش نظارے سے آراستہ وپیراستہ نہیں کیا اور نہ ان کو دنیا کے بہت سے حسین پہاڑوں کی طرح حسن وخوبصورتی کا پیکر بنایا اور دل کو لبھانے والی سینری (Scenery) بنایا کیونکہ اگر ایسا کر دیا جاتا تو پھر لوگ حرم میں آکر وہاں کے سرسبز وشاداب مناظر کی تصویر کشی میں اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کرتے اور اُس خانۂ کعبہ میں پہنچ کر بھی جو کہ مرکزِ توحیدِ خداوندی ہے اس سے اپنے اللہ کی یاد اور اس کے تذکروں کو چھوڑ کر ان پہاڑوں کے رنگ برنگ نظاروں میں کھوئے رہتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اللہ کے گھر میں آکر اللہ سے اور کعبہ میں آکر ربِ کعبہ سے دور ہو جاتے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے گھر کے اردگرد کو ظاہری زیبائش وآرائش سے خالی رکھا تاکہ دل ایک اکیلے اللہ کی طرف رہے جو کہ ایک سچے موحد اور مؤمن بندے کی شان ہے تو گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان پہاڑوں کو ظاہری خوبصورتی اور رونق سے خالی کر کے اپنے

بندوں پر بڑا فضل فرمایا اور ہماری حفاظتِ توحید کا بھرپور انتظام کیا۔

جبکہ ہر مؤمن کو حرم کے یہ پہاڑ انتہائی عزیز اور محبوب ہوتے ہیں، اسی لئے قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے شعائر اللہ کی تعظیم کو مؤمن کے ایمان اور اس کے تقویٰ کی نشانی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ﴾

(سورۃ الحج، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے۔ (معارف القرآن، ج:۶،ص:۲۶۱)

اس لئے حرم کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی پاکی اور بزرگی کا ترجمان ہے۔ اسی لئے حدودِ حرم میں نیکی کا اجر و ثواب بڑھا دیا جاتا ہے اور گناہ پر سزا بھی بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسا کہ **"مُعلِّم الحجّاج"** کے مصنف صفحہ: **۳۱۳** پر فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اگر میں طائف میں پچاس گناہ کروں وہ مکہ مکرمہ میں ایک گناہ کرنے سے میرے نزدیک اچھے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کسی شہر میں صرف ارادے پر عمل کرنے سے پہلے مؤاخذہ نہیں ہوتا لیکن مکہ مکرمہ میں ارادے پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾

(سورۃ الحج، آیت: ۲۵)

ترجمہ: اور جو اس میں چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے، اسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک۔

(معارف القرآن، ج:۶،ص:۲۵۱)

صاحبو! حرم، حدودِ حرم اور جبالِ حرم ان سب کی تعظیم و احترام مؤمن پر لازم اور ضروری ہے۔ تقریرِ بالا سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان پہاڑوں کو ظاہری زیب و زینت سے خالی رکھنے کا راز خود بندوں کے فوائد و مصالح کا لحاظ رکھنا ہے تاکہ زائرینِ حرمِ پاک کلی طور پر یکسو ہو کر اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ رہیں اور اللہ کے گھر میں رہ کر قلب و نظر کا محور و مرکز بس ایک اکیلے اللہ کی ذات ہو۔

ہجرت کا ایک تکوینی راز

یہ بھی ہجرت کا اک رازِ تکوین ہے ورنہ روضہ بھی ہوتا جوارِ حرم
قلبِ عاشق کے دو ٹکڑے ہوتے یہاں درمیانِ حرم روضۂ محترم
جا کے طیبہ میں دے سبز گنبد پہ جاں اور مکہ میں ہوجا فدائے حرم

حضرتِ والا دامت برکاتہم یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانے کا ایک تکوینی راز بیان فرمارہے ہیں جو کہ بالکل وہبی اور الہامی ہے۔ احقر راقم السطور نے اس راز کو نہ کبھی کسی سے سنا اور نہ کسی کتاب میں نظر سے گزرا۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے مدینے ہجرت فرمانے کا حکم اس لئے دیا تاکہ آپ کے بعد جب لوگ بیت اللہ پر حاضری دیں تو ان کے دل و دماغ پر انوارِ بیت اللہ چھائے رہیں اور وہ پورے طور پر یکسوئی کے ساتھ اللہ کے گھر کے طواف کرنے میں مشغول رہ کر اپنے جذباتِ محبت وعقیدت بارگاہِ ربّ العزت میں پیش کرتے رہیں اور خدا کا گھر اس کو خدا کی یاد میں منہمک رکھے اور گھر کے سامنے کھڑے ہو کر گھر والے کی یاد سے دل و دماغ کو معمور رکھے اور اس کا قلب کسی دوسری جانب مائل و راغب ہو کر منقسم نہ ہو جبکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت نہ فرماتے تو آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کا روضہ (قبرِ مبارک) یہاں حرمِ مکی میں ہوتا تو جب آپ کے عشاق یہاں حاضر ہوا کرتے تو ان کے جذباتِ محبت وعقیدت دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتے اور قلب وجگر کے دو ٹکڑے ہوتے جس کو حضرت یوں فرماتے ہیں کہ ''درمیانِ حرم اور روضۂ محترم'' قلبِ عاشق کے دو ٹکڑے ہو جاتے نہ تو وہ پوری یکسوئی کے ساتھ دربارِ رسالت میں گنبدِ خضراء پر فدا ہو پاتا اور نہ ہی تجلیاتِ الٰہیہ اور بیت اللہ کے انوارات سے پورے طور پر متجلی اور مستفید ہو پاتا کیونکہ ایک مسلمان کے لئے یہ دونوں اس کے جذباتِ محبت وعقیدت فدا کرنے کے مرکز ہیں کہ ہر مؤمن کے دل میں ان سے صرف تعلق ہی نہیں بلکہ انتہائی درجے کی محبت اور گہری وابستگی پائی جاتی ہے، اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے کہ دونوں مقامات کو ایک مخصوص فاصلے پر رکھا یہ ایک ایسا فطری وذوقی معاملہ ہے کہ جس کو ہر مؤمن بغیر کسی دلیل کے بآسانی محسوس کرسکتا ہے۔

وطن کی محبت پر اللہ کے حکم کو ترجیح

بت وطن کے بھی ہجرت سے سب گر گئے
سوئے طیبہ چلے جب نبی ﷺ کے قدم

اس شعر میں ہجرت کی ایک دوسری حکمت کو ذکر کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ (زاد ھمَا اللہُ شرفًا و عظمةً) کی طرف ہجرت فرما کر اُمت کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وطن پرستی کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ اسلام وطنی عصبیت کو عصبیۃ جاہلیۃ قرار دیتا ہے۔ صرف اخوت فی الاسلام اور تناصر علی الحق (حق پر ایک دوسرے کی مدد کرنا) کا قائل ہے اور انصارِ مدینہ کے ساتھ ہجرت کے بعد پوری زندگی گزار کر آپ نے اُمت کے لئے ایک بہترین اُسوۂ چھوڑا کہ وطن کی محبت اگرچہ فطری امر ہے لیکن اللہ کے حکم اور اس کے دین کے تقاضوں کی راہ میں آڑ نہ بننی چاہیے۔ ورنہ اُسے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کی دودھاری تلوار سے ذبح کردو تاکہ وہ راہِ خداوندی میں رکاوٹ نہ بنے اور جب بھی دین کی خاطر ترکِ وطن کی نوبت آئے تو وطن کی محبت کو پیچھے ڈال دے۔

حاضریٔ حرم، محض اللہ کا کرم

آپ کے گھر میں اختؔر کی یہ حاضری
ایک نا اہل پر ہے خدا کا کرم

حضرتِ والا نے اس نظم کی ابتداء و انتہاء دونوں میں اپنے نا اہل ہونے اور حاضریٔ حرمین شریفین کی نعمتِ عظمیٰ کے غیر مستحق ہونے کے باوجود اپنے اللہ کی عظیم نعمت اور اس کے فضل و کرم کو ذکر فرمایا ہے کہ اس نعمت کے حصول کا یہ بندۂ ناکارہ بالکل مستحق نہ تھا بس اللہ نے فضل فرما کر مجھے یہ سعادت بخش دی۔

قرآن میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ کہ تمہیں جو بھی نعمت حاصل ہو رہی ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے: مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ کہ تمہیں جو بھی بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تمہارے اپنے کمال کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

حضرت تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بندے کو ہر وقت یہ سوچنا چاہیے کہ جو بھی خوبی مجھ کو حاصل ہوئی ہے تو اولاً تو یہ میری ذاتی نہیں بلکہ محض عطائے الٰہی ہے۔ ثانیاً اس کے قبولیت کی کوئی ضمانت اور گارنٹی (Guarantee) نہیں، شاید بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو یا نہ ہو۔ ثالثاً اخیر تک اس پر بقاء اور ثبات قدمی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ جب یہ تین باتیں ذہن میں رہیں گی تو ان شاء اللہ عجب و کبر سے حفاظت رہے گی، اس لئے اہل اللہ اس سے غافل نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ اخیر میں بھی حضرت نے ارشاد فرمایا کہ حاضریٔ حرمین شریفین کی نعمت محض فضلِ خدا تعالیٰ ہے۔

شرقی ہوں یا غربی، دل مرا حجازی ہے

دل تڑپتا ہے میرا سینے میں
ہائے پہنچوں گا کب مدینے میں
قلب جس کا نہ ہو مدینے میں
اس کا جینا ہے کوئی جینے میں

چونکہ ہر مؤمن کا ایمانی اور روحانی رشتہ جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے، اگرچہ وہ رنگ و نسل، شکل و صورت کے اعتبار سے کسی بھی قوم و وطن سے تعلق رکھتا ہو، مگر اپنے اس رشتے کے اعتبار سے وہ مدنی و حجازی ضرور ہے۔ ہندی ہو یا پاکستانی، ترکی ہو یا ایرانی، مشرقی ہو کہ مغربی شمالی ہو کہ جنوبی دل و دماغ کے اعتبار سے اور سوچ و فکر کے اعتبار سے اس کے لیے مدنی و حجازی ہونا ایک ضروری امر ہے۔ اس لئے کہ مدینہ منورہ ہمارے محبوب و پسندیدہ دینِ اسلام کا مرکز اور ہماری جانوں سے زیادہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن اور وطن ہے جن

سے محبت کرنا ہر مؤمن کے ایمان کا جزوِ لازم ہے کہ جس کے بغیر کمالِ ایمانی ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرّسول ﷺ من الایمان، ج: ۱، ص: ۷)

تم میں سے کوئی شخص مؤمنِ کامل نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ میں اس کو اس کے والد و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

صاحبو! ایک مسلمان کو مدینہ سے محبت ہونے کے لئے اور اس کو مدینہ سے دلی وابستگی اور تعلق کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ مدینہ منورہ ہمارے محبوب آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے کیونکہ محبت کا فطری اصول ہے کہ محبوب کی ہر شئے عزیز ہو جاتی ہے۔ جگر نے کہا ہے ۔

بھول سکتا ہوں کہیں ان کی محبت کے مزے

میری آنکھوں میں وہ ایک ایک ادا پھرتی ہے

بالخصوص جبکہ فرمانِ نبوی کے مطابق مدینہ پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی زیارت کرنے والا۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

﴿عَنْ حَاطِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ وَمَنْ مَاتَ بِاَحَدِ الْحَرَمَیْنِ بُعِثَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾

(شعب الایمان للبیہقی، فضل الحج والعمرۃ، ج: ۳، ص: ۴۸۸، مکتبۃ دار الباز مکۃ المکرّمۃ)

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری وفات کے بعد میری (قبر کی) زیارت کی۔ اُس نے گویا میری زندگی ہی میں مجھ کو دیکھا اور جو حرمین (مکہ مکرّمہ یا مدینہ منورہ) دونوں میں سے کسی میں وفات پائے گا قیامت کے دن ان لوگوں کے ساتھ اُٹھایا جائے گا جو خدا کی حفظ وامان میں ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ مسلمان عمر بھر اس تمنا میں گزار دیتا ہے کہ کاش! مجھے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میسر آجائے تو جبکہ روضۂ اقدس کی زیارت پر اُس کے دل کی یہ مراد برآتی ہے تو پھر کیوں ہر مسلمان کا دل مدینہ جانے کے لئے بے قرار نہ ہوگا۔ کیا ہی خوب کہا ۔

وہ دن خدا کرے کہ مدینے کو جائیں ہم

خاکِ درِ رسول کا سرمہ بنائیں ہم

اور ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی بدنصیبی اور محرومی کیا ہوسکتی ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

کے بغیر زندگی گزار رہا ہو تو نہ اُسے مکین کی محبت ہے نہ مکان کی۔ نہ اُس کے دل میں زیارتِ مدینہ کا شوق ہے اور نہ لقائے آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کا، یہ زندگی کوئی زندگی کہلانے کے قابل نہیں۔ اس لئے حضرت والا نے ارشاد فرمایا۔

قلب جس کا نہ ہو مدینے میں
اس کا جینا ہے کوئی جینے میں

فیضانِ مدینہ ہے یہ فیضانِ مدینہ

ساحل سے لگے گا کبھی میرا بھی سفینہ
دیکھیں گے کبھی شوق سے مکہ و مدینہ

مؤمن جو فدا نقشِ کفِ پائے نبی ہو
ہو زیرِ قدم آج بھی عالم کا خزینہ

گر سنتِ نبوی کی کرے پیروی اُمت
طوفاں سے نکل جائے گا پھر اس کا سفینہ

یہ دولتِ ایمان جو ملی سارے جہاں کو
فیضانِ مدینہ ہے یہ فیضانِ مدینہ

جو قلب پریشاں تھا سدا رنج و الم سے
فیضانِ نبوت سے ملا اُس کو سکینہ

جو دردِ محبت کا ودیعت تھا ازل سے
مؤمن پہ ہوا کشف وہ مدفون خزینہ

اے ختمِ رُسل! کتنے بشر آپ کے صدقے
ہر شر سے ہوئے پاک ہوئے مثلِ نگینہ

خالی تھا جو انوارِ محبت کی رمق سے
اک آگ کا دریا سا لگے ہے وہی سینہ

صدقے میں ترے ہوگیا وہ رہبرِ اُمت
جو کفر کی ظلمت سے تھا اک عبدِ کمینہ

اے صلِ علیٰ آپ کا فیضانِ رسالت
جو مثلِ حجر تھا وہ ہوا رشکِ نگینہ

جو ڈوبنے والا تھا ضلالت کے بھنور میں
اب رہبرِ اُمت ہے وہ گمراہ سفینہ

جو کفر کی ظلمات سے تھا ننگِ خلائق
ہے نورِ ولایت سے منوّر وہی سینہ

اختر کی زباں اور شرفِ نعتِ محمد ﷺ
اللہ کا احسان ہے بے خون و پسینہ

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **سفینہ**: کشتی۔ **فدا نقشِ کفِ پائے**: جو اتباعِ سنت میں جان کی بازی لگا دے۔ **زیرِ قدم**: قدموں کے نیچے۔ **خزینہ**: دولت۔ **سدا**: ہمیشہ۔ **رنج و الم**: دکھ و درد۔ **سکینہ**: چین۔ **ودیعت**: امانت۔ **ازل**: پہلے سے۔ **کشف**: کھل گیا۔ **مدفون**: دفن کیا ہوا۔ **مثلِ حجر**: پتھر کی طرح۔ **رشکِ نگینہ**: موتی بھی رشک کرنے لگا۔ **ضلالت**: گمراہی۔ **بھنور**: ڈوبنے کی جگہ۔ **ننگِ خلائق**: جو مخلوق کو شرما دے۔ **منوّر**: روشن۔

اللہ سے حسنِ ظن عبادت ہے

ساحل سے لگے گا کبھی میرا بھی سفینہ
دیکھیں گے کبھی شوق سے مکہ و مدینہ

ایک حدیثِ قدسی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرد علی الجھمیۃ وغیرھم التوحید، ج:۲، ص:۱۱۰۱)

کہ میں بندے کے ساتھ ویسا معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان کرتا ہے۔ اس لئے کسی بھی مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں سے کسی بھی حال میں مایوس و نا اُمید نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہر نیک تمنا کو پورا کرنے کے لئے اُس کے ضروری اسباب اختیار کرتا رہے اور اُس کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے **فضل** و کرم کا اُمیدوار رہے۔ خواہ بظاہر ہماری کوششیں کیسی ہی معمولی اور کمزور ہوں، مگر کبھی بھی اپنی سعی وکوشش پر نظر نہ کرے بلکہ اس اللہ کی قدرت وقوت پر مکمل بھروسہ اور اعتماد رکھے کہ جس کی قدرت کا یہ عالم ہے **اِذَا اَرَادَ شَیْئًا قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن** کہ جب اللہ کسی چیز کو چاہتے ہیں تو اُس سے کہتے ہیں کہ تو ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اُمید رکھنے میں کبھی بھی دل میں اس طرح کے خیالات کو جگہ نہ دے کہ کیسے ہوگا؟ کب ہوگا؟ کہاں سے اور کیونکر ہوگا؟ اقوالِ سلف، جلد:۶، صفحہ:۵۵۸ پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ کام میں لگئے اور تجویز کو فنا کیجئے یہ نہ سوچئے کہ کام اس طرح کرنا ہے، اس طرح ہونا چاہیے، اس وقت جو اختیار میں ہے شروع کر دیجئے کیا نتیجہ ہوگا؟ کیونکر ہوگا؟ کس طرح ہوگا؟ ان باتوں سے ہمت میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اگر مگر اور شاید وغیرہ نوع کے اندیشوں اور وہموں کو دل میں جگہ نہ دے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ مجھ سے پُراعتماد طریقے پر اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کی بھیک مانگے اور دل میں قبولیت کے یقین کے ساتھ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے اور مجھ سے مانگنے کے بعد بےفکر اور مطمئن ہوجائے۔ کیونکہ میں حکیم ہوں، میرا ہر عمل حکمتوں پر مبنی ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کس بندے کی مطلوبہ حاجتیں کب پوری کرنے میں اس کے لئے حکمت ومصلحت ہے۔

ہمارا کام در کھٹکھٹانا ہے

کسی کو جلدی، کسی کو تاخیر سے دینے میں، کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے میں، کسی کو اس کی مطلوبہ شئے اور کسی کو اُس کا نعم البدل دینے میں غرض یہ کہ تم اپنا کام کرو اور میں اپنا کام کروں گا۔ اسی کو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پہ ہو کیوں تری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

یعنی بندے کا کام بندگی کرنا اور مانگنا ہے۔ مسلسل اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہنا ہے۔ خواہ اس کو جواب مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔ درحقیقت مختصر لفظوں میں اسی کو توکل کہتے ہیں کہ بندہ اسباب اختیار کر کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے۔ پھر اللہ کی طرف سے جو بھی فیصلہ ہو اُسے اپنے لئے خیر سمجھے۔

اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں حضرت والا کے شعر کا خلاصہ یہ ہوا کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے در سے اُمید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ ان شاء اللہ عنقریب وہ دن آئے گا کہ جب ہماری اُمیدوں اور تمناؤں کے مرکز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ حاضری کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا اور ہمیں حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوگی۔ پھر ہم فرطِ محبت سے مکہ اور مدینہ کا دیدار کریں گے۔ فرحت ومسرت کے ساتھ اپنے جذباتِ عقیدت ومحبت بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ بارگاہِ ربّ العزت میں سربسجود ہوکر اپنی آہوں اور نالوں سے خدائے وحدہٗ لاشریک کو رو رو کر منائیں گے۔ اپنی بگڑی حالت سنواریں گے اور اپنے مولیٰ سے رو رو کر مولیٰ کو مانگیں گے۔ اللہ والوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بیت اللہ پہنچ کر بڑی آہ وزاری اور درد وتڑپ کے ساتھ اللہ سے اللہ کو مانگا کرتے تھے جیسے کہ مچھلی بغیر پانی کے تڑپ رہی ہو اور یہ شعر پڑھتے تھے ؎

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

یہ تڑپنے کی ادا اللہ والوں ہی سے ملتی ہے۔ چنانچہ ہمارے حضرت والا کی زندگی کا سب سے پہلا شعر ہے ؎

دردِ فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت پر اِک ماہیٔ بے آب ہے

عقلمند اپنے دوست کی اتباع کرتا ہے نہ کہ دشمن کی

مؤمن جو فدا نقشِ کفِ پائے نبی ہو
ہو زیرِ قدم آج بھی عالم کا خزینہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو ہدایت وضلالت کے راستوں کو پہچاننے اور سمجھنے کے لئے دل ودماغ اور نظر وفہم عطا فرمایا۔ اس کے سامنے دونوں راستوں کے نفع وضرر کو واضح کر دیا ہے۔ ایک رحمٰن کا راستہ ہے جو بندے کو اُس کے خالق سے ملاتا ہے اور ایک شیطان کا راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اپنے خالق و مالک کے عتاب وعقاب، غصہ اور غضب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت ۲۰۸)

ترجمہ: اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۹۷)

اور دُشمن کے نقشِ قدم پر چل کر سوائے تباہی وبربادی کے کچھ بھی حاصل نہیں اور اللہ اہلِ ایمان کا دوست ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جانوں سے زیادہ ہمارے قریب ہیں اور ہمارے ایمان وہدایت اور اصلاحِ حالت اور جہنم سے نجات کے بہت حریص اور فکر مند ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہ اللہ اہلِ ایمان کے دوست ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ اور فرمایا حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ لہٰذا دانشمندی اور عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم شیطان کا کہنا نہ مانیں بلکہ رحمٰن کی فرمانبرداری کریں اور شیطان کے نقوشِ قدم کی اتباع نہ کریں بلکہ نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اگر چہ آپ کی اتباع میں ہمیں اپنی جان ومال فدا کرنا پڑے تو ان شاء اللہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا عالم اور اُس کے خزانے اور بڑے بڑے ملوک وسلاطین آپ کی غلامی کی بدولت مغلوب ومقہور رہوں گے اور دنیا بھر کے خزانے زیرِ قدم نظر آئیں گے۔ اور وہ دُشمنانِ عالم کی تمام سازشیں اور مکر وفریب ایسے ہی صاف ہوتے نظر آئیں گے۔ جیسے مکڑی کے جالے کو ایک معمولی سی جھاڑو سے صاف کر دیا جاتا ہے اور اس کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔

گر سنتِ نبوی کی کرے پیروی اُمت
طوفاں سے نکل جائے گا پھر اس کا سفینہ

یہی وہ مضمون ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس تاریخی ارشاد میں ذکر فرمایا نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ ہم وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راستے سے عزت بخشی ہے اور وہ راہِ اسلام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل تابعداری اور آپ کے نقشِ قدم کی پیروی ہی عزت و رفعت کی ضامن ہے۔ اسی کو حضرت والا اپنے اس شعر میں فرما رہے ہیں۔

ہر رشد و ہدایت کا اصلی مرکز مدینہ منورہ ہے

یہ دولتِ ایمان جو ملی سارے جہاں کو
فیضانِ مدینہ ہے یہ فیضانِ مدینہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے کفار و مشرکینِ مکہ کو جب دعوتِ توحید و رسالت پیش فرما رہے تھے تو وہ لوگ آپ کو اور آپ کی دعوت قبول کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کو بہت ستایا کرتے تھے اور بڑی ایذائیں اور تکلیفیں پہنچایا کرتے تھے جن کا بیان کرنا یہاں مقصود نہیں۔ بس اتنا عرض ہے کہ اس طرح وہ آپ کو کھل کر دعوت دینے سے مانع اور رکاوٹ بنتے تھے۔ جس کے نتیجے میں آپ کو اس راہ میں بڑی تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر ایک دن وہ آیا کہ آپ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم مل گیا اور آپ فوراً اس کی تعمیل میں اپنے وطنِ عزیز کو خیر باد کہہ کر اپنے رفیقِ سفر و حضر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفرِ ہجرت کے لئے مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر اشاعتِ اسلام اور تبلیغِ حق کا کام بڑے زور و شور سے شروع فرمادیا۔ بلادِ مختلفہ سے مختلف قبائل کے سرداران وفود کی شکل میں جوق درجوق پہنچنا شروع ہوگئے۔ انسانی فلاح و نجات کی دولت (دولتِ ایمان) سے مشرف ہوکر واپس اپنے قبیلوں اور ملکوں میں اس کی تبلیغ و اشاعت شروع کردی۔

جہاں جہاں رکاوٹیں پیش آتی گئیں اور دُشمنانِ اسلام اس راہ میں آڑے آئے تو حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر ان رکاوٹوں کو بزورِ قوت و طاقت ہٹانے میں مصروف ہوگئے اور دُشمن کو اسلام یا جزیہ، یا موت پر مجبور کردیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حکمِ جہاد بلا کسی خوف و خطر جرأت و ہمت اور بڑی دلیری کے ساتھ انجام دیا اور خدائی الفاظ میں اُولٰئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ کہلائے اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ کا خطاب پائے مگر تبلیغِ اسلام کا حق ادا کردیا۔ دنیائے کفر و ضلالت کو ظلمتوں اور ذلتوں سے نکال کر اسلام کے نور سے منور کردیا اور حقیقی عزت و عظمت کی راہوں سے روشناس کرادیا۔

بلاکسی شک و شبہ کے آج راقم السطور سمیت تمام مسلمانانِ عالم اسی مرکزِ رشد و ہدایت، مدینہ منورہ کے فیضان سے مسلمان کہلا رہے ہیں اور مذہبِ اسلام سے آشناء ہیں۔ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ وَثَبَّتَنَا اللّٰہُ عَلَیْہِ حَتّٰی نَلْقَاہُ۔

بعثت نبوت اور نزول سکینہ

جو قلب پریشاں تھا سدا رنج و الم سے
فیضانِ نبوت سے ملا اُس کو سکینہ

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت پوری قوم انتہائی تباہی و بربادی میں ڈوبی ہوئی اور کفر و شرک کی تاریک ترین وادیوں میں حیراں و سرگرداں قتل و قتال اور خوں ریزی کی آگ میں جلتی ہوئی بے چینی اور بے سکونی کی زندگی گزار رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تعلیماتِ الٰہیہ اپنی قوم کو پیش کیں کہ جس پر عمل پیرا ہو کر دشمنی دوستی میں، عداوتیں محبتوں میں اور نفرتیں الفتوں میں بدل گئیں۔ تڑپتا ہوا دل اور بے چین روح قرار و سکون پا گئی کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سکون اپنی محبت و تعلق میں رکھا ہے۔ اللہ سے محبت و تعلق وہی معتبر ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات و اتباع کے ساتھ ہو اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا و آخرت کے ہر نوع کا چین و سکون اور سلامتی ظاہر و باطن اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں منحصر کر دی ہے۔

جیسا کہ حدیث پاک کا حصہ ہے اَسْلِمْ تَسْلَمْ کہ مکمل طور پر اللہ کے حکموں کے سامنے جھک جاؤ! تو تمہیں ہر طرح کی سلامتی اور قلبی چین و سکون اور دنیوی و اخروی آفات و بلیات سے حفاظت نصیب ہو جائے گی۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ دورِ نبوت سے لے کر آج تک جس قدر پُر سکون اور بالطف زندگی غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور عاشقانِ دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی ہے، دنیاداروں کو اس کی ہوا بھی میسر نہیں آئی۔ یہ سب کچھ اُسی فیضانِ نبوت کا اثر ہے اور اُس گلشنِ مدینہ کے پھولوں کی خوشبو ہے، جس نے سارے عالم کو معطر کر دیا۔

عہدِ الست کا تمام بنی آدم پر غیر شعوری اثر

جو درد محبت کا ودیعت تھا ازل سے
مؤمن پہ ہوا کشف وہ مدفون خزینہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا میں پیدا کرنے سے پہلے حضرتِ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر یکجا فرمایا اور اُن سے یہ عہد لیا کہ "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں۔ "قَالُوْا بَلٰی" تو سب پکار اُٹھے کہ کیوں نہیں بے شک آپ ہمارے ربّ ہیں۔ جس کو "عہدِ الست" کہا جاتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی﴾
(سورۃ الاعراف، آیت: ۱۷۲)

ترجمہ: اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب بولے ہاں ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴،ص:۱۰۷)

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لاکر اپنی اپنی قوموں کو اس عہد کی یاددہانی کراتے رہے تاکہ اللہ کے سامنے بندوں کے لئے کوئی عذر و دلیل باقی نہ رہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہمیں یہ عہد یاد نہ تھا، اُسی سلسلے کی آخری کڑی ہمارے محبوب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے۔ آپ نے دنیا میں تشریف لاکر اُس درِ محبتِ الٰہی کو جو عہدِ الست کی شکل میں طبائع میں مرکوز کیا گیا تھا اور خزانۂ معرفتِ خداوندی کو جو دل کے نہاں خانوں میں دفن کیا گیا، اُمت پر کھولا اور واضح کیا اور اس عہد کی یاددہانی کرائی۔

صاحبو! اسی پُرانی چوٹ اور محبت کی چنگاری اور اقرارِ ربوبیتِ خداوندی کا ایک اثر یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر لوگ اپنے اندرونِ باطن ایک ایسا شعوری اور غیر شعوری جذبۂ عبدیت و نیازمندی رکھتے ہیں کہ جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس کا رُخ صحیح ہونے کی صورت میں وہ اپنے جذباتِ عبدیت اور ادائے بندگی صرف ایک اکیلے اللہ کے لئے خاص کرتے ہیں اور اگر ان کا رُخ غلط ہوجائے تو پھر وہ مختلف شکلوں میں غیر اللہ کو اپنا معبود و مسجود بناڈالتے ہیں اور مختلف مصائب و حالات میں حلِ مشکلات کے لئے انہی کو پکارتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس عہدِ الست کا اثر غیر شعوری طور پر ایسے لوگوں میں بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ جو اپنی زبان سے خدا کے وجود کے منکر اور دھریہ ہوتے ہیں کہ کسی سمندری طوفان یا فضائی حادثے کے خطرات یا اور مصائب و آلام کی صورت میں وہ اپنے آہ و نالوں سے کسی غیر معین اور غیر مرئی طاقت سے نصرت و مدد کے طالب ہوتے ہیں جس سے اس بات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ اُس عہدِ الست کا اثر پوری کائنات کے بسنے والے انسانوں میں مختلف انداز سے موجود ہے۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اشارہ کردیا۔

دل ازل سے تھا کوئی آج کا شیدائی ہے
تھی جو اِک چوٹ پُرانی وہ اُبھر آئی ہے

حضور ﷺ اور فکرِ اصلاح و ایمانِ امت

اے ختمِ رُسل! کتنے بشر آپ کے صدقے
ہر شر سے ہوئے پاک ہوئے مثلِ نگینہ

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کے طفیل ساری بشریت کو شرور و فتن سے بچنے اور باطن کی گندگیوں اور غلاظتوں سے پاک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۱۲۸)

ترجمہ: (اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں (کہ تم کو نفع حاصل کرنا آسان ہو) جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے۔ (معارف القرآن جلد:۴، ص:۴۹۵)

خلق کا خالق سے رابطہ آپ کی رسالت کا مرہونِ منت ہے اور ہر بشر کے لئے خالقِ بشر کی معرفت بدون آپ کی رسالت پر ایمان لائے ممکن نہ تھا۔ اللہ کی رضاء اور ناراضگی کے کاموں کا علم آپ کے بغیر ناممکن ومحال تھا۔ اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی بندوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار پائی۔ پھر آپ کی شانِ نبوت ختمِ نبوت ختمِ زمانی ومکانی دونوں لحاظ سے ہے، اس لئے تا قیامت تمام اہلِ ایمان اور اہلِ دل، اہلُ اللہ کا تعلق اور قربِ مع اللہ سب آپ ہی کی نبوت ورسالت کا فیضان ہے۔

خالی تھا جو انوارِ محبت کی رمق سے
اک آگ کا دریا سا لگے ہے وہی سینہ

اللہ تعالیٰ کی محبت جب دل میں راسخ ہوتی ہے اور نسبت مع اللہ تام اور کامل ہوجاتی ہے تو بندے کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بقول مجدد تھانوی قدس سرہٗ: ''جس طرح بالغ کو اپنے بلوغ کی خبر ہوجاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق اور نسبتِ خاصہ کا دل کو احساس ہونے لگتا ہے۔'' جس کا خاصہ بالفاظِ حکیم الامت دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر ہے۔ اسی کو حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پیارے انداز میں فرمایا ؎

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

اور اس نسبت کے حصول کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ بندے کو طاعات سے رغبت اور معاصی سے نفرت ہوجاتی ہے اور بتقاضائے بشریت صدورِ معصیت پر جلد ندامت وتوبہ کے ذریعے درجاتِ قرب کی منزلیں طے کر لیتا ہے اور یہ دردِ محبت اور سوزِ باطن اور سینے میں گرمیٔ عشقِ الٰہی ہر شخص کو اس کے مجاہدات کے بعد الگ الگ عطا کی جاتی ہے اور اُسی اعتبار سے اس کے دل کو جلاء وروشنی عطا ہوتی ہے۔

جیسا کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے اہل اللہ کے قلوب کی جلاء وروشنی اور گرمیٔ محبت کو سمجھاتے ہوئے یہ مثال پیش کی ہے کہ بعض آئینے سورج کے سامنے کر کے ان کا عکس کاغذ پر ڈالنے سے محض روشنی حاصل ہوتی ہے اور دوسرے بعض آئینے کاغذ میں آگ لگادیتے ہیں اور وہاں دھواں اُٹھنے لگتا ہے بعینہٖ یہی صورتِ حال اولیاء اللہ کے دلوں کی ہے کہ ان کے اردگرد بیٹھنے والوں کے دلوں پر ان کے قلوب کا عکس اسی طرح پڑتا ہے کہ بعض اپنے سینے میں آگ کا ایک دریا رکھتے ہیں تو سامنے بیٹھنے والوں کے قلوب کو اس محبتِ خداوندی کی آگ سے جلا کر رکھ دیتے ہیں اور بعض محض روشنی ڈالنے کی حد تک محدود رہتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرتِ والا فرمارہے ہیں کہ اب اللہ کی محبت کے انوار سے سینہ ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی آگ کا دریا ہو جبکہ پہلے اس میں انوارِ محبت کی رمق بھی نہ تھی۔

بزبانِ نبوت صحابہ نجوم ہدایت ہیں

صدقے میں ترے ہوگیا وہ رہبرِ اُمت
جو کفر کی ظلمت سے تھا اک عبدِ کمینہ

وہ لوگ جو کفر وشرک کی ظلمتوں میں بھٹک رہے تھے اور شقاوت و بدبختی کی راہوں کو طے کررہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ کی بدولت اور آپ کی نبوت ورسالت پر ایمان لانے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ وہ اندھیروں سے نکل کر اُجالوں میں آ گئے بلکہ دوسروں کو تاریکی سے نکال کر روشنی دکھانے والے بن گئے۔ صرف راہرو منزل ہی نہیں بلکہ راہبر منزل بھی بن گئے اور ایک دو ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری جماعت کو ایسا بلند مرتبہ اور عالی مقام حاصل ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ فَبِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ﴾

(المشكوة، باب مناقب الصحابة ﷺ، ص: ۵۵۴)

کہ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، تم ان میں سے جس کی اتباع کرلوگے ہدایت پا جاؤ گے۔

آپ کے صدقے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نجومِ ہدایت کا مقام حاصل ہوا۔ بالخصوص خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ﴾

(المشكوة، كتاب الايمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ص: ۳۰)

تم میرے طریقے اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑے رہنا۔

اے صلِ علیٰ آپ کا فیضانِ رسالت
جو مثلِ حجر تھا وہ ہوا رشکِ نگینہ
جو ڈوبنے والا تھا ضلالت کے بھنور میں
اب رہبرِ اُمت ہے وہ گمراہ سفینہ

ان دونوں اشعار میں قدرِ مشترک یہی مضمون مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کی بدولت جو لوگ پتھر کی طرح تھے ان کی قیمت وحیثیت دونوں جہان میں اتنی ہوگئی کہ وہ رشکِ نگینہ بن گئے اور جن کا سفینہ ظلمت وضلالت کے بھنور میں ڈوب رہا تھا، اب وہی رہبرِ اُمت بن گئے۔ جو لوگ مخلوق کے لئے باعثِ ننگ وعار تھے اب ولایت وتقویٰ کے نور سے وہی منور اور روشن ہوکر رشکِ آفتاب و ماہتاب بن گئے۔

مدح محمد ﷺ کی توفیق فضل خداوندی ہے

اختؔر کی زباں اور شرفِ نعتِ محمد ﷺ
اللہ کا احسان ہے بے خون و پسینہ

کسی شخص کی زبان وقلم کا حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں استعمال ہونا اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور احسان ہے۔ محض توفیقِ الٰہی کا نتیجہ ہے ورنہ وہ ذاتِ عالی تو اتنے اونچے مقام کی حامل ہے کہ خود خالق نے جس کی تعریف کی ہے تو بھلا مخلوق کی کیا جرأت کہ وہ اس کی مدح وثناء کے لئے زبان کھولے۔ حضرت والا ارشاد فرمارہے ہیں کہ میرا کوئی کمال نہیں، یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے بے خون وپسینہ ہمیں یہ نعمت عطا فرمائی۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کسی بھی نعمت کو محض اس کے فضل وکرم کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اپنے مجاہدوں اور ریاضتوں کی طرف سے اس کی نسبت کرنا یہ کفرانِ نعمت ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بعض لوگ اپنے کمالات کو اپنے مجاہدات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ سراسر کفرانِ نعمت ہے اس لئے بندہ خواہ کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اور اُسے خواہ کتنا ہی اونچا کمال ہوجائے۔ مگر یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کی آیت ہے کہ:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک وصاف کردیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، ص:۳۶۹)

یہ آہِ سحر کا اثر دیکھتے ہیں

یہ آہِ سحر کا اثر دیکھتے ہیں
مدینے کے شام و سحر دیکھتے ہیں

جسے آپ کا باخبر دیکھتے ہیں
اُسے غیر سے بے خبر دیکھتے ہیں

غلامی سے تیری غلاموں کا رُتبہ
ملائک سے بھی فوق تر دیکھتے ہیں

تجلی جو ہے سبز گنبد پہ ہر دم
اُسے رشکِ شمس و قمر دیکھتے ہیں

مدینہ کا جغرافیہ دیکھ کر ہم
عجب حالِ قلب و جگر دیکھتے ہیں

تصور میں آتا ہے جب سبز گنبد
تو ایمان کو گرم تر دیکھتے ہیں

بفرطِ محبت بشوقِ نظر ہم
مدینے کے دیوار و در دیکھتے ہیں

ابوبکر و فاروق و عثمان و حیدر
تصور میں ہم اُن کے گھر دیکھتے ہیں

جو روضے پہ حاضر سلاطیں ہوئے ہیں
تو پندار زیر و زبر دیکھتے ہیں

جو جالی پہ صلِّ علیٰ کہہ رہے ہیں
اے اختؔر انہیں چشمِ تر دیکھتے ہیں

مشکل الفاظ کے معنی:۔آہِ سحر: تہجد کے وقت رونا۔ ملائک: فرشتے۔ فوق تر: بہت اونچا۔ تجلی: روشنی۔ رشکِ شمس و قمر: جس پر سورج اور چاند بھی رشک کرتے ہوں۔ جغرافیہ: نقشہ۔ عجب: کیف، مزا۔ بفرطِ محبت: شدت محبت کے ساتھ۔ پندار: تکبر۔ زیر و زبر: ریزہ ریزہ۔ چشمِ تر: آنسو بہانے والی آنکھ۔

دیدارِ مدینہ آہ سحر گاہی کا اثر ہے

یہ آہِ سحر کا اثر دیکھتے ہیں
مدینے کے شام و سحر دیکھتے ہیں

مدینہ منورہ دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح کوئی سیر وتفریح کی جگہ اور سیاحت کا شہر نہیں بلکہ مدینہ منورہ کی حاضری ایک مسلمان کے لئے اہم ترین عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے اور ہر مسلمان کی انتہائی اور آخری درجے کی اُمیدوں میں سے ایک اُمید ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں مسلمان یہاں آنے کے لئے مضطرب اور بے قرار رہتے ہیں اور بارگاہِ ربُّ العزت میں یہاں کی حاضری کے لئے آہ وزاری کرتے رہتے ہیں۔

اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کو حضرتِ والا دامت برکاتہم نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کا اثر قرار دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے مانگی ہوئی ایک مراد پوری ہونے پر خوشی ظاہر فرما رہے ہیں۔ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ اس حاضری کو ایک عظیم نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اس کو اپنی دعاؤں کا حصہ بنانا چاہیے۔

آپ ﷺ کی محبت دل سے ہر غیر کو نکال دے گی

جسے آپ کا باخبر دیکھتے ہیں
اُسے غیر سے بے خبر دیکھتے ہیں

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جب تک غیر اللہ قلب سے پورے طور پر نہیں نکلتا اس وقت تک اللہ تبارک وتعالیٰ کا قوی تعلق حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے آدمی پوری لگن دُھن اور دھیان کے ساتھ کوشاں نہیں ہوتا۔ تب تک اُسے محبتِ الٰہیہ حاصل نہیں ہوتی۔ ہر ماسوا اللہ سے پورے طور پر صرفِ نظر کر کے ایک اللہ پر اپنا سب کچھ فدا اور قربان کرنے کا جذبہ ہی خدا تک پہنچانے والا ہے اور ہر غیر سے بے خبر ہو کر ہی اللہ سے باخبر ہونا ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تک پہنچنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ جتنا ہم حضور سے باخبر ہوں گے اتنا ہم اللہ سے باخبر ہوں گے اور جتنی حضور سے محبت ہوگی اتنی اللہ سے محبت ہوگی اور غیروں کی محبت سے دل خالی ہو کر رہ جائے گا۔

چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق بنے تو ہر غیر سے ایسے بے خبر ہوئے کہ آپ کی محبت پر نہ اپنے مال و دولت کی کوئی پرواہ کی اور نہ اپنے اقرباء واہلِ خاندان گراں گزرے بلکہ سب کچھ خوشی خوشی اپنے محبوب کے اشاروں پر لٹاتے چلے گئے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نظریں پڑنے کے بعد اور آپ کے وصال کے بعد کون ایسا ہو سکتا ہے کہ جن پر نظرِ التفات بھی ڈالی جائے، اس لئے آپ کے باخبر کیونکر غیروں کی خبر رکھیں گے۔

غلامی سے تیری غلاموں کا رُتبہ
ملائک سے بھی فوق تر دیکھتے ہیں

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی غلامی کی بدولت آپ کے عاشقوں اور غلاموں کا مقام ملائکہ سے بھی اونچا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ خواصِ ملائکہ سے خواصِ مؤمنین اور عام ملائکہ سے عام مؤمنین افضل ہیں۔ چونکہ اللہ کے بعد سب سے اونچا مرتبہ پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے آپ کے متبعین کاملین کا مرتبہ باقی سب سے بڑھ کر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو خَیْرُ الْخَلَائِقِ بَعْدَ الْاَنْبِیَآءِ کہا جاتا ہے۔ جو کہ پوری اُمت میں باتفاق اہل السنۃ والجماعۃ سب سے افضل ہیں کیونکہ اشیاء کی قیمتیں نسبت سے بڑھتی اور گھٹتی ہیں۔

تجلیاتِ جمالیہ اور روضۂ اقدس ﷺ

تجلّی جو ہے سبز گنبد پہ ہر دم
اُسے رشکِ شمس و قمر دیکھتے ہیں

روضۂ اقدس پر ہر آن اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات کا نزول ہوتا رہتا ہے جن کے سامنے سورج اور چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ اس لئے کہ سورج اور چاند سے کائنات کا ظاہر روشن ہوتا ہے اور یہ تجلیاتِ الٰہیہ باطن کو ایمان و معرفت کے نور سے منور کرتی ہیں۔ انسان کی فلاح و نجات کے لئے اور اس کو ظلمات سے نکالنے کے لئے اصل چیز باطن کا منور ہونا ہے۔ اس لئے وہ لوگ کہ جن کے قلوب مزکّٰی مجلّٰی ہیں وہ اپنے دل میں ان انوار و تجلیات کو محسوس کر کے اپنے ایمان و معرفت میں اضافہ پاتے ہیں۔ اسی لئے حضرتِ والا نے فرمایا کہ سبز گنبد پر نازل ہونے والی تجلیات رشکِ شمس و قمر ہیں۔

مدینہ پر نظر پڑتے ہی دل فرطِ محبت سے جھوم اٹھتا ہے

مدینہ کا جغرافیہ دیکھ کر ہم عجب حالِ قلب و جگر دیکھتے ہیں
تصور میں آتا ہے جب سبز گنبد تو ایمان کو گرم تر دیکھتے ہیں
بفرطِ محبت بشوقِ نظر ہم مدینے کے دیوار و در دیکھتے ہیں

کوئی بھی عاشق جب اپنے معشوق اور محبوب کے وطن کا تصور کرتا ہے یا اُس کا تذکرہ کرتا ہے یا اُس کی نظروں کے سامنے دیارِ محبوب کے آثار و نشانات آ جاتے ہیں تو اُس کا حال وہی ہوتا ہے جو حضرتِ والا نے ان اشعار میں ذکر کیا کہ میرے قلب و جگر کا حال کچھ اور ہی نظر آیا۔ میرے ایمان کی حرارت و گرمی شدت و تیزی اختیار کر گئی اور بڑے والہانہ انداز سے فرطِ محبت میں جھوم جھوم کر مدینے کے در و دیوار پر نظریں پڑیں۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَ ذَا الْجِدَارَ
وَ مَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ
وَ لٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَ

میں لیلیٰ کے شہر سے گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اُس دیوار کو چومتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے میرے دل کو شہروں کی محبت نے نہیں موہ لیا بلکہ ان لوگوں کی محبت نے جو شہروں میں رہنے والے ہیں۔

آہ! مجنوں کو گر بتوں کے عشق کے بجائے حقیقی عشق کا مزہ مل جاتا تو وہ ان مٹی کے کھلونوں اور خاک کا ڈھیر بن جانے والے حسین اور حسیناؤں پر جان نہ چھڑکتا۔

ابوبکر و فاروق و عثمان و حیدر
تصور میں ہم اُن کے گھر دیکھتے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا مقتضی یہ ہے کہ آپ کے اصحاب سے بھی محبت ہو کیونکہ اصولی بات یہی ہے کہ حبیبُ الحبیبِ حبیب محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوا کرتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنے محبوب تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿اللہ اللہ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ﴾

(سنن الترمذی، باب فی من سبّ اصحاب النبی ﷺ، ج: ۲، ص: ۲۲۵)

کہ میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو! میرے بعد ان کو نشانہ نہ بناؤ اور جو ان سے محبت رکھے گا تو وہ میری محبت ہی کی وجہ سے رکھے گا اور جو اُن سے بغض رکھے گا تو وہ میرے بغض ہی کی وجہ سے بغض رکھے گا۔ اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کے دوران جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہوتی ہے، اسی طرح حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بالخصوص خلفائے راشدین کی یادیں بھی تازہ ہو جاتی ہیں، ان کا رہنا سہنا حضور کی مجلس میں آنا، آپ کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا وغیرہ جیسے احوال یاد آنے لگتے ہیں۔

روضۂ اقدس ﷺ پر سلاطین دنیا کی حالت

جو روضے پہ حاضر سلاطیں ہوئے ہیں
تو پندار زیر و زبر دیکھتے ہیں

اپنے اپنے وقت کے بڑے بڑے بادشاہ جب روضۂ اقدس پہ حاضری دیتے ہیں اُن کی حالت ایسی متواضعانہ اور عاجزانہ ہوتی ہے کہ جس کو دیکھ کے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی حکومت وسلطنت کا نشہ آپ کے سامنے حاضر ہو کر دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے اور ان کی انانیت کی بو تک محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ آپ کے دربار میں پہنچ کر بڑے سے بڑا انسان نیازمندانہ شان میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ آدابِ حضوری پورے طور پر بجالانے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے اور نجات وفلاح کا اُمیدوار ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت والا نے فرمایا کہ آپ کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد بڑے بڑے امرا اور سلاطین کے پندار و گھمنڈ زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔

روضۂ اقدس ﷺ پر حضرت والا کی حالت

جو جالی پہ صلِّ علیٰ کہہ رہے ہیں
اے اختر انہیں چشمِ تر دیکھتے ہیں

حضرتِ والا نے اس شعر میں حضور کے سچے عشاق کا حال بیان فرمایا ہے کہ جب ان کو فراقِ طویل کے بعد وصالِ حبیب میسر آتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے سامنے جی بھر کر اپنی جدائی کے صدمے کو آنکھوں سے آنسو بہا کر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ دوستوں نے یہی حال حضرتِ والا کا اسی سال سفرِ مدینہ میں مشاہدہ کیا جو مئی ۲۰۰۸ء میں ہوا کہ حضرت والا وہاں اپنے احباب کے ساتھ حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل شاملِ حال ہوا کہ روضۂ اقدس پر نگرانی کرنے والے عرب علماء نے ازخود حضرت کی وہیل چیئر (Wheel chair) کو سامنے کیا اور دیر تک حضرت بڑی گریہ وزاری کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش فرماتے رہے اور ان حضرات نے اپنے عام عادت کے خلاف حضرتِ والا کو وہاں ٹھہرنے دیا جس کے بارے میں ساتھیوں نے بتایا کہ تقریباً چالیس منٹ (Minutes) حضرتِ والا نہایت تضرع اور بڑی توجہ وحضوری کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش فرماتے رہے۔

گلستانِ طیبہ سے مسرور ہوں گا

عجم کے بیاباں سے مفرور ہوں گا
گلستانِ طیبہ سے مسرور ہوں گا

میں دیدارِ گنبد سے مخمور ہوں گا
کبھی نور ہوں گا کبھی طور ہوں گا

گناہوں سے اپنے میں رنجور ہوں گا
بفیضِ شفاعت میں مغفور ہوں گا

اڑے گی ہوا سے جو خاکِ مدینہ
میں ایسے غباروں میں مستور ہوں گا

میں روضہ پہ صلِّ علیٰ نذر کر کے
بہ دل نور ہوں گا بہ جاں نور ہوں گا

مدینہ کے انوارِ شام و سحر سے
سراپا دل و جاں سے مسرور ہوں گا

میں ممنون ہوں گا خدا کے کرم کا
کبھی دل میں اپنے نہ مغرور ہوں گا

ہر اک امر میں راہِ سنت پہ چل کر
خدا کے کرم سے میں منصور ہوں گا

اُحد کے شہیدوں کے خونِ وفا سے
سبق لے کے پابندِ دستور ہوں گا

مدینہ میں جب قلب و جاں چھوڑ آیا
میں مہجور ہو کر نہ مہجور ہوں گا

قبا کی زیارت و نفلوں سے اختر
ہر اک راہِ سنت سے مخمور ہوں گا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **عجم**: عرب کے علاوہ زمین۔ **بیاباں**: ویرانہ۔ **مفرور**: بھاگ جانا۔ **گلستان طیبہ**: مدینہ شریف کے باغ۔ **مسرُور**: خوش۔ **مخمور**: مست و سرشار۔ **طور**: پہاڑ، یعنی کبھی میں طور پہاڑ کی طرح ریزہ ہوجاؤں گا۔ **رنجور**: غم زدہ۔ **بفیضِ شفاعت**: یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے صدقے میں۔ **مغفور**: جس کی مغفرت کردی گئی ہو۔ **غباروں**: گرد۔ **مستور**: چھپا ہوا۔ **نذر**: پیش کر کے۔ **سراپا**: سر سے پاؤں تک۔ **ممنون**: احسان مند۔ **مغرور**: متکبر۔ **منصور**: مدد کیا ہوا۔ **پابندِ دستور**: پابند سنت۔ **مهجور**: دور ہو کر۔

بیابانِ عجم اور گلستانِ طیبہ

عجم کے بیاباں سے مفرور ہوں گا
گلستانِ طیبہ سے مسرور ہوں گا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچا عشق رکھنے والے کے لیے دیارِ حبیب سے دور رہ کر زندگی گزارنا اگرچہ بڑے بڑے بنگلوں اور شاہی محلات میں ہوں بالکل ایسا ہی ہے جیسے بستی کو چھوڑ کر بیاباں میں رہنا اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں سارے عجم کو بیابان سے تعبیر کیا اور اپنے محبوب کے وطن مدینہ طیبہ کو گلستان طیبہ کے پیارے نام سے موسوم کیا اور جس طرح انسان جنگل و بیابان سے بھاگ کر آبادی کا رخ کرتا ہے اسی طرح ایک مومن اس عجم

کے بیابان سے بھاگ کر گلستانِ مدینہ پہنچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے اور اس کو خوشی اور مسرت کا ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا یک لازمی اثر ہے اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

میں دیدارِ گنبد سے مخمور ہوں گا
کبھی نور ہوں گا کبھی طور ہوں گا

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس بقعۂ ارض، خطۂ زمین میں آرام فرما ہیں اس پر قائم گنبد خضریٰ دور سے نظر آنے لگتا ہے اور جیسے ہی اس پر آپ کے امتی کی نظر پڑتی ہے تو اس کو ایک طرح کا وجد طاری ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ مدہوش کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے وہ اپنے کو ایک ایسے عالم میں پاتا ہے جہاں اس کو اپنی امیدوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آتا ہے اور اسے یکلخت اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کی شکل میں حاصل ہونے والی نعمتِ عظمیٰ پر جذباتِ تشکر سے اس کا دل بھر آتا ہے اور اس کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے۔

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

احقر کو یہی معنویت لیے ہوئے بے ساختہ بچپن میں پڑھا ہوا ایک کلام یاد آیا۔

کعبے پر پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گئے
یوں ہوش و خرد مفلوج ہوئے دل ذوق تماشا بھول گیا

جب مومن کی نظر گنبدِ خضریٰ پر پڑتی ہے تو اس کا دل انوارِ تجلیات سے منور ہو جاتا ہے کبھی اس کی حالت مثلِ طور کے ہوتی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی تجلیات پڑنے کی صورت میں ریزہ ریزہ ہو گیا اسی مناسبت کا ایک شعر جو خود صاحبِ کلام یعنی حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے آج ہی سنایا اور صورت یہ ہوئی کہ راقم السطور حضرت سے ملنے کے لیے دار العلوم کراچی گیا اور استفسار کیا کہ اللہ تعالیٰ کے دل میں سمانے کا کیا مطلب ہے تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تجلیاتِ الٰہیہ کا قلب میں آنا ہے نہ کہ خود اللہ کا دل میں آنا ہے جیسا کہ میرا شعر ہے۔

بسا لینا کسی کو دل میں دل ہی کا کلیجہ ہے
پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طور ہو جانا

گنہگاروں کا بڑا سہارا آپ ﷺ کی شفاعت ہے

گناہوں سے اپنے میں رنجور ہوں گا
بفیضِ شفاعت میں مغفور ہوں گا

اپنے گناہوں پر رنج وغم اور حزن وملال اور ندامت وشرمندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور حقیقی ولی کی پہنچان یہی ہوتی ہے کہ کرتے رہنا اور ڈرتے رہنا اور ان کو اپنی طاعات بھی اللہ جل شانہٗ کی عظمتِ شان کے سامنے سیئات محسوس ہوتی ہیں اس لیے وہ کانپتے لرزتے رہتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی امید کو اپنا اصل سہارا سمجھتے ہیں اس پر ایک بڑا عبرتناک واقعہ یاد آیا ایک شخص جو بظاہر دین کا بہت پابند نہ تھا مگر اس کے دل میں ایمان کی چنگاری تھی اور گناہوں میں بھی مبتلا رہتا تھا چنانچہ ایک دن اس کے ایک غیر مسلم دوست نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر دی تو اس نے اسی وقت اس کی گردن پر بوتل (Bottle) مار کر اسے مار ڈالا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ جن کی شفاعت کی امید پر میں گناہ کیا کرتا تھا اس شخص نے ان کو برا کہا تو میں اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے گناہگاروں کے لیے حقِ شفاعت کا ملنا اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاقی قول ہے اس کے علاوہ دوسری شفاعتیں بھی احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں جیسے کہ شہداء اور حفاظِ کرام اور علماء کی شفاعت وغیرہ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مومن کے لیے ایک بڑی امید کا سامان ہے۔

عاشقِ رسول اور خاکِ مدینہ

اڑے گی ہوا سے جو خاکِ مدینہ میں
تو ایسے غباروں میں مستور ہوں گا

اس شعر میں ذکر کردہ مضمون اس خاص محبت کی کیفیت کا ترجمان ہے جو تمام اہلِ محبت کا خاصہ ہے کہ محبوب کے در و دیوار، گلی کوچے اور گرد وغبار کے اندر اسے محبوب کی جھلک نظر آتی ہے اسی لیے اگر دیارِ حبیب کا گرد وغبار بھی بدن پر آ لگتا ہے تو وہ ان کو دنیا بھر کے مختلف نوع کے کریم (Creams) اور پاؤڈر (Powders) عمدہ قسم کی خوشبوؤں سے بھی زیادہ محبوب ہوتا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا عشقِ مدینہ

اسی قلبی کیفیت کی ترجمانی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت اور وابستگی کا حال حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدہ بہاریہ میں یوں فرمایا ؎

امیدیں لاکھ ہیں لیکن بڑی امید یہ ہے
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں بن کے تیرے غبار

اس پر احقر کو اپنے ساتھ پیش آمدہ ایک قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک ڈاکٹر (Doctor) کے یہاں بیٹھے بیٹھے دورانِ گفتگو کچھ دینی مسائل پر تبادلۂ خیال ہونے لگا تو اس نے احقر کے سامنے یہ اشعار پڑھے اور کہنے لگا کہ میں ایک عرصہ تک تمہارے علماء کے متعلق بدگمانی کا شکار تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ تمہارے دیو بندی علماء کو عشقِ رسول حاصل نہیں ہے لیکن حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدۂ بہاریہ پڑھنے کے بعد میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں اپنے اس غلط خیال اور بدگمانی سے تائب ہوا اور بہت سے اپنے مکتبِ فکر کے حضراتِ ائمہ مساجد اور علماء مدارس کو یہ اشعار دکھا کر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عشقِ رسول کا ذکر کیا کہ یہ پورا قصیدہ تو عشقِ رسول کا کیا عمدہ ترجمان ہے تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

اور اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے حضرات اکابر اہل اللہ کو نہ صرف یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی درجے عشق تھا بلکہ آپ کے شہر کے در و دیوار اور اڑنے والے غبار تک شاہوں کے تاجوں کے موتیوں سے زیادہ محبوب تھے حتی کہ حضرت علامہ رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق مشہور بات ہے کہ مدینے سے آئی ہوئی کھجوروں کی گھٹلیوں کو پیس کر ان کا سفوف بنا کر کھایا کرتے تھے ان کو پھینکنا گوارا نہ تھا اللہ تعالیٰ راقم السطور اور اس کے جملہ متعلقین اور تمام مومنین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اور اطاعت کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

صلوٰۃ وسلام کی برکات

میں روضہ پہ صلِ علیٰ نذر کر کے
بہ دل نور ہوں گا بہ جاں نور ہوں گا

ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر پہنچ کر صلوٰۃ وسلام کا تحفہ پیش کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ڈائریکٹلی (Directly) بالمشافہ اس کو جواب عنایت فرماتے ہیں تو اس کے دل و جان کے روشن ہونے اور اس کا نصیب چمک اٹھنے میں کیا تردد ہوسکتا ہے۔

جمالِ حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے

میری شفاعت واجب ہوگئی اور جن اہل اللہ کا قلب مثلِ آئینہ کے صاف شفاف ہوتا ہے تو ان کے دلوں پر روضۂ اقدس سے نکلنے والے انوار وتجلیات اور فیوض وبرکات کا عکس صاف اور واضح طریقے سے منعکس ہو جاتا ہے۔

مدینہ کے انوارِ شام و سحر سے
سراپا دل و جاں سے مسرور ہوں گا

ہر مسلمان وہاں جا کر صبح وشام رات دن توبہ واستغفار صلاۃ وسلام اور ذکر وتلاوت وغیرہ میں مشغول رہتا ہے اور عام طور پر دوسرے علائقِ دنیویہ سے یکسو اور خالی الذہن ہو جاتا ہے تو اس لیے خاص طور پر مدینے میں رہ کر ان عبادات کی کثرت ہوتی ہے جس سے دل وجان میں خوشی اور مسرت اور خاص کیف وسرور کا آنا ایک امر لابدی ہے اسی کو حضرت والا نے اس شعر میں ذکر کیا ہے ۔

میں ممنون ہوں گا خدا کے کرم کا
کبھی دل میں اپنے نہ مغرور ہوں گا

صاحبو! روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور کسی بھی نعمت کے ملنے پر ہر مسلمان کو یہی سوچنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے عطا کی ہے میرا اس میں کوئی استحقاق نہ تھا تو ان شاء اللہ وہ عجب وکبر اور غرور اور گھمنڈ سے محفوظ رہے گا اسی کو حضرت والا نے اس شعر میں ارشاد فرمایا کہ مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ مجھے گلستانِ طیبہ میں حاضری کی سعادت میسر آئی۔

دو شرطوں کے ساتھ قبولیت ونصرت موعود ہے

ہر اک امر میں راہِ سنت پہ چل کر
خدا کے کرم سے میں منصور ہوں گا

علمائے کرام نے لکھا ہے کہ مکۃ المکرّمۃ میں حاضری کے دوران ذکر لا الٰہ الاّ اللہ کی کثرت اور مدینہ منورہ میں حاضری کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا اہتمام رکھنا چاہیے اور آپ کی ایک ایک سنت پر عمل کرنے کی فکر اور لگن رہنی چاہیے اور وہاں سے یہ عزم کر کے اپنے وطن لوٹے کہ اپنی زندگی کے صبح وشام اور لیل ونہار کو آپ کی سنتوں کے نور سے منور کر کے زندگی گزاروں گا۔ یہی راستہ اصلاح وفلاح کا ضامن اور نصرت وتائیدِ الٰہی شاملِ حال ہونے کا ذریعہ ہے۔

صاحبو! راہِ سنت پر اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سنت کے مطابق عمل پر اللہ تعالیٰ کی مدد جب آئے گی جب کہ اس میں دو باتیں پائی جائیں نمبرا۔ وہ عمل حدودِ شریعت سے باہر نہ ہو یعنی افراط وتفریط سے خالی ہو اور نمبر۲۔ اس عمل کے کرنے میں مکمل اخلاص ہو ان دونوں شرطوں میں سے اگر کوئی شرط مفقود ہو تو پھر وہ

عمل نہ تو بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت آتی ہے نفس و شیطان جو ہمارے ازلی دشمن ہیں کبھی دین کے رنگ میں ہمیں ایسی راہ پر ڈال دیتے ہیں جس کی صورت تو دین ہوتی ہے اور ہم اس کو دین سمجھ کر کرتے رہتے ہیں مگر ان دو باتوں میں سے کسی ایک کے نہ پائے جانے کی وجہ سے بجائے قربِ خداوندی حاصل ہونے کے دن بدن ہم اللہ سے دور ہوتے جاتے ہیں اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

کوئی شخص خوب صدقہ وخیرات کرنے کا جذبہ رکھتا ہے اور جو بھی آتا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے مگر شریعت نے اس پر اہل وعیال اور بیوی بچوں کا صرفہ ونفقہ جو لازم کیا ہے اس کو ادا نہیں کرتا ہے تو یہ عمل حدودِ شریعت سے متجاوز ہونے کی وجہ سے عند اللہ مقبول نہ ہوگا خواہ اس کے دل میں کتنا ہی اخلاص ہو اسی طرح وہ شخص کہ جو خوب مال و دولت اللہ کی راہ میں لٹاتا ہو اور اس کے ایڈورٹائز (Advertise) وتشہیر یعنی اپنے نام ونمود کے روشن ہونے اور چمکنے کی نیت دل میں رکھتا ہو تو گو کہ یہ عمل شریعت وسنت کے مطابق ہو مگر اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے اس پر نصرت وتائیدِ الٰہی کا وعدہ نہیں ہے۔

شہدائے اُحد کا درسِ صدق ووفا

احد کے شہیدوں کے خونِ وفا سے
سبق لے کے پابندِ دستور ہوں گا

اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہدِ الست سے وفا کا آخری درجہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کی راہ میں اپنی جان پیش کر دے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دامنِ احد میں ستر جانیں پیش کر کے اس عہدِ وفا کو پورا کر دکھایا اور اپنی جانوں کے عوض وہ جنت کے محلات اور اپنے مولیٰ کی رضا کے مستحق قرار پائے اور قیامت تک آنے والی امت کو یہ سبق دے گئے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جان و مال اہل وعیال گھر و کاروبار سب کچھ قربان کر دینا ہی حقیقی اسلام کی روح ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنے خالق و مالک کے حکم پر فدا ہو جانا اور اس پر مضبوطی سے جمے رہنا سچے مسلمانوں کا شیوہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کا طریقہ ہے اپنی خواہشات و آرزوؤں کا خون کر دینا اور انقیاد و فرمابرداری کے زیور سے آراستہ ہونا دنیا وآخرت کی سرخروئی کا ذریعہ ہے اور شہدا احد وغزوۂ احد کے متعلق تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہے بس اس شعر میں حضرت والا نے ان کی اس فدائیت وجانثاری سے ملنے والے سبق کو ذکر کیا ہے۔

مدینہ سے دوری صرف جسمانی ہے

مدینہ میں جب قلب و جاں چھوڑ آیا
میں مہجور ہو کر نہ مہجور ہوں گا

مدینہ کی زیارت کی دولت سے مالا مال ہونے والا مسافر جب اپنے سفر کی آخری ساعات گزار رہا ہوتا ہے تو وہاں سے جدائی کے تصور سے اس کو جتنا بھی صدمہ اور رنج و غم ہو وہ کم ہے کیونکہ اس کائنات میں آپ سے زیادہ محبوب کوئی پیدا نہیں ہوا، اپنے محبوب سے جدائی ہر شخص کے لیے شاق ہوتی ہے اسی لیے بالآخر مسافرِ مدینہ یوں کہتے ہوئے رخصت ہوتا ہے جیسے ہمارے محترم تائب صاحب جونپوری کہتے ہیں ؎

اپنی پلکوں پہ تارے سجائے ہوئے
اور دلوں میں لیے بے کلی آگئے
وہ مدینہ وہ روشن نگر چھوڑ کر
پھر سے ہم شہرِ تیرہ شبی آگئے

اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں ہر سچے مسلمان کے دل کی حالت کی ترجمانی کی ہے کہ اگرچہ مدینہ سے جدائی پر ظاہر کے اعتبار سے تو ہم نے مدینہ چھوڑ دیا ہے اور جسم و قالب کے لحاظ سے ہم نے ہجران اختیار کرلیا لیکن ہمارے دل و دماغ اور قلب و روح مدینے کے ساتھ وابستہ ہیں اس لیے حقیقۃً ہم نے مدینے کو نہیں چھوڑا جیسا کہ حضرت والا نے دوسرے مقام پر اسی کو فرمایا ؎

اے اختؔر مرے قلب و جاں ہیں وہاں
مدینے سے گو دور رہتے ہیں ہم

قیامِ مدینہ اور اس کی یادوں کی دل سے وابستگی کے عنوان پر جگر مرحوم نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

بھول سکتا ہوں کہیں ان کی محبت کے مزے
میری آنکھوں میں وہ ایک ایک ادا پھرتی ہے

مسجد قبا میں نماز پڑھنا عمرہ کے برابر ہے

قبا کی زیارت و نفلوں سے اختؔر
ہر اک راہِ سنت سے مخمور ہوں گا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصَّلٰوةُ فِيْ مَسْجِدِ قُبَاءٍ كَعُمْرَةٍ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الصلوٰة، باب ماجاء فی الصلوٰة فی مسجد قباء، ج:۱، ص:۷۴)

﴿كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي مَسْجِدَ قُبَاءٍ رَاكِبًا وَمَاشِيًا زَادَ ابْنُ نُمَيْرٍ فَيُصَلِّي فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب التهجد، باب اتیان مسجد قباء راکباً وماشیاً، ج ۱، ص ۱۵۹)

یعنی مسجدِ قباء کی ایک نماز اجر وثواب میں ایک عمرے کے برابر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی پیدل اور کبھی سوار مسجدِ قباء میں تشریف لاتے تھے اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس میں دو رکعت نماز بھی پڑھتے تھے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا رخ کیا تو اول اول مدینہ سے باہر جنوبی غربی جانب بنو عمرو بن عوف کی بستی قباء میں قیام فرمایا تھا یہ مدینہ منورہ سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے پھر چند روز بعد مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تھے اس محلے میں جس مقام پر آپ نماز پڑھا کرتے تھے وہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

جس کی دیوار قبلہ کا رخ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے درست کیا اور بنیاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے لیے پتھر ڈھونڈنے میں شریک رہے اسلام کی یہ سب سے پہلی مسجد تھی آپ اکثر ہفتہ کے روز اس مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھتے تھے متعدد روایتوں میں اس کی فضلیت آئی ہے

مدینہ منورہ میں حاضر ہونے والوں کو اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو مسجدِ قباء میں حاضر ہو کر کوئی نماز یا تحیۃ المسجد ضرور ادا کرنی چاہیے۔

در منزلے کہ جاناں روزے رسید باشد
باخاکِ آستانش داریم مرحبائے

دیارِ مدینہ

نظر ڈھونڈتی ہے دیارِ مدینہ ہیں دِل اور جاں بے قرارِ مدینہ
وہ دیکھو اُحد میں شجاعت کا منظر شہیدوں کے خونِ شہادت کا منظر
وہ ہے سامنے سبز گنبد کا منظر اسی میں تو آرام فرما ہیں سرور
ابو بکرؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و حیدرؓ یہیں تھے یہ پروانۂ شمعِ انور
یہیں سے تو اسلام پھیلا جہاں میں مدینہ کا شہرہ ہے ہفت آسماں میں
نشانِ نبی ہے یہ مسجد قبا کی ہے قندیل طیبہ نبی کی ضیاء کی
مدینہ کے دیوار و در دیکھتے ہیں عجب حال قلب و جگر دیکھتے ہیں
یہ مسکن ہے شاہِ مدینہ کا اخترؔ فلک بوسہ زن ہے یہاں کی زمیں پر

مشکل الفاظ کے معنی: دیارِ: گھر۔ بے قرار: بےچین۔ اُحد: پہاڑ کا نام۔ شجاعت: بہادری۔ شُہرہ: شہرت۔ ہفت آسمان: ساتوں آسمان۔ قندیل: دِیا۔ ضیاء: روشنی۔ مَسکن: رہائش گاہ۔ فلک: آسمان۔ بوسہ زن: چوم لینا۔

جوارِ محمد ﷺ میں رہتے ہیں ہم

زمیں پر مدینہ کی رہتے ہیں ہم فلک پر مگر ناز کرتے ہیں ہم
نہ پوچھو کہ کیا ہے ہمارا شرف جوارِ محمد ﷺ میں رہتے ہیں ہم
کرم ہے یہ مالک کا اے دوستو! مدینے کی بستی میں بستے ہیں ہم
مدینے کی نسبت ہے قیمت مری وگرنہ حقیقت میں سستے ہیں ہم
مدینہ میں مرنا مقدر میں ہو خدا سے دعا یہ بھی کرتے ہیں ہم
یہ نالائقوں پر ہے رب کا کرم محمد ﷺ کی نگری میں رہتے ہیں ہم
شفاعت محمد ﷺ کی بھی ہو نصیب دعا رات دن یہ بھی کرتے ہیں ہم
مدینے میں ہر سال ہو حاضری خدا سے یہ فریاد کرتے ہیں ہم
پس اے ساکنانِ مدینہ مجھے نہ بھولو گذارش یہ کرتے ہیں ہم
اے اخترؔ مرے قلب وجاں ہیں وہاں مدینے سے گو دور رہتے ہیں ہم

مشکل الفاظ کے معنی: فلک: آسمان۔ ناز: فخر۔ شرف: نصیب۔ جوار: پڑوس۔ نسبت: تعلق۔ مقدر: تقدیر میں ہو۔ نگری: گلی۔ ساکنانِ مدینہ: مدینہ میں رہنے والے۔

فدا تجھ پہ میں خاکِ شہرِ مدینہ

مبارک تجھے ہو اے ارضِ مدینہ
نبی کا شہر ہے یہ شہرِ مدینہ

ترے پاس جب سیدِ دوجہاں ہے
نہ کیوں رشکِ افلاک ہو پھر مدینہ

ترے سبز گنبد پہ عالم فدا ہے
فلک جیسے چومے زمینِ مدینہ

ترا ذرّہ ذرّہ نشانِ نبی ہے
فدا تجھ پہ میں خاکِ شہرِ مدینہ

اُحد کے یہ دامن میں خونِ شہیداں
سبق دے رہا ہے وفائے مدینہ

نشانی ہے اسلام کی عظمتوں کی
صحابہ کے قدموں سے خاکِ مدینہ

وفاداریوں پر صحابہؓ کی اختؔر
ہے تاریخ روشن یہ شہرِ مدینہ

مشکل الفاظ کے معنی:۔ ارض: زمین۔ افلاک: فلک کی جمع، آسمان۔ فدا: قربان۔ اُحد: پہاڑ کا نام۔ دامن: بیچ میں۔

یاجبال الحرم یاجبال الحرم

میری نظروں میں تم ہو بڑے محترم
یا جبال الحرم یا جبال الحرم

یہ دعائے حرم لذتِ ملتزم
ہو عطا سب کو یہ نعمتِ مغتنم

اے خدا ہے فقط آپ کا یہ کرم
کررہے ہیں جو ہم سب طوافِ حرم

آگیا سامنے روضۂ محترم
جس کی زیارت کو یارب ترستے تھے ہم

رحمتِ دوجہاں کا ہے فیضِ اتم
جن کے صدقے میں مسلم ومومن ہیں ہم

آپ ہی کے شرف سے یہ رُتبہ ملا
امتِ مسلمہ ہے جو خیر الامم

ہیں سلاطینِ عالم بھی احرام میں
بن کے حاضر ہوئے ہیں گدائے حرم

میرے مالک یہ اختؔر کی سن لے دعا
ہو مقدر میں ہر سال دیدِ حرم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ جبال الحرم: حرم کے پہاڑ۔ نعمتِ مغتنم: قابل قدر نعمت۔ فیضِ اتم: کامل فیض۔ خیرُ الامم: بہترین اُمت۔ سلاطینِ عالم: دنیا کے بادشاہ۔ گدا: فقیر۔ دید: زیارت۔

لذتِ ذکرِ نامِ خدا ہے چمن

لذتِ ذکرِ نامِ خدا ہے چمن — اور غفلت کی دنیا ہے دشت و دمن
کی ہے جس نے بھی ہجرت ترے نام پر — پا گیا پا گیا وہ بہارِ وطن
ہے ضروری گناہوں کو بھی چھوڑ دے — اصل ہجرت نہیں صرف ترکِ وطن
یہ ہے فیضانِ آہ وفغاں دیکھ لو — دامنِ کوہ میں دل ہے کیسا مگن
بالیقیں پائے گا نسبتِ اولیاء — جس کے دل کو لگی ہے خدا سے لگن
شہرِ محبوب ہو گا جہاں بھی کہیں — عاشقوں کا سنا ہے وہی ہے وطن
پھر مدینے کی لذت کو میں کیا کہوں — کاش ہوتا مدینے میں میرا وطن
کس طرح میں کہوں دل سے اے دوستو — زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن
ہیں وطن میں مگر دل مدینے میں ہے — اے مدینہ! فدا تجھ پہ ہوں صد وطن
نیک لوگوں میں ہو صاحبِ دردِ دل — ہے چمن میں کوئی جیسے رشکِ چمن
روز و شب ہے یہ اخترؔ کی آہ و فغاں — بخش دے روزِ محشر مجھے ذوالمنن

مشکل الفاظ کے معنی: چمن: باغ۔ دشت: جنگل۔ دمن: کوڑا پھینکنے کی جگہ۔ دامنِ کوہ: پہاڑ کے بیچ میں۔ مگن: مست۔ فیضانِ آہ وفغاں: اللہ تعالیٰ کی محبت میں رونے پر جو رحمت برستی ہے۔ بالیقیں: یقیناً۔ نسبتِ اولیاء: ولایت۔ لگن: دُھن۔ صد وطن: سینکڑوں وطن۔ ذوالمنن: اللہ تعالیٰ۔

نامِ خدا کی لذت وحلاوت

لذتِ ذکرِ نامِ خدا ہے چمن
اور غفلت کی دنیا ہے دشت و دمن

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ دلوں کو اطمینان ملنے اور لذت وسرور حاصل ہونے کا محض ایک ہی راستہ ہے اور وہ اللہ کی یاد ہے یعنی مومن بندہ ہر حال کے حکم کو اپنے اوپر نافذ کرلے اور اللہ کے احکام کو سر سے پیر تک اس طرح اوڑھ لے کہ جس طرح مچھلی پوری کی پوری پانی میں رہ کر قرار پاتی ہے اس لیے تفسیرِ مظہری کے مفسر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بذکر اللہ میں جو باء ہے یہ فی کے معنی میں ہے اور اس کی مثال میں فرماتے ہیں کَمَا اَنَّ السَّمَکَۃَ تَطْمَئِنُّ فِی الْمَآءِ لَا بِالْمَآءِ۔ اللہ کا نام لینے میں بندے کو وہ کیف وسرور ملتا ہے جو دل کو باغ و بہار کردیتا ہے اسی کو حضرت والا نے فرمایا۔

اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

اور بالفاظِ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام
شیر و شکر می شود جانم تمام

اور اس نام کی لذت وحلاوت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ؎

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیرِ دورِ جام ہے

صاحبو! بعض لوگ اس شک وشبہ میں پڑے رہتے ہیں کہ صرف اللہ اللہ کا ذکر مشروع نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن میں یہ نہ فرماتے:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً﴾

(سورۃ المزمل، آیت:۸)

ترجمہ: اور پڑھے جا نام اپنے رب کا اور چھوٹ کر چلا آ اس کی طرف سب سے الگ ہو کر۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۵۸۴)

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ اسم سے معلوم ہوا کہ تنہا اللہ کے اسم ذات کا ذکر بھی مشروع ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان فی آخر الزمان، ج:۱،ص:۸۴)

کہ جب تک اللہ اللہ کہنے والا کوئی زمین پر باقی ہوگا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی کہ اس میں صرف اللہ اللہ اسمِ ذات کا ذکر مشروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

جبکہ اس کے بالمقابل اللہ کی یاد سے غافل رہنے والے انسان کا دل ویران اور اجاڑ ہو جاتا ہے جیسا کہ جنگل کی ویرانی اور بربادی اور اسے کسی کل سکون نہیں ملتا جیسا روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر خودکشی کرنے والے اور ڈیپریشن (Depression) اور ٹینشن (Tension) کے بیمار بڑے بڑے بنک بیلنس (Bank Balance) کے مالک ہوتے ہیں اور مادی اسبابِ عیش وعشرت کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں ہوتی مگر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے الفاظ میں وہ اسبابِ سکون کے مالک ہوتے ہیں مگر سکون سے عاری ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں الگ ہیں سامانِ سکون بازاروں میں ملتا ہے مگر سکون نہیں ملتا ہے وہ صرف اللہ کی یاد میں ہے جیسا کہ اسی کو حضرت والا نے دوسرے مقام پر یوں فرمایا ؎

سکونِ دل اترتا ہے فلک سے اہلِ تقویٰ پر
بدوں حکمِ خدا سائنس داں پھر کیسے پا جاتا

اگر پٹرول کے مانند ہوتا یہ سکونِ دل
زمیں میں کرکے بورنگ اس کو ہر کافر بھی پاجاتا

حقیقتِ ہجرت پر ہی وطن کی بہار ملتی ہے

کی ہے جس نے بھی ہجرت ترے نام پر
پاگیا پاگیا وہ بہارِ وطن
ہے ضروری گناہوں کو بھی چھوڑ دے
اصل ہجرت نہیں صرف ترکِ وطن

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ہجرت کے فرض ہونے کے بعد اپنے وطن وقوم اور اپنے اہل وعیال اور اقرباء واعزاء اور اپنی تجارت وکاروبار کو اللہ کے نام پر چھوڑ دیا حتی کہ خود اللہ کے لیے اللہ کے گھر کو چھوڑ دیا اور جو گھر کو گھر والے کی خوشی میں چھوڑ دے تو گھر والا اس کو بغیر گھر کے مل جاتا ہے۔

صاحبو! اس گفتگو سے شریعت کا انتہائی قیمتی اصول سامنے آتا ہے کہ ہر عمل سے مومن کا مقصود خود عمل نہیں بلکہ اللہ کی ذات ہوتی ہے اسی لیے جب اللہ کا حکم بیت اللہ کو چھوڑنے کا ہو تو پھر اس کا چھوڑنا ہی عبادت ہے جب اللہ کا حکم صوم وصلوٰۃ نہ کرنے کا ہو تو نہ کرنا ہی عبادت ہے کیونکہ اللہ کی رضا بندے کو نہ کرنے سے مل رہی ہے اور سبحان اللہ کیا ہی مبارک آج کا دن ہے کہ ذوالحجہ کی نو تاریخ ہے جبکہ یہ مضمون لکھا جارہا ہے تمام حجاج کرام بیت اللہ کو چھوڑ کر ٹھیک اسی وقت اللہ کے سامنے آہ وزاری اور گریہ وبکاء میں مصروف ہیں اگر آج کوئی حاجی اللہ کے گھر کے عشق میں بیت اللہ سے چمٹا رہے اور عرفات نہ جائے تو دوستو! نہ اس کا حج صحیح ہوگا نہ اس کو اللہ کی رضا حاصل ہوگی اسی سے یہ اصول نکل کر سامنے آیا کہ ہجرت کی اصل حقیقت حق تعالیٰ کی ناراضگی کے کاموں کا ترک کرنا ہے محض ترکِ وطن نہیں جب جو حکم ملے اس کے آگے سر تسلیم خم کردے اسی لیے نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

﴿وَ الْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، ج: ۱، ص: ۶)

کہ حقیقی مہاجر اللہ کے ممنوعات ومحرمات یعنی گناہوں کو چھوڑنے والا ہے۔ اسی کو حضرتِ والا نے اگلے شعر میں پیش کیا ہے ؎

ہے ضروری گناہوں کو بھی چھوڑ دیں
اصل ہجرت نہیں صرف ترکِ وطن

دل میں یادِ الٰہی سکونِ دائمی کی جڑ ہے

یہ ہے فیضانِ آہ وفغاں دیکھ لو
دامنِ کوہ میں دل ہے کیسا مگن

کسی مومن کے دل سے آہ وفغاں جب ہی نکلتی ہے جب اس کا دل غفلت وقساوت کے میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں تو پھر وہ جس جگہ میں رہے اور جس فضا میں رہے اس کا دل یادِ خداوندی میں مست ومگن رہتا ہے اور وہ دنیا کے غموم وافکار سے بے فکر و بے غم کر دیا جاتا ہے، اس لیے اسے پہاڑ کے دامن میں بھی وہی لطف آتا ہے جو کسی شاندار بنگلے اور عالی شان محل میں آیا کرتا ہے کیونکہ اس کے دل کی مستی وکیف وسرور کا تعلق بیرونی عیش وعشرت کی چیزوں سے نہیں ؎

جائیے کس واسطے اے دردؔ میخانے کے بیچ
اور ہی ہستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

اللہ سے اللہ کا سائل محروم نہیں رہ سکتا

بالیقیں پائے گا نسبت اولیاء
جس کے دل کو لگی ہے خدا سے لگن

حضرت تھانوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو اپنے اللہ سے اللہ کو مانگے گا اللہ اس کو ضرور ملیں گے بس اس مقصد کے لیے دھن اور دھیان، تڑپ اور لگن کی ضرورت ہے پھر جوش میں آ کر حضرت یہ شعر پڑھتے تھے ؎

عاشق نشد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ! درد نیست وگرنہ طبیب ہست

کہ کوئی اللہ کا عاشق ایسا نہیں گزرا کہ جس نے صدقِ دل سے اللہ کو مانگا ہو اور اللہ نے اس کے حال پر نظرِ کرم نہ فرمائی ہو اے میرے پیارے! تم میں درد ہی نہیں ورنہ طبیب تو ہے جو درد کا درماں کرے گا۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے اس کی جستجو میں اس سے بھی زیادہ مضطرب و بے قرار رہنے کی ضرورت ہے جس طرح کوئی شدید بھوک وپیاس کا شکار آدمی کھانے اور پانی کی تلاش میں بے چین رہتا ہے اور یہ راہ تھک کر بیٹھنے والی راہ نہیں بلکہ اس راہ پر چلنے والا ہر قدم پر اپنی منزل کو پا رہا ہے اگر کبھی ٹھوکریں لگ کر گر جائے اور نفس وشیطان کے اثر سے طبیعت میں کچھ تاثر آئے اسے فوراً ہی یہ کہہ کر دفع کر دے جیسا کہ شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ پڑھا کرتے تھے ؎

ہم نے طے کی اس طرح سے منزلیں
گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا اتنا عرصہ ہوا ذکر وفکر میں مجھے مقصود حاصل نہیں ہوا کیا بنے گا حضرت نے فرمایا اے میاں! یہ طلب ہی اصل مقصود ہے جس میں تم لگے ہو، جلدی نہ کرو اور پھر جوش میں آکر یہ شعر پڑھا ؎

یابم او را یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں جستجو تو ہے وہ مجھے ملتے ہیں یا نہیں میری آرزو تو ہے شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ نے فرمایا ؎

اگر ہیں آپ صادق اپنے اقرارِ محبت میں
طلب خود کر لیے جائیں گے دربارِ محبت میں

اس لیے مرتے دم تک گرتے پڑتے جیسے بھی ہو اللہ کو پانے کی جستجو میں لگا رہنا ہی اصل طریق اور روحِ سلوک ہے اور قلب میں نسبتِ اولیاء اللہ کامل جانے کا ذریعہ ہے۔

جہاں میرا محبوب وہی میرا وطن

شہر محبوب ہو گا جہاں بھی کہیں
عاشقوں کا سنا ہے وہی ہے وطن
پھر مدینے کی لذت کو میں کیا کہوں
کاش ہوتا مدینے میں میرا وطن
کس طرح میں کہوں دل سے اے دوستو!
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن
ہیں وطن میں مگر دل مدینے میں ہے
اے مدینہ! فدا تجھ پہ ہوں صد وطن

ان تمام اشعار میں مدینہ منورہ کو اپنے محبوب کے وطن ہونے کی نسبت سے ذکر کرکے اس سے دل کی وارفتگی اور تعلق کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک عجیب نکتے کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ میں مدینے کے سوا کسی جگہ کے لیے دل سے زندہ باد کیسے کہہ سکتا ہوں جبکہ میرا دل سوائے مدینے کے کسی اور جگہ ہے ہی نہیں۔

نیک لوگوں میں ہو صاحب دردِ دل
ہے چمن میں کوئی جیسے رشکِ چمن

وہ اللہ کا نیک بندہ جو اپنے سینے میں خدا کی محبت میں تڑپنے والا دل رکھتا ہو اور اس کی آنکھیں اللہ کے خوف سے اشکبار رہتی ہوں تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے پورے چمن میں کوئی درخت ایسا ہو جو سارے چمن کے لیے قابلِ رشک ہو اس لیے مطلق نیک ہونا الگ بات ہے اور اس مقام و مرتبے پر پہنچنا جو اولیائے صدیقین کو حاصل ہوتا ہے یہ خاص مقربین بارگاہِ الٰہی کی شان ہوتی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کے تین درجے ذکر فرمائے ہیں۔

ہم جیسوں کے لیے بڑی اُمید افزا آیت قرآنی

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾

(سورۃ الفاطر، آیت: ۳۲)

ترجمہ: پھر کوئی ان میں برا کرتا ہے اپنی جان کا اور کوئی ان میں ہے بیچ کی چال پر اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہے لے کر خوبیاں اللہ کے حکم سے۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۳۳۹)

تو گویا تین درجے ہوئے ظالم، مقتصد، سابق، علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ظالم سے مراد کہ واجبات کی ادائیگی کے ساتھ وہ بعض گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور مقتصد وہ کہ واجب ادا کرتا ہے ساتھ ہی سنت کا اہتمام بھی کرتا ہے لیکن بعض مکروہات اور ناپسندیدہ چیزوں میں ابتلاء رکھتا ہے اور سابق وہ کہ جو بعض جائز چیزوں اور مباح امور کو اس وجہ سے ترک کر دیتا ہے کہ اس سے عبادت میں خلل پڑتا ہے یا اس میں شبہ حرام کا ہوتا ہے یعنی مشتبہات سے پرہیز کرتا ہے تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ تینوں قسم کے حضرات مغفور اور جنتی ہیں ان شاء اللہ دوسری بات اہم نکتے کی یہ ہے جو مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے کہ آیت کی ابتداء میں اَلَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا اس سے امت محمدیہ کی عظیم فضیلت ظاہر ہے کیونکہ لفظ اِصْطَفَيْنَا قرآن کریم میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے لیے وارد ہوا ہے اور ملائکہ کے لیے جیسے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا اور اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا البتہ انبیاء کا اِصْطَفَيْنَا اور انتخاب اعلیٰ درجے کا اور مومنین کا اصطفاء اس سے کم درجے کا ہے۔

ساری آہ وفغاں کا نچوڑ مغفرت کا نصیب ہو جانا ہے

روز و شب ہے یہ اخترؔ کی آہ و فغاں
بخش دے روزِ محشر مجھے ذوالمنن

نظم کے اخیر میں حضرت والا ایک دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! شب و روز کے تمام آہ و نالوں کا ایک ہی مقصد اور بس اتنا نچوڑ ہے کہ جب یہ بندہ کل روزِ محشر جب آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو تو آپ نظرِ رحمت ڈال کر اس

کے لیے مغفرت کا فیصلہ کردیں کہ آپ کی شان یہ ہے کہ آپ ذوالمنن ہیں اور بلا استحقاق عطا کرنے والے کریم بلکہ اکرم الاکرمین ہیں اس لیے امید ہی نہیں بلکہ آپ کی ذاتِ عالی سے یہ یقین ہے کہ آپ مجھے بلا استحقاق نعمتِ مغفرت بھی عطا فرمادیں گے جیسا کہ حضرت والا کے ایک دوسرے شعر میں ہے ؎

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

اور ؎

یارب! تیرے کرم سے یہ کچھ بھی نہیں بعید
رحمت بروزِ حشر تیری بے شمار ہو

اور فرمایا ؎

اپنے کرم سے بھیک مجھے مغفرت کی دے
بندہ تیرا محشر میں نہ یہ شرمسار ہو

منقبتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

سیہ دیدہ میں پوشیدہ جمالِ حق کی تابانی
صحابہ کے دلوں کو جس نے بخشا نورِ یزدانی

وہ سلطانِ جہاں تھے قلب میں تھا فقر پنہانی
مقامِ عبدیت کے ساتھ تھی ان کی جہاں بانی

خدادیدہ نظر کو چونکہ دیکھا تھا صحابہ نے
وہ ایماں آج کیسے پاسکے گا کوئی ربانی

تجلی گاہ جو جاں تھی اسی روح منور سے
ہر اک مومن کو ہوتی تھی عطاء معراجِ روحانی

مبارک ان کی آنکھوں کو کہ جن آنکھوں نے دیکھے تھے
نبی کے چہرۂ انور پہ جلوہ ہائے ربانی

جنہوں نے مال و زر بھی آبرو بھی جان بھی دے دی
کوئی جانے گا کیا ان کا مقامِ کیفِ احسانی

ہمیشہ ہر صحابی راہِ سنت کا تھا شیدائی
وہ دیوانے تھے لیکن خاک پا تھی ان کی فرزانی

یہ کیسا معجزہ تھا دوستو! شانِ رسالت کا
شتربانوں کو بخشے جس نے آدابِ جہانبانی

خدا ان سے ہے راضی اور وہ رب سے ہوئے راضی
شہادت اس حقیقت پر ہیں خود آیاتِ قرآنی

بھلا غیرِ صحابی پا سکے گا مرتبہ اُن کا
کہ ہے منصوص اُن پر رحمت حق فضلِ رحمانی

صحابہ کی محبت کو بھی ہم ایمان سمجھتے ہیں
کہ اُن کے دم سے اُمت کو ملی تعلیمِ قرآنی

صحابہ کی حیاتِ باوفا تاریخ ایماں ہے
جو اختؔر دے رہی ہے رات دن پیغامِ ایمانی

مشکل الفاظ کے معنی:۔ سیہ دیدہ: آنکھ کی سیاہ پتلی۔ جمالِ حق: اللہ تعالیٰ کا جمال۔ تابانی: روشنی۔ نورِ یزدانی: اللہ تعالیٰ کا نور۔ سلطانِ جہاں: دنیا کے بادشاہ۔ پنہانی: چھپا ہوا۔ عبدیت: بندگی۔ جہاں بانی:......۔ خُدا دِیدہ نظر: جس آنکھ نے خدا کو دیکھا ہو۔ ربّانی: اللہ والا۔ مال و زر: مال و دولت۔ آبرو: عزت۔ کیفِ احسانی: اللہ تعالیٰ کی حضوری کی لذت۔ شیدائی: دیوانہ۔ خاکِ پا: پاؤں کی خاک۔ فرزانی: عقل۔ شُتربانوں: اُونٹ چرانے والے۔ منصوص: جس کی تائید قرآن پاک میں ہو۔ رحمتِ حق فضلِ رحمانی: اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل۔

قلوب صحابہ کی تابانی عکسِ جمالِ یزدانی ہے

سیہ دیدہ میں پوشیدہ جمالِ حق کی تابانی
صحابہ کے دلوں کو جس نے بخشا نورِ یزدانی

یہ اشعار حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح اور ان کی عظمت و محبت کے بیان میں ہے جس شخص نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں ایمان کے ساتھ دیکھا ہو اور اسی پر اس کی موت واقع ہوا سے صحابی کہا جاتا ہے حدیث کی کتابوں میں حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و محامد کے سلسلے میں باقاعدہ ابواب قائم کئے گئے ہیں بنیادی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ کرام اللہ کی پسندیدہ اور محبوب جماعت ہے اور ان سے جو اختلافات و مشاجرات واقع ہوئے ہیں وہ سب اجتہاد پر مبنی ہیں اس لیے سب برحق ہیں اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کو **رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ** کی بشارت سنائی اور ایک جگہ فرمایا کہ **اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الۡاِیۡمَانَ** کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا ہے اور بہت سی آیات اور احادیث اس معنی میں موجود ہیں۔

ان کے مقام کا اندازہ اس امت کے جلیل القدر محدث مفسر مجاہد حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے اس قول سے بخوبی ہوسکتا ہے جس میں ان سے پوچھا گیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کس کا مرتبہ زیادہ بڑھ کر ہے تو جواب ارشاد فرمایا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جو جہاد کیا ہے اس میں استعمال ہونے والے گھوڑے کے پیروں کے نیچے سے اڑنے والے غبار کے برابر بھی میں عمر بن عبدالعزیز کو نہیں سمجھتا اس لیے باتفاقِ امت کوئی بڑے سے بڑا ولی خواہ وہ کسی بھی درجے پہ پہنچ جائے ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور شرفِ صحابیت نبوت کے بعد اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑا شرف اور سعادت ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلافات کو بیان کرنا اور ان کی تنقیص یا ان پر تنقید کرنا اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے خلاف ہے جو ایسا کرے وہ فاسق و فاجر اور بددین ہے حضرت والا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے جمالِ حق کا مشاہدہ کرایا جس کے نتیجے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا ایسا خاص نور راسخ ہوا کہ جس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا مرتبہ انبیاء کے بعد سب سے اونچا ٹھہرا اور اس صحبت کی برکتوں سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مراتب و درجات اتنے اونچے قرار پائے کہ کوئی ولی کتنے ہی مجاہدات و ریاضتیں کر کے بھی اس درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔

نہ پائیں گے کبھی اہلِ جنوں کی شان یکتائی
کریں اہلِ خرد تا عمر چاہے خامہ فرسائی

شرف صحابیت کی برکت سے فقر میں سلطنت کا ملنا

وہ سلطانِ جہاں تھے قلب میں تھا فقر پنہانی
مقامِ عبدیت کے ساتھ تھی ان کی جہاں بانی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑے اونچے درجے کا مقامِ عبدیت عطا فرمایا تھا اس لیے مسکنت اور عاجزی، تواضع اور فنائیت جیسے اوصاف ان میں بے شمار تھے فقیری میں رہ کر اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہت عطا فرمائی تھی اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو اللہ کے سامنے اپنے کو مٹاتا ہے اور مکمل طور پر خدا کا ہو جاتا ہے تو پھر سارا عالم اس کا ہو جاتا ہے۔

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا تو کوئی شئے نہیں میری

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو یعنی اس کے تقاضوں پر ثابت قدم رہتے ہو اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾

(سورۃ النور: آیت: ۵۵)

ترجمہ: (اے مجموعہ امت) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نور ہدایت کا کامل اتباع کریں) ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمادے گا جیسا ان سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۴۳۸)

جانوروں پر صحابہ کی حکمرانی

اللہ تبارک تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے صدقے ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ کفار بادشاہ ان کے ناموں سے کانپتے اور لرزتے تھے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان کی آواز میں ایسا اثر رکھا تھا کہ جب وہ اللہ کی عظمتوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا واسطہ دے کر سمندروں اور دریاؤں درند اور چرند کو پکار کر خطاب کرتے تھے تو وہ بھی ان کے سامنے مطیع نظر آتے تھے چنانچہ جب حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک لشکر افریقہ کے جنگلات میں پہنچا اور وہاں کے درندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو یوں خطاب کیا:

﴿أَيَّتُهَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوْا عَنَّا، فَإِنَّا نَازِلُوْنَ فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ﴾

(معجم البلدان، حرف القاف والياء وما يليهما، ج:۴، ص:۴۲۱، دار الاحياء التراث العربی)

نبوت کے بعد شرفِ صحابیت کا مرتبہ ہے

خدا دیدہ نظر کو جس نے دیکھا تھا صحابہ نے
وہ ایماں آج کیسے پا سکے گا کوئی ربانی

اس شعر میں بڑے قیمتی نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے کہ جو کسی دوسرے کو ہو ہی نہیں سکتی اور وہ یہ کہ ان کی نظریں اس ہستی پر پڑیں جس کو معراج کے موقعہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا۔

تو جس نے خدا دیدہ نظر کو دیکھا ہو اور اس ہستی کی نگاہیں جس پر پڑی ہوں اس کے برابر بعد میں آنے والا کوئی بڑے سے بڑا اولی اللہ کیسے ہو سکتا ہے اس لیے کہ نظر کی تاثیر ایک مسلم حقیقت ہے جس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں پیش کیا ہے کہ اگر نظرِ بد کی تاثیر برحق ہے تو اللہ والوں کی اچھی نظر میں کیوں اثر نہ ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ عنایت کا کیا ہی کہنا ڈاکٹر عارفی کا فرمودہ ہے ؎

نہ جانے کس ادا سے میری جانب اس نے دیکھا تھا
ابھی تک دل میں تاثیرِ نظر محسوس ہوتی ہے

صاحبو! جب اللہ والوں کی زیارت کا یہ اثر حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ یعنی جب ان کو دیکھا جاتا ہے تو اللہ کی یاد آتی ہے تو پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیدار کی جو بھی فضیلت اور اہمیت ذکر کی جائے وہ کم ہے اسی لیے چند لمحہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت بحالتِ ایمان شرفِ صحابیت

ملنے کا باعث قرار پائی خواہ طویل صحبت نہ رہی ہو گویا اس شعر میں اسی راز کو بیان کیا گیا ہے کہ محض اللہ کے نبی کا دیدار کیوں اس قدر فضیلت کا باعث ہے۔

تجلیاتِ نبوت اور معراجِ روحانی

تجلی گاہ جو جاں تھی اسی روح منور سے
ہر اک مومن کو ہوتی تھی عطاء معراجِ روحانی

یعنی اللہ تبارک تعالیٰ کی تجلیات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلبِ مبارک پر پڑتی تھی اور آپ سے آپ کے متبعین اہلِ ایمان ان تجلیات وانوار سے منور اور روشن ہوتے تھے اور آپ کی صحبت کے نتیجے میں ہر مومن کو معراجِ روحانی عطا ہوتی تھی کیونکہ جس طرح آفتابِ دنیا کے نور سے روشن ہونے والا آئینہ کا عکس اردگرد کو روشن کرتا ہے تو ضرور بضرور اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات سے متجلی ہونے والا قلب دوسرے قلوب کو منور اور روشن کردے گا اس لیے آپ کی تعلیمات وہدایات اور آپ کی خاص عنایات وتوجہات کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معراجِ روحانی نصیب ہوجاتی تھی یعنی ان کا جسم اگرچہ زمین پر موجود ہے مگر ان کا دل ودماغ عرشِ اعظم پر اللہ سے ملاقات کررہا ہوتا ہے۔

مبارک ان کی آنکھوں کو کہ جن آنکھوں نے دیکھے تھے
نبی کے چہرۂ انور پہ جلوہ ہائے ربانی

اس شعر میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بحالتِ ایمان زیارت کی اہمیت کو ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کی حقانیت کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بہت سے سچے عشاق کے چہروں پر اپنی خاص تجلیاتِ جذب رکھی ہیں یعنی ان چہروں پر انسان نظر ڈالتے ہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ چہرے والا جس مذہب کا ماننے والا ہے وہ مذہب ضرور سچا اور حق ہے۔

چنانچہ ایسے مختلف واقعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں پیش آئے کہ آپ کے چہرۂ انور پر نظر پڑتے ہی آپ کی جان کا دشمن کافر حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا اور اس نوع کے واقعات ہمارے بہت سے اکابر کے ساتھ بھی پیش آتے رہے۔ چنانچہ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ لندن (London) تشریف لے گئے تو جب ائیر پورٹ (Airport) پر اتر کر امیگریشن (Immigration) سے نکل رہے تھے تو وہاں کے عملے کے بہت سے غیر مسلم مرد وعورتیں آپ کے اردگرد جمع ہوگئے اور انگریز آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ انسان عام انسانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ جزز (Jesus) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معلوم ہوتے ہیں اسی طرح میرے استاذ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور میرے شیخ حضرت مولانا شاہ

حکیم محمد اختر صاحب مدظلہم کے ساتھ بھی اس نوع کے قصے پیش آئے اور بعضوں نے یہ کہتے ہوئے اسلام قبول کیا کہ جس مذہب کے یہ شخص ہیں وہ مذہب جھوٹا نہیں ہوسکتا اس لیے میں بھی اس میں داخل ہوتا ہوں۔

جان و مال کی قربانی پر مقامِ احسانی کا ملنا

جنہوں نے مال و زر بھی آبرو بھی جان بھی دے دی
کوئی جانے گا کیا ان کا مقامِ کیفِ احسانی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے ایمان اور اسلام کو بچانے کیلیے اللہ کی راہ میں ہر اس چیز کی قربانی پیش کی جس کی قربانی متصور ہوسکتی ہے اور جو انسان کو محبوب اور پیاری اشیاء ہوتی ہیں جان و مال و اولاد عزت و آبرو سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کر دیا اور اپنے دل سے اللہ و رسول کی محبت کے علاوہ باقی ہر شے کی محبت کو نکال ڈالا اسی لیے قرآن میں اللہ نے ارشاد فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَہُمْ لِلتَّقْوٰی اور یہی وہ لوگ ہیں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے آزمالیا یہی وجہ ہے کہ جب دین و دنیا کا تقابل ہوتا ہے تو دنیا کا چھوڑنا ان کے لیے بالکل آسان تھا جس کے نتیجے میں انہوں نے دین کی خاطر اپنی جان کو بھی لٹا دیا اور یہ مقامِ احسانی جان کی قربانی ہی سے حاصل ہوتا ہے اس لیے قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَرَضُوْا عَنْہُ کے الفاظ استعمال فرمائے اور ان کے لیے جنت اور اپنی رضامندی کی بشارت سنائی۔

راہ سلوک دیوانگی سے طے ہوتی ہے فرزانگی سے نہیں

ہمیشہ ہر صحابی راہِ سنت کا تھا شیدائی
وہ دیوانے تھے لیکن خاک پاتھی ان کی فرزانی

حضرات صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر اس قدر مضبوطی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ کوئی سنت ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سے چھوٹتی نہ تھی یہاں تک کہ لوگ ان کو مجنوں اور دیوانہ کہتے تھے اسی لیے قرآنِ پاک میں ہے کہ منافقین نے ان کو بے وقوف کہا اور حدیث شریف میں یہ مضمون آیا کہ تم مومنِ کامل نہیں بنو گے جب تک کہ تم اللہ کا اس کثرت سے ذکر نہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنوں کہنے لگیں اس لیے اسلام کا یہ راستہ اور منزلِ مقصود بغیر دیوانگی کے طے نہیں ہوتا یہ دیوانگی بڑی کام کی ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں دیوانگی کا عاشق ہوں عقل کے بہت گھوڑے دوڑائے پر کام بنا نہیں دوراندیش عقل کو میں نے بہت آزمایا برسوں لیکن کچھ کام نہ آئی یہ عقل و خرد کی باتیں اور۔

بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

پھر سب نے اپنے کو دیوانہ کہا تو اسی سے کام بنا۔

جب بھی نازک کوئی مقام آیا
میرا دیوانہ پن ہی کام آیا

ایسے اللہ کے دیوانوں اور مستانوں کی دیوانگی پر ہزاروں فرزانوں کی فرزانگی رشک کرتی ہے اور خاک بن جاتی ہے جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے کہ جو پورے طور پر اللہ کا بندہ بن کر اللہ کو راضی کرنے کی فکر کرتا ہے تو ان کے قدموں میں دنیا ذلت کے ساتھ آتی ہے۔

شتربانوں کی جہانبانی حضور ﷺ کا معجزہ ہے

یہ کیسا معجزہ تھا دوستو! شانِ رسالت کا
شتربانوں کو بخشے جس نے آدابِ جہانبانی
خدا ان سے ہے راضی اور وہ رب سے ہوئے راضی
شہادت اس حقیقت پر ہیں خود آیاتِ قرآنی

اوّل شعر کی تشریح ماقبل مفصلاً ذکر ہو چکی اور دوسرے شعر میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اُس منصوص فضیلت کا ذکر ہے جس پر صراحۃً نصِ قرآنی موجود ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾

(سورۃ الفتح، آیت: ۲۹)

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدہ میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی نشانی ان کی ان کے منہ پر ہے سجدے کے اثر سے۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۸۷)

صحابہ کی دو اہم خصوصیتیں

بھلا غیرِ صحابی پا سکے گا مرتبہ اُن کا
کہ ہے منصوص اُن پر رحمتِ حق فضلِ رحمانی
صحابہ کی محبت کو بھی ہم ایمان سمجھتے ہیں
کہ اُن کے دم سے اُمت کو ملی تعلیمِ قرآنی

اوّل شعر میں حضرت والا نے صحابہ کرام کے بلند مقام کی جانب خاص طریق سے توجہ دلائی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اُن کی فضیلت آسمانوں سے قرآن کے پاروں میں خود

اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی ہے تو اُن کی فضیلت کا منصوص ہونا یہ ایسی فضیلت ہے جو بعد کے اولیائے اُمت کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

اور دوسری اہم فضیلت حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ ہے کہ پورے قرآن وسنت کے نقل ہونے کا مدار حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نفوس قدسیہ ہیں۔ انہی کی بدولت ہم تک سارا قرآن وحدیث کا ذخیرہ منتقل ہوا۔ اس لیے اُن کی تعظیم وتکریم اور اُن پر اعتماد وبھروسہ کرنا ایمان کا جزوِ اہم ہے۔ ورنہ ہماری صلاح وفلاح کی دونوں بنیادیں یعنی قرآن وسنت کا غیر معتبر اور غیر مستند ہونا لازم آئے گا اس لیے یہ حضرات پوری اُمتِ مسلمہ کے محسن ہیں۔ ان کے بارے میں زبان درازی کرنا یا ان کے اختلافات کو تقریر یا تحریر میں اُچھالنا جائز نہیں ہے اور ایسا کرنے والا فاسق ہے۔

صحابہ کی حیاتِ باوفا تاریخ ایماں ہے
جو اخترؔ دے رہی ہے رات دن پیغامِ ایمانی

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اللہ تبارک تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت و رفاقت کو اس طرح نبھایا کہ اُس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ چنانچہ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب تبوک کے موقعہ پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ اے صدیق! تم نے اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں دیا۔ گھر میں کیا چھوڑا؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا ایمان افروز جواب دیا کہ جو ہر مومن کو دل کی تختی پر لکھ لینا چاہیے کہ میں نے اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے پوری امتِ مسلمہ کے لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جاں نثاریوں سے بھری تاریخ کا ایک ایک ورق اور ان کی زندگی کا ہر باب رات و دن، ایمان واسلام، صدق وفاء، ایثار واحسان کی کھلی دعوت دے رہا ہے۔

بیادِ حضرت شیخ پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ

بتاؤں کیا کیا سبق دیئے ہیں تیری محبت کے غم نے مجھ کو
ترا ہی ممنون ہے غمِ دل اور آہ و نالہ دلِ حزیں کا

جفائیں سہہ کر دعائیں دینا یہی تھا مجبور دل کا شیوہ
زمانہ گذرا اسی طرح سے تمہارے در پر دلِ حزیں کا

جو تیری جانب سے خود ہی آئے پیامِ الفت دلِ حزیں کو
تو کیوں نہ زخمِ جگر سے بہہ کر لہو کرے رخ تیری زمیں کا

نہیں تھی مجھ کو خبر یہ اختؔر کہ رنگ لائے گا خوں ہمارا
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ممنون: احسان مند۔حزیں: غم زدہ۔ جفائیں: ظلم۔ سہنا: برداشت کرنا۔ شیوہ: عادت۔پیامِ الفت: محبت کا پیغام۔لہو: خون۔

ایذائے خلق پر صبر انبیاء و اولیاء کی سنت اور فتوحات کی کنجی ہے

بتاؤں کیا کیا سبق دیئے ہیں تیری محبت کے غم نے مجھ کو
ترا ہی ممنون ہے غمِ دل اور آہ و نالہ دلِ حزیں کا

ان اشعار کو سمجھنے سے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھنا ضروری ہے کہ جب حضرت والا اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کے ساتھ ان کی خدمت میں رہتے تھے تو اللہ کے غیبی تکوینی نظام کے تحت وہاں کچھ حاسدین پیدا ہوگئے جو حضرت والا کے متعلق خلافِ واقعہ غلط باتیں کہتے رہتے تھے تا کہ حضرت والا کو ایذاء و تکلیف پہنچے اور برداشت نہ کر کے حضرت کا ساتھ چھوڑ دیں چنانچہ حضرت والا کو حاسدین اس طرح کے جملے کہا کرتے تھے مالٹا چوسی، مرغی کھائی شیخ کو چھوڑ کے کاہیں کو جائیں (پوربی جملہ) اور اشارہ کر کے چڑایا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک مرتبہ بعض نادان حضرت والا کے شیخ سے آکر کہنے لگے کہ آپ اپنی امانتیں وغیرہ ان کے پاس جمع نہ کیا کریں کیونکہ یہ ابھی جوان ہیں کہیں یہ خرد برد نہ کردیں تو حضرت پھولپوری رحمہ اللہ نے ان کو غصہ میں فرمایا کہ یہ جوان صاحب نسبت ہیں اس کے لیے ایک روپیہ اور ایک کروڑ روپیہ برابر ہیں اور جاؤ دو رکعت نماز پڑھ کے توبہ کرو ورنہ کسی صاحبِ نسبت سے بدگمانی سوئے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے بتایا کہ صوفی غلام سرور صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مولانا شاہ ابرار الحق رحمہ اللہ حضرت والا سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ بہت سے لوگ اب آپ کی جان کے دشمن ہوگئے ہیں اس لیے اب آپ یہاں سے کچھ دنوں کے لیے چلے جائیں تو اس پر حضرت والا نے جواب دیا کہ میں ایک اللہ والے سے اخیر عمر میں اس طرح داغ بے وفائی

نہیں دے سکتا جبکہ اس وقت حضرت کو میری خدمت کی ضرورت ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے جس میں ذرا تبدیلی ممکن نہیں اور حضرت کو صورتِ حال کا علم نہیں اس لیے اللہ کے ولی سے بے وفائی کا تصور بھی مجھ سے ممکن نہیں بالآخر وہ وقت آیا کہ خود ان لوگوں کو پاکستان چھوڑ کے جانا پڑا اور حضرت والا بسلامت و عافیت اللہ کی طرف سے حفظ و امان میں رہے اور میر صاحب مدظلہم سے ہم نے یہ بات سنی کہ حضرت حبیب الحسن خاں شیروانی رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ حضرت پھولپوری نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت والا کے لیے فرمایا کہ انہوں نے شیخ کی خدمت میں جس طرح سولہ سال گزارے ہیں ہم جیسے ایک دن بھی نہیں گذار سکتے تھے انہی مضامین کو حضرت ان چار اشعار میں پیش کر رہے ہیں کہ اے میرے شیخ! میں نے آپ کی محبت سے بہت کچھ حاصل کیا ہے کیونکہ یہ محبت ایک اللہ والے سے اللہ کے لیے تھی تو اس کے نتیجے میں دلِ حزیں اور اس دل کو آہ و نالہ کی نعمت میسر آئی جو اللہ کے نبیوں کی میراث ہے اور حق تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے۔

جفائیں سہہ کر دعائیں دینا یہی تھا مجبور دل کا شیوہ
زمانہ گذرا اسی طرح سے تمہارے در پر دلِ حزیں کا

لوگوں کی طرف سے جفائیں ایذائیں اور حضرت والا کی طرف سے ان کے حق میں دعائیں کرنا یہ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کا حصہ ہے اسی ادا کے ساتھ حضرت پھولپوری کی چوکھٹ پر حضرت والا کی سولہ سالہ زندگی کا ایک بڑا حصہ گزرا ہے۔

جو تیری جانب سے خود ہی آئے پیامِ الفت دلِ حزیں کو
تو کیوں نہ زخمِ جگر سے بہہ کر لہو کرے رخ تیری زمیں کا

مرید کو بے شک شیخ سے محبت ہوتی ہے لیکن حقیقی شیخ وہی ہوتا ہے جو خود اپنے مرید سے ایسی محبت رکھتا ہو کہ مرید کا دل شیخ کی جانب کھینچتا چلا آئے اور اس کی ہر ادا مرید کو پیامِ الفت دے رہی ہو یہی معاملہ حضرت والا کے ساتھ ان کے شفیق شیخ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اسی کی جانب اس مذکورہ بالا شعر میں اشارہ کیا۔

نہیں تھی مجھ کو خبر یہ اختؔر کہ رنگ لائے گا خوں ہمارا
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اے اللہ! مجھے یہ علم نہ تھا کہ میرے یہ مجاہداتِ اختیاریہ اور غیر اختیاریہ (جن سے گزرنا محض آپ کے فضل وکرم سے ہوا) رنگ لائیں گے اور میں اپنے آہ و نالوں کا اثر اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دشمن کی زبان خنجر بند بھی ہو جائے تو میری آستین سے بہنے والا خون خود میرے زخم و درد کی پکار بنے گا اور رنگ لائے گا چنانچہ آج اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام خاردار راہوں سے گزارنے کے بعد مہکتے ہوئے پھولوں کے گلزار تک پہنچا دیا ہے اور سارے عالم میں حضرت والا کو ایک خاص عزت کا مقام عطا فرمایا ہے۔ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.

سفرِ بنگلہ دیش

بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار جانفزاء آئی
کہ بنگلہ دیش میں خوشبوئے اشرف کو صباء لائی

بیانِ سنتِ نبوی سے بنگلہ دیش روشن ہے
کہیں سنبل کہیں نسریں کہیں ریحان و سوسن ہے

شبِ تاریک روشن ہوگئی انوارِ سنت سے
جسے دیکھو وہی مسرور ہے اذکارِ سنت سے

مدرسے اک منٹ کے اور یہ انوار سنت کے
جہاں میں عام ہوجائیں یہ سب گلزار سنت کے

تری تقریر سے بادل چھٹے ظلمات بدعت کے
ملے ہیں طالبوں کو ہر طرف لمعات سنت کے

اولو العزمی تری دیکھی برائی کو مٹانے میں
نہیں دیکھی ہے ہم نے ایسی جرات اس زمانے میں

اثر فرما کسی کا خوف تجھ پر ہو نہیں سکتا
مزاجِ شیرِ نر روباہ ہر گز ہو نہیں سکتا

جہاں ہر نامناسب خو پہ شانِ احتسابی ہے
وہیں عفو و کرم کی شان بھی کیا بے مثالی ہے

تری شفقت سے ہم سب ناقصاں امید رکھتے ہیں
بحمداللہ شبِ تاریک میں خورشید رکھتے ہیں

یہ اختر خاک تیرہ بے زباں بے سازوساماں ہے
مگر مٹی پہ بھی فیضِ شعاعِ مہرِ تاباں ہے

میری یہ گرمی ایماں ترے آتش فشاں سے ہے
مرے کانٹوں پہ شانِ گل بھی تیرے گلستاں سے ہے

مجھے احساس ہے تیرے چمن میں خار ہے اختر
مگر خاروں کا پردہ دامنِ گل سے نہیں بہتر

چھپانا منہ کسی کانٹے کا دامن میں گلِ تر کے
تعجب کیا چمن خالی نہیں ہے ایسے منظر سے

مشکل الفاظ کے معنی: جانفزاء:...... خوشبوئے اشرف: مراد اس سے حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ صباء: صبح کی تازہ ہوا۔ سنبل، نسریں، ریحان و سوسن: پھولوں کے نام۔ شبِ تاریک: اندھیری رات۔ مسرور: خوش۔ ظُلماتِ بدعت: بدعت کی گمراہی۔ طالبون: چاہنے والے۔ لمعات: روشنی۔ اُولوالعزمی: پکا ارادہ۔ مزاج شیرِ نر: شیرانہ مزاج۔ رُوباہ: لومڑی۔ خو: عادت۔ شانِ احتسابی: سرزنش کی شان۔ عفو و کرم: درگذر و عنایت۔ بے مثالی: جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ ناقصان: نالائق۔ خورشید: سورج۔ خاک تیرہ:...... فیضِ شعاعِ مہرِ تاباں: چمکتے ہوئے سورج کی کرن کا فیض۔ آتش فشاں: لاوا۔ خار: کانٹا۔ گلِ تر: تر و تازہ پھول۔

حضرت ہردوئی اور گلشنِ سنت کے پھولوں کی بہار

بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار جانفزاء آئی
کہ بنگلہ دیش میں خوشبوئے اشرف کو صباء لائی

بیانِ سنت نبوی سے بنگلہ دیش روشن ہے
کہیں سنبل کہیں نسریں کہیں ریحان و سوسن ہے

شبِ تاریک روشن ہوگئی انوارِ سنت سے
جسے دیکھو وہی مسرور ہے اذکارِ سنت سے

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بنگلہ دیش کا سفر فرمایا اور وہاں خاص طور پر احیائے سنت کے لیے قدم بقدم اہلِ علم کے بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب فرمایا اور سنتوں کی اتباع کی اہمیت اور اس کے فوائد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک منظم حکمتِ عملی اہلِ بنگلہ دیش کو مرتب فرما کر دی اور اس کے لیے حضرت والا مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کے ان علوم و فیوض کو ایک کتابچے کی شکل میں مرتب فرمایا جس کا نام ایک منٹ کا مدرسہ ہے جو دنیا بھر کی مختلف مساجد میں روزانہ پابندی کے ساتھ ایک منٹ کے لیے پڑھ کر سنایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں پورا بنگلہ دیش انوارِ سنت سے روشن ہوگیا اور ہر سمت ایسی پر کیف بہاریں محسوس ہونے لگیں کہ جیسے کسی حسین اور خوبصورت باغ میں مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبو مہک رہی ہو، بدعت کی تاریکیاں چھٹ گئیں اور لمعاتِ سنت روشن ہوگئیں، شمعیں روشن ہوگئیں جیسا کہ حضرت نے اگلے دو شعروں میں یہی بات ذکر فرمائی۔

حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک امتیازی شان

مدرسے اک منٹ کے اور یہ انوار سنت کے
جہاں میں عام ہوجائیں یہ سب گلزار سنت کے
تری تقریر سے بادل چھٹے ظلمات بدعت کے
ملے ہیں طالبوں کو ہر طرف لمعات سنت کے
اولو العزمی تری دیکھی برائی کو مٹانے میں
نہیں دیکھی ہے ہم نے ایسی جرات اس زمانے میں
اثر فرما کسی کا خوف تجھ پر ہو نہیں سکتا
مزاج شیرِ نر روباہ ہرگز ہو نہیں سکتا

حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خاص صفت مشہور تھی کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے بلکہ بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ منکر کو دیکھ کر فوراً ہی نکیر فرماتے تھے بڑے ہی صاحبِ عزیمت بزرگ تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ منکر پر نکیر بلا تحقیر ہونی چاہیے عرب وعجم میں کہیں بھی کسی مقام پر تشریف لے جاتے اور کوئی منکر دیکھتے یا خلافِ سنت کوئی چیز نظر آئی تو اس پر نکیر کیے بغیر نہ رہتے تھے یہ صفت یعنی منکر پر نکیر کرنا اور بھلائی کا حکم دینا قرآنِ کریم میں اللہ نے مومن کی صفت بتائی ہے دارالعلوم دیو بند کی دارالحدیث تحتانی میں خود راقم السطور نے حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے دورانِ وعظ یہ بات سنی حضرت نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۷۱)

ترجمہ: اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں سکھلاتے ہیں نیک بات اور منع کرتے ہیں بری بات سے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۴۲۰)

اس پر ارشاد فرمایا کہ جس طرح حکومت کے بہت سے ڈیپارٹمنٹ (Departments) شعبے ہوتے ہیں اور ہر شعبے والوں کی الگ الگ علامتیں ہوا کرتی ہیں پولیس (Police) کی الگ علامت ہوتی ہے فوج کی الگ علامت ہوتی ہے اسی طرح اہلِ ایمان کی خاص پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ باہم دوست ہوتے ہیں اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کرتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں زکوۃ ادا کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں بہت سی آیات واحادیث امر بالعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت پر موجود ہیں۔ بہر حال حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شانِ عزیمت اللہ نے عطا فرمائی تھی کہ بڑے سے بڑے موقعہ پر مصلحت کا شکار نہ ہوتے جو حق ہوتا بلا خوف

لومۃ لائم بیان فرما دیتے۔

جہاں ہر نامناسب خو پہ شانِ احتسابی ہے
وہیں عفو و کرم کی شان بھی کیا بے مثالی ہے
تری شفقت سے ہم سب ناقصاں امید رکھتے ہیں
بحمداللہ شب تاریک میں خورشید رکھتے ہیں

یعنی حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کی شانِ تربیت بڑی عالی اور نرالی تھی کہ ہر نامناسب پر احتساب فرماتے لیکن دوسری جانب غایت درجہ شفقت اور بے انتہا عفو درگزر سے کام لیتے تھے اس لیے ہم جیسوں کے لیے حضرت والا کی ذاتِ عالی ایسی تھی جیسے شبِ تاریک میں خورشید فروزاں ہو۔

شیخ کے کمالات میں مرید کے عیوب چھپ جاتے ہیں

یہ اخترؔ خاکِ تیرہ بے زباں بے ساز و ساماں ہے
مگر مٹی پہ بھی فیضِ شعاعِ مہرِ تاباں ہے

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ میری حیثیت مٹی کا ڈھیر ہے جس کے پاس تقریر و بیان ہے نہ ذکر عبادت کا خاص ذخیرہ ہے لیکن جس طرح چمکتا سورج ایک خالی بے آب و گیاہ زمین پر روشنی بکھیرتا ہے تو اس مٹی پر پھول و پھل اُگ آتے ہیں۔

تو اسی طرح ان شاء اللہ میں آپ کی صحبت و معیت میں رہ کر اپنی خاکِ تیرہ کو روشن کر کے اس پر اللہ کے قرب اور اس کی محبت و معرفت کے پھول اُگاؤں گا۔

میری یہ گرمیٔ ایماں ترے آتش فشاں سے ہے
میرے کانٹوں پہ شانِ گل بھی تیرے گلستاں سے ہے
مجھے احساس ہے تیرے چمن میں خار ہے اخترؔ
مگر خاروں کا پردہ دامنِ گل سے نہیں بہتر
چھپانا منہ کسی کانٹے کا دامن میں گلِ تر کے
تعجب کیا چمن خالی نہیں ہے ایسے منظر سے

حضرت والا غایت درجہ تواضع کے طور پر اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی اور کمتر ہونے کو اپنے شیخ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ مجھے جو ایمانی حرارت اور احسانی کیفیت حاصل ہو رہی ہے اس کی بس اتنی

حقیقت ہے کہ جیسے کسی آتش فشاں کے پاس کی چیزیں اس کی حرارت سے گرم ہو جاتی ہے اسی طرح اے میرے شیخ! میرے ایمان میں جو گرمی ہے وہ اسی آتش فشاں کا اثر ہے جو آپ کے سینے میں موجود ہے اور جس طرح تنہا کانٹا ناگوار و ناپسند دیدہ ہوتا ہے لیکن گلستان میں کسی پھول کے دامن میں بسے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس کانٹے کے عیب پر پھول کے ذریعے پردہ پڑ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے اور پھر اس پھول کی قیمت کے ساتھ کانٹوں کی قیمت لگتی ہے، ایسے منظروں سے چمن خالی نہیں ہے، یہی روزمرہ ہم دیکھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح میرا حال ہے کہ میں بھی ایک کانٹے کی طرح عیبوں سے بھرا ہوا ہوں کمالات وخوبیوں سے تہی دامن میرے عیبوں کا پردہ آپ کی معیت پا کر اسی طرح ہو جاتا ہے جس طرح وہ کانٹے گلوں کے دامن میں منہ چھپائے ہوئے ہیں ہم بھی اللہ والوں کے دامن میں آ کر چھپ جائیں تو کیا عجب کہ ستاری ہو جائے آہ! مولانا روم بہت بڑے آدمی ہیں فرماتے ہیں ؎

آں خاری گریست کہ اے عیب پوش خلق

کہ ایک کانٹا رو رہا تھا کہ خدایا آپ نے مجھے خار بنایا لوگ ہم کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں اور چمن بدر کر دیتے ہیں ہمارے لیے انتظامِ چمن کر دیجئے کہ ہم نہ نکالے جائیں ؎

شد مستجاب دعوت او گلعذار شد

اللہ نے اس خارگلستاں کی فریاد رسی فرمائی اور اس پر ایک گل اُگا کر اس کو چھپا دیا اب دامنِ گل میں چھپ گیا اور مالی کی نظر سے مستور ہو گیا تو صدا چمنستان میں رہتا ہے گلوں کی معیت کی برکت ہے یہ دوستو!

فیضانِ شیخ

دورِ نشاط چل بسا گردش جام ہوچکی
صبح بہار وصل کی فرقت شام ہوچکی

عشق بھی تام ہوچکا عقل بھی تام ہوچکی
زندگی بے نظام کی زیر نظام ہوچکی

دیکھو تو فیض شیخ سے زاغ بھی ہنس ہوگیا
زندگی اک ہلال سے ماہ تمام ہوچکی

نشۂ کبر وجاہ تھا سیرت نفور عشق تھی
عاشق میکدہ ہے وہ خوگر جام ہوچکی

اے مرے خالق حیات تجھ پہ فدا ہو صد حیات
تیری رضا سے بندگی میری تمام ہوچکی

اختؔر بے نوا کو گر تیرا کرم کرے معاف
سمجھوں گا مجھ پہ اے خدا رحمت تمام ہوچکی

مشکل الفاظ کے معنی: دورِ نشاط: خوشی کا زمانہ۔ چل بسا: ختم ہوگیا۔ گردش: حرکت۔ جام ہونا: رُک جانا۔ بہارِ وصل: ملاقات کی بہار۔ فرقت: جدائی۔ تام: مکمل۔ **بے نظام:** بے ڈھنگ۔ زیرِ نظام: ڈھنگ والی۔ زاغ: کوا۔ ہنس: چڑیا۔ ہلال: نامکمل چاند۔ ماہِ تمام: مکمل چاند۔ **سیرت:**......۔ نفور:......۔ عاشقِ میکدہ:......۔ خوگر:......۔ بے نوا:......۔

اس نظم کے تمام اشعار حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ کی توجہ خاص سے ہوئے کہ حضرت والا نے ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم کو یہ مصرعہ عطا فرمایا۔

دورِ نشاط چل بسا گردش جام ہوچکی

اور اس پر اشعار کہنے کی فرمائش کی تو حضرت والا نے یہ اشعار کہے جس میں حضرت ارشاد فرمارہے ہیں کہ فرحت ونشاط کا زمانہ گذر گیا جو کہ اصل زمانہ تھا دینی علمی سرگرمیوں کا ہمت عالی اور قویٰ مضبوط تھے وہ دور چلا گیا اور جو وصلِ محبوب کی بہاریں تھیں کہ اپنے شیخ سے فیوض وبرکات سے مالا مال ہوتے تھے ان بہاروں کی صبح، شام میں بدل چکی ہے اور اللہ نے اپنے فضل سے بدنظم اور بے ڈھنگ زندگی کو منظم بنادیا اور اپنی رحمت سے کمالِ عشق اور وفورِ عشق کی دولت عطا فرمادی۔

آہ! صحبتِ شیخ کا کیا کہنا ہے کہ جو لوگ زاغ تھے ہنس ہوگئے، پہلے مُردوں پر مرتے اور جان دیتے تھے اب حیّ وقیوم اللہ پر فدا ہونے لگے اور کیا ہی کہنے ہیں کہ اب صحبتِ شیخ کی برکت سے ایک ہلالِ ناتمام ماہِ تمام بن گیا جو کبر وجاہ کے نشے میں چور تھا اور اللہ کے عاشقوں سے دور تھا وہ اس میکدہ اشرفی سے ایسا آشنا ہوا کہ بس عاشق بن گیا اور محبتِ خداوندی کے جام وپیمانوں کا خوگر ہوگیا اے وہ ذاتِ خداوندی! جس نے مجھے حیات بخشی اگر مجھے سو زندگیاں بھی ملیں تو وہ بھی تجھ پر قربان کردوں، مجھے ایسی شانِ بندگی عطا کردے کہ تو مجھ سے راضی ہوجائے اور یہ تیرا اختر بے یار ومددگار اور بے سہارا ہے، بس تیرے عفو وکرم کا سہارا لگائے ہوئے ہے، تو مجھ پر کرم فرما کر مجھ کو معاف کردے تو بس یہی اس کی پہچان ہوگی کہ مجھ پر آپ کی رحمت تام ہوچکی۔

سامنے جلوے ہیں ان کے کو بہ کو

دردِ دل کے واسطے کر جستجو	زخمِ حسرت اور خونِ آرزو
غم سے ٹکڑے ہو گئے دل کے مگر	دل کے ہر ذرّہ میں ہیں انوارِ ھو
ان کی جانب سے محبت کا مرے	امتحاں ہے ہر شکستِ آرزو
اے خدا تجھ پر فِدا ہو ہر زماں	میری دولت میری جان و آبرو
حسرتوں کے غم اگر ہیں راہ میں	سامنے جلوے ہیں ان کے کو بہ کو
ایسی شکلوں کو نہ میں دیکھوں کبھی	آپ سے جو دور کر دے خوبرو
تجھ کو کیوں مشکل ہے یہ صرفِ نظر	دیکھ اے ظالم شہیدوں کا لہو
شکر کرتے ہیں غمِ حسرت پہ ہم	دیکھ کر یاربّ ترے جام و سبو
دیدۂ اختر ہے گو حسرت زدہ	دیدۂ دل دیکھتی ہے نورِ ھو

مشکل الفاظ کے معنی:۔جستجو: تلاش۔زخمِ حسرت اور خونِ آرزو: اللہ تعالیٰ کی محبت میں حرام خواہشات کا خون کرنا۔انوارِ ھو: اللہ تعالیٰ کے انوار۔کو بہ کو:...... خوبرو: حسین چہرے۔ صرفِ نظر: نظر ہٹانا۔لھو: خون۔جام و سبو: مراد حلاوتِ ایمانی۔دیدہ: آنکھ۔

رضائے محبوب میں آرزوؤں کا پورا نہ کرنا امتحانِ محبت ہے

درد دل کے واسطے کر جستجو
زخم حسرت اور خونِ آرزو
غم سے ٹکڑے ہوگئے دل کے مگر
دل کے ہر ذرے میں ہیں انوارِ ھو
ان کی جانب سے محبت کا مرے
امتحاں ہے ہر شکستِ آرزو

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی شدید اور قوی محبت جو دل و جان میں راسخ ہو اس کے حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دل میں جتنی ناجائز خوشیاں اور حرام لذتیں ہیں ان سب کو چھوڑ دے چاہے دل پر کتنا ہی زور پڑے اور کتنی ہی مشقت اٹھانی پڑے جب تک کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے حرام خوشیوں کو پامال کرنے پر آمادہ اور تیار نہیں ہوتا اگرچہ وہ طاعات پر پابند ہو مگر گناہوں میں پڑ کر کچھ نفس کو مزے بھی دیتا رہتا ہو تو ایسے آدمی کو دردِ دل عطا نہیں ہوتا اس لیے کہ دل پر غم اٹھانے سے اللہ تعالیٰ نے مل جانے کا وعدہ فرمایا ہے اور خاص انوارات وتجلیات نصیب ہونے کی بشارت سنائی گئی ہے۔

اور اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ کسی ماں کے چار بچے ہوں اور ایک ان میں سے بیمار ہو اور گھر پر عمدہ قسم کا مرغن کھانا اور کباب و بریانی وغیرہ تیار کی گئی ہو لیکن اس بیمار بچے کے لیے ڈاکٹر کی طرف سے اس طرح کے کھانے سے پرہیز بتایا گیا ہے اس لیے ماں اپنے اس بیٹے سے یہ درخواست کرتی ہے کہ بیٹا تم میرا کہنا مانو اور ابھی ان کھانوں کے قریب مت جاؤ کیونکہ یہ تمہاری صحت کے لیے مضر ہیں اس پر بیٹا جواب دیتا ہے کہ امی جان میری طبیعت پر بہت زور پڑے گا اور برداشت کرنا بڑا مشکل ہوگا اور میرا دل بہت ٹوٹے گا لیکن چونکہ آپ کا فرمان ہے تو دل کا توڑنا گوارا ہے اور دل پر غم اٹھانا منظور ہے مگر آپ کا حکم نہیں توڑوں گا چنانچہ وہ بیٹا ان کھانوں کے قریب نہیں جاتا اس کے نتیجے میں امی جان قریب آکر اور بڑی پیار بھری حالت میں اشکبار ہو کر بچے کو گود میں اٹھاتی ہے اور اسے مبارک باد دے کر کہتی ہے کہ بیٹا میرا حکم نہ توڑنے کی وجہ سے عنقریب جب تیری صحت ہو جائے گی تو میں تجھے ان سب کھانوں سے لذیذ کھانے بنا کر کھلاؤں گی تو اس بچے کی سعادت وخوش نصیبی کا کیا کہنا اور ماں کے نزدیک اس کے قرب اور پیار کا کیا عالم جس کو حضرت والا نے اس طرح فرمایا ہے ؎

میرے حسرت زدہ دل پر انہیں یوں پیار آتا ہے
کہ جیسے چوم لے ماں چشمِ نم سے اپنے بچے کو

یا ایک دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ جب کبھی کسی ملکی ضرورت سے کچھ لوگوں کے مکانات توڑنے پڑ جاتے ہیں تو حکومت وقت کی طرف سے یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ جس جس کا مکان حکومت کی ضرورت کے لیے توڑا گیا ہے ایسے لوگوں کے لیے شاہی خزانے سے عمدہ قسم کے حسب منشاء و پسند مکانات بنائے جائیں کیونکہ انہوں نے حکومت کی ضرورت کی وجہ سے اپنے مکانات توڑنے کی اجازت دی ہے بس ٹھیک بالکل دل کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ جو بندہ اپنا دل اپنے اللہ کے لیے توڑتا ہے تو پھر اس ٹوٹے ہوئے دل کی تعمیر حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے خزانۂ قرب ومعرفت سے فرماتے ہیں اور جتنا جس درجہ میں اس نے دل پر غم اٹھایا اور اس کو اللہ کے لیے توڑا اور ذرہ ذرہ کر دیا اتنے ہی اس میں انوار خداوندی سرایت کر جاتے ہیں اور اس سے نسبت مع اللہ کی خوشبو مہکنے لگتی ہے اسی کو حضرت والا نے اپنے خاص اسلوب و انداز میں یوں تعبیر فرمایا۔

تیرے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

اللہ تعالیٰ پر جائز محبتیں بھی قربان کر دینی چاہیے

اے خدا تجھ پہ فدا ہو ہر زماں
میری دولت میری جان و آبرو

صاحبو! دردِ دل حاصل کرنے لے لیے صرف ناجائز اور حرام خواہشات اور تمناؤں کو چھوڑ دینا اور اللہ کی مرضی پر قربان کر دینا جس کا معنی یہ ہے کہ ایک لمحہ گناہ کر کے اللہ کو ناراض نہ کرنا یہ تو مومن بندے کے لیے لازم اور ضروری ہی ہے لیکن اللہ کے خاص مقرب بندوں کے لیے اس سے بھی آگے کا درجہ یہ ہے کہ ان کی جو جائز آرزوئیں اور تمنائیں ہوں ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر جب تقاضہ سامنے آجائے تو بلا چوں و چراں قربان کر دے اور اپنی مصالح کے فوت ہونے کی طرف نظر نہ اٹھائے مثال کے طور پر اللہ کے دین کے لیے گھر سے ہجرت کرنا پڑے تو اس وقت بیوی بچوں کی محبت رکاوٹ نہ بنے چلتے ہوئے شاندار کاروبار کی منفعت آپ کے اور آپ کے ارادوں کے درمیان حائل نہ ہوں وطن میں رہنے والے دوست واحباب سے تعلق اور اپنی جائے پیدائش کے ساتھ انس اور لگاؤ غرض یہ کہ یہ سب جائز محبتیں ہیں لیکن دل پر کتنا ہی زور پڑے اور ٹوٹ کر چورا چورا ہو جائے بس مومن بندے کی شان یہ ہونے چاہیے کہ امرِ الٰہی آنے پر سب کو خیر آباد کہہ دے۔

صحابہ کرام کی زندگی پڑھ لینے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی ہر نوع کی تمنائیں اور خواہشیں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاروں پر اس طرح قربان کر دیں تھی کہ اس کے خلاف ان کے دل میں سوچنے کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی کامیابی اور سرخروئی اور

عزت و رفعت کا راز ہی یہی تھا اور آج بھی اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح قائم ہے کہ جو بندے اپنا سب کچھ اللہ پر قربان کرتے ہیں اور دل میں اس کے برخلاف خیال بھی نہیں لاتے تو آخرت کی عزتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی ان کو چمکا دیتے اور روشن کر دیتے ہیں۔

حسین شکلوں پر نظر ڈالنا اللہ سے دور کر دیتا ہے

حسرتوں کے غم اگر ہیں راہ میں
سامنے جلوے ہیں ان کے کو بکو
ایسی شکلوں کو نہ دیکھوں میں کبھی
آپ سے جو دور کردے خوبرو

انسان کے اندر گناہ کرنے کے تقاضے فطری طور پر رکھے گئے ہیں اور شہوتِ بطن اور شہوتِ فرج یہ دونوں شہوتیں گناہوں کا سر چشمہ اور مرکز ہیں اس لیے ایسی نامحرم عورتوں اور لڑکیوں کی یا بے ریش امرد لڑکوں کی شکل و صورت دیکھنے اور ان سے میل جول اور تعلقات میں نفس کو حرام لذت ملتی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ جب دل میں حسین مردوں کی شکلیں موجود ہونگی تو اللہ تعالیٰ سے قرب کا تصور و خیال بھی فضول اور بے کار ہے لہٰذا ایسی شکلوں کو ہرگز نہ دیکھے جتنا بھی دل پر زور پڑے اور حسرتیں ہوں برداشت کرتا جائے تو اس کو اللہ کے قرب کی لذت اور اس کی تجلیات خاصہ دل میں محسوس ہونے لگیں گی لیکن جب تک کوئی خوب رو ہمارے دل میں موجود رہے گا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بہت غیرت والے ہیں جہاں کوئی دوسرا موجود ہو وہاں اللہ نہیں آتے اسی لیے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ میں پہلے غیر اللہ کو دل سے نکالنے کی بات کی گئی ہے پھر اللہ تعالیٰ کو پا لینے کا ذکر ہے جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

لا الٰہ ہے مقدم کلمۂ توحید میں
غیرِ حق جب جائے ہے تب دل میں حق آجائے ہے

اس لیے خاص طور پر ایسی حسین اور خوب رو شکلوں سے اپنے دل کو بچانا از حد ضروری ہے ورنہ اس گناہ کے نتیجہ میں آج کے زمانے میں کئی جوان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

شہیدوں کے خون سے عبرت

تجھ کو کیوں مشکل ہے یہ صرفِ نظر
دیکھ اے ظالم شہیدوں کا لہو

یعنی وہ بندہ جو اللہ کی راہ میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے اور اس کو راہِ حق میں قربان کر دیتا ہے تو اس کو دیکھ کر سبق حاصل کرنا چاہیے اور یہ نتیجہ نکال لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اتنے محبوب اور پیارے ہیں کہ آرزوؤں کا لہو پی جانا یہ تو معمولی بات ہے کیونکہ اللہ پر تو جان بھی قربان کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ شہدا اس محبوب اللہ کے لیے اپنی گردنیں کٹا کر خون بہا دیتے ہیں بس مردِ مومن کے لیے ہمت مردانہ کی ضرورت ہے تو پھر کچھ بھی مشکل نہیں جو لوگ مشکل سمجھتے ہیں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر استحضار کے درجہ میں یقین نہیں رکھتے ورنہ جو آدمی مثال کے طور پر یہ جانتا ہو کہ میرے سامنے ایک فوجی افسر ہتھیاروں سے مسلح کھڑا ہوا ہے اور پاس سے اس کی حسین بیٹی گزر رہی ہے اور وہ فوجی تاک لگائے ہوئے غور سے دیکھ رہا ہے کہ کون ہے جو میری بیٹی پر ذرا نظر ڈالے تو میں اس کا کام تمام کردوں تو بتائیے کہ یہ شخص اس فوجی کے کھڑے ہونے کہ باوجود اس کی بیٹی پر نظر ڈالنے کی احمقانہ حرکت کر کے اپنی موت کو دعوت دے گا؟ کبھی بھی نہیں تو پھر قرآن میں اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی اور ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ یعنی کہ تم کو پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ گھات میں ہیں تو اگر یہ عقیدہ استحضار کے درجے میں دل میں موجود ہو تو پھر حسین شکلوں کو دیکھنا فوراً چھوٹ جائے گا۔

مجاہدۂ قلیل پر انعامِ کثیر

شکر کرتے ہیں غمِ حسرت پہ ہم
دیکھ کر یارب ترے جام و سبو
دیدۂ اختر ہے گو حسرت زدہ
دیدۂ دل دیکھتی ہے نورِ ھُو

یعنی اللہ تعالیٰ اس قدر شاکر و شکور ہیں، اتنا قدر کرنے والے ہیں کہ بندے کی طرف سے تھوڑا ہونے پر خوب نوازتے ہیں جب کہ اس کی توفیق بھی خدا ہی عطا فرماتے ہیں تو جو بندہ ذرا قوت و ہمت سے اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کی لذتوں کو چھوڑتا ہے اسے حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی شرابِ محبت کے ایسے جام و سبو عطا ہوتے ہیں کہ پھر وہ بندہ غمِ حسرت اٹھانے کی توفیق دیئے جانے پر حق تعالیٰ کا خوب شکر ادا کرتا ہے۔

خاص طور پر یہ اشعار جنوبی افریقہ میں جوہانسبرگ سے نیروبی تک طیارے میں موزوں ہوئے ہیں اور

جہازوں میں انگریز ننگی جوان لڑکیاں پھرتی رہتی ہیں تو ایسے موقعہ پر نہ ان کی طرف دیکھنا نہ ان سے مسکرا کر باتیں کرنا گو ظاہری طور پر آدمی کو حسرت میں مبتلاء کرے گا اور دیکھنے والے یہ محسوس کریں گے کہ نا معلوم یہ شخص کیوں اداس اداس محسوس ہو رہا ہے لیکن حضرت والا فرماتے ہیں کہ ظاہری اداسی اور آنکھوں کا حسرت زدہ ہونا یہ دیدۂ دل میں روشنی اور اجالا پیدا کرتا ہے اور اس کو انوارِ ھو سے منور کر دیتا ہے جس سے دل میں تازگی اور فرحت وسرور اور انبساط ونشاط پیدا ہو جاتا ہے۔

ہائے لمحاتِ غفلتِ دل کے

آرزو میری خاک میں مل کے لطف لیتی ہے عشقِ کامل کے
مٹ گئے رنج راہِ منزل کے پاس آئے ہیں جب سے وہ دل کے
رنج حسرت ہے راہ میں لیکن لطف شامل ہیں ان کی منزل کے
کیا کہوں ان کے قرب کا عالم کتنے عالم ہیں عالم دل کے
فرطِ لذّت سے جھوم جاتا ہوں کتنی خوشیاں ہیں آپ سے مل کے
اب خزاں دل سے دُور ہے کیونکہ پاس رہتے ہیں وہ مرے دل کے
جب یہ لذت ہے دل کے طوفاں میں کیا کہوں کیف دل میں ساحل کے
کیا خبر تھی کہ خوں بہا ہیں آپ ہائے لمحات غفلت دل کے
ایسے ویسے بھی ہو گئے کیسے فیض کیسے ہیں شیخِ کامل کے
جان ان پر فِدا کرو اخترؔ سرخ رو ہو گے خاک میں مل کے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ خاک میں ملنا: فنا کر دینا۔ فرطِ لذّت: شدت لذت۔ کیف: مزا۔ خوں بہا: حرام خواہشات کا خون کرنے کا بدل۔ ھائے: افسوس۔ سرخ رُو: کامیاب۔

حرام آرزوئیں خاک میں ملانے سے مولیٰ ملتا ہے

آرزو میری خاک میں مل کے
لطف لیتی ہے عشقِ کامل کے

حضرت والا دامت برکاتہم ان اشعار میں جس مضمون کو ارشاد فرما رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں مختلف قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں رکھتا ہے جن میں سے بعض حرام اور ناجائز خواہشات ہوتی ہیں جن کو پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ کچھ جائز اور مباح تمنائیں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا من جانب اللہ مبغوض اور ناپسندیدہ نہیں ہوتا، مگر ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اس دنیا کے جھمیلوں میں زیادہ

منہمک اور مشغول ہونا پڑتا ہے تو اللہ اپنے خاص بندوں کو اپنا خاص مقامِ قرب عطا فرما کر، جس طرح حرام خواہشات سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اس کے سامنے مختلف قسم کے موانع اور رکاوٹیں ان کی تکمیل کی راہ میں سدِّ باب ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جائز اور مباح آرزوؤں اور تمناؤں میں بے حد انہماک اور اشتغال سے بھی اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ فرماتے ہیں اور جب اس طرح ان کی اُمیدیں خاک میں ملتی ہیں اور ان کی ذہنی مادی اسکیمیں اور نقشے اور دنیوی ترقی کے پروگرام فیل ہوتے رہتے ہیں تو پھر اُنہیں اپنے مولیٰ کے عشقِ کامل کا مزہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ ایک جوان لڑکا اپنی جوانی کے نشے میں کسی نامحرم سے دوستی اور عشق لڑانے کے لیے اس سمت میں چلا اور ابتدائی مرحلے ہی میں اس کو اپنی اُمیدوں میں ناکامی نظر آنے لگی۔ اس کو بظاہر اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری جانب سے اُسے مثبت اشاروں کے بجائے منفی جوابات ملنے لگے تو اس موقعہ پر اس کی یہ حرام خواہشات اور ناجائز اُمیدیں خاک میں ملتی نظر آئیں۔ جن حرام کاریوں کی لذتوں کا نقشہ اپنے ذہن میں سوچے ہوئے تھا اور جن اُمیدوں کا محل اپنے خیال میں تعمیر کیے ہوئے تھا، وہ سب ڈھیر ہو کر خاک میں ملتا نظر آیا۔ اب یہ اپنے اس حسرت زدہ دل میں بآسانی اپنے مولیٰ کی محبت کے مزے حاصل کر سکتا ہے۔

یہی دلیل ہے اس بات کی کہ اس بندے سے اللہ تعالیٰ کو غایت درجہ محبت ہے کہ اپنے بندے کو اس کی ناجائز حرکتوں اور حرام کاموں سے بچا کر زبردستی اس کی پیشانی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔

اتفاق سے ایسا ہوا...... کی حقیقت

صاحبو! کس قدر نادانی اور غفلت کی بات ہے کہ آج ہم اس طرح کے معاملات کو اتفاقات سے تعبیر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اتفاق سے ایسا ہوا کہ میں نے جس سے عشق بازی کی تھی وہ میرے ارادوں پر پانی پھیر گئی یا پھیر گیا۔ مجھے اس تک رسائی حاصل نہ ہوسکی۔ پہلے ہی دن جب فون پر رابطہ کیا یا ایس۔ ایم ایس (S-M-S) بھیجا تو اس کے یا میرے والدین کو خبر ہوگئی یا کسی اور طریقے ہمارے عشق کا راز فاش ہوگیا اور محبت کی گاڑی نہ چل سکی۔ مزید یہ کہا جاتا ہے کہ کسی بزرگ کی مجلس میں جانا ہوا تو اس عشقِ مجازی اور ناجائز محبت کی نحوست ولعنت کا پتہ چلا تو سارے ارمان دل سے نکل گئے اور تمام تمنائیں خاک میں ملا ڈالیں اور حالت یہ ہوگئی کہ دنیا کی بڑی سے بڑی حسین وجمیل لڑکی بھی سامنے آجائے اور اس کو دیکھنے کی دل میں کتنی ہی تمنا پیدا ہو تو ہر تمنا خاک میں ملا ڈالی۔ اب اس کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھوں اور نہ دل کو اس کے ناپاک خیال سے گندہ کروں۔ بس یہی وہ مقام ہے جس کو حضرتِ والا ارشاد فرماتے ہیں کہ سالک کو اس مقام پر پہنچ کر عشقِ کامل کا لطف میسر آتا ہے۔

اس لیے میرے بھائیو! صورتاً یہ ناکامی ہے اور درحقیقت کامیابی ہے۔ بظاہر یہ محرومی ہے، مگر درحقیقت مقصد بر آری ہے اور کہنے کو یہ بدنصیبی اور بدقسمتی ہے، مگر دراصل یہ سعادتمندی اور خوش نصیبی ہے۔

ایک عبرت ناک واقعہ

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو دار العلوم دیوبند میں ہمیں ہمارے استاد مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے سنایا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایک خادم تھے۔ اُن کے لیے ان کا کھانا روزانہ کسی کے گھر سے آیا کرتا تھا، مگر آہستہ آہستہ گھر کی خاتون سے سلام دعا شروع ہوئی۔ پھر شُدہ شُدہ آپس میں خیر خیریت کی باتیں ہونے لگی اور ہوتے ہوتے آپس میں تعلق اور محبت پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ باضابطہ ناجائز مقصد کی تکمیل کے لیے ایک رات کا مخصوص حصہ طے ہوگیا۔ چنانچہ خادم اس مقصد کی تکمیل کے لیے چل دیئے تو صورتِ حال یہ ہوئی کہ ابھی وہ تھوڑا ہی چلے تھے کہ راستے میں شدید آندھی وطوفان اور بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ اتنی دیر تک قائم رہا کہ ان کا وعدہ کیا ہوا وقت ختم ہوگیا۔ بالآخر وہ خادم آگے بڑھنے کے بجائے واپس پیچھے لوٹ گیا، کیونکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے تہجد میں اُٹھنے کا وقت ہو چکا تھا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ غلط ارادے نہیں کیا کرتے۔

تو دوستو! کیا آپ اس واقعے کو محض ایک اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ نہیں نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی حفاظت کا ایک خاص انتظام ہے۔ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اولیاء اللہ کے خادموں پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظرِ عنایت اور حفاظت ہوتی ہے کہ جس سے نظامِ عالم حرکت میں آجاتا ہے۔ کیا کوئی عقل مند انسان اس ناکامی اور محرومی کو واقعی ناکامی اور محرومی قرار دے سکتا ہے؟ بالکل نہیں، بلکہ یہ تو عین کامیابی اور سعادت مندی ہے۔

رہ گئی وہ آرزوئیں اور تمنائیں جو گو کہ حرام نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں خوب مال و دولت جمع کروں اور خوب عیش وعشرت کی زندگی گزاروں۔ شاندار عمارتیں، اونچے محلات، اعلیٰ درجے کی گاڑیاں غرض یہ کہ ہر قسم کے سامانِ عیش وعشرت کو جمع کرلوں، مگر جب اللہ تعالیٰ کو اس بندے سے محبت ہوتی ہے تو دنیا میں انہماک سے اور عیش و عشرت میں اشتغال سے اس کو اس طرح بچا لیتے ہیں کہ اس کے لیے بظاہر مال و دولت کے تمام راستے ناکامیوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ بالآخر وہ سب اُمیدوں کو چھوڑ کر تعلیم وتعلّم اور دعوت وتبلیغ اور درس وتدریس کی راہ کو اختیار کرتا ہے اور اُس کا مرنا جینا صرف دین کے لیے رہ جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے ایک استاد فرماتے تھے میں ایک خالص مدرّس ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ دنیاوی کاروبار کی طرف لگنا چاہا، پر اکثر ناکامی ہی سامنے آئی اور نفع کے بجائے نقصان اُٹھانا پڑا تو بالآخر میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ سے یکسوئی اور پورے انہماک کے ساتھ دین کی خدمت لینا مقصود ہے۔ چنانچہ ماشاء اللہ آج وہ استاد بخاری وترمذی کے مدرّس اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ درحقیقت یہ سب اللہ تعالیٰ بندوں کے فائدے کے لیے کرتے ہیں ورنہ اللہ کو ہم سے کوئی منفعت مقصود نہیں ہے۔ اصغر گونڈوی کا شعر ہے ؎

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغرؔ
کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

شانِ ربوبیت کی ایک جھلک

بھائیو! یہ سب اللہ کی شانِ ربوبیت ہے جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے جسم کے رب ہیں اوراس کو آفات وبلیات سے بچاتے ہیں اسی طرح وہ ہمارے قلب وروح کے بھی ربّ ہیں کہ ان کوامراض اور بُرائیوں سے بچاتے ہیں۔ اس لیے بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ خواہ کتنا ہی دل پر زور پڑے اوراس کو کیسا ہی رنج وصدمہ پہنچے، مگر وہ پختہ فیصلہ کرلے کہ اللہ کے حکم کوتوڑ نا منظور نہیں۔ تو یاد رکھیے پھراس ٹوٹے ہوئے دل میں اللہ تعالیٰ اپنی خاص تجلیات کے ساتھ متجلی ہوتے ہیں اورحق تعالیٰ اس ٹوٹے ہوئے دل کوایسی لذت اور حلاوت عطا فرماتے ہیں کہ دونوں جہان کی نعمتیں بھی اُس کے سامنے ہیچ ہیں۔

حلاوتِ قربِ خداوندی اوراس کی خاص حکمت

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حلاوتِ قربِ خداوندی کوحضرتِ والا نے جس خاص انوکھے انداز سے بیان فرمایااس کو نہ پہلے کہیں سنااور نہ کہیں پڑھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بھوکا انسان اپنے سامنے رکھے ہوئے عمدہ اور لذیذ قسم کے کھانے اورمختلف انواع واقسام کے حلوہ جات میں سے خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش! مجھے مزید بھوک ہوتی تو اورمزید لذیذ اشیاء سے اپنا پیٹ بھرتا اور جو چیزیں کھانے سے رہ گئی ہیں ان میں سے بھی کھاتا۔ خواہ اس نے خوب سیر ہوکر کھایا ہو پھر بھی اگراُسے یہ علم ہوجائے کہ بہت لذت وفرحت بخش قسم کی مٹھائی وغیرہ ابھی باقی ہے تواس کی تمنا ہوتی ہے، کاش! پیٹ کے اندر کوئی جگہ نکل آئے تاکہ وہ اس کو بھی کھاسکے تو غرض یہ کہ اس کی آخری درجے کی سیرابی کبھی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ جوحسینوں کا عاشق ہوتا ہے۔ بالفرض اگراس کو ساری دنیا کی حسین اورحسینائیں دکھادی جائیں اور پھر بھی اُسے یہ پتہ چلے کہ ابھی کسی خطے کا حُسن اُس نے نہیں دیکھا تو وہ اس کی تمنا کرے گا کہ کاش! اُسے دیکھوں اوراُس کے بغیر اُسے چین وسکون میسر نہیں ہوگا اور دوسرا وہ بھوکا شخص جس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے وہ کھانا ڈھونڈتا رہتا ہے تاکہ اس کے ذریعے اپنی بھوک دور کرے۔

اگرآپ غور فرمائیں تو یہ معلوم ہوگا کہ جس طرح یہ بھوکا کھانے کامحتاج ٹھہرا۔ اسی طرح وہ سیراب شخص بھوک کا خواہشمند اورمتلاشی ٹھہرا تو ایک لحاظ سے یہ دونوں ہی محتاج ہوئے اوراپنے دل کے قرارواطمینان اورتسلی اور تشفی کے لیے ایک کھانے کامحتاج تو دوسرا مزید بھوک کا متمنّی تاکہ اورمزید لذیذ اورمزیدار چیزیں کھاسکے۔ جبکہ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی ذات جس کے قلب میں سماجائے تو گویااس نے لذاتِ عالم کا کیپسول (Capsule) کھالیا کیونکہ سارے عالم کی لذتوں کا خالق اور مرکزِ لذاتِ عالم اللہ کی محبوب ذات ہے تو اس کو دل میں بسالینا اور

دل کو اس کی محبت سے سرشار کر لینا خلاصہ اور نچوڑ ہے تمام لذتوں کے پالینے کا۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نام میں بھی ایسے ہی لذت وحلاوت رکھ دی ہے، اس لیے جب بندہ مؤمن اللہ کا نام دل کی گہرائیوں کے ساتھ لیتا ہے تو مؤمن کی ساری جان شیر وشکر بن جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے دل میں مزید کسی فانی لذت کی تمنا نہیں پاتا اور نہ اطمینان وسکون کے لیے اُسے مزید کسی شئے کی حاجت رہتی ہے بلکہ دونوں جہان کی ساری نعمتیں مل جانے سے بھی بڑھ کر اس نعمتِ قربِ خداوندی میں اُسے خاص لطف اور مزہ نصیب ہوتا ہے۔ جس کو حضرت والا نے اپنے اِن اشعار میں بیان فرمایا۔

وہ شاہِ دو جہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کر پائے
ارے یارو جو خالق ہو شکر کا
جمالِ شمس کا نورِ قمر کا
نہ لذت پوچھ پھر نامِ خدا کی
حلاوت نامِ پاک کبریا کی

انبیاء علیہم السلام کے قلوب کا دنیا کی طرف مائل نہ ہونے کا ایک قیمتی راز

دراصل یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبھی دنیا کے منصب وعہدوں اور اس کی فانی لذتوں اور مزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی نظر میں اصحابِ دولت وثروت کی کوئی قیمت واہمیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ دنیا کے حقیر خزانوں کی طرف وہ للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

تقریباً یہی حالت اُن کے نائبین علماء اور اولیاء اُمت کی ہوتی ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں اور عہدے داروں کو خاطر میں نہیں لاتے اور اُمراء ورؤساء سے تعلقات اور دوستی کو خطرے کی گھنٹی سمجھتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جس کو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ترمذی کی شرح میں ذکر فرمایا کہ شام کے ایک عالم جو بڑے درجے کے محدث تھے، ایک مسجد میں معتکف رہتے اور وہیں حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن بادشاہ ان کی خدمت میں ملنے کے لیے حاضر ہوا تو وہ جس طرح پیر پھیلائے بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ جب لوگوں نے عرض کیا حضرت! سامنے سے بادشاہ آرہے ہیں۔ تو ارشاد فرمایا کوئی حرج نہیں آنے دو۔ چنانچہ جب وہ آگئے تو شیخ نے ان کے سامنے دنیا کی بے ثباتی اور اس کی فنائیت وغیرہ کا تذکرہ کیا جس سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور وہاں سے چلا آیا۔ پھر اپنے پاس سے اپنے ایک خادم کے ذریعے اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی ہدیے میں بھیجی۔ جب خادم نے آکر وہ تھیلی ان اللہ والے کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے قبول کرنے سے منع کردیا اور خادم سے

یہ فرمایا کہ بادشاہ سے جا کر یہ کہہ دینا اِنَّ الَّذِی یَمُدُّ رِجْلَیْهِ لَا یَمُدُّ یَدَیْهِ یعنی کہ جو شخص اپنے پیروں کو پھیلایا کرتا ہے وہ اپنے ہاتھوں کو نہیں پھیلاتا۔

شیخ کی توجہات کا اثر

میرے دوستو اور بھائیو! یہ احقر جو اشعار کی تشریح پیش کر رہا ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور ہمارے حضرت والا کی دعاؤں اور توجہات کا نتیجہ اور سامعین، اہلِ مجلس کی طلب صادق کا اثر ہے۔ احقر نہ اس کا اہل ہے اور نہ اپنے کسی کمال کا اس میں دخل ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ جب میرے شیخ و مرشد کا حکم ہوتا ہے تو اس کی تعمیل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اشعار کی تشریح کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔ توفیقِ الٰہی سے جو مضامین کتاب وسنت کی روشنی میں دل میں آتے رہتے ہیں ان کو پیش کرتا ہوں۔ اگر اس موقعہ پر احقر اشعار اور ان کی تشریح پیش کرنے سے پہلو تہی اور اعراض کرے اور کسی حیلے بہانے سے بچنا چاہے تو وہ درحقیقت خود رائی ہوگی اور شیخ کی حکم عدولی ہوگی جو سالک کے لیے بے حد مضر اور نقصان دہ ہے اور بلکہ آگے بڑھ کے یہ کہیے کہ خود رائی یعنی اپنی رائے پر چلنے کا شوق جو کہ دل کی ایک بیماری ہے، اس کو تواضع سمجھنا نادرست اور غلط ہے بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ جب اپنے بزرگوں اور بڑوں کی طرف سے کسی کام کا حکم ہو تو اس کی بجا آوری کو اپنی سعادت سمجھے۔ تقریباً بعینہٖ یہی صورتِ حال احقر کے پیشِ نظر ہے کہ حضرتِ والا کا حکم ہے اس کو پورا کرنے کے لیے زبان بنتا ہوں، ورنہ ایک مدت سے کان بن کے رہتا تھا اور دل میں اُس کی تمنا ابھی بھی ہے اور فی نفسہٖ اپنے شیخ کے پاس کان بن کر رہنا ہی زیادہ مفید اور نفع بخش ہے۔

شیخ کا دل خوش کرنا عبادت ہے

چونکہ مرید کو اپنے شیخ سے جو محبت ہوتی ہے وہ للہ محبت ہے، جس کی حدیثوں میں بڑی فضیلت موجود ہے۔ شیخ اپنے مرید کو اللہ کی طرف راہ دکھلاتا ہے، اس لیے اپنے شیخ کے دل کو خوش کرنا بھی اسی طرح عبادت قرار پائے گا جس طرح کہ نبی کے دل کو خوش کرنا عبادت ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ نبی اور نائب نبی دونوں کا دل خوش کرنا عنداللہ محمود اور پسندیدہ ہے حتیٰ کہ ملا علی قاری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مطلق مؤمن کے دل کو خوش کرنا من جملہ عبادت کے ہے، جبکہ خالصتاً بوجہ اللہ ہو اور اس میں دنیوی غرض شامل نہ ہو۔

اس مضمون کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بحوالہ ایک روایت ذکر فرمایا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم مجھ کو گزشتہ شب میں دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ میں تمہارا قرآن سن رہا تھا واقعی میں تم کو داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی کا حصہ عطا ہوا ہے۔ روایت کیا ہے اس کو بخاری و مسلم اور ترمذی نے اور برقانی کی روایت میں مسلم سے اتنا اور زیادہ ہے کہ حضرت

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! واللہ اگر مجھ کو معلوم ہو کہ آپ میرا قرآن سن رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر اس کو خوب بناتا، سنوارتا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس سے استنباط فرمایا کہ بزرگوں کا دل خوش کرنے کے لیے اگر کوئی طاعت یا خدمت اچھی طرح کی جائے کہ مخلّی بالطبع (خالیُ الذہن) ہو کر اس طرح نہ کرتا تو ظاہر میں اس میں شبہ ریاء کا معلوم ہوتا ہے، مگر چونکہ تطییبِ قلب اہل اللہ بلکہ قلبِ مسلم خود عبادت ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک عبادت کو دوسری عبادت کے واسطے اچھی طرح کرتا ہے، اس لیے ہرگز یہ ریاء نہیں ہے۔ حدیث میں اس کے استحسان پر صاف دلالت ہے۔ سبحان اللہ! حکیم الامت جیسا عالم اپنے وقت کے مجدّد کیا خوب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس نادان کو مدتوں یہ شبہ رہا کہ اکثر کسی کی فرمائش سے جو قرآن عمدہ طرح پڑھنے کی عادت ہے۔ شاید یہ اچھا نہ ہو۔ الحمد للہ! کہ اس حدیث کا سِرِّ دقیق جس کی ابھی تقریر کی گئی ہے، قلب میں فائز ہوا اور یہ شبہ بالکل رفع ہو گیا۔ پھر اس حدیث پر نظر پڑنے سے اس کی اور تائید ہو گئی۔

حدیث میں دوبارہ غور کرنے سے مقبولانِ الٰہی کی بڑی فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طلب ورضاء مثلِ رضاءِ حق تعالیٰ کے ہے جبکہ دونوں میں تعارض نہ ہو اور راز اس میں یہی ہے کہ ان کی رضاء کو رضاءِ حق کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور مطلوب بالذّات طلب رضائے حق تعالیٰ ہی ہے۔ (التکشف ص: ۴۵۷)

اور شارح مشکوٰۃ ملا علی قاری رحمہ اللہ اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

﴿اِدْخَالُ السُّرُوْرِ فِی قَلْبِ الْمُؤْمِنِ اَفْضَلُ مِنْ عَمَلِ الثَّقَلَیْنِ﴾

(المرقاۃ، ج:۴، ص:۴۳)

یعنی ایک صاحبِ ایمان کے دل خوش کر دینا یہ ثقلین یعنی جن وانس کے عمل اور عبادت سے افضل ہے۔

صاحبو! کیا کوئی مسلمان یہ جرأت کر سکتا ہے کہ صحابیٔ رسول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ریاء کار اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر بنا سنوا کر پڑھنے کو ریاء کاری کہے۔ ظاہر ہے یہ بات ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے بعض ظاہر بیں اس طرح کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ بس اللہ کو راضی کرنے کے لیے جو عمل ہو وہ ہی اخلاص ہے۔ کسی اور کی رضاء کو پیشِ نظر رکھنا یہ ریاء اور شرکِ اصغر ہے، مگر ان کے سامنے یہ بھی رہنا چاہیے کہ مقبولانِ الٰہی کو راضی کرنے کی نیت یہ خود ایک ایسا عمل ہے جو اللہ کی رضاء کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ عمل بھی اخلاص ہی کہلائے گا، لہٰذا خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ اولیاء اللہ اور مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے دلوں کو خوش کرنا ایک نیک اور پسندیدہ عمل ہے۔ ہاں! رؤساء و اغنیاء اور امراء و حکام سے مال و دولت وعہدے اور منصب کی حرص وطمع میں ان کو خوش کرنے کی کوشش کرنا اور محض ان کی خوشنودی کے لیے جائز و ناجائز کی پرواہ کیے بغیر ان کے حسبِ منشاء معاملات انجام دینا یہ بڑے درجے کا گناہ ہے اور شریعت کی نگاہ میں سخت وعید کا سبب ہے۔ جیسا کہ مختلف روایات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر وعیدیں سنائی ہیں۔

اولیاء اللہ کے پاس بیٹھنا گویا مجالست مع اللہ ہے

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ التکشف ،صفحہ:۴۲۳ پر ایک حدیث شریف نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عائذ بن عمرو سے ایک حدیثِ طویل میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک قصہ میں جس میں حضرت ابوبکر نے حضرت سلمان اور صہیب اور بلال کو کچھ نصیحت کی تھی جس سے ایک رئیس کی طرفداری کا شبہ ہوتا تھا) فرمایا اے ابوبکر! کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کر دیا ہے، اگر ان کو ناراض کر دیا تو بس اپنے ربّ کو ناراض کر دیا۔ حضرت ابوبکر ان کے پاس آئے اور کہا اے میرے بھائیو! میں نے تم کو شاید ناراض کر دیا ہو۔ انہوں نے کہا نہیں اے بھائی! اللہ تعالیٰ تم کو بخشے۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔ (المشکوٰۃ،ص:۵۶۸)

حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں اس قول کی روشنی میں کہ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّجْلِسَ مَعَ اللّٰہِ فَلْیَجْلِسْ مَعَ اَھْلِ التَّصَوُّفِ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد لَئِنْ اَغْضَبْتَھُمْ سے معلوم ہوا کہ مقبولانِ الٰہی کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے گا وہ گویا حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس اس بناء پر یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ مقبولانِ الٰہی کے ساتھ مجالست ایسی ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجالست اور لفظ ''مجالست'' کا اذن دوسری حدیث میں ہے:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾

(شعب الایمان)

اس حدیث پاک کی تشریح یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ذاکر کے جلیس ہیں تو جو ذاکر کے پاس بیٹھا ہے وہ اللہ کے ساتھ بیٹھا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ اس لیے یہ مضمون یہاں ضمناً آ گیا ہے کہ بس احقر حضرتِ والا کے اس کلام کی تشریح کی جرأت حضرت والا کی موجودگی میں اس لیے کرتا ہے کہ ایک تو حضرت کا حکم ہے اور دوسرے حضرت کے قلب کا خوش ہونا ان شاء اللہ میرے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشی کا باعث ہوگا۔

محبوبِ حقیقی کو پالینا سارے غموں کو مٹا دیتا ہے

مٹ گئے رنج راہ منزل کے
پاس آئے ہیں جب سے وہ دل کے

جس طرح اس دنیا میں جو لوگ کسی کے عشق (درحقیقت فسق) میں گرفتار ہوتے ہیں اور پھر اپنے معشوق و محبوب تک رسائی کے لیے بڑے بڑے دشوار گزار مراحل اور مختلف نوع کے مصائب و آلام سے گزر جانے کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ بالآخر جب ان کو اپنے محبوب تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے تو جملہ مصائب و آلام ان کے لیے

ایک افسانہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں بزعم خود ایسا سرور و نشاط اور عارضی کیف و لذت ملتی ہے کہ اس راہ کے تمام رنج و غم بھلا دیئے جاتے ہیں۔ ''بزعم خود'' اس لیے عرض کیا ہے کہ عشقِ مجازی یعنی فسق میں حقیقی چین و سکون اور قلبی لذت و فرحت میسر ہو ہی نہیں سکتی۔

غرض اس مثال سے یہ سمجھانا ہے کہ سالک کو بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں کچھ رنج و غم اٹھانے پڑتے ہیں۔ جیسے نظر بچانے میں دل پر غم اُٹھانا چھوٹے بڑوں کی تلخ اور کڑوی ناموافق باتیں سن کر اس کو سہنا، ایذائے خلق پر تحمل و برداشت کر کے کر کے دل پر صدمہ جھیل جانا اور تمام ہی قسم کی خواہشاتِ نفس کی پیروی سے بچنے اور من چاہی کے خلاف ''ربّ چاہی'' پر عمل کرنے میں جو تکالیف اور مشقتیں اُٹھائی ہیں۔ جب مردِ مؤمن کو ان کے نتیجے میں اللہ ملتا ہے اور پھر حق تعالیٰ کی طرف سے سارے عالم میں عزت و عظمت اور ہر قسم کی عافیت و راحت عطا ہوتی ہے تو پھر راہِ منزل کے سارے رنج و غم مٹ کر صاف ہو جاتے ہیں۔ گو کہ ایسے لوگ اپنے ظاہر کے اعتبار سے کیسی ہی بے سرو سامانی اور فقر و فاقے کے عالم میں ہوں اور صورتاً ہر چہار طرف سے ان کو ناموافق حالات نے گھیرا ہو، مگر تب بھی ان کے دلوں میں سرور و نشاط کا وہ عالم ہوتا ہے کہ عام اہلِ دنیا تو کیا سلاطینِ عالم کو بھی اس کی ہوا نہیں لگتی۔ وہ اپنے اللہ کی یادوں میں ایسے مست و سرشار اور کھوئے رہتے ہیں کہ ان کے ظاہری دنیوی نوع کے رنج و غم ان کے حق میں بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں، کیونکہ ان کی نظر ہر وقت اپنے حاکم و حکیم اللہ پر رہتی ہے۔ ان کے پیشِ نظر ہر گھڑی یہ عقیدہ مستحضر رہتا ہے کہ میرے اللہ کا ہر فیصلہ میرے حق میں خیر ہی خیر ہے کیونکہ محبوب اپنے محبوب کے لیے بُرائی نہیں چاہتا، اس لیے وہ رضاء بالقضاء کے ذریعے فرحاں و شاداں رہتے ہیں۔

اسی پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا جس کو حضرت والا نے اپنے مواعظ میں کسی مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ ایک بزرگ غالباً خواجہ بہلول رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ جب اُن سے کسی نے پوچھا کیا حال ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بہت اچھا ہے۔ پورا عالم میری منشاء کے مطابق چل رہا ہے۔ تو کسی نے پوچھا حضرت! آپ کی منشاء کے مطابق پورا عالَم کیسے چل سکتا ہے؟ آپ تو ایک مخلوق اور بندے ہیں۔ عالَم تو ربّ العالمین کے منشاء اور مشیت کے تحت چل رہا ہے۔ تو خواجہ صاحب نے کیا جواب ارشاد فرمایا دراصل میں نے اپنی منشاء کو اللہ کی منشاء میں فنا کر دیا ہے، اس لیے عالَم میں جو کچھ بھی ہو گویا کہ میری بھی منشاء اُسی طرح ہے۔ اس لیے ولی کامل مردِ مؤمن حق تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو گا تو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہر حالت کو اپنے لیے خیر اور رحمت سمجھے گا اور ہر حال میں وہ راضی بہ قضاء رہے گا۔

مومن کی شان ہر حال میں راضی برضاء رہنا ہے

حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیفِ مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے چلتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اثقل دیکھا ہے

خود ہمارے حضرت والا نے اس مضمون کو اپنے دوسرے شعر میں فرمایا ؎

کیف و تسلیم و رضاء سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

احقر نے ایک مرتبہ حضرت والا کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا تھا جس میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے دل کے بہت زیادہ رنجیدہ اور غمزدہ ہونے کا تذکرہ کیا تھا۔ احقر نے یہ بھی لکھا تھا کہ کثرت سے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کا وظیفہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر حضرت والا کی طرف سے جو جواب موصول ہوا اُسے پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی اور بڑا نفع ہوا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ایک مؤمن بھائی کی تکالیف و پریشانی سے دوسرے مؤمن بھائی کو تکلیف و پریشانی لاحق ہو کیونکہ جنابِ نبی کریم علیہ السلام نے سب مؤمنین کی مثال ایک جسم کی طرح بیان کی ہے جس طرح جسم کے کسی عضو کو تکلیف پہنچنے سے دوسرے اعضا بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی مؤمن بھائی کی تکلیف و پریشانی سے دوسرے مسلمان کا تکلیف محسوس کرنا کمالِ ایمانی کی نشانی ہے، مگر حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح ہر مؤمن پر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح اللہ کے ہر فیصلے پر راضی رہنا بھی فرض ہے۔ یعنی راضی بہ قضائے خداوندی رہنا ایمان کا جزء اور حصہ ہے، اس لیے ایسا حد سے بڑھ کر غم کہ جو صحت وطبیعت کو متاثر کردینے والا ہو رضاء بالقضاء کے مقتضٰی کے خلاف ہے اور دین ہونے کے بجائے بے دینی ہے۔

سبحان اللہ! یہی وہ معاملات ہیں جن میں انسان کسی شیخ و مرشد کا محتاج ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ بظاہر عین دین و ایمان سمجھ رہا ہے بعینہ وہی چیز صحیح شرعی حدود سے نکل جانے کی بناء پر افراط وتفریط کا شکار ہوجانے کے سبب دین نہیں رہتی۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

بمئے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہِ رسم و منزل را

کہ اگر تیرا پیر تجھے کہے کہ تو اپنے سجّادے کو شراب سے رنگین کردے تو تو ایسا کردینا کیونکہ جو راہ طے کیا ہوا شیخ کامل ہے وہ راستے کے نشیب وفراز اور اس کے اُتار و چڑھاؤ سے واقف ہے۔ وہ کبھی غلط مشورہ دے کر تمہیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔

اتباعِ شیخ حدودِ شریعت میں منحصر ہے

اس شعر کے ظاہری معنی پر ہر طالب صادق کو ایک اعتراض پیدا ہوگا کہ شریعت کا مسلّمہ اصول اور ضابطہ ہے لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ کسی مخلوق کی اطاعت کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ اللہ کی معصیت اور اس کی نافرمانی ہوتی ہو تو پھر آخر کسی شیخ کے کہنے پر شراب سے سجّادے کو رنگین کیسے کیا جا سکتا ہے؟ بالفاظِ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ کہ اصل مقصود بالذات اطاعتِ باری تعالیٰ ہے حتیٰ کہ نبی کی اطاعت بھی بوجہ اطاعتِ باری تعالیٰ اور بغرضِ تعمیل اوامرِ خداوندی ہی مقصود ہوتی ہے، اسی لیے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے جگہ جگہ پر یہ بات تحریر فرمائی کہ تصوف صرف وہی معتبر ہے جو سنت وشریعت کے مطابق ہو اور جو چیز سنت وشریعت کے خلاف ہو اس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اہلِ بدعت کا مخترع ہے۔ اس کی اتباع جہنم تک پہنچانے والی اور اللہ کی ناراضگی اور عذاب کی موجب ہے۔ چنانچہ ''بصائر حکیم الامت'' صفحہ: ۵۰ پر درج ہے کہ دوسری اہم چیز جو حضرت کے دل ودماغ میں کاوش واضطراب پیدا کررہی تھی، وہ دورِ حاضر کی خانقاہی فقیری ودرویشی کی ہیئتِ کذائی تھی۔ جہاں کتاب وسنت سے بالکل بیگانہ اور بے نیاز ہوکر چند جوگیانہ رسم اور طریقۂ نفس کشی ہی کو واصلِ حق ہونے کا ذریعہ اور چند ملحدانہ عقائد کو حاصلِ تصوّف وسلوک سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک عالمگیر فتنہ تھا جس میں اکثر دینی رجحان رکھنے والے نادان عوام مبتلا تھے۔ بس اس سب کی حضرت نے مدلل اصلاح فرمائی ہے۔ القصہ مختصر یہ کہ کتاب وسنت سے ہٹا ہوا تصوف جہالت وضلالت ہے تو پھر اس شعر میں شراب کے سلسلے میں پیر کی ماننے کی بات کس طرح درست ہوسکتی ہے۔

''بمےئ سجادہ رنگین کن'' کی شرح از حضرت تھانوی قدس سرہٗ

چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے جواب ارشاد فرمایا ہے کہ دراصل اس شعر میں مے سے مرادامرِ مباح ہے، مگر چونکہ بعض امورِ مباح فی نفسہٖ ہوتے ہیں لیکن وہ بظاہر عقل وشرع کے خلاف معلوم ہوتے ہیں تو اس وقت انسان ان پر عمل کرنے سے جھجکتا ہے تو ایسے امور کے متعلق اس شعر میں خطاب ہے کہ ان میں اپنے شیخِ کامل عالمِ ربانی کی بات مان لینا چاہیے، اپنی رائے پر عمل نہ کرنا چاہیے اور پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک مثال پیش فرمائی ہے جیسے بعض اوقات زیادہ ذکر وعبادت کی وجہ سے کوئی سالک روحانی قبض کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کا شیخ الوقت اس کو بہت سے وظائف اور عبادات سے روکتا ہے۔ اچھے کھانے پینے اور لوگوں کے ساتھ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق سیر وتفریح وغیرہ امور کا حکم دیتا ہے تو ایسے موقعہ پر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص مجھے بہت سی عبادات اور راتوں میں جاگنے رونے سے منع کررہا ہے۔ سیر تفریح وغیرہ کا حکم دے رہا ہے تو یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ بس اس موقعہ پر سالک کو چاہیے کہ اپنے شیخ کی بات کو قبول کرلے۔

اس کی ایک اور مثال میرے ذہن میں آئی کہ حضرت مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم ہمارے یہاں دارالعلوم آزاد وِل جنوبی افریقہ میں تشریف لائے تھے۔ حضرت کا بیان ہوا تھا تو اس میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ ہم نے جب حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب سے تعلق اصلاحی قائم کیا تو ہر ہفتہ حضرت کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ ایک دن مجلس کے بعد ہمیں الگ لے جاکر یہ فرمایا بھائی! آپ لوگ اِدھر اُدھر تقریریں وغیرہ نہ کیا کریں۔ آپ بیانات کے لیے نہ جایا کریں اور ریڈیو وغیرہ پر بھی نہ جایا کریں اور اخبارات و رسائل میں بھی مضامین نہ لکھا کریں۔ تو اب بظاہر یہ دین کے کاموں سے روکنا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے جو خود حضرت مفتی رفیع عثمانی نے بیان فرمائی کہ ایک دن حضرت نے اندر کمرے میں لے جاکر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ کے بہت سے خطوط دکھائے جو انہوں نے صرف ہم دو بھائیوں کے بارے میں حضرت کو لکھے تھے کہ یہ دونوں صاحبزادے بے حد ہونہار ہیں۔ دیکھیں ان کو ضائع ہونے سے بچالینا اور فرمایا کہ دیکھو وہاں مدینے سے یہ حضرت شیخ کے اتنے خطوط ہیں اور ایک لمبے عرصے تک اجازت نہ دی۔ پھر جب اجازت دی تو فرمایا کہ بھائی! رسمی بیانات نہ کرنا بلکہ جہاں جاؤ زخم پر مرہم رکھو یعنی جو مرض وہاں پھیلا ہوا دیکھو اس کی اصلاح سے متعلق بیان کرو۔ چنانچہ پھر بعد میں اجازت دے دی، مگر ایک مخصوص مدت تک بیانات وغیرہ پر بالکل پابندی لگی رہی۔ ان حضرات نے جو خود اتنے بڑے علماء ہیں اس کو قبول کیا تو آج آپ اور ہم سب دونوں بھائیوں کو ماشاء اللہ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ نے کیسا چمکایا ہے۔

راہِ حق میں منزل کا مزہ

رنج و حسرت ہیں راہ میں لیکن
لطف شامل ہیں اُن کی منزل کے

یعنی جب بندۂ مؤمن اللہ کی راہ میں اپنی حرام آرزوؤں کا خون کرکے اس خونِ حسرت کو پیتا ہے اور رضاءِ حق تعالیٰ کے لیے تلخ سے تلخ اور کڑوے سے کڑوے گھونٹ کو شیر و شکر سمجھ کر پی جاتا ہے۔ جذباتِ شہوت ہوں یا جوشِ غضب ہو سب کے اوپر اللہ تعالیٰ کے حکم کو غالب رکھتا ہے اور مرضیٔ مولیٰ کے مطابق اپنی خواہشات کو لگام دیتا ہے اور حرام محبتوں کے جذبات کی گاڑی پر اپنے مولیٰ کے حکم کے مطابق بریک لگادیتا ہے تو اُسے ہر قدم پر منزل یعنی قربِ حق تعالیٰ کا مزہ ملتا ہے اور اس کو نقد اور کیش (Cash) ایسے بے شمار لطف و مزے ملتے ہیں جن کا قرآن و حدیث میں جگہ جگہ وعدہ کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کی اس دنیوی حیات کو حیاتِ طیبہ یعنی بالطف زندگی کردیا جاتا ہے اور جس طرح جنت میں پُر بہار بارونق زندگی نصیب ہوگی اور عیش ہی عیش اور راحت ہی راحت ہوگی۔ ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں اس کی ایک جھلک دکھادیتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نظر کی غیر محرم سے حفاظت پر نقد حلاوتِ ایمان کا وعدہ فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ نے ایمان اور عملِ صالح پر

اسی دنیا میں حیاتِ طیبہ کے دینے کا قرآن میں تذکرہ کیا ہے اور اللہ کے باغی اور نافرمانوں کے لیے اسی دنیا کو ان پر تنگ اور تلخ کیے جانے کی وعید مذکور ہے۔ حضرت والا نے دونوں قسم کے لوگوں کی اپنے خاص انداز میں اس شعر میں ترجمانی کی ہے ؂

دُشمنوں کو عیشِ آب و گل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا
ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

اسی طرح حضرت تائبؔ صاحب نے اس مضمون کو یوں پیش کیا ؂

ایماں کی حلاوت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
نظروں کی حفاظت کا اور ہی کچھ ہے
ہر پل غمِ حسرت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
ہر لمحہ شہادت کا مزہ اور ہی کچھ ہے

حلاوتِ ایمانی کی ایک الہامی دلیل

اس مضمون کی ایک عجیب وغریب دلیل جو حق تعالیٰ نے قلب کو عطا فرمائی اور جس کا ماخذ وہ حدیث شریف ہے جس میں شہداء راہِ خداوندی کا ذکر کیا گیا کہ جب شہید بارگاہِ الٰہی میں پہنچتا ہے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ جنت کی ان ساری نعمتوں کے ساتھ ساتھ تیری کوئی اور تمنا ہو تو بتا تو وہ بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! آپ نے سب کچھ عطا فرما دیا۔ اب کوئی تمنّا باقی نہیں ہے، مگر یہی سوال اس سے بار بار کیا جاتا ہے تو بالآخر وہ یہ عرض کرتا ہے کہ بس اگر کوئی تمنا ہے تو یہی ہے کہ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے اور میں آپ کی راہ میں لڑتا لڑتا پھر سے شہید ہو جاؤں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود شہید ہونے میں اُسے وہ لطف ومزہ اور اعزاز واکرام حاصل ہوا ہے کہ جس کی تحصیل کے لیے وہ جنت کی نعمتیں چھوڑنے کے لیے تیار اور راضی ہے۔ پھر سے اس راہِ عشق ووفا سے گزر کر اور طریقِ صدق وصفاء کے گلی کوچوں میں قدم رکھ کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہونے کا متمنّی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت اور اپنے بندوں پر بڑا احسان اور کرم ہے کہ اپنے دین کا غم اُٹھانے والوں کو آخرت کے اجرِ عظیم کے ساتھ ساتھ دنیا ہی میں پرسکون اور بالطف حیات عطا فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۹۶)

ترجمہ: اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۱)

اگر یہ اہلِ بستی ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان سے برکتوں کے دہانے کھول دیتے۔

اور ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَظَمَ غَیْظًا وَهُوَ یَقْدِرُ عَلٰی اِنْفَاذِهٖ مَلَأَ اللّٰهُ جَوْفَهٗ اَمْنًا وَّ اِیْمَانًا﴾

(تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۳۱۹)

جس شخص نے غصے کے مقتضٰی پر عمل کی قدرت ہونے کے باوجود اس کو قابو میں رکھا تو اللہ اُس کے باطن کو امن چین و سکون اور ایمان سے بھر دیں گے۔

صاحبو! ذرا غور تو کرو کہ ہمارے مہربان اللہ کی کیسی نعمتِ عظمیٰ ہے کہ غصے کے پینے پر آخرت میں عظیم اجر ملنے کے وعدے کے باوجود اسی وقت کیش اور نقد دو عظیم الشان نعمتیں عطا فرمارہے ہیں دل کا امن اور کمالِ ایمان۔ جو اتنی بڑی نعمتیں ہیں کہ ان کو لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا اور جس کے حصول کے لیے آج دنیا والے سارے عالم میں بے چین و پریشان ہیں۔ بس یہ مذکورہ تفصیل ہی حضرت والا کے اس شعر کی تشریح ہے کہ اس راہ میں رنج و حسرت تو ہیں، مگر یہ ایسی قیمتی راہ ہے کہ جس کا راہی چلتے چلتے لطفِ منزل پالیتا ہے۔ بس کسی درجہ صاحب ذوقِ سلیم ہونا چاہیے تو پھر اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کا مشاہدہ کرے گا۔ جیسا کہ لذیذ پھلوں کو کھا کر ان کی صحیح لذت کا ادراک کر لیا جاتا ہے۔

حیاتِ اولیاء رشکِ صد حیات ہے

کیا کہوں ان کے قرب کا عالم
کتنے عالم ہیں عالمِ دل کے

جب کسی دل کو اللہ تبارک و تعالیٰ کا قرب نصیب ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں ایسی بہاریں آتی ہیں اور اُسے ایسی حیات عطا ہوتی ہے کہ جس پر سیکڑوں اور ہزاروں حیات قربان کی جاسکتی ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

جب کبھی وہ اِدھر سے گزرے ہیں
کتنے عالم نظر سے گزرے ہیں

اور اس حقیقت کا صحیح ادراک و احساس اس کے حاصل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ جیسا کہ شہد و شکر کو میٹھا تو کہا جاسکتا ہے، مگر ان دونوں کے مٹھاس میں فرق و امتیاز ان کو چکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ عربی زبان کا مقولہ ہے

مَنْ لَّمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ کہ جو کسی چیز کو نہ چکھ لے اس کو صحیح ادراک نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت اولیاء اللہ کے قلوب کا کیا عالم ہوتا ہے اور خالقِ دو جہاں ربِ کائنات کی معیتِ خاصّہ حاصل ہونے کے نتیجے میں ان کے قلب میں کتنے عالم جمع ہوتے ہیں۔ اس کو جاننا سمجھنا بس اس شخص کا حصہ ہے جس کو قلبِ سلیم عطا ہوا ہو کیونکہ اللہ کو پا لینے سے دل و دماغ ہزار ہا عالم کی لذتوں کا مرکز و سرچشمہ بن جاتا ہے۔

فرطِ لذت سے جھوم جاتا ہوں
کتنی خوشیاں ہیں آپ سے مل کے

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی حرام اور ناجائز خواہشات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور قرب وحضوریٔ خاص سے جو خوشی عطا ہوتی ہے اُس کے سبب میں فرطِ لذت سے جھوم اُٹھتا ہوں۔ چنانچہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس خصوصی ملاقات اور معیت کا وعدہ اپنے متقی اور نیکوکار بندوں سے یوں فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۱۲۸)

ترجمہ: اللہ ساتھ ہے ان کے جو پرہیزگار رہیں اور جو نیکی کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۴۰۶)

چنانچہ اہلِ تقویٰ اور خاصانِ خدا کو اس کے اثراتِ خاصہ کا ادراک واحساس قدم بقدم ہوتا رہتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت و مدد اُترتی ہوئی دیکھتے ہیں اور مشکل سے مشکل مرحلے پر خصوصی فہم و بصیرت ان کو عطا ہوتی رہتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان انعام ہے۔

تقویٰ کا ایک عظیم الشان انعام

اس انعام کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾

(سورۃ الانفال، آیت: ۲۹)

ترجمہ: اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو اللہ سے تو کر دے گا تم میں فیصلہ اور دور کر دے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۲۱۶)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ ایک فیصلے کی چیز دے گا، اس میں ہدایت اور نورِ قلب ہے جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور غلبہ علی الاعداء اور نجاتِ آخرت ہے۔ جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوگا۔

حضرت مفتی شفیع صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کو فرقان عطا

ہونے کا اکثر مفسرین صحابہ کے نزدیک یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد اور حفاظت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ کوئی دُشمن ان کو گزند نہیں پہنچا سکتا اور تمام مقاصد میں کامیابی ان کی رفیق ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''فُرقان'' سے مراد اس آیت میں وہ عقل و بصیرت ہے جس کے ذریعے حق و باطل میں کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہوجائے تو معنی یہ ہوا کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت و فراست عطا فرمادیتے ہیں کہ ان کو اچھے بُرے میں فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۲۱۸)

اولیاء کے لیے حفاظت کا وعدہ ہے نہ کہ عصمت کا

اسی معیتِ خصوصیہ اور حفاظتِ خاصہ کو حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ روایت میں ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ج:۲، ص:۹۶۳)

حدیثِ قدسی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے مقبول بندے سے عداوت کرے میں اس کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں اور میرا بندہ مجھ سے کسی ایسے ذریعے سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ادائے فرائض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں۔ پھر جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اُس کا پاؤں ہوجاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے مطلب یہ کہ اکثر اُس کے جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا الالعارض لایدوم۔

مسئلہ محفوظیت اولیاء مشہور ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء محفوظ کُنْتُ سَمْعَہُ الخ کی جو تقریر ترجمہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کے اعتبار سے حدیث اس کا اثبات کرتی ہے۔ (التکشف، صفحہ:۴۷۰)

اس حدیث سے اندازہ لگائیں کہ جب بندہ نیکی اور تقویٰ اختیار کرکے اللہ کا مقرب بندہ بنتا ہے تو پھر ہر وقت اس کے ساتھ اللہ کی کیسی خصوصی رحمت معیت و نصرت شامل رہتی ہے، اس لیے کیوں نہ وہ فرطِ لذت سے جھوم اُٹھے۔

بہارِ قربِ خداوندی پر خزاں نہیں آتی

اب خزاں دل سے دور ہے کیونکہ
پاس رہتے ہیں وہ میرے دل کے

اس شعر کے اندر گویا کہ جو بہار دل کو حاصل ہوئی تھی، اُس کے دوام کو بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے بعد قلب میں ایسا موسمِ بہار آیا ہے جس کو اب کبھی خزاں لگنے والی نہیں جبکہ دنیا کی محبتوں میں اگر لقائے محبوب سے بظاہر نفس کو کچھ حظ اور سرور مل بھی جائے تب بھی وہ ایسا سرور اور خوشی ہوتی ہے کہ جب تک وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہے تو بظاہر خوشی محسوس کررہا ہے۔ جیسے ہی جدائیگی ہوتی ہے تو پھر اُسی معشوق ومحبوب کی جدائیگی اس کے عاشق کی بےچینی وپریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ گوکہ اس کا معشوق بڑی خوشی اور بےفکری سے اپنے بستر پر خراٹے لے کر سورہا ہو، مگر ادھر اُس کا عاشق بےچین وبےقرار ہوکر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ کبھی رات کی تنہائیوں میں پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گھومتا نظر آتا ہے تو کبھی چھتوں پر سگریٹ نوشی کے ذریعے گھوم پھر کر اپنا غم بھلانا چاہتا ہے۔ حق تعالیٰ کی عظیم نعمت نیند کی حلاوت ومٹھاس سے محروم رہتا ہے اور اس کا سکونِ زندگی بالکل تباہ وبرباد ہوچکا ہوتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے فراق اور جدائیگی میں اس قدر بےقرار اور بےچین رہتا ہے کہ نہ تو وہ پڑھنے لکھنے کے قابل نہ ہی وہ کسی کاروبار کے قابل رہتا ہے نہ گھر میں اُسے چین وسکون ملتا ہے اور نہ مسجد ومدرسہ میں اس کو یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بقول حضرت والا یوں کہیے کہ اس کے دل کا قبلہ بدل جاتا ہے۔ یعنی جس طرح نمازوں میں کسی اللہ والے اور جملہ اہلِ ایمان کے دلوں کا رُخ قبلے کی طرف ہوتا ہے۔ اس طرح اُس عاشق کا دل ہر وقت اپنے سامنے اس معشوق کی صورت دیکھتا رہتا ہے اور اس کا قلب ہر گھڑی اُس کے اردگرد گھومتا رہتا ہے اور یوں اس کو کسی کلی سکون میسر نہیں آتا۔ جیسا کہ حضرت مولانا اسعد اللہ مظاہری خلیفہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں ؎

عشقِ بتاں میں اسعد کرتے ہو فکرِ راحت
دوزخ میں ڈھونڈتے ہو جنت کی خواب گاہیں

اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے عشقِ مجازی کی لعنت میں گرفتار ہونا یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عذاب ہے اور یہ ایک لعنتی فعل ہے۔ گویا دنیا میں اس کو مظہرِ غضبِ خداوندی وناراضگی الٰہی قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ نصوصِ مختلفہ اس پر دال ہیں جبکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت ایسی پاکیزہ اور صاف شفاف ہے اور قربِ خداوندی سے قلب کو ایسی بہار حاصل ہوتی ہے کہ پھر خزاں اس سے ہمیشہ دور رہتی ہے اور اُس کے شب وروز

کا ایک لمحہ بھی خزاں کا شکار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر آن اپنے مولیٰ کے ساتھ واصل رہتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی جدائی کے غم اور صدمے سے دوچار نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے ویسے ہی اللہ بھی اس کو یاد کرتے ہیں اور اس کی پوری زندگی کو سراپا چین وسکون بنا دیتے ہیں۔ اس پر عنایاتِ الٰہیہ کی ہر آن بارش برستی رہتی ہے۔ بس شرط اس کے لیے یہ ہے کہ ہمارے قلب میں غیر اللہ کے سوا کسی کا گذر نہ ہو جو کہ ہمارے کلمۂ توحید کی اساس و بنیاد اور اُس کا مغز اور نچوڑ ہے کیونکہ غیر اللہ کے دل میں رہنے سے اللہ تعالیٰ دل سے دور ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کیفِ جاوداں اس کو حاصل نہیں رہتا۔ اس کے دل کو خزاں کا موسم آ کر ساری بہار ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بعض پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ معلومات کی وسعت تو خوب ہے، مگر غیروں سے قلب کی حفاظت نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو اہمیت دیتے ہیں۔ امرد لڑکوں سے بلا دریغ اختلاط اور میل جول اور غیر محرم عورتوں سے بلا تکلف ہنسی مذاق وغیرہ کا سلسلہ رکھتے ہیں اور حفاظتِ قلب کا اہتمام نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے قلب کو اپنے قرب کی لذت سے محروم رکھتے ہیں۔ حقیقی علم بھی جو کہ قلب کی ایک روشنی اور جلا ہے۔ ایسے لوگوں کو عطا نہیں ہوتا۔ اس نوع کے بعض قصے حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج'' کے شروع میں بھی ذکر فرمائے ہیں حتیٰ کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا جس مرد سے اگرچہ وہ امرد نہ بھی ہو گفتگو کرنے میں اُس کی آواز میں اور اُس کے نقشے اور چہرے اور آنکھوں کی رنگت و بناوٹ میں نفس کو لطف ملنا شروع ہو تو فوراً اس سے ہٹ جائے اور دور ہو جائے۔

موجوں کی طغیانی میں ساحل کا لطف

جب یہ لذت ہے دل کے طوفاں میں
کیا کہوں کیف دل میں ساحل کے

یعنی یہ جو دل میں حرام خوشیوں کو چھوڑنے میں دل پہ زور پڑتا ہے اور رضاءِ مولیٰ کی خاطر ناجائز لذتوں کو چھوڑنے میں طبیعت پر گرانی ہوتی ہے۔ کبھی مخلوق کے تلخ اور کڑوے جملے سن کر دل چرتا نظر آتا ہے۔ بسا اوقات ناموافق اور ناخوشگوار حالات کی صورت میں اور مصائب و آلام سے دوچار ہونے کی حالت میں دل کو سخت صدمہ اور رنج اُٹھانا پڑتا ہے تو عین اس طوفانِ رنج و غم اور طغیانی کے عالم میں میں اپنے دل کو حاصل ہونے والی لذت اور روح کا سکون اور حلاوت و مٹھاس بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اسی کو حضرت والا دل کے طوفانوں میں ملنے والی لذت فرما رہے ہیں۔ یعنی خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرتے ہوئے بھی جبکہ ابھی منزل پر نہیں پہنچا۔ اُسے ہر قدم پر منزل کا مزہ اور لطف ملنا شروع ہو جاتا ہے تو کیا ہی خوش نصیب ہے وہ بندہ جو اس راہ کے کانٹوں کو پھول سمجھ کر برداشت کرے اور کیا ہی خوب اس کی بہاروں اور خوشیوں کا عالم ہوگا جب اس کی کشتی ساحل پہ جا لگے گی۔

اور اس کا سِر اور راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے اور ہماری حقیقت جسم اور روح سے مرکب ہے اور قلب وقالب کا مجموعہ ہے تو اس ربّ العالمین اللہ نے جس طریقے سے جسم کے لیے غذاؤں کا انتظام فرمایا اور انہیں بقائے حیات کا ذریعہ بنایا۔ پھر ظاہری اور جسمانی زیب وزینت اور ترقی کے لیے طرح طرح کی نعمتیں پیدا فرمائی ہیں تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی روح کی حیات کے لیے اور قلب کے سرور وانبساط کے لیے بالفاظِ دیگر روحانی حیات قائم رکھنے کے لیے اپنے ذکر اور اپنی یاد کو ذریعہ قرار دیا۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں ذاکر اور غیر ذاکر کو زندہ اور مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روحانی حیات کے لیے غذاء ذکر اللہ ہے، اس لیے اللہ کی راہ میں دل پر غم اور صدمے اُٹھانے سے اور اپنی حرام آرزؤں کا خون کرنے سے دل کو حقیقی حیات میسر ہوتی ہے۔ وہ زندہ کہلانے کے قابل ہوتا ہے۔ یہی راز ہے دل کے طوفانوں میں لذتِ قربِ خداوندی حاصل ہونے کا۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کا ایمان افروز واقعہ

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ جب شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمۃ مالٹا کی جیل میں قید تھے۔ گھر والوں کی طرف سے ایک خط پہنچا جس میں حضرت سے گھر والوں نے درخواست کی تھی کہ حضرت آپ اپنے موقف میں تھوڑا نرمی کا پہلو اختیار کریں اور آ کر گھر والوں کی خیر خبر لیں کیونکہ بعض ناموافق حالات کا سامنا تھا اور ایسی آزمائشیں مسلسل آ رہی تھیں جو درحقیقت انبیاء اور وارثینِ انبیاء کو پیش آیا کرتی ہیں۔ اس پر حضرت مدنی علیہ الرحمۃ نے خط کا جواب لکھتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا ؎

مصائب میں اُلجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا
تیرے عشق میں کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

کوئی اس شعر سے اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ مصائب کا مانگنا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے تو پھر اس طرح کا جملہ کیسے درست ہے کیونکہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا مقصد مصائب وحوادث کا مانگنا نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے غیر اختیاری طور پر پیش آمدہ مصائب وحوادث کے سلسلے میں اپنے ایمانی جرأت وشجاعت پر مبنی موقف سے پیچھے نہ ہٹنے کے سلسلے میں اپنے عزم وارادے کا اظہار ہے جو کہ تاریخ میں رجال اللہ اصحابِ دعوت وعزیمت کی سنت رہی ہے۔ پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ خاصانِ خدا اور مقبولانِ بارگاہ پر جب بھی ایسے حالات آئے تو وہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے تمام صعوبتوں اور دشواریوں کو برداشت کرتے رہے۔

احقر راقم السطور اس واقعے سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان اولیاء اللہ کو ایسے سخت سے سخت حالات میں بھی دل دل میں اپنے مولیٰ کی محبت کا لطف اور مزہ آتا رہتا ہے، اس لیے وہ اس سے پیچھے ہٹنے اور چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس کے لیے احقر کے ذہن میں اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی واضح مثال عطا فرمائی کہ بسا اوقات بندہ مؤمن اپنی بعض حاجات اور مشکلات کے لیے اللہ کے سامنے ہاتھ اُٹھا کر روتا رہتا ہے اور عین رونے کی حالت میں باوجودیکہ ابھی تک وہ مشکلات دور نہیں ہوتی وہ اپنے دل میں ایک خاص قسم کا سکون محسوس کرتا ہے۔ اس ناچیز کا یہ بارہا کا تجربہ ہے۔

تمام حرام خواہشات کو قربان کرنا اللہ کو پالینا ہے

کیا خبر تھی کہ خوں بہا ہیں آپ
ہائے لمحاتِ غفلتِ دل کے

جو بندے اپنے دل و جان سے اللہ پر فدا ہوتے ہیں اور ہر لمحۂ حیات اپنے مولیٰ پر قربان کردیتے ہیں۔ ان کی ہر گھڑی کا شغل ذکر اللہ اور یادِ الٰہی ہوتی ہے اور گناہوں میں پڑنے اور اپنے مولیٰ کو ناراض کرنے سے اس قدر دور رہتے ہیں، جیسے کہ آگ کی چنگاری اور شعلے سے انسان دور بھاگتا ہے۔ قدم بقدم ان کو ایک ہی فکر اور غم لاحق رہتا ہے کہ اپنے ہر عمل سے اللہ کو راضی کرنا ہے اور اُس کی ناراضگی سے بچنا ہے تو وہ ضرور اپنے مولیٰ کو پا کر رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ سے نسبتِ خاصہ کا پھل ان کو ضرور عطا ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو حضرت والا ایک بہت ہی عمدہ مثال کے ذریعے سمجھا رہے ہیں۔ اگر مقتول کے ورثاء اس بات پر راضی ہوجائیں کہ قاتل ان کو خون بہا دیدے اور قاتل اس کے لیے تیار ہو تو اس جان کی طرف سے جو اُس نے لی ہے، یہ بری الذمہ ہوجاتا ہے اور پھر اس سے اس کے بدلے میں قصاص یعنی اس کی جان نہیں لی جاتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ خون بہا دے کر جان محفوظ کرلی گئی اور اس کو قصاصاً قتل ہونا نہیں پڑا۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے بندہ اپنی تمام ناجائز خواہشات اور حرام آرزوؤں کا خون کرتا ہے تو وہ اپنے مولیٰ کو اپنے دل میں پاتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اپنے دل سے غفلت کو پورے طور پر نکال دے اور جس حال کا جو حکم ہو، اس کو اپنے اوپر لاگو کرے۔ تمام اعضاءِ بدن سر سے پیر تک جن اغراض و مقاصد کے لیے عطا ہوئے ہیں، ان کو اس پر لگادے۔ یہی اصل حقیقت ہے اللہ پر فدا ہونے کی، اسی لیے فرمایا گیا کُلُّ مُطِیْعِ اللہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ جو بھی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگا ہوا ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا ہے، کیونکہ اگر اُس کے دل میں اللہ کی یاد نہ ہوتی تو وہ اپنی زندگی کو اپنی جی چاہی پر ڈھالدیتا اور اس کا چال چلن عرف و رواج کے مطابق ہوتا اور گناہوں سے بچ کر خونِ آرزو پینے کی اس کو حاجت نہ ہوتی، اس لیے عاصی اور گنہگار کو عین گناہ اور نافرمانی کے وقت میں

ذاکر نہیں کہا جائے گا۔

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ ہائے افسوس! زندگی کے ان لمحات پر جو آپ کی یاد سے غفلت میں گزرے ہیں ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر لمحۂ حیات آپ پر فدا کرتا اور اس کے نتیجے میں آپ کو پا جاتا، اس لیے ہر انسان کے لیے موت کے وقت میں وہ گھڑیاں بہت باعثِ حسرت و افسوس ہوں گی جو اُس نے اپنے مولیٰ سے غافل ہو کر نفس و شیطان کی غلامی میں گزاری ہوں۔

غفلتِ دل پر اولیاء اللہ کی حسرت و ندامت

صاحبو! غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت والا اس شعر میں غفلتِ دل پر افسوس کا اظہار فرما رہے ہیں۔ پھر معصیت و نافرمانی اور اللہ کی ناراضگی والے اعمال میں زندگی گذارنے والوں کو اس سے کس قدر عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ ان گذرے ہوئے لمحاتِ حیات پر کس قدر پشیمانی اور شرمندگی کے آنسو گرانے چاہئیں۔

بالکل سچ اور صحیح بات ہے کہ اولیاء صدیقین کے لیے تھوڑی سی دیر اللہ کی یاد سے غفلت ہی بے حد رنج و قلق کی چیز ہوتی ہے اور اگر کبھی بشری تقاضوں کے تحت وہ اس کا شکار ہو جاتے ہیں تو ان کے دل سے ایسی آہ و فغاں نکلتی ہے اور وہ اپنی اس حالت پر اس قدر گریہ و زاری کرتے ہیں کہ پھر ان کو بمقتضائے احادیث شریفہ یہ لمحاتِ غفلت، لمحاتِ ذکر و قرب میں مبدل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی شانِ رحیمی اور کریمی ہے کہ توبہ پر صرف گناہوں اور غفلتوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ حسنات سے مبدل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ توبہ مزید تجلیاتِ قربِ خداوندی کا موجب بن جاتی ہے۔

میرے بھائیو! توفیقِ الٰہی اور فضلِ خداوندی سے ابھی ابھی ایک مضمون دل میں آیا۔ فائدے کے لیے عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ یہی حسرت و ندامت آج اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ کی بارگاہ میں نعمتِ عظمیٰ ہے جس کا اندازہ مرنے کے بعد ہوگا۔ از روئے احادیثِ شریفہ ساری زندگی کا ظالم اور پاپی، شرابی اور کبابی، فاسق و فاجر، کافر و مشرک ایک بار حسرت و ندامت سے اللہ کے در کو کھٹکھٹائے اور اپنے کیے سے باز آجائے تو سارے سیئات سے بھرے ہوئے رجسٹر حسنات سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ جہنم کے کنارے پر کھڑا ہوا انسان یکدم اپنا رُخ بدل کر جنت کے باغات میں پہنچ جاتا ہے۔ دوسری وہ حسرت و ندامت ہے جو مرنے کے بعد ہوگی، وہ انسان کے لیے نافع اور کارآمد نہ ہوگی اور اس کی بدولت عذاب سے چھٹکارا نہ ملے گا **يَوْمَئِذٍ يَنْدَمُ الْإِنْسَانُ وَلَا يَنْفَعُهُ النَّدَمُ** جس دن انسان نادم پشیمان ہوگا مگر یہ ندامت اس کو نافع نہ ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر کافروں کی اس حسرت و ندامت کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں شدتِ حسرت کا ذکر جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس طرح فرمایا ہے کہ اگر وہ جگہ موت کی ہوتی تو ان کو اس سے موت آچکی ہوتی۔ اس لیے

حضرت والا کے اس شعر میں ہمارے لیے ایک عظیم الشان نصیحت ہے کہ ہم دنیا میں رہتے رہتے زندگی کے ہر لمحے کو خدا کی یاد میں گزاریں اور جو لمحۂ حیات غفلت کے ساتھ گزر گیا ہے اس پر دل سے نادم اور شرمندہ ہوں اور پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ غفلتوں کی دلدلوں سے نکل کر اپنے مولیٰ کی یاد میں لگ جائیں۔ اس رجوع الی اللہ اور توبہ کے عمل پر ایک حدیث قدسی ذہن میں آئی جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَاَنِیْنُ الْمُذْنِبِیْنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴾

(تفسیر روح المعانی، ج:۳۰)

یعنی گنہگاروں کا اپنے گناہوں اور خطاؤں پر اللہ کے سامنے رونا اور معمولی رونے کی آواز بھی اللہ کے نزدیک اتنی زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے کہ تسبیح کرنے والوں کی آواز بھی اللہ کو اتنی پسند نہیں۔ غور کرنے کا مقام کہ گنہگاروں کے رونے کی آواز تسبیح خوانوں کی آواز کے برابر بھی نہیں بلکہ زیادہ محبوب قرار دیا ہے، اس لیے جو لوگ حرام محبتوں میں مبتلا ہیں اور حسین حسیناؤں کے چکر میں پڑ کر اللہ سے غفلت میں اپنے لحاتِ حیات ضائع کر رہے ہیں وہ ذرا معصیت کی مجرمانہ لذت سے اپنے کو نکال کر اللہ ربّ العزت کی طرف بڑھیں۔ وہ ایسا لطفِ حیات پائیں گے کہ پھر اپنے ماضی پر پچھتاتے ہوئے اور کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ کہتے ہوں گے کہ ہائے ہمارے غفلتِ دل کے وہ لحات اور آہ کس قدر تلخ تھی ہم پر ہماری حیات۔

تاثیر صحبت اہل اللہ

ایسے ویسے بھی ہوگئے کیسے
فیض کیسے ہیں شیخِ کامل کے

اس شعر میں اہل اللہ کی صحبت میں تاثیر کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اہل اللہ کی صحبت و خدمت اور ان کی محبت و اطاعت سے کتنے ہی غفلتوں کے سمندروں میں ڈوبے ہوئے لوگ اس سے نکل گئے اور کیسے کیسے راہ بھٹکے ہوئے راہِ حق پر گامزن ہوگئے اور بے شمار فسق و فجور کی ظلمات اور تاریکیوں میں پھنسے لوگ نورِ حق سے منور ہوگئے۔ خود ہمارے حضرت والا کی خدمت میں بہت سے عشاقِ مجازی کے عشق و محبت کا رُخ ایسا تبدیل ہوا کہ ان کا سارا عشقِ لیلیٰ عشقِ مولیٰ میں بدل گیا اور جو کل شقاوت و بدبختی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یکدم سعادت و نیک بختی والی حیات کی طرف لوٹ آئے۔ بقول حضرت مولانا منصور الحق صاحب ؎

میرے پیارے مرشد سے ملنے سے پہلے
کیا کرتے تھے جو شقاوت کی باتیں
میرے پیارے مرشد سے ملنے کے بعد
اب کیا کرتے ہیں وہ سعادت کی باتیں

یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحبتِ اہلُ اللہ کو فرضِ عین قرار دیا۔ چنانچہ ''بصائرِ حکیم الامت'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب صفحہ: ۱۴۶ پر ہے کہ میں تو اس زمانے میں اہل اللہ کی صحبت کو فرضِ عین کہتا ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ اس زمانے میں اہل اللہ اور خاصانِ حق کی صحبت اور ان سے تعلق رکھنے کے فرضِ عین ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ آج کل ایمان کی سلامتی کا ذریعہ صرف اہل اللہ کی صحبت ہے۔ اس تعلق کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ کوئی جادو اثر نہیں کرتا۔ (بحوالہ الافادات الیومیہ)

آج میں حیران ہوتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں سے پوچھیں کہ حضرت تھانوی کیسے عالم تھے، کیا وہ مجدد تھے، کیا وہ حکیم الامت تھے اور کیا مفسر اور محدث اور فقیہ تھے تو اہلِ حق طبقے کا تقریباً ہر فرد اس کا جواب ''جی ہاں'' میں دے گا اور اتنا ہی نہیں بلکہ خود حضرت تھانوی کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا، مگر نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ جب حضرت کے اس قول کو پیش کرو تو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

محبتِ عاشقانِ حق مرادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے

صاحبو! راقم السطور آپ سب کو دعوتِ غور وفکر دیتا ہے کہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعائیہ جملے میں غور فرمائیں:

﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنۡ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیۡ اِلٰی حُبِّکَ وَفِیۡ رِوَایَۃٍ اَللّٰھُمَّ ارۡزُقۡنِیۡ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنۡ یَّنۡفَعُنِیۡ حُبُّہٗ عِنۡدَکَ﴾

(مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۱۰۹۳)

غور کرنے کی بات ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے خود اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ کے عاشقوں کی محبت دونوں کو اس حدیث میں کیوں جمع فرمایا۔ اس سے اس بات پر صاف دلالت ہوتی ہے کہ اللہ والوں کی محبت مرادِ رسول ہے اور جو مرادِ رسول ہو وہ مرادِ خداوندی ہوا کرتی ہے، اس لیے اللہ والوں کی محبت حاصل کرنے اور مانگنے کی چیز ہوئی۔ گویا اس دعا میں اُمت کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اے میری اُمت! اللہ تعالیٰ سے اللہ کی محبت کو بھی مانگو اور اللہ کے عاشقوں کی محبت کو بھی مانگو۔

ایک طالب علمانہ سوال اور اس کا تفصیلی جواب

میرے اہلِ علم دوستو اور عزیز طلبہ! آج ماشاء اللہ جمعہ کی رات ہے۔ مجلس میں بڑی تعداد میں آپ اہلِ علم اور طلبہ موجود ہیں۔ الحمدللہ حضرت والا بھی تشریف فرما ہیں، اس لیے اس مقام پر ایک خاص مضمون اپنی اصلاحِ فہم اور افادۂ عام کے لیے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس حدیث شریف اور دوسری بعض احادیثِ شریفہ سے اہل اللہ کی محبت کا مضمون ثابت ہوتا ہے، مگر دراصل جو اہلِ خانقاہ کا مدعا ہے وہ اس سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مدعا محض اہل اللہ کی محبت اور صحبت

نہیں بلکہ یہ ہے کہ کسی ایک متعین شیخ کامل مصلح و مرشد و ولی اللہ سے محبت و عقیدت اور بیعت و اصلاح کا ایسا تعلق قائم کیا جائے کہ نگاہ دوسرے تمام اولیاء اللہ سے ہٹ جائے۔ بس اسی ایک متعین شیخ سے اس طرح چپک کر رہا جائے کہ نہ کسی اور کی وعظ و نصیحت سنے اور نہ ان کی مجلسوں میں بیٹھے اور نہ ان سے کوئی عقیدت و تعلق اور خاص رابطہ ہو۔ تو بالفاظِ دیگر یہ کہیے کہ خانقاہ میں اہل اللہ کی محبت کی بات نہیں کی جاتی بلکہ شخصیت پرستی کی تبلیغ ہوتی ہے جو اتنا سخت گناہ اور قابلِ نفرت امر ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اسی وجہ سے مشرک قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۳۱)

ترجمہ: ٹھیرالیا انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، وہ پاک ہے ان کے شریک بتلانے سے۔

(معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۳۶۲)

خلاصہ یہ کہ جو مضمون اہل اللہ سے محبت کا احادیثِ شریفہ سے ثابت ہو رہا ہے وہ آپ کا مدعا نہیں جو آپ کا مدعا ہے وہ احادیث سے ثابت نہیں۔

تو میرے اہلِ علم ساتھیو! اس سلسلے میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر تقلید کے مسئلے کو ثابت کرتے ہوئے بڑی قیمتی مثال ذکر فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی دل کی بیماری میں مبتلا ہو اور اُسے اس کی دوا استعمال کرنی ہو اب وہ اپنی مرضی سے مختلف ہارٹ انگلش اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے۔ ان سے اپنا مرض بیان کر کے مختلف دوائیاں لے کر گھر چلا آتا ہے۔ پھر بیٹھ کر اپنی رائے اور مرضی سے ڈاکٹر زید کی دوائی جمعے کے دن ڈاکٹر عمرو کی دوائی سنیچر کے دن اور ڈاکٹر خالد کی اتوار اور ڈاکٹر ماجد کی دوا پیر کے دن استعمال کرتا ہے تو کیا ایسا بیمار کبھی شفایاب ہوسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ خود اپنے ہاتھوں، اپنی ہلاکت و تباہی کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ ایسا کر کے نہ کبھی کوئی شفا پاتا ہے اور نہ ہی اہل عقل و فہم کی نگاہ میں ایسے شخص کو ہشیار اور سمجھ دار قرار دیا جاتا ہے بلکہ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ آپ ڈاکٹروں کی معلومات کر کے خوب غور و فکر کریں اور ان سے متعلق شفایاب ہونے والے احباب سے دریافت کریں اور تجربے کاروں سے رائے معلوم کریں اور پھر اس سب کے بعد جس ڈاکٹر پر طبیعت میں انشراح ہو تو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ اُس کے مشورے اور رائے کا اتباع کرے۔ اس کی دی ہوئی دوائی کو پابندی اور اہتمام کے ساتھ استعمال کرے۔ سارے عالم کے تمام عقلاء کا یہی متفقہ فیصلہ ہے اور اسی صورت میں بیماری کا علاج ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قلب کے دوسرے ماہر ڈاکٹروں میں نقائص اور خرابیاں نکالنا شروع کردے اور لوگوں کے سامنے ان کی کمی، خامی اور کمزوری بیان کرتا

پھرے۔ ایسا کرنا ذی عقل کی نگاہ میں بالکل بے ہودہ اور نازیبا عمل ہوگا۔

شفائے جسمانی وروحانی کے لیے ایک ماہر طبیب کی اتباع لازم ہے

اب خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ جس طرح دنیوی معاملے میں ایک معین ڈاکٹر کو اپنے احوال کی صحیح اطلاع اور اس کے مشوروں کی اتباع صحت جسمانی کے لیے لازم اور ضروری ہے۔ ٹھیک بالکل اسی طرح اپنی اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس اور شفائے روحانی کے لیے ایک متعین طبیبِ روحانی عالمِ ربانی کی اتباع لازم اور ضروری ہے۔ ہاں! البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہم اس عالمِ ربانی اور شیخ ومرشد کو قرآن وسنت کی روشنی میں اور وقت کے علماء وصلحاء کے ان کی نسبت حسنِ ظن رکھنے اور ان کے شیخ برحق ہونے کی تائید کرنے کے نتیجے میں جانچنے اور پرکھنے کے مکلّف ہیں۔ پھر یہ کہ اس کے پاس بیٹھ کے اللہ کی یاد دل میں آنا اور دنیا سے دوری اور آخرت کی رغبت کا پیدا ہونا اور گناہوں سے نفرت وتوحش اور طاعات کی طرف رغبت وتوجہ کا پایا جانا یہ سب علامات شیخ برحق ہونے کی ہیں، لہٰذا ایسے شیخ کامل سے تعلق کے بعد اس کی تعلیمات پر عمل کرنا اور اس کی ہدایات کی اتباع کرنا لازم اور ضروری ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح وہ جسمانی بیمار اپنے متعین ڈاکٹر کی بات مانے بغیر شفاء نہیں پاسکتا۔ اسی طرح یہ سالک کبھی بھی منزلِ سلوک طے کر کے واصل الی اللہ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ تجربہ اس پر شاہد ہے اور جس طرح وہاں دنیوی معاملے میں دوسرے ڈاکٹروں کی تنقیص جائز نہیں۔ اسی طرح یہاں دینی معاملے میں بھی ہم دوسرے مشائخ سے نہ تو بدظنی رکھیں اور نہ ان کو کمتر سمجھیں۔ اسی طرح نہ تو ان کی تحقیر جائز ہے اور نہ ہمیں ان کی تنقیص کا حق حاصل ہے۔ ہر ایک سے حسنِ ظن رکھنے کے ساتھ اپنے شیخ کو اپنے لیے سب سے زیادہ نافع سمجھے۔ اس میں نہ کوئی حرج ہے اور نہ شرعی قباحت ہے کیونکہ نفع کا مدار مناسبت پر ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کو ہر ایک سے مناسبت ہو، اسی لیے مشائخ اہلِ حق نے لکھا ہے کہ جس کو جس سے مناسبت ہو۔ اسی سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم کیا جائے جس کی باتوں سے طبیعت زیادہ مانوس ہو اور امورِ دینیہ میں نفع زیادہ ہو رہا ہو، اس کے مواعظ ومکاتیب سے روز بروز دین میں ترقی محسوس ہو رہی ہو اور اس کے وعظ وتقریر سے دل پر زیادہ اثر ہوتا ہو تو یہ ان سے مناسبت کی دلیل ہے۔

باہمی مناسبت فطرت میں ودیعت رکھی گئی ہے

یہ طبیعتوں کی مناسبتوں کا اتفاق واختلاف ایک فطری وقدرتی عمل ہے۔ ایسا ممکن ہے کوئی شخص اپنے زمانے کا بڑا ولی اللہ ہو اور تقویٰ وللّٰہیت کے مرتبۂ عظمیٰ پر فائز ہو، لیکن دوسرے شخص کو اس کے ساتھ مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے نفع نہ پہنچ رہا ہو۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ:

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الحب فی اللہ ومن اللہ، ص: ۴۲۵، قدیمی کتب خانہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ارواح لشکر کے لشکر ہیں جو (عالمِ ارواح میں) مجتمع تھیں جن میں وہاں جان پہچان ہوتی ہے ان میں یہاں بھی باہم الفت ہے اور جن میں جان پہچان نہیں ہوتی ان میں اختلافِ مزاج ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تحت اسی مزاجی مناسبت کے اختلاف کو ذکر کیا ہے کہ اشتراط تناسب شیخ ومرید درنفع یہ امر تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوضِ باطنی کے لیے پیر ومرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ اس حدیث کے عموم میں یہ مناسبت بھی داخل ہے کیونکہ نفع عادۃً موقوف ہے الفت پر اور الفت بنصِ حدیث موقوف ہے تعارفِ عالم ارواح پر جو حقیقت ہے مناسبتِ فطری کی اور یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر مشائخ طالب کو اپنے پاس سے دوسرے شیخ کے پاس جس سے مناسبت مظنون یا مکشوف ہو بھیج دیتے ہیں۔

(التکشف، صفحہ: ۳۲۸، مطبوعہ: کتب خانہ مظہری)

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج جو دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں ایک مشرق کے رہنے والے انسان کو کسی مغرب میں رہنے والے سے اور شمال میں رہنے والے کو کسی جنوب میں رہنے والے سے محبت وتعلق اور انس ولگاؤ ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ان میں بہت گہری دوستی اور محبت ہو جاتی ہے تو درحقیقت یہ اسی عالمِ ارواح میں باہمی تعارف وتقارب کا اثر ہے، اسی لیے دینی افادے واستفادے کے لیے بھی یہ مناسبت ضروری ہے کیونکہ اگر مناسبت نہ ہو تو سالہا سال گزر جانے کے باوجود سالک کو نفع نہیں ہوتا، اسی لیے احقر کے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ نے ایک خط کے جواب میں یوں ارشاد فرمایا کہ خواب پر مدار اعتماد واعتقاد کا رکھنا لا حاصل ہے۔ مکاتبت کے ذریعے مناسبت کا علم کر لیا جائے اور پھر اصلاحی تعلق قائم کیا جائے۔

دراصل اس پوری تفصیل کا منشاء یہ ہے کہ جس طرح ظاہری جسمانی ڈاکٹروں میں حصولِ صحت وشفایابی کے لیے ایک مناسبت والے ڈاکٹر کو تجویز کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب کے لیے ایک شیخ ومرشد کا انتخاب از حد ضروری ہے، اسی لیے یہ مسئلہ اُمت کے تمام اولیاء کاملین کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ پوری تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس مردِ مؤمن عالمِ دین نے کسی ایک متبعِ سنت وشریعت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو پھر وہ خود رجلِ کامل ہی نہیں بنا بلکہ رجال گر بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس سے دین کا خوب کام لیا۔

نظامِ خانقاہی پر شخصیت پرستی کے الزام کی حقیقت

اب رہ گیا شخصیت پرستی کا لفظ تو اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اس پر روشنی ڈالی جائے جس سے واضح ہو جائے گا کہ مشائخ اہلِ حق سے تعلق کے لیے یہ تعبیر اختیار کرنا یا تو بعض دشمن عناصر کی شرارت کا نتیجہ ہے یا بعض نادان دوستوں کی جہالت ونادانی کا ثمرہ ہے۔

آپ غور فرمائیں اس میں دو لفظ ہیں۔ نمبر ا شخصیت اور نمبر ۲ پرستی۔ سو شخصیت کا معنی اور مطلب تو بالکل واضح ہے یعنی ایک معزز ذات اور قابل قدر بزرگ ہستی اور پرستی کا مطلب ''پوجنا'' اور کسی کی عبادت کرنا تو دونوں لفظوں کو ملا کر اس کا مفہوم ومطلب یہ ہوا کہ کسی بڑی معزز ہستی کو پوجنا اور اس کی عبادت کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ معترض کا یہ کہنا کہ خانقاہ میں شخصیت پرستی ہوتی ہے۔ اس سے اُس کی کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو مراد ہو نہیں سکتی کہ جس طرح ہندو اپنے مندروں میں بتوں کی پوجا کرتے ہیں، ان کے سامنے جھکتے اور سجدہ کرتے ہیں تو اس سے تو بدیہی طور پر مشائخ اہل حق کی خانقاہیں خالی ہیں اور اس طرح کی کسی عبادتِ غیر اللہ کا وہاں نام ونشان نہیں ہے، لہٰذا یہ تو مراد نہیں ہوسکتی تو غالباً اس جملے سے ان کی مراد یہ ہے کہ لوگ ایک شخصیت کے اردگرد ہر وقت جمے رہتے ہیں اور ایک بڑا جم گھٹا اکھٹا رہتا ہے۔ پھر اس کی مدح وثناء حد سے بڑھ کر تعریفیں کرتے ہیں اور اس کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور اس کی بات کو قرآن وحدیث کی طرح حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور اُس سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جتنی اللہ سے کرنی چاہیے اور جو ذکر واذکار وہ بتائے، اس میں کمی زیادتی کو ناجائز وحرام سمجھتے ہیں جبکہ یہ حقِ تشریع غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتا اور جس سے وہ روک دے رُکتے ہیں اور جس کو کرنے کو کہیں تو کرتے ہیں حالانکہ تحریم حلال اور تحلیل حرام کا حق بھی صرف نبی کو ہے۔

تعظیم اولیاء اور حق تشریع دو الگ چیزیں ہیں

اسی خرابی کی وجہ سے تو یہود ونصاریٰ کو شرک فی الربوبیت کا مرتکب قرار دیا گیا۔ چنانچہ اسی نوع کا اعتراض ایک مرتبہ میرے سامنے ایک سعودی ساتھی نے کیا کہنے لگا کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ شیخ نے ذکر بتایا، اس کو پورا کرلو یہ غلط ہے۔ دلیل یہ پیش کی کہ شیخ کو حقِ تشریع نہیں ہے جو مقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے اس میں کمی زیادتی کا کسی کو حق نہیں۔ انہوں نے برجستہ یہی آیت پڑھی جس میں یہود ونصاریٰ کے متعلق یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے جو نصِ صریح حرام ہے۔ احقر نے ان کو تو الزامی جواب دے کر خاموش کردیا اور وہ یہ کہ میں اور آپ اس وقت دعوت وتبلیغ میں نکلے ہوئے ہیں تو صرف چھ نمبروں میں دین کو محدود کردینے کا حق واختیار اکابرِ مرکز کو دینا کیا یہ غیر نبی کو تشریع کا حق دینا نہیں؟ مگر اس کا تحقیقی جواب سمجھنے سے پہلے چند باتیں بطورِ تمہید عرض کرتا ہوں۔ نمبر ا ہماری شریعتِ اسلامیہ میں علمائے کرام کا مرتبہ بہت عظیم قرار دیا گیا ہے اور ان کا احترام وتعظیم دین کا ایک حصہ شمار کیا جاتا ہے کیونکہ علماء نائبین انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تذلیل وتحقیر کرنا یا ان کے ساتھ بے ادبی وبے اکرامی کا معاملہ کرنا بڑا گناہ ہے۔

چنانچہ مشہور عالمِ ربانی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے ''اسلامی سیاست'' صفحہ: ۱۵۱ پر یہ حدیث نقل کی ہے:

﴿اُخِذَ عَلَیْنَا الْعَھْدُ الْعَامُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ نُکْرِمَ الْعُلَمَآءَ وَنُبَجِّلَھُمْ وَنُوَقِّرَھُمْ وَلَا نَرٰی لَنَا قُدْرَۃً عَلٰی مُکَافَاتِھِمْ وَلَوْ اَعْطَیْنَا ھُمْ جَمِیْعَ مَا نَمْلِکُ اَوْخَدَمْنَاھُمُ الْعُمْرَ کُلَّہٗ وَھٰذَا الْعَھْدُ قَدْ اَخَلَّ بِہِ الطَّالِبُ طَلَبَۃُ الْعِلْمِ وَ الْمُرِیْدُوْنَ طَرِیْقَ الصُّوْفِیَآءِ﴾

(لواقع الانوار القدسیّۃ فی بیان العھود المحمدیّۃ)

یعنی حضرت شیخ فرماتے ہیں علامہ عبدالوہاب شعرانی جو اکابرِ صوفیاء میں سے ہیں انہوں نے عہودِ محمدیہ کے سلسلے میں ایک کتاب لکھی ہے یعنی جن جن باتوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے عہد لیا ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انہیں میں سے اوپر ذکر کردہ عہد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہم لوگوں سے اس بات کا ایک عام عہد لیا گیا کہ علماء کا اکرام واعزاز کریں اور ان کی تعظیم کریں۔ ہم میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ان کے احسانات کا بدلہ ادا کرسکیں۔ چاہے ہم وہ سب کچھ دے دیں جو ہماری مِلک میں ہے اور خواہ مدتُ العمر ان کی خدمت کرتے رہیں، اس معاہدے میں بہت سے طلبہ اور بہت سے مریدین کوتاہی کرنے لگے ہیں حتیٰ کہ ہم کو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے اُستاد کے حقوقِ واجبہ ادا کرتا ہو۔ یہ دین کے بارے میں ایک بڑی بیماری ہے جس سے علم کی اہانت کا پتہ چلتا ہے اور اس ذاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ساتھ لاپرواہی کا پتہ چلتا ہے جس نے اس کا حکم فرمایا ہے۔ (اسلامی سیاست صفحہ ۱۵۱، بحوالہ لواقع الانوار القدسیّۃ فی بیان العھود المحمدیّۃ)

اس تحریر سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ معترض نے اپنے شیخ کی جس محبت وعقیدت اور تعظیم وتکریم کو شخصیت پرستی سمجھا ہے وہ تو عین شریعت میں محبوب ومطلوب ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے مامور بہ ہے، اس سلسلے میں مزید احادیث دیکھنی ہوں تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب ''التکشُّف'' کی طرف مراجعت کریں لہٰذا ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ یہ شخصیت پرستی نہیں ہے۔

اپنے شیخ کی حد سے زیادہ تعریف اور مزاجِ شریعت وسنت

البتہ معترض کا دوسرا اعتراض کہ ہر شخص اپنے شیخ کو سب سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے تو اس سلسلے میں، میں اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرسکتا ہوں کہ معترض کسی حد تک حق بجانب ہے۔ اس کا یہ اعتراض کسی درجہ درست اور صحیح ہے کیونکہ بہت سے ناداں غالی قسم کے لوگ دین کے جس شعبے میں بھی داخل ہوتے ہیں تو اس میں حدود سے تجاوز کرکے افراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں اور خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، اس لیے اس سلسلے میں قولِ فیصل وہ ہے جس کو مجدد الملت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے شیخ کو اپنے نفع کے لیے پوری دنیا میں سب زیادہ انفع خیال کرے، لیکن دوسروں پر ترجیح یا تقابل درست نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس پر شدید نکیر فرمائی ہے یہاں تک کہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے پیر یا دوسرے کسی بزرگ کی ثناء میں حد سے زیادہ مبالغہ نہ کرے۔ اور اس کے متعلق ایک روایت نقل فرماتے ہیں:

﴿عَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهٗ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الآداب، باب المفاخرة والعصبية، ص: ۴۱۷، قديمي كتب خانه)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو اتنا مت بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا (کہ ان کو الٰہ اور ابن اللہ کہنے لگے) میں تو بندہ ہوں سو تم لوگ مجھ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔ اللہ کا عظیم الشان رسول کہہ کر کہ میرے سب فضائل اس عنوان میں داخل ہو گئے اسی واسطے تفصیلِ فضائل کے وقت بھی انہیں فضائل پر اکتفاء کرنا واجب ہے کہ اس سے آگے مرتبۂ الوہیت ہے تجاوز درست نہیں۔

اس کے تحت حضرت تھانوی بطورِ فائدہ کے تحریر فرماتے ہیں کہ اصلاح ترکِ مبالغہ در ثناء شیخ حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے پیر یا دوسرے کسی بزرگ کی ثناء میں زیادہ مبالغہ نہ کرے کہ حدِّ کذب یا شرک تک پہنچ جائے کیونکہ جب صاحبِ نبوت کے لیے اس کی ممانعت ہوئی تو صاحبِ ولایت کے لیے کیسے جائز ہوگا۔ (التکشف ص ۳۸۶)

میرے دوستو! غور کرنے کا مقام ہے کہ اوّل تو خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلامِ مبارک سے تعریف میں حد سے زیادہ مبالغے کی مذمت صاف صاف معلوم ہوگئی۔ پھر اپنے وقت کے حکیم الامت مجدد الملت کی تشریح و توضیح سے اس کی قباحت و شناعت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے تو پھر آگے کسی کے لیے بھی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ کسے باشد کہ وہ اس قبیح فعل کا مرتکب ہو۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک لَا تَطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور بشر ہونے میں سب کے ساتھ شریک ہوں۔ میرا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس سے آگے بڑھانا کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں مجھے شریک قرار دے دو یہ غلو ہے۔ تم نصاریٰ کی طرح کہیں اس غلو میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور یہودی و نصاریٰ کا یہ غلو فی الدین صرف انبیاء ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ انہوں نے جب یہ عادت ہی ڈال لی تو انبیاء علیہم السلام کے حواریین اور متبعین اور ان کے نائبین کے مقابلے میں بھی یہی برتاؤ اختیار کیا۔ رسول کو تو خدا بنا دیا تھا۔ رسول کے متبعین کو معصوم کا درجہ دے دیا۔ پھر یہ بھی تنقید و تحقیق نہ کی کہ یہ لوگ حقیقتاً انبیاء کے متبع اور ان کی تعلیم پر صحیح طور سے قائم بھی ہیں۔ یا محض وراثۃً عالم یا شیخ سمجھے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں ان کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو خود بھی گمراہ تھے اور ان کی گمراہی کو اور بڑھاتے تھے۔ دین اور تدیّن ہی کی راہ سے ان کا دین برباد ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی اُمتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے۔ اس لیے ہمارے آقا و مولیٰ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو اس وبائے عظیم سے بچانے کے لیے مکمل تدبیریں فرمائی۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَدَاةَ جَمْعٍ هَلُمَّ الْقُطْ لِیْ فَلَقَطْتُ لَهُ حَصَیَاتٍ مِّنْ حَصَی الْخَذْفِ فَلَمَّا وَضَعَهُنَّ فِیْ یَدِهٖ قَالَ نَعَمْ بِاَمْثَالِ هٰؤُلَاءِ وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ فَاِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالْغُلُوِّ فِی الدِّیْنِ﴾

(مسند احمد، رقم الحدیث: ۱۷۵۴)

کہ حج کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمی جمرات کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کرلائیں۔ انہوں نے متوسط درجے کی کنکریاں پیش کردیں۔ آپ نے ان کو بہت پسند فرمایا کہ دومرتبہ فرمایا بمثلھنّ بمثلھنّ یعنی ایسے ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہیے۔ پھر فرمایا وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ فَاِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالْغُلُوِّ فِی الدِّیْنِ یعنی غلو فی الدین سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی اُمتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں۔

اس حدیث سے چند اہم مسائل بھی معلوم ہوگئے۔

(۱) اوّل یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں ان کی حدِ مسنون یہ ہے کہ وہ متوسط ہوں نہ بہت چھوٹی ہوں نہ بہت بڑی۔ بڑے بڑے پتھر اُٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

(۲) دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حدِ شرعی وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے متعین فرمادی، اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

(۳) تیسرے یہ واضح ہوگیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حدِ مسنون سے تجاوز کیا جائے۔

علماء ومشائخ کی تعظیم واتباع میں راہِ اعتدال

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے صفحہ: ۶۲۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب "حُجَّۃُ اللهِ البالغة" میں یہ فرمایا ہے کہ تحریفِ دین کے دنیا میں کیا کیا اسباب پیش آتے ہیں اور شریعتِ اسلامیہ نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا ہے کہ کسی سوراخ سے یہ وباء اس اُمت میں نہ پھیلے۔

ان اسباب میں سے دین کے بارے میں تعمّق وتشدد یعنی غلو فی الدین کو بڑا سبب قرار دیا، مگر افسوس ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر اہتمام اور شریعت کی اتنی پابندیوں کے باوجود آج اُمتِ مسلمہ اسی غلو کی بُری طرح شکار ہے۔ دین کے سارے ہی شعبوں میں اُس کے آثار نمایاں ہیں۔ ان میں سے بالخصوص جو چیز ملت کے لیے مہلک اور انتہائی مضر ثابت ہورہی ہے وہ دینی مقتداء اور پیشواؤں کا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت تو اس طرف گئی ہے کہ مقتداء اور پیشواء اور علماء وعرفاء کوئی چیز نہیں کتابُ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ جیسے وہ اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم رجال ونحن رجال یعنی وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوسناک جو نہ عربی زبان سے واقف ہے نہ قرآن کے حقائق ومعارف سے نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بیان وتفسیر سے محض قرآن کا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو قرآن کا عالم کہنے لگے۔ قرآن کریم کی جو تفسیر وتشریح خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بلاواسطہ شاگرد یعنی صحابہ کرام سے منقول ہے۔ اس سب سے قطع نظر جو بات ذہن میں آ گئی، اس کو قرآن کے سر تھوپ دیا حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلم کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کے نسخے لکھے لکھائے لوگوں تک پہنچا دیتے۔ رسول کو معلم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔

اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات صرف کتابُ اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں کسی بھی علم وفن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر کبھی کوئی شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹری یا طبِ یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا۔ انجینئری کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینئر نہیں بنا۔ کپڑے سینے یا کھانے پکانے کی کتابیں دیکھ کر کوئی درزی یا باورچی نہیں بنا بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم وتعلّم اور معلّم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر افسوس کہ قرآن وسنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے کسی معلّم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ چنانچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تو اس طرف غلو میں بہہ گئی کہ صرف قرآن کے مطالعے کو کافی سمجھ بیٹھے۔ علماء وسلف کی تفسیروں اور تعبیروں کو اور ان کی اقتداء واتباع کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی ایک بھاری جماعت اس غلو میں مبتلا ہوگئی کہ اندھا دھند جس کو چاہا اپنا مقتداء اور پیشوا بنالیا۔ پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی نہ یہ معلوم کہ جس کو ہم مقتداء و پیشوا بنا رہے ہیں یہ علم وعمل اور اصلاح وتقویٰ کے معیار پر صحیح بھی اُترتا ہے یا نہیں اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے، وہ قرآن وسنت کے مخالف تو نہیں؟ شریعتِ اسلام نے غلو سے بچا کر ان دونوں کے درمیان طریقہ کار یہ بتلایا کہ کتابُ اللہ کو رجالُ اللہ سے سیکھو اور رجالُ اللہ کو کتابُ اللہ سے پہچانو یعنی قرآن وسنت کی مشہور تعلیمات کے ذریعے پہلے ان کو پہچانو جو کتاب وسنت کے علوم میں مشغول ہیں اور ان کی زندگی کتاب وسنت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ پھر کتاب وسنت کے ہر اُلجھے ہوئے مسئلہ میں ان کی تفسیر وتشریح کو اپنی رائے سے مقدم سمجھو اور ان کا اتباع کرو۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۴۲۳)

اولیاء اللہ میں تقابل وتفاضل کسی کو جائز نہیں ہے

میرے دوستو! اولیاء اللہ میں تقابل وتفاضل تو کیا؟ کسی کے متعلق یقین سے اس کی بزرگی اور ولایت کا قائل ہونا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی اس حدیثِ پاک سے استدلال فرماتے ہیں:

﴿عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ مَادِحًا اَخَاهُ فَلْیَقُلْ اَحْسِبُ فُلَانًا وَ اللهُ حَسِیْبُهٗ وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللهِ اَحَدًا اَحْسِبُ فُلَانًا کَذَا وَ کَذَا اِنْ کَانَ یَعْلَمُ مِنْهُ ذٰلِکَ اخرجه الشیخان وابو داؤد﴾

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اپنے بھائی مسلمان کی ضرور ہی مدح کرنا ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ہے آگے خدا کافی جاننے والا ہے۔ اور خدا کے نزدیک کسی کے مزکیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور یہ جو کہے گا کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ایسا ہے۔ وہ بھی اس شرط سے کہ اُس کے علم میں بھی وہ شخص ایسا ہو ورنہ اس عنوان سے بھی مدح جائز نہیں۔ روایت کیا اس کو بخاری و مسلم و ابوداؤد نے۔

حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اصلاح ترکِ جزم بولایتِ کسے'' حدیث کے عموم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو بدونِ نص کے محض گمان سے قطعاً ولی کہنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ اکثر کو اس میں بے احتیاطی ہے۔ البتہ اگر ظناً کہہ دے تو مضائقہ نہیں ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس ظنّیت کی تصریح بھی کر دے لیکن اگر اعتماداً اعلیٰ قرینۃ المقام والکلام تصریح نہ بھی کرے تب بھی مضائقہ نہیں۔ ہاں! شیخ کہنا کسی کو جزم سے بھی جائز ہے کیونکہ مشیخت امرِ مشاہد ہے یعنی طریق تربیت کا جاننا بر خلاف ولایت کے کہ امرِ غیبی ہے یعنی مقبول عند اللہ ہونا۔ (التکشف ،صفحہ:۳۸۶)

صاحبو! یہ دونوں حدیثیں اور پھر بزبان حضرت تھانوی اس کی تشریح ہمارے مدعا پر کس قدر واضح اور صریح دلیل ہیں، اس لیے جو آج کل بعض لوگوں نے اپنے مشائخ کے متعلق یہ عادت قائم کر لی ہے کہ ان کی تعریف میں حد سے تجاوز اور مشائخ کے درجات میں باہمی ترجیح و تقابل والا انداز یا ایسے طریق پر گفتگو جس سے بعضوں کی تنقیص ہوتی ہو، یہ سب باتیں شرعی طور پر بے بنیاد اور غلط ہیں۔ بڑے افسوس اور دُکھ کی بات ہے کہ مشائخ اور بزرگانِ دین سے تعلق کا اصل مقصود یعنی ان کی تعلیمات وارشادات پر چل کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا کہ خود انہوں نے جن باتوں پر چل کر اللہ کو راضی کیا۔ یہ مقصد لوگوں کے ذہن سے غائب ہو گیا۔ ہاں! بزرگوں کی خدمت اور ان کی تعظیم و توقیر کی جائے اور ان کی صحبتوں اور دعاؤں سے خوب نفع اُٹھایا جائے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرتا۔

آمدم برسرِ مطلب

اب احقر اصل اعتراض اور اس کے جواب کی طرف لوٹتا ہے کہ جو لوگ بزرگوں کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ درحقیقت ہمارے اکابر اولیاء اللہ کی تعلیمات پر حقیقی طور پر عامل نہیں ہیں اور نہ ہی صحیح معنی میں اہلِ حق مشائخ سے مخلصانہ طور پر جڑے ہوئے ہیں ورنہ وہ کبھی اس طرح کے ممنوعات و محرمات میں مبتلا نہ ہوتے، اس لیے بعض لوگوں کی اس جہالت و نادانی اور غلو کی وجہ سے پورے سلسلۂ طریقت اور مشائخِ سلسلہ پر اعتراض درست نہیں۔

راقم السطور بشرح صدر یہ بات عرض کرتا ہے کہ تصوف اور طریقت کا جو مسئلہ قرآن و سنت سے بال برابر بھی ہٹا ہوا ہو اُس کا ہمارے اہلِ حق بزرگوں کے یہاں طریقت سے کوئی جوڑ نہیں۔ اللہ بہت بہت جزائے خیر دے

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو خصوصاً اور دوسرے ہمارے اکابر کو عموماً کہ ایسے جو گیانہ اور جاہلانہ تصوف کو اسلامی تصوف سے بالکل الگ اور صاف صاف کر دیا۔ بزبانِ اہلِ اردو ''دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا''

البتہ اپنے شیخ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ یہ روئے زمین پر میرے لیے سب سے نافع ہے، ضروری ہے کیونکہ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو تو نفع تو ہوگا لیکن مکمل اور تام نفع نہ ہوگا، اسی لیے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی مجلس میں جنید و شبلی ہوں اور حاجی صاحب بھی ہوں تو ہم جنید و شبلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ بس حاجی صاحب ہی کی طرف اپنی نگاہ رکھیں۔ ہاں! حاجی صاحب کا جی چاہے وہ ان کی طرف دیکھیں ہم تو کسی کی طرف بھی نہ دیکھیں گے۔ (پسندیدہ واقعات، صفحہ:۱۸۶)

شیخ و مرشد بنانے پر اہلِ عرب کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب رہ گیا تیسرا اہم اعتراض جو عام طور پر عربوں کو ہوا کرتا ہے کہ ہم نے ان مشائخ کو حقِ تشریع دے رکھا ہے جو غیرِ نبی کے لیے جائز نہیں ہے، لیکن اس سلسلے میں دراصل غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک تو حقِ تشریع ہے یعنی شریعت و قانون سازی اور تحلیل و تحریم کا اختیار کسی کو سونپنا۔

دوسری چیز ہے کہ نائبینِ انبیاء کو محض تربیت و اصلاحِ باطنی کے سلسلے میں اپنا معتمد اور بڑا سمجھ کر اس کی باتوں پر مشوروں پر عمل کرنا اور اس کو اپنا راہبر و راہنما تسلیم کرنا ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ پہلے کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ گویا مرید اپنے شیخ و مرشد کو اس بات کا مجاز اور مختار قرار دے رہا ہے کہ وہ اس کے لیے جو چاہے جائز کر دے اور جو چاہے ناجائز اور جس کو چاہے حلال یا حرام کر دے اور پھر اس کے لیے اُس کے خلاف کرنا ممنوع اور ناجائز سمجھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا معاملہ کسی اہلِ حق شیخ کے یہاں موجود نہیں ہے جو بات مشائخ اہل اللہ کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ شیخ و مرشد اپنے مرید کے احوال کے اعتبار سے اس کے لیے مختلف اذکار و اشغال ماثورہ و منقولہ متعین اور مقرر کر دیتا ہے۔ نہ تو اس کے خلاف کرنے کو حرام و ناجائز سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی اُس کی پابندی کو عقیدے کے لحاظ سے لازم اور ضروری سمجھا جاتا ہے تو یہ ٹھیک اس طرح ہوا جیسے کوئی بیمار شخص اپنی بیماری کے لیے طب کی کتاب دیکھ کر مختلف دوائیوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے بجائے کسی بڑے ماہر ڈاکٹر سے اپنے لیے دوائی تجویز کراتا ہے۔ اس لیے خلاصہ یہ نکلا کہ سلسلۂ طریقت کی یہ پوری کڑی از قبیلِ تربیت ہے نہ کہ از قبیلِ تشریع ہے۔

دیکھئے! مثلاً جماعتِ تبلیغ کے چھ نمبر ہیں اور تمام دعوت و تبلیغ میں لگنے والے حضرات کو اس کا پابند کیا جاتا کہ وہ ان چھ نمبروں ہی کے اندر اپنے کام کو محدود رکھیں اور باقی باتوں کو نہ چھیڑیں اور ہم سب بلا کسی اشکال و اعتراض اس کی پابندی کرتے ہیں نہ کسی عربی کو اعتراض ہوتا ہے نہ عجمی کو، اسی لیے احقر نے اپنے ساتھ دعوت و تبلیغ

میں نکلے ہوئے ایک عرب ساتھی کو، ان کے اوپر ذکر کیے ہوئے اشکال کا یہی الزامی جواب دیا اور ان سے عرض کیا مَا هُوَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا تو اس پر وہ خاموش ہوگئے۔ اس لیے ہمارے اکابر علماءِ دیو بند میں اکثر حضرات کا کسی نہ کسی شیخِ کامل سے اصلاحی تعلق قائم رہا ہے جس کی برکت سے اللہ نے ان کو سارے عالم میں چمکایا اور اُن کے ایمانی و عملی فیض سے سارا عالَم روشن ہوا۔ اسی لیے میں یہ بات بڑی شرحِ صدر سے کہتا ہوں کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں میں جنھوں نے دینی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اہل اللہ کے ساتھ وابستہ نہ رہا ہو۔ یہی حضرت والا کے اس شعر کا سبق ہے جس کی تشریح چل رہی ہے ؎

ایسے ویسے بھی ہوگئے کیسے
فیض کیسے ہیں شیخِ کامل کے

جان فدا کرنا سرخروئی اور کامیابی کا راستہ ہے

جان ان پر فدا کرو اختؔر
سرخ رو ہوگے خاک میں مل کے

اللہ تعالیٰ کی مرضی پہ اپنی خواہشات کو قربان کرنے والا اور اپنے دل و جان کو اللہ تعالیٰ پر فدا کرنے والا جس دن اس مسافر خانے سے نکل کر آخرت کی طرف چلے گا تو اُسے بڑی قیمتی حیات نصیب ہوگی اور کامیابی اور سرخروئی اس کا مقدر بنے گی اور گو کہ بظاہر اس کا جسم خاک میں مل جائے گا، مگر اس کے لیے وہ کسی قید خانے سے نکل کر آزادی پانے اور جیل سے رہائی حاصل ہونے کے مترادف ہوگا۔ جیسے تائب صاحب کا ایک شعر ہے ؎

زندوں کو ہے پیغام جو زنداں میں ہیں اب تک
آزاد جو ہونا ہے تو میدان کھلا ہے

لیکن اس سرخروئی کے لیے یہ شرط ہے کہ اپنی حرام خواہشات پر شیروں کی طرح دلیرانہ جرأتمندانہ حملہ کرے اور ہمت سے وار کرے صرف تمنّاؤں سے اور آرزوؤں سے اور محض جاں فدا کرنے کے جذبے سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ جیسا کہ حضرت خواجہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی فکر کے اہتمام سے ہوگی

پھول مرجھا گئے ذرا کھل کے

کون رخصت ہوا گلے مِل کے
شامیانے اجڑ گئے دل کے

حُسن فانی ہے عِشق بھی فانی
پھول مرجھا گئے ذرا کھل کے

کیسا چہرہ بدل گیا ان کا
دام کچھ بھی نہیں رہے تل کے

کی نہ توبہ اگر گناہوں سے
دونوں روئیں گے خاک میں مِل کے

صدق توبہ و چشم گریاں سے
سامنے ہیں نشان منزل کے

ناؤ گزری ہے جو بھی طوفاں سے
لطف ملتے ہیں اس کو ساحل کے

اے خدا آپ کے کرم سے سب
کٹ گئے دن ہمارے مشکل کے

بعد مدت کے بزمِ ساقی میں
میر خوشیاں منا گلے مل کے

میں کہاں اور شاعری میری
فیض ہوتے ہیں شیخ کامل کے

آج اختؔر ہے مجمعِ ابرار
آؤ کر لیں ذرا دعا مل کے

مشکل الفاظ کے معنی:۔شامیانے: تنبو۔دام: قیمت۔ صدق توبة: سچی توبہ۔ چشم گریاں: آنسو بہاتی ہوئی آنکھ۔ناؤ: کشتی۔بزمِ ساقی: شیخ کی محفل۔مجمعِ ابرار: صالحین کی جماعت۔

شیخ کے گلے ملنے سے دل کی حالت بدل گئی

کون رخصت ہوا گلے مل کے
شامیانے اُجڑ گئے دل کے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل اللہ کی صحبت اوران کی ملاقات اور خدمت ورفاقت میں عجیب کیمیا تاثیر رکھی ہے کہ ان سے ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی چلی جاتی ہے اور دنیا کی محبت نکلتی نظر آتی ہے صرف ان کی زیارت ودیدار سے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے ان سے معانقہ کرنا اور گلے ملنا اندرون قلب عجیب انقلاب برپا کردیتا ہے اس لیے حضرت والا یہاں یہ بات بیان فرمارہے ہیں کہ میرے شیخ سے گلے ملنے کے بعد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کے شامیانے اور تانے بانے ٹوٹ گئے جس کے نتیجے میں قرب خداوندی کی لذت دل میں محسوس ہونے لگی۔

کھلا ہوا حسن عنقریب مرجھانے والا ہے

حسن فانی ہے عشق بھی فانی
پھول مرجھا گئے ذرا کھل کے
کیسا چہرہ بدل گیا ان کا
دام کچھ بھی نہیں رہے تل کے

سبحان اللہ! حسن فانی کی فنائیت اور خرابی کو ایک عجیب وغریب تشریح کے ذریعے سے سمجھایا ہے کہ اے میرے نادان دوست اگر تو حسن فانی پر عاشق ہو رہا ہے تو یہ بات نہ بھولنا کہ جس طرح پھول تھوڑی دیر کے لیے کھلتا ہے اور پھر مرجھا کر خاک میں مل جاتا ہے اور اس کے بعد کسی کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی یہ حسن فانی کی رنگت و رونق بھی جلد زوال پذیر ہے تو تیرا یہ عشق بھی عنقریب رخصت ہوتا دکھائی دے گا۔

اس لیے فانی سے دل لگانا انجام کی تباہی اور بربادی ہے کیسے کیسے خوبصورت چہرے اب بگڑے ہوئے نظر آرہے ہیں اور جو بدن پر تل کے نشانات تھے جنہیں حسن کے ترازو میں تولا جاتا تھا اور جس کی بناء پر عشق کی گرم بازاری ہوتی تھی آج سارا بازارِ عشق ماند پڑ گیا ہے نہ تل کی کوئی قیمت رہی اور نہ تل والے چہرے کی۔ سب پھولوں کی عارضی رنگت تھی جو مرجھا کر ختم ہوگئی لہٰذا سمجھداری کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی ذات پاک کے ساتھ عشق ومحبت کا رشتہ قائم رکھئے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے نہ وہ خود فنا ہونے والی نہ اس سے کی ہوئی محبت زائل ہونے والی بلکہ تمام ایسے موقعوں پر جہاں سب سہارے ٹوٹتے دکھائی دیں وہاں اس ذات کا سہارا رہتا ہے تو وہ عشق ومحبت ہر حال میں کام آنے والی ہے اور بالآخر دائمی وصالِ محبوب تک پہنچا دیتی ہے۔

ظالم وظلام وظلوم بندہ......غافر وغفار وغفور اللہ

کی نہ توبہ اگر گناہوں سے
دونوں روئیں گے خاک میں مل کے
صدق توبہ و چشم گریاں سے
سامنے ہیں نشان منزل کے
ناؤ گزری ہے جو بھی طوفاں سے
لطف ملتے ہیں اس کو ساحل کے

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے لیے ہر حالت میں گناہوں سے توبہ کا راستہ باقی رکھا ہے خواہ وہ گناہ کر کے کیسی ہی آخری حد تک پہنچ گیا ہو اس لیے کسی بھی حال میں اللہ کی رحمت سے ناامیدی حرام ہے تو عشق مجازی میں

گرفتار دونوں فریق اور حسن مجازی کے شیدائی عاشق و معشوق جنہوں نے اپنے اللہ کی نافرمانی میں بہت کچھ اپنی صلاحیتیں برباد کی حضرت والا ان کو توبہ کی دعوت دیتے ہیں اور توبہ نہ کرنے کا خطرناک انجام ذکر کرنے کے ساتھ یہ بھی ذکر فرما رہیں کہ توبہ کرنے کی صورت میں منزل کے نشانات بالکل سامنے ہیں۔

قربان جائیں ہم اپنے اللہ کی ذات رحیمی و کریمی پر کہ بندوں پر اتنا رحم کرنے والے اور معاف کرنے والے ہیں کہ قرآن میں اپنے لیے تینوں الفاظ ذکر فرمائے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اے میرے بندے اگر تو ظالم ہے تو میں غافر ہوں اگر تو ظلّام ہے تو میں غفّار ہوں اگر تو ظلوم بھی ہے تو بھی مایوس نہ ہو میں تیرے لیے غفور ہوں یعنی درجہ بدرجہ قدم بہ قدم اگر تو گناہ میں بڑھتا چلا گیا اور بحرِ عصیان میں غرق ہوتا اور ڈوبتا چلا گیا تو تو جس حد تک بھی جارہا ہے اور پھر مجھے تو پکارے تو میں تجھے اس سمندر سے نکال کر ایسا پاک وصاف کردینے والا ہوں کہ تیرے اوپر کسی قسم کا کوئی اثر ہی باقی نہیں رہے گا حتی کہ جو چار گواہ تیرے گناہ کرتے وقت میں نے قائم کیے تھے ان کی گواہی کو بھلادوں گا تاکہ تجھے کل قیامت میں کسی قسم کی ندامت نہ ہو۔

لیکن بس شرط یہ ہے کہ صدق دل سے توبہ کر اور اگر ہو سکے تو میرے سامنے کچھ ندامت کے آنسوؤں کے قطرے بھی گرادے اور نہیں تو کم سے کم رونے والوں کی صورت بنالے اور مجھے پکار میں تجھے ظلمت کے سمندر سے سے نکال کر ساحل تک پہنچا دوں گا۔

اے میرے بندے! اگر تو ساری زندگی اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں اور جسم کے تمام اعضاء شب و روز اور رات و دن میری نافرمانی پر خرچ کردے یہاں تک کہ تو نافرمانی کرتے کرتے تھک جائے کہ اب مزید تجھ سے کچھ نہ ہو سکے اور تو پھر میرے سامنے ندامت و شرمندگی کے ساتھ ایک آہ نکالے اور تائب ہو کر میری بارگاہ میں آئے تو بھی تو مجھے معاف کرنے والا پائے گا اپنی مراد میں محروم نہیں رہے گا۔

اور اگر ایسا نہیں تو پھر یاد رکھنا چاہیے کہ دونوں عاشق و معشوق اپنے انجامِ بد کے لیے تیار رہیں جس دن دونوں کے جنازے خاک میں ملیں گے اور توبہ کا موقعہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا پھر رونے دھونے اور حسرت و افسوس اور پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہے، لہٰذا اگلی سیکنڈ سے پہلے بندے کو اللہ کی طرف رجوع ہو کر سرخروئی اور کامیابی کے راستے پر چل پڑنا چاہیے وہ انسان عقل مند نہیں کہلاتا جو ہاتھ کو اس لیے آگ میں جلا رہا ہو کہ اس کے پاس بہت اچھا مرہم رکھا ہوا ہے یہی معاملہ اس شخص کا ہے جو توبہ کی امید پر گناہوں میں مبتلاء ہو۔

گو کہ جو شخص عشقِ مجازی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور اسے حرام لذتوں کا چسکا لگ جاتا ہے تو اس کے لیے اسے چھوڑنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس کی کشتی طوفانوں سے گزری ہوتی ہے اس کو ساحل کے لطف بھی خوب ملتے ہیں تو یہ بندہ اگر طبیعت پر خوب زور ڈال کر اور راہِ حق میں مجاہدے اٹھا کر پورے عزم اور قوت سے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اسی درجہ میں اسے اللہ کا قرب اور لذت بھی عطا کی جاتی ہے۔

نیکی کا اچھا اور برائی کا ناگوار لگنا ایمان کی نشانی ہے

اے خدا آپ کے کرم سے سب
کٹ گئے دن ہمارے مشکل کے
بعد مدت بزمِ ساقی میں
میر خوشیاں منا گلے مل کے

اے اللہ! آپ نے اپنے کرم سے منازل سلوک طے کرنے کی توفیق بخشی اور مختلف حالات میں ہمیں ثابت قدم رکھا اور آپ ہی کا کرم ہے کہ اب ہمیں ساحل کا مزہ مل رہا ہے اب اللہ تعالیٰ کے کرم سے ایسے حالات عطا ہوے ہیں کہ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں میسر ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں اعلان ہے ''کہ اللہ نے ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں رکھیں ہیں'' اور بھلائی اور نیکی کے حصول پر خوشیاں منانا مومن کی نشانی ہے جیسا کے ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے پوچھا کہ ایمان کی علامت کیا ہے ارشاد فرمایا کہ:

﴿عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَ سَاءَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، ص: ۱۶، قدیمی کتب خانہ)

یعنی جب نیکی سے دل خوش ہو اور برائی سے دل میں رنجیدگی ہو اور ناگواری ہو تو یہ ایمان کی نشانی ہے۔

میں کہاں اور شاعری میری
فیض ہوتے ہیں شیخ کامل کے
آج اخترؔ ہے مجمع ابرار
آؤ کرلیں ذرا دعا مل کے

فرماتے ہیں کہ میں کوئی فنی شاعر نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے شاعری سیکھی ہے بس اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر ان کی دعاؤں اور توجہات کی برکت سے دل کی حالت بدل گئی اور اس میں ایسا درد سا قائم ہو گیا کہ جس سے میں بیان درد پر مجبور ہو جاتا ہوں اور یہ بیانِ درد اشعار کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ بس میری شعر و شاعری کی یہ حقیقت ہے اس لیے یہ جو کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کا کرم اور شیخ کامل کا فیض ہے۔

اور اسی کی برکت ہے کہ آج اخترؔ کو مجمع ابرار نصیب ہے اور جہاں اللہ والے موجود ہوں تو دعاؤں کی قبولیت کی زیادہ امید ہو جاتی ہے۔ اس لیے مل کر کے دعا کر لی جائے اور اللہ سے اپنی مرادیں مانگ لی جائیں۔

یہ مستی دردِ دل کی اشرف مینائے عالم ہے

یہ مستی دردِ دل کی اشرف مینائے عالم ہے
ہر اک جام محبت اشرف صہبائے عالم ہے

بہت گلشن ہیں دنیا میں مگر سب ہیچ و فانی ہیں
یہ گلشن دردِ دل کا افضلِ گلہائے عالم ہے

بہت تحفے ملے دنیا میں لیکن کیا کہوں اے دِل
یہ تحفہ دردِ دل کا حاصلِ نعمائے عالم ہے

جسے دیکھو اسی کے سر میں ہے سودا کسی شے کا
مگر سودائے جاناں اکبرِ سودائے عالم ہے

بس اک ہنگامہ دردِ عشق حق کا گرم رہتا ہے
سوا اس کے ہمہ فانی ہر اک غوغائے عالم ہے

خوشی پر ان کی مرنا اور جینا ہی محبت ہے
نہ کچھ پروائے بدنامی نہ کچھ پروائے عالم ہے

ہے روح بندگی بس ان کی مرضی پر فدا ہونا
یہی مقصودِ ہستی ہے یہی منشائے عالم ہے

ہماری خاک اس لمحہ میں ہے رشکِ فلک اختؔر
وہی لمحہ جو میرا ذاکرِ مولائے عالم ہے

مشکل الفاظ کے معنی:۔مستی دردِ دل: اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کی لذت۔ اشرف: سب سے بہتر۔ مینائے عالم: دنیا جہاں کے شربت۔ جام محبت: محبت کا پیالہ۔ صہبائے عالم: صبح کے وقت پی جانے والی شراب۔ گلشن : باغ۔ ہیچ وفانی: حقیر اور ختم ہوجانے والے۔ گلہائے عالم: دنیا جہاں کے پھول۔ نعمائے عالم: دنیا جہاں کی نعمتیں۔ سودائے جاناں:۔۔۔۔۔۔ اکبر: بڑا۔ غوغائے عالم:۔۔۔۔۔۔ مقصودِ ہستی ، منشائے عالم: دنیا کا مقصد اصلی۔ فلک: آسمان۔

قلبِ عارف کی کیف و مستی کا عالم

یہ مستی دردِ دل کی اشرفِ مینائے عالم ہے
ہر اک جامِ محبت اشرفِ صہبائے عالم ہے

ارشاد فرمایا کہ اللہ کی محبت کی شراب کو پی کر جو مزہ اور لطف اور کیف و سرور حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کی شرابوں سے کہیں اونچا عمدہ اور صاف ستھرا ہے اور جس طرح انسان دنیا کی شراب پی کر بے ہوش ہو جاتا ہے اور بے ہودہ قسم کی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور گندگیوں میں جا کے منہ ڈالتا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ کی محبت کی شراب کے نشے میں وہ عظمتِ خداوندی اور عشقِ مولیٰ کے گیت گانے میں اور اللہ کی بڑائی اور کبریائی کی باتوں میں دیوانہ وار لگ جاتا ہے اور اُس کے تقاضوں پر بلاخوف لومۃ لائم جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ بالآخر وہ ایسا جامِ محبت پیتا ہے کہ خود بھی مست ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی مست کر دیتا ہے۔

گلشنِ دردِ دل کے پھولوں کی خوشبو کا اثر

بہت گلشن ہیں دنیا میں مگر سب ہیچ و فانی ہیں
یہ گلشن دردِ دل کا افضل گلہائے عالم ہے

دنیا میں زیب زینت اور خوبصورتی کی بہت سی جگہیں اور مختلف قسم کے پھولوں سے سجے ہوئے گلشن اور حسین خوبصورت پارک (Park) ہیں لیکن وہ سارے فانی اور ہیچ ہیں اور اہلِ حقیقت کی نگاہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ ان پر ایک دن خزاں آنے والی ہے اور وہ فنا ہو کر ختم ہو جائیں گے، مگر اللہ کی محبت و معرفت اور قرب و نزدیکی کے پھولوں سے سجے ہوئے گلشن پر کبھی خزاں نہیں آتی اور وہ کبھی فنا نہیں ہو گا۔

اس گلشن کا کمال یہ ہے کہ یہ بارہ مہینے میں ہر دن اور چوبیس گھنٹے میں ہر لمحہ شگفتہ اور معطر رہتا ہے۔ اور اس صاحبِ گلشن کے روح اور جسم کو بہار دیتا رہتا ہے۔ شاید آپ کو تعجب ہو لیکن ایک سچی حقیقت یہ ہے کہ اللہ والوں کو نیند میں بھی ایک عجیب لطف و لذت حاصل رہتی ہے جو اہلِ دنیا کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہی تو وجہ ہے کہ رات دن دنیا کے چکر میں پریشان رہنے والا اور حرام محبتوں میں مزے لینے والا چین و سکون کی نیند نہیں سو پاتا ہے۔

چنانچہ بعض بزرگوں کو احقر نے اس حال میں دیکھا کہ مختصر سوتے اور آرام فرماتے، مگر ایسی پُرسکون نیند میسر آتی کہ معمولی سے وقت میں دو دو دن کی تعب و تھکان دور ہو جاتی۔ چنانچہ ایک بار حضرت مسیح الامت حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر تھا تو دورانِ مجلس حضرت نے ارشاد فرمایا کہ دو تین دن سے باقاعدہ سویا نہیں ہوں۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے مسلسل مجالس اور خط و کتابت کا سلسلہ اور دوسرے اصلاحی کاموں میں مشغول تھے۔ بس تھوڑی دیر اونگھ آئی ہے، اللہ نے اسی میں پوری نیند کا آرام دے دیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اس گلشنِ دردِدل کے افضل و برتر ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ انسان دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اس دردِدل اور قربِ باری تعالیٰ کو اپنے ساتھ ساتھ بارگاہِ الٰہی میں لے کر جائے گا۔ اسی لیے قرآن میں قلبِ منیب اور قلبِ سلیم والے لوگوں کے لیے جنت میں داخلہ موعود ہے کیونکہ موت سے ظاہر دنیوی جسم تو خاک میں مل جاتا ہے، مگر روح باقی رہتی ہے اور اس عالم سے عالم ارواح میں منتقل ہوجاتی ہے تو جن اوصاف وکمالات اور انوار وتجلیات کے ساتھ یہاں سے نکلتی ہے، اسی طرح بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتی ہے۔ اسی لیے عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ اس گلشنِ دردِدل کو موت کے بعد بھی خزاں لاحق نہیں ہوتی۔

تحفۂ دردِدل کی کوئی مثال نہیں

بہت تحفے ملے دنیا میں لیکن کیا کہوں اے دل
یہ تحفہ دردِدل کا حاصلِ نعمائے عالم ہے

ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں بہت سی نعمتیں حاصل ہوئیں لیکن اللہ کی محبت کا مل جانا ان ساری نعمتوں میں سب سے بڑھ کر ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی بھی نعمتیں آپ کو حاصل ہوسکتی ہیں وہ سب مخلوق ہیں اور اپنے خونِ حسرت کو پی کر حرام خوشیوں کا خون کر کے جس دل میں اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ خالق ہیں تو ظاہر ہے خالق اور احکم الحاکمین اللہ کو پالینا مخلوق کو اس سے کیا نسبت ہوسکتی ہے اور قرآنِ کریم سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ سب سے بڑی نعمت مسلمان کے لیے اللہ کی رضاء اور اس کا قرب ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰٓىۙ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰىۚ﴾

(سورۃ اللیل آیت: ۲۰-۱۹)

ترجمہ: اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلہ دے مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے۔

(معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۷۵۸)

یعنی سب سے بڑی نعمت اپنے مولیٰ کی رضامندی کو چاہنا ہے۔ اس کو آپ دوسرے انداز میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی محبت اور معرفت کا پالینا گویا مقصدِ حیات کو پالینا ہے کیونکہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے کہ ہم اپنے اللہ کو پہچانیں اور ذکر وعبادت کے ذریعے اُس کا قرب حاصل کریں۔ جیسا کہ کسی مسافر کی سب سے بڑی خوشی کا سامان یہی ہوتا ہے کہ اُس نے جس مقصد کے لیے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس مقصد میں کامیاب ہوکر واپس لوٹ گیا۔

مولیٰ سے مولیٰ کو مانگنا سیکھئے

جسے دیکھو اُسی کے سر میں ہے سودا کسی شئے کا
مگر سودائے جاناں اکبرؔ سودائے عالم ہے

دنیا میں جتنے ذی شعور اہلِ عقل حضرات ہیں ان میں سے ہر ایک کسی مقصد کے حصول کی خاطر تگ ودو اور جدوجہد میں مصروفِ عمل ہیں اور ہر صبح اُٹھ کر اُس کو پانے کے لیے سعی وکوشش میں لگ جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک ہے:

﴿كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا اَوْمُوْبِقُهَا﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الطهارة، ص:۳۸، قديمي كتب خانه)

یعنی ہر انسان صبح کو اُٹھ کر اچھے یا بُرے کاموں میں لگ جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اس کی خاطر بیچنے والا ہوتا ہے۔ پس بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو جہنم سے آزاد کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض اپنی غلط حرکتوں کے نتیجے میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں کسی شئے کا سودا ہے اور اُس کو اسی کی دھن اور اسی کا دھیان ہر وقت لگا رہتا ہے اور وہ اس کے لیے اپنی ہر قسم کی بدنی قوت وصلاحیت اور دماغی فکر وسوچ خرچ کرتا ہے۔ بڑی تعداد تو لوگوں کی وہ ہے کہ جو دنیا کی چیزیں زمین وجائیداد واور مال ودولت جاہ ومنصب کے حصول کے لیے صبح سے شام تک اپنی ہر طرح کی صلاحیتوں کو خرچ کررہے ہیں اور اس کے لیے مختلف طرح کی اسکیم اور پلاننگ بناتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اسی پر خرچ کر کے زیرِ زمین پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن اللہ والے اور خدا کے سچے عاشق اپنے ہر لمحۂ حیات کو اور اپنی ہر قسم کی صلاحیتوں اور کاوشوں کو مولائے کائنات کو پانے میں خرچ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس جانِ جاناں کی خاطر اپنی جان دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ بالآخر جب وہ اپنے مولیٰ کو پالیتے ہیں۔ پھر کائنات کی ہر مخلوق اُن سے محبت کرنے لگتی ہے۔ آسمانوں میں ان کے چرچے ہونے لگتے ہیں، زمین وآسمان کا ہر ذرّہ انہیں اپنا دکھائی دیتا ہے۔

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اِک تو نہیں میرا تو کوئی شئے نہیں میری

تفصیلی روایت ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ وَاَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب العلم، ص:۳۲، قديمي كتب خانه)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہلِ دل علماء ربّانیین کے حق میں چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں دُعا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

مچھلیاں پانی میں ذرّے خاک میں برگ و شجر
نیک عالم کو دُعا دیتے ہیں ہر شام و سحر

اس کا راز واضح ہے کہ اللہ والوں کی باتوں اوران کی تعلیمات و ہدایات سے عالم میں خیر پھیلتی ہے۔لوگوں میں رُشد و ہدایت عام ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اس وقت معاشرے پر اللہ کی رحمتیں برستی ہیں جس کا نفع کائنات کی ہر مخلوق کو پہنچتا ہے تو پھر مخلوقات اُس کے لیے دُعا کرتی ہے۔

صاحبو! صحیح عقلمندی اور دانشمندی یہی ہے کہ ہمارے دل و دماغ میں ''سودائے جاناں'' ہو اور ہماری سعی و کوشش کا مقصد و محور خالقِ کائنات کو پالینا ہو۔اسی لیے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مشترک مشن اور غرضِ دعوت انسانوں کا رُخ مخلوق سے خالق کی طرف اور عباد سے ربّ العباد اور کائنات سے ربِّ کائنات کی طرف پھیرنا تھا۔ چنانچہ یہ دعوت **یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہ** ان سب کی مشترکہ دعوت تھی جس کا لُبِّ لباب اور نچوڑ یہی ہے کہ ایک اکیلے اللہ کی طرف اپنا رُخ پھیرلو۔

میرے دوستو! جب بندہ اللہ کو پالیتا ہے اور محبوب بارگاہِ ربّ العزت بن جاتا ہے تو پھر ہر قدم پر خود اللہ ربُّ العزت اُس کے حامی و ناصر بن جاتے ہیں۔ساری اُمت اگر اس کو نقصان پہنچانے پر اکھٹی ہوجائے تب بھی اس کا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے اُس کے حامی ہوتے ہیں۔جیسا کہ حدیثِ قدسی ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرّقاق، باب التواضع، ج: ۲، ص: ۹۶۳)

کہ جو شخص میرے مقبول بندے سے عداوت کرے میں اس کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں اور میں ان کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہوں تو بھلا ظاہر ہے جس کا خدا حامی بن کر کھڑا ہو جائے پھر اُس کے مدِّ مقابل کی تباہی و بربادی میں کیا شک ہے؟

چنانچہ بعض وہ لوگ جنہوں نے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کی شان میں گستاخیاں کی تھیں۔حضرت کی وفات کے بعد اس قدر خراب حالات سے دوچار ہوئے اور ایسی تباہی و بربادی کا شکار ہوئے جو ناقابلِ بیان ہے حتیٰ کہ بعضوں نے حضرت کی قبر پر جا کے معافی مانگی کہ حضرت معاف کرو،ہم مٹ رہے ہیں،تباہ ہو رہے ہیں۔

بجز عشق حق سب فانی و ہیچ ہے

بس اک ہنگامہ دردِ عشق حق کا گرم رہتا ہے
سوا اس کے ہمہ فانی ہر اک غوغائے عالم ہے

اللہ تعالیٰ کی محبت اوراس کے عشق کی گرمی سے دل میں اک جوش سا اُٹھتا رہتا ہے جو کہ اپنے دل پر اللہ کی راہ کے غم اُٹھانے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی غذائے اولیاء ہے۔اسی سے روح کو تازگی اور فرحت ملتی ہے اور عبد کا

رشتہ معبود سے اور مخلوق کا خالق سے قوی اور طاقت ور ہوتا ہے۔ یہی سرمایہ نجات اور سامانِ بخشش ہے۔ باقی سارا عالم اور اس کی لذتیں اور رونقیں دنیا کا محض ایک شور شرابہ اور ہاؤ ہو ہے۔ جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں یکدم انسان ان کو چھوڑ کر اپنے کو بالکل بے سہارا دیکھتا ہے اور سارے سہارے ٹوٹتے نظر آتے ہیں جبکہ حاملین دردِ دل اللہ کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں جو جیتے مرتے ہر گھڑی ساتھ ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا سہارا ٹوٹتا نہیں ہے لہٰذا تم اُسے مضبوطی سے پکڑو، چھوڑو نہیں۔ جیسے آپ کسی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور وہ رسی بھی مضبوط ہو تو پھر وہ رسّی ٹوٹے گی نہیں اور آپ کو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اللہ کی رسّی اور سہارے کو مضبوطی سے پکڑنا یہ ہے کہ ایک سانس بھی اُس کی حکم عدولی نہ کی جائے اور ایک لمحہ گناہ کر کے اللہ کو ناراض نہ کیا جائے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی نافرمانیوں میں لگے رہنے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ایمان پکا ہے۔ ہم اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔

عاشق صادق کے لیے محبوب کی مرضی ہی سب کچھ ہے

خوشی پر ان کی مرنا اور جینا ہی محبت ہے
نہ کچھ پروائے بدنامی نہ کچھ پروائے عالم ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾
(سورۃ الانعام، آیت: ۱۶۲)

ترجمہ: تو کہہ کہ میری نماز میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا سارے جہاں کا ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۵۰۶)

اس آیت کا سبق ہم سب کے لیے یہ ہے کہ ہماری موت وحیات ہماری خوشی اور غمی، ہمارا چلنا پھرنا غرض یہ کہ ہر قول و فعل اور فکر وسوچ کا رُخ صرف ایک اکیلے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کو راضی کرنا ہو۔ خواہ اس راہ میں ہمیں اپنوں اور غیروں کے طعنوں اور ملامتوں کا شکار ہونا پڑے۔ یہی انبیاء اولیاء کا خصوصی امتیازی وصف ہے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی اتنی قدر و منزلت ہے کہ جہاں قرآن کریم میں دین سے پھر جانے والے یعنی مرتدین کے مقابلے میں محبوبین باری تعالیٰ کا ذکر ہوا ہے تو اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس وصفِ خاص کو اپنے ایسے بندوں کے لیے ذکر فرمایا ہے کہ جو دین سے مرتد نہ ہوں گے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾
(سورۃ المائدۃ، آیت: ۵۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لائے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں، نرم دل ہیں مسلمانوں پر، زبردست ہیں کافروں پر، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے، یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے، اور اللہ کشائش والا ہے خبردار۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۶۶)

اس آیت کی تفسیر کے تحت حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اوصاف اپنے ایسے عاشقوں کے ذکر فرمائے جن کو مرتدین کے مقابلے میں لائے ہیں۔ اس سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ ان اوصاف کے حاملین ارتداد سے محفوظ رہیں گے کیونکہ پورے طور پر مقابلہ جبھی متحقق ہوگا جبکہ مقابل یعنی مرتدین کا وصفِ ارتداد ان میں نہ پایا جائے۔

یہی بات حضرت والا اس شعر میں ارشاد فرما رہے ہیں میری محبت کا معیار یہی ہے کہ اپنے اللہ کی خوشی پر ہی میرا مرنا اور جینا ہو چاہے سارا عالم میرا مخالف ہو، اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ملامت کی پرواہ کرنا دل کا نہایت خطرناک مرض ہے

صاحبو! ملامت کی پرواہ کرنا اور لوگوں کے طعنوں سے بچنے کی فکر میں رہنا دل کا ایسا خطرناک مرض ہے کہ بسا اوقات سعادت کو شقاوت میں بدل دیتا ہے اور کفر و شرک کو چھوڑ کر دائرۂ ایمان میں داخل ہونے سے مانع بن جاتا ہے۔ چنانچہ دورِ نبوت کا مشہور واقعہ ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا ابوطالب کو زندگی کے آخری لمحات میں دعوتِ ایمان پیش کی تو یہی طعن و تشنیع کا خوف ایمان سے رکاوٹ بن گیا۔ وہ کہنے لگے کہ بھتیجے! اگر مجھے میری قوم کی ملامت اور طعن زنی کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کلمے کو پڑھ کر تیری آنکھ کو ٹھنڈی کرتا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اسی ملامت کے خوف نے کتنی بڑی سعادت اور ابدی فوز و فلاح سے محروم رکھا۔ اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے رسومات کی پابندی کو اس پہلو سے بہت خطرناک قرار دیا کیونکہ رسومات کی پابندی کے پیچھے قوم و معاشرے کی طعن و تشنیع کا خوف کارفرما ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اگر ہم ایسا ایسا (خلافِ شرع) کام نہ کریں تو ناک کٹ جائے گی۔ لوگوں میں ذلیل ہو جائیں گے۔

اصلاحی مجالس کا انعقاد کس نیت سے ہونا چاہیے

اس ضمن میں اللہ نے دل میں بات ڈالی کہ اگر شیخ نے کسی کو خلافت و اجازت عطا کی اور اس کو حکم دیا کہ اپنے مقام پر اصلاحی مجالس کا آغاز کرو اور اُس نے حکم کے مطابق مجالس کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر ابتداءً یا تو کوئی خاص توجہ لوگوں کی طرف سے نہ ہوئی اور حاضرینِ مجلس کی تعداد بہت کم رہی یا گو کہ مجلس میں آنے والے حضرات تو متوجہ ہوئے، مگر مقامی بعض حضرات کی طرف سے مختلف نوع کے طنزیہ جملے سننے کو ملے اور بعضوں کی طرف سے مذاق بنانے والی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تو اس موقعہ پر بھی لوگوں کی ان باتوں کی طرف خیال کر کے اور ان کے

اس طرح کے جملوں کے خوف سے مجلس نہیں چھوڑنی چاہیے بلکہ اللہ کی رضاء کے لیے شیخ کے حکم کے تحت برابر اصلاحی مجلس کرتا رہے۔اس سلسلے میں استقامت اختیار کرے اور خود اپنی اصلاح پر نظر ہو اور محض رضاءِ الٰہی کے لیے اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ بالآخر ان شاء اللہ شُدہ شُدہ آپ کی مجالس سے خوب فیض جاری ہو جائے گا۔لوگوں میں اللہ کی طرف سے خود بخود مقبولیت ڈال دی جائے گی۔

حاصل یہ نکلا کہ اپنے خالق پر نظر ہو مخلوق کی طرف مثبت و منفی کسی نوع کا خیال نہ ہو کیونکہ ہمارا مقصود اللہ کے لیے دین پھیلانا ہے۔ چنانچہ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی کے ایک خلیفہ نے حضرت کو خط لکھا کہ حضرت آپ نے مجھے اصلاحی مجلس کرنے کے لیے فرمایا ہے، مگر یہاں لوگوں کو کوئی خاص توجہ نہیں ہے اور کبھی کوئی شریک نہیں ہوتا۔ کبھی بہت کم لوگ شریک ہوتے ہیں، اس لیے مجھے بڑا عجیب محسوس ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں مجلس چھوڑ دوں۔ اس پر حضرت رحمہ اللہ نے جواب تحریر فرمایا اوہو! افسوس ابھی تک مخلوق ہی پر نظر ہے جب شیخ کا حکم ہے تو خود اپنی اصلاح کے لیے اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے مجلس جاری رکھو۔ لوگ کم شریک ہوں تو بھی یہی نیت رہے اور لوگ زیادہ شریک ہوں تب بھی اسی نیت سے کام میں لگے رہو اور مخلوق سے نظر اُٹھالو۔

حکمِ شیخ کے سامنے خود رائی نہیں چاہیے

اس ضمن میں ہم سالکین طریقت کے لیے ایک اہم نکتہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس راہ میں خود رائی یعنی اپنی رائے پر چلنا بے حد مضر ہے۔ اگر اپنا شیخ و مرشد کسی کام کے لیے حکم دے تو پھر اس طرح کے خیالات دل میں لانا کہ میں اس قابل نہیں ہوں اور میں ایسا نہیں کر سکتا، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے، میرے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں، میں تو معمولی آدمی ہوں، اصلاحی مجالس قائم کرنا یا لوگوں کو بیعت کرنا جیسے دینی کاموں کے لیے میں اپنے اندر صلاحیت نہیں پاتا ہوں، یہ سب باتیں شیخ کے حکم دینے کے بعد خود رائی ہے۔ اس کو اپنے دل سے نکال کر کام میں لگ جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ احقر تقریباً سات سال سے حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کیے ہوئے اور جیسا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شیخ کے پاس کان بن کے رہنا چاہیے نہ کہ زبان۔ یعنی زیادہ بولنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ شیخ کی باتیں سنتا رہے اور اپنے اوپر تطبیق دیتا رہے۔ بندہ بھی چند سال تک اسی طرح حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوتا اور خاموشی سے وقت گزار کر چلا جاتا، لیکن بعض دوستوں کی طرف سے حضرت والا کو میرے متعلق یہ خبر دی گئی کہ حضرت والا ان سے اشعار پڑھوائیں اور اس کے بعد حضرت نے احقر کو حکم دیا تو فوراً وہی مذکورہ سب خیالات دل میں آنا شروع ہوئے، مگر پھر توفیقِ الٰہی سے حضرت تھانوی کی یہ بات دل میں آئی کہ شیخ کے حکم کے بعد اس طرح کے خیالات ''خود رائی'' پر مبنی ہیں، اس لیے اب کان بننے کی بجائے زبان بننا ہی اصولِ طریقت کے مطابق ہے۔ چنانچہ بندہ کھڑا ہو جاتا ہے اور حسبِ حکمِ شیخ اشعار پڑھ کر ان کی تشریح شروع کر دیتا جس

کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے احقر سے ''فیضانِ محبت'' کی تشریح کا یہ کام لیا۔ تقریباً تمام تشریحات کا یہ مجموعہ خود حضرت والا کے سامنے کھڑے ہوکر پڑھے جانے والے کلام کا ہے جو بلا شک محض توفیقِ الٰہی اور شیخ کی دعاؤں اور توجہ کا نتیجہ ہے۔

مرضی خداوندی کا حصول روح بندگی ہے

ہے روحِ بندگی بس ان کی مرضی پر فدا ہونا
یہی مقصودِ ہستی ہے یہی منشاءِ عالم ہے

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی کریں اور اللہ کو راضی کرنے والے تمام کام انجام دیں۔ اللہ کی ناراضگی سے بچیں، یہی کامل عبدیت ہے اور یہی مقصدِ تخلیقِ بنی آدم ہے جس کے لیے کل کائنات کا نظام قائم ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۹)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ:۱۷۰)

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾

(سورۃ الجاثیۃ، آیت: ۱۳)

ترجمہ: اور کام میں لگا دیا تمہارے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۷، صفحہ:۷۷۸)

یعنی خلاصہ یہ کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام نعمتیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ خود انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا، اس لیے صحیح بندہ وہی ہے جو ہر گھڑی اپنے اللہ کی مرضی پر فدا ہوتا رہے۔ گویا اُس نے اپنے دنیا میں آنے کے مقصد کو پورا کرلیا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے استعمال کا حق ادا کر دیا۔

ذکرِ مولیٰ میں گزرنے والا لمحہ سب سے قیمتی ہے

ہماری خاک اس لمحے میں ہے رشکِ فلک اختر
وہی لمحہ جو میرا ذاکرِ مولائے عالم ہے

حدیثِ قدسی ہے جس میں اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾

(شعب الایمان)

جو مجھے یاد کرتا ہے میں اُس کا ہمنشیں ہوتا ہوں۔ گویا اللہ کو یاد کرنے کے وقت میں بندے کا رشتہ اپنے اللہ سے اور مخلوق کا ربط خالق سے اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ خود خالق سبحانہ وتعالیٰ نے ذاکر کے ہمنشیں ہونے کی خبر دے دی تو پھر کیوں نہ یہ لمحاتِ حیات رشکِ افلاک ہو جائے۔ حتیٰ کہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کے سامنے ایسے بندوں کے تذکرے ہوتے ہیں اور اس سے بڑی سعادت مؤمن کے لیے کچھ نہیں ہوسکتی کہ اللہ اُس کا ہمنشیں ہو۔ لفظ ''خاک'' بول کر حضرت والا نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ یہ انسان اگر اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر زندگی گزارے گا تو بارگاہِ ربُّ العزت میں اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ یہ خاک کا ایک ڈھیر ہے اور بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ خاک سے بھی بدتر اور فروتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کے نتیجے میں اور اس کی نافرمانی اور حکم عدولی کی وجہ سے اس پر خدا کا غضب اور غصہ برستا ہے اور یہ مستحقِ عذاب وعقاب قرار پاتا ہے، اس لیے کافر قیامت کے دن یہ تمنا کرے گا کہ اے کاش! کہ میں مٹی ہوتا کیونکہ اس کو سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ اور خاک ومٹی پر خدا تعالیٰ کا غضب نہیں ہے۔

عروجِ بندگی

نہ گلوں سے مجھ کو مطلب نہ گلوں کے رنگ و بو سے
کسی اور سمت کو ہے مری زندگی کا دھارا
جو گرے ادھر زمیں پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اُٹھا فلک پر مری بندگی کا تارا

سبق دیتی ہے ہر دم اہلِ دل کی داستاں مجھ کو

جہاں دے کر ملا ہے دل میں وہ جانِ جہاں مجھ کو
بہت خونِ تمنّا سے مِلا سُلطانِ جاں مجھ کو

نظر آتا ہے اپنے دل کا جب زخمِ نہاں مجھ کو
تو اپنا درد خود کرتا ہے مجبورِ بیاں مجھ کو

بیانِ دردِ دل آساں نہیں ہے دوستو لیکن
سبق دیتی ہے ہر دم اہلِ دل کی داستاں مجھ کو

زبانِ عشق کی تاثیر اہل دل سے سُنتا ہوں
مگر مسحور کرتی ہے محبت بے زباں مجھ کو

قفس کی تیلیاں رنگین، دھوکہ دے نہیں سکتیں
کہ ہر دم مضطرب رکھتی ہے یادِ گلستاں مجھ کو

مری صحرا نوردی اور میری چاک دامانی
بہت مجبور کرتی ہے مری آہ و فغاں مجھ کو

کہاں تک ضبطِ غم ہو دوستو راہِ محبت میں
سُنانے دو تم اپنی بزم میں میرا بیاں مجھ کو

ملا کرتی ہے نسبت اہلِ نسبت ہی سے اے اختؔر
زباں سے ان کی ملتا ہے بیانِ دُرفشاں مجھ کو

مشکل الفاظ کے معنی: جانِ جہاں: سارے جہان کی جان، مراد اللہ تعالیٰ۔ سُلطانِ جاں: مراد اللہ تعالیٰ۔ زخمِ نہاں: اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھایا ہوا پوشیدہ زخم۔ مسحور: جادو جیسا اثر۔ محبت بے زباں: خاموش محبت۔ قفس: پنجرا مراد دنیا۔ رنگین تیلیاں: حرام لذات۔ مضطرب: بے چین۔ یادِ گلستاں: یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد۔ صحرا نوردی :......۔ چاک دامانی:......۔ بزم: محفل۔ نسبت: تعلق مع اللہ۔ اھلِ نسبت: اولیاء اللہ۔ بیانِ دُرفشاں :......۔

اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ پر لٹا دینا گویا کہ سارا جہان دیدینا ہے

جہاں دے کر ملا ہے دل میں وہ جانِ جہاں مجھ کو
بہت خونِ تمنا سے ملا سلطانِ جاں مجھ کو

جب بندہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردے تو اللہ تعالیٰ اس کو سارا جہان قربان کرنے کے برابر قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے وہ سب قربان کر کے یہ بات ثابت کردی کہ اگر سارا جہان بھی اس کے پاس ہوتا تو وہ اس کو بھی قربان کر دیتا خاص طور پر ہر انسان اپنے دل میں بہت سی تمنائیں رکھتا ہے اور گویا دل دل میں تمناؤں کا ایک عالم سجا ہوا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے اللہ کا سچا عاشق بندہ ان سب تمناؤں کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور بس ایک ہی آرزو لے کر دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور وہ یہ کہ مجھے میرا مولیٰ مل جائے اور میں اپنے اللہ کے قرب کو حاصل کرلوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تم میرے غیر کو دل سے نکالو تو پھر میں تمہیں مل جاؤں گا۔

بس اتنی بات ہے کہ بعضوں کو اس کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور اپنے بہت سے علائق دنیویہ پر ضرب کاری لگانی پڑتی ہے اور ان کے راہ خداوندی میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے ان کو راستہ سے ہٹانا پڑتا ہے تو ان کو اسی درجہ کا قرب نصیب ہوتا ہے جیسے بعض لوگ کہ جو عاشق مزاج ہوتے ہیں اور غیر اللہ کے عشق میں مبتلاء ہوتے ہیں اور غیر حق تعالیٰ کو دل دیے رہتے ہیں تو ان کو بہت خونِ تمنا کا دریا عبور کر کے ساحل ملتا ہے لیکن بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ کا ملنا اور اس کی قرب کے لذت کا حاصل ہونا لازمی اور یقینی ہے بس آدمی کو یہی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اپنا سب کچھ جو موجود ہو قربان کردے اور آئندہ کے لیے دل میں یہی نیت رکھے کہ راہِ خداوندی میں جو کچھ بھی رکاوٹ بنے میں اسے اللہ کی راہ میں لگا دوں گا۔

میرا بیان میری داستانِ محبت ہے

نظر آتا ہے اپنے دل کا جب زخم نہاں مجھ کو
تو اپنا درد خود کرتا ہے مجبور بیاں مجھ کو
بیانِ دردِ دل آسان نہیں ہے دوستو لیکن
سبق دیتی ہے ہر دم اہلِ دل کی داستاں مجھ کو

اس کا حاصل صرف اتنی بات ہے کہ درد والا جب ڈاکٹر کے سامنے اپنا درد اور بیماری بیان کرتا ہے تو اسے کسی تقریر کی مشق (Practice) کی ضرورت نہیں پڑتی بس اسی طرح جب اللہ اپنا دردِ محبت کسی کے دل میں عطا فرماتے ہیں تو اس کو ایسی زبان بھی دے دیتے ہیں جس سے وہ اس درد کو بیان کرے۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف

میں اس کا ذکر کیا گیا ہے جو اسی کتاب میں احقر نے دوسرے مقام پر ذکر کی ہے۔

بس اس شعر میں یہ سبق ملتا ہے کہ جو لوگ دین کی دعوت کا کام کرنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت پھیلانا چاہتے ہیں تو انہیں اس کے ساتھ ساتھ کہ وہ بیانات حفظ کریں اور ان کی (Practice) کریں یہ بات بھی لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دل میں اللہ کی محبت و عظمت پیدا کریں اور اس کے عشق کی آگ دل میں لگا لیں تو خود بخود بیان کرنے کی شکلیں سامنے آتی چلی جائیں گی اور ایسا بیان کا ملکہ اور قوت نصیب ہوگی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور علوم بھی ایسے عطا ہونگے کہ جن کا تصور محض کتابوں کو پڑھ کر ممکن نہیں ہے اور ایسے دل کو اللہ تعالیٰ وہ اسرار وحِکَم عطا فرماتے ہیں کہ جن کو عام عقلیں سمجھنے سے بھی قاصر ہوتی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا سمجھنا اسی شخص کے لیے آسان ہوتا ہے جس کا دل خود حامل درِ دِمحبت ہو اور ایسے خاصانِ خدا کے دل میں گذرنے والے بعض اونچے علوم بہت سے ظاہری عقل رکھنے والوں کے لیے باعثِ فتنہ بن جاتے ہیں کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ لغت کا ایک محدود دائرہ ہے اور اس کی تعبیرات انسان کی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق ہوتی ہیں اور اہل اللہ کے دل میں آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی محبت کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے تو لغت کچھ خاص معنی تو بتا سکتی ہے لیکن دل میں گزرنے والی صحیح کیفیات محبت کا بیان اس سے ممکن نہیں اس لیے حضرت والا نے یہ بات فرمائی ہے کہ بیانِ دردِ دل آسان نہیں ہے جیسا کہ حضرت والا کے ایک دوسرے شعر میں ہے ؎

جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پا سکتے نہیں دردِ نہانی
لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

محبت کی تاثیر بلا زبان جادو کی طرح ہے

زبان عشق کی تاثیر اہل دل سے سنتا ہوں
مگر مسحور کرتی ہے محبت بے زباں مجھ کو

یعنی اللہ کے عاشقوں کی زبان اور اہلِ دل کے بیانات کی تاثیر جو عشق و محبت خداوندی کے سلسلے میں ہو لوگوں کے دلوں کی کایا پلٹ کے رکھ دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہو جانا ان کی ذات پر ہر چیز فدا کرنے کی دعوت دے رہا ہے تو دلوں میں اللہ کی محبت کا آنا انسان کے مکمل دین پر آجانے کی جڑ ہے اس لیے اگر کسی کو آسانی کے ساتھ پورے دین پر لانا ہو تو اس کے دل کو محبت خداوندی کا چسکا لگا دو وہ خود بخود اس کو جادو کی طرح اللہ کی طرف کھینچ کر لے آئے گی اور پھر اس کی ہر ادا منشاء خداوندی کے

مطابق ہوگی کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے محبت ہو جاتی ہے اس کی اطاعت کا جذبہ بھی دل میں آ جاتا ہے اور اس کا کہنا مان کر چلنا آسان ہی نہیں بلکہ مزیدار ہو جاتا ہے اسی لیے اہل اللہ کے لیے دین کی ان باتوں پر عمل کرنا بالکل سہل اور آسان ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے لیے جن پر عمل کرنا بہت گراں اور دشوار ہو پھر ان کو تقریروں اور بیانات کی حاجت نہیں رہتی اور نہ ہی وہ زیادہ دلائل و براہین کے طلب گار رہتے ہیں بلکہ محبت خود انہیں اپنے محبوب پر فدا ہونے کی دعوت دیتی ہے یہی محبتِ بے زباں کا مسحور کرنا ہے۔

مومنِ صادق دنیا کی زیب وزینت سے دھوکہ نہیں کھا سکتا

قفس کی تیلیاں رنگین، دھوکہ دے نہیں سکتیں
کہ ہر دم مضطرب رکھتی ہے یادِ گلستاں مجھ کو
مری صحرانوردی اور میری چاک دامانی
بہت مجبور کرتی ہے میری آہ و فغاں مجھ کو

جو پرندہ گلستان میں اڑنے پھرنے والا ہو اور وہاں کی باغ و بہار کا شیدائی ہو اگر اسے کسی قفس اور پنجرے میں بند کر دیا جائے اور اس قفس کی تیلیاں بڑی رنگین اور خوبصورت ہوں لیکن اس کے باوجود جو پرندہ گلستاں کی باغ و بہار کا عادی ہو اس کو یہ رنگین تیلیاں دھوکے میں نہیں ڈال سکتیں وہ ہر دم مضطرب اور بے قرار رہے گا اور اسے یادِ گلستاں اس پنجرے میں بے چین رکھے گی گو کہ ظاہری طور پر وہ بہت خوبصورت اور نہایت عمدہ ہو۔

میرے دوستو! میری یہ بات یاد رکھئے جس اللہ والے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت آ جاتی ہے اور جس مومن کے قلب میں صحیح ایمان راسخ ہو جاتا ہے پھر اس کو یہ دنیا کی رنگ رلیاں اور ظاہری زیب و زینت کسی قیمت پر فریب نہیں دے سکتیں۔ وہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت میں ایسا مست رہتا ہے کہ یہ ظاہری زیب و زینت اسے ایسی ہی نظر آتی ہیں جس طرح اس پرندہ کے لیے قفس کی رنگین تیلیاں، اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ مصنوعی مزین گھر میرے رہنے کی جگہ نہیں ہے میرا امیدانِ زندگی اور میرے سکون کی جگہ وہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کی باتیں ہو رہی ہوں اور یادِ الٰہی کی باغ و بہار قائم ہو کیونکہ آخرت کی نعمتیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا مزہ اور اس کے قرب کی لذت و حلاوت کے سامنے یہ دنیا اور اس کی ساری باغ و بہار کچھ بھی نہیں اور بلا شک ایک سچے ایمان والے کے لیے دنیا جی لگانے کی جگہ نہیں ہے یہ تو ایک مسافر کی گذرگاہ ہے مومن کا دل تو ہر وقت اپنے اللہ تعالیٰ کی یادوں میں اٹکا رہتا ہے اسے اس کی فرصت ہی کہاں کہ وہ ان چیزوں کو دل دے اور لطف اندوز ہو اور ان میں ایسا منہمک ہو جائے کہ جیسا یہی مقصدِ حیات ہو مگر یہ بات جب ہی پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت کا چسکا دل کو لگا ہوا ہو اور اسی صورت میں اس طرح کے اشعار کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اسی لیے تو حضرات صحابہ کرام رضوان

اللہ علیہم اجمعین کتنے ہی مال دار رہے ہوں لیکن جب اللہ کے لیے جان دینے کی باری آتی تھی تو ایسا ہی لگتا تھا کہ جیسے یہ اس دنیا کے پنجرے سے نکل کر آخرت کے گلستاں کی طرف بھاگنا چاہتے ہیں۔

بالآخر ایسے اہل اللہ کے دل میں اللہ کے عشق و محبت کی آگ ایسی لگی ہوتی ہے اور ان کی زبانوں سے رات و دن ایسی آہ و فغاں نکلتی ہے کہ وہ اپنے ظاہر کو بنانے اور اس کا خیال رکھنے کی طرف اگر التفات کرنا بھی چاہیں تو وہ اندرونی محبت خداوندی کی حالت اور رات و دن گریہ و بکاہ اور آہ و فغاں ان کو ظاہری زیب و زینت سے دور رکھتی ہے اور انہیں اپنی صحرا نوردی اور اپنی چاک دامانی میں مست رکھتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی اس دل کی حالت کی وجہ سے دنیا کی طرف التفات نہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں بھی تو ان کی طبیعت اس طرف نہیں چلتی اس لیے حضرت والا نے یہ فرمایا کہ میری بے سروسامانی اور ظاہری پراگندہ حالی میری اسی آہ و فغاں کا ثمرہ ہے اور کیوں نہ ہو کہ جب انسان ظاہر کی فکر میں پڑتا ہے تو وہ باطن سے غافل ہو جاتا ہے اور جسے اللہ اپنے باطن کی فکر دیتے ہیں پھر اسے ظاہر کی پرواہ نہیں رہتی اور یہی خاصانِ خدا کی حالت اور ان کی عادت ہوتی ہے۔

نسبت، نسبت والوں ہی سے ملتی ہے

کہاں تک ضبطِ غم ہو دوستو راہِ محبت میں
سنانے دو تم اپنی بزم میں میرا بیاں مجھ کو
ملا کرتی ہے نسبت اہلِ نسبت ہی سے اے اختر
زباں سے ان کی ملتا ہے بیانِ دُرفشاں مجھ کو

جب اہل اللہ کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی نسبتِ خاصہ عطا ہوتی ہے اور محبتِ قویہ دل میں راسخ ہوتی ہے تو پھر خود بخود بیانِ دُرفشاں نصیب ہو جاتا ہے اس لیے ان کے ساتھ رہ کر، قلب میں اللہ کی محبت کے موتی آجاتے ہیں تو ایک عاشق کا بیان بس انہیں موتیوں کو بکھیرتا ہے اس لیے محبت والا جب بیان کرنے بیٹھتا ہے تو وہی اپنی محبت کی کہانی دہراتا ہے اور حضرت والا نے اس میں ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ فرما دیا کہ جس طرح سبزی سبزی والوں سے ملتی ہے، اور مٹھائی مٹھائی والوں سے اور کباب کباب والوں سے ملتا ہے اور سونا سونے والوں سے بس اسی طرح محبت، محبت والوں اور نسبت، نسبت والوں سے ملتی ہے۔ اور اس کا ماٰخذ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدِنٌ وَمَعْدِنُ التَّقْوٰى قُلُوْبُ الْعَارِفِيْنَ﴾

(الجامع الصغير لسيوطي، ج: ۲، ص: ۱۲۵)

یعنی ہر چیز کی ایک کان ہوتی ہے جو وہاں سے ملتی ہے اور تقویٰ کی کان اہل اللہ کے دل ہیں اگرچہ اس حدیث پر محدثین نے کلام کیا ہے لیکن بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا یونس مظاہری اس کا مضمون درست اور صحیح ہے

تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محبت، محبت والوں سے اور نسبت، نسبت والوں ہی سے حاصل ہوگی اسی کی طرف حضرت والا نے اس میں اشارہ فرمایا ہے۔

موت کا کارنامہ

قضا کے بعد ہوئی سرد نفس کی دنیا
نہ حُسن و عشق کے جھگڑے نہ مال و دولت کے

میری زندگی کا پہلا شعر

دردِ فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت پر اک ماہی بے آب ہے

دل پر آرزو رکھتے ہوئے بے آرزو رہنا

حقیقت میں تو رہنا ہے یہی باحق و ھو رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہ محوِ رنگ و بو رہنا

علامت جذبِ پنہاں کی یہی معلوم ہوتی ہے
تری خاطر مری ہر سانس وقفِ جستجو رہنا

یہ دعوت بے زباں بھی ہے مگر آتش فشاں بھی ہے
گریباں چاک ہوکر عشقِ حق میں کوبہ کو رہنا

حقیقت بندگی کی ہے یہی اے دوستو سن لو
دل پر آرزو رکھتے ہوئے بے آرزو رہنا

مرے احباب مجلس سے کوئی پوچھے مزہ اس کا
بشرحِ دردِ دل اختر کا محوِ گفتگو رہنا

مشکل الفاظ کے معنی: باحق و ھو: اللہ تعالیٰ کی خوشی اور اس کی یاد۔ محوِ رنگ و بو: دنیوی عیش میں مگن ہونا۔ جذبِ پنہاں: اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی طرف کھینچنا۔ وقفِ جستجو: تلاش میں لگے رہنا۔ آتش فشاں: بڑھکتی ہوئی آگ۔ کوبہ کو...... بے آرزو: خواہش کا پورا نہ کرنا۔ احباب مجلس: حاضرین مجلس۔ بشرحِ دردِ دل: اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کی شرح کرنا۔ محوِ گفتگو: بیان میں مگن۔

اصل حیات ذکر اللہ ہے

حقیقت میں تو رہنا ہے یہی باحق و ھو رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہ محوِ رنگ و بو رہنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ حقیقت میں جس زندگی کو زندگی کہا جاسکتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں گزرے اور یہی باحق و ہو رہنے کی حقیقت ہے۔ گو کہ ان کے اردگرد دنیا کی چیزیں اور ساز و سامان موجود ہو، مگر جس وقت اللہ کا جو حکم متوجہ ہو اس سے غافل نہیں رہتے اور تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اپنے وقت پر انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے تمام طاعات وعبادات کو مظاہرِ ذکرِ الٰہی قرار دیا ہے اور جملہ معاصی کو اللہ سے غفلت کے مظاہر ٹھہرایا ہے، اس لیے دین کے پانچوں شعبوں میں یعنی اعتقادات، عبادات، معاملات، معاشرت و اخلاق ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ کے جو احکام ہیں اُن پر پورے طور پر عمل پیرا ہونا کامل اسلام ہے۔ ایسا کرنے والا اللہ کا ذاکر ہے اور جو شخص اس سے غافل ہو گو کہ وہ زبان سے اللہ اللہ کرتا ہو تو وہ نہ پورے طور پر مسلمان ہے اور نہ ہی وہ حقیقت میں ذاکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہم سے یہی ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں پورے طور سے داخل ہو جاؤ، تمام دین کے شعبوں میں اللہ کے احکام کی پابندی کرو اور سر سے پیر تک تمام اعضاءِ بدن کو صرف اس کام کے لیے استعمال کرو جس کے لیے اللہ نے استعمال کا حکم دیا ہے۔ دنیا کی ظاہری زیب و زینت پر فریفتہ ہونا اور اس عالمِ صد رنگ و بو میں محو رہنا کوئی رہنے میں رہنا نہیں ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ذاکر کو زندہ اور غافل کو مردہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت والا کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

مجھے اس عالمِ صد رنگ و بو سے کیا مطلب
میری حیات تو بس آپ ہی کا اک غم ہے

اور حضرت والا نے کیا ہی خوب فرمایا ؎

نہ گلوں سے مجھ کو مطلب نہ گلوں کے رنگ و بو سے
کسی اور سمت کو ہے میری زندگی کا دھارا

حضرت خواجہ صاحب اسی کو یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

رنگ رلیوں پہ زمانہ کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو باندازِ بہار آئی ہے

دنیا کا رنگ و بو اور اس کی عیش و عشرت زیب و زینت بجز دھوکے کے اور کچھ نہیں۔ ہمارے محبوب جنابِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی اس حقیقت کو مختلف اسلوب اور مختلف انداز سے اُمت کو سمجھایا تاکہ اس کے دھوکے

سے اُمت کو بچایا جا سکے، اس لیے یہی کام آپ کے سچے وارثین، علماءِ ربانین انجام دیتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت کی مثالیں اور اس کی حکمتیں

اس میں یہ حکمت اور راز مخفی ہے کہ انسان فطری طور پر مختلف مزاج اور طبیعتوں پر پیدا ہوا ہے۔ اسی طبیعتوں کے اختلاف کے پیشِ نظر ایک ہی بات کو مختلف انداز سے پیش کرنا زیادہ مؤثر اور نافع اور اقرب الی القبول ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

﴿عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰی حَصِیْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِیْ جَسَدِہٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَکَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَا لِیْ وَ لِلدُّنْیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص: ۴۴۲)

مجھے دنیا سے اور دنیا کو مجھ سے کچھ تعلق نہیں ہے، میری مثال تو بس ایسی ہے جیسے ایک مسافر راستہ سے گزرتا ہے، کسی درخت کے نیچے تھوڑی دیر اُس کے سائے میں آرام کرے اور پھر فوراً وہاں سے آگے چلتا ہے۔ کسی مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَاللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ مَا سَقٰی کَافِرًا مِنْھَا شَرْبَۃً﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص: ۴۴۱)

اگر دنیا کی حیثیت اللہ کی نگاہ میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ کسی کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتے اور بعض مقامات پر دنیا کی حقیقت سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی اپنی انگلی کو سمندر میں ڈالے اور ڈال کر نکالے اور دیکھے کہ اس پر کتنا پانی لگ کر آیا ہے۔ پھر فرمایا کہ دنیا کی نسبت آخرت کے مقابلے میں حقیقت کے اعتبار سے اتنی بھی نہیں جتنی اس پانی کو سمندر سے نسبت ہے۔

ایک دوسری جگہ دنیا کی حقارت اور دنائت کو سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایک مردار ناقص الخلقت بکری کے بچے کے متعلق صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی اس کو ایک درہم میں لینے کو تیار ہوگا؟ صحابہ کرام نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ! نہیں کیونکہ یہ بالکل بے کار ہے۔ پھر اس مثال کو سامنے رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی حقیقت اس سے بھی زیادہ گئی گزری ہے اور اس کی حیثیت اللہ کی نگاہ میں اتنی بھی نہیں ہے۔

دنیا کے محبوب عنداللہ نہ ہونے کا ایک خاص راز

غور کرنے کی بات ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس دنیا کے رنگ و بو اور اس کی عیش و عشرت کی کوئی اہمیت اور وقعت ہوتی تو پھر یہ دنیا سب سے زیادہ اس طبقہ اور گروہ کو دی جاتی جس کو اللہ کے یہاں سب سے اونچا

مقام حاصل ہے۔ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور وہ انبیاء کی جماعت ہے اور ان کے بعد نائبینِ انبیاء ہیں حالانکہ سب اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ سیّدالانبیاء جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے عیش و عشرت سے بالکل نفرت تھی اور مختلف احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی دنیوی بے سروسامانی کا ذکر موجود ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان مشہور ہے کہ میں نے ایک چاند پھر دوسرا پھر تیسرا چاند مسلسل اس طرح دیکھا کہ میرے گھر میں چولہا نہیں جلا۔

غرض اس تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ بس اتنی بات ذکر کرنی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ کو دنیا کی لذتوں اور عشرتوں سے دور رکھا جانا اور خود ان کا دور رہنا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قدر و وقعت نہیں ہے، اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بیمار کو (بعض خاص بیماریوں استسقاء وغیرہ میں) پانی سے بچاتا ہے۔

اس سے ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے دنیا کے حالات تجارت و ملازمت، زراعت اور صنعت و حرفت حکومت اور بادشاہت وغیرہ میں ہماری تمنا کے مطابق سہولتیں اور راحتیں حاصل ہوتے رہنا اللہ کے یہاں ہمارے محبوب ہونے کی دلیل نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے اور خاص بندوں کے لیے ایسی صورتحال خاص طور پر پیدا فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کے ان گورکھ دھندوں، کھیل تماشوں اور بیکار لہو ولعب میں اپنی عمرِ عزیز ضائع نہ کرنے پائیں تو گو کہ وہ لوگ بظاہر ناموافق اور نامساعد حالات سے دوچار رہتے ہیں، مگر وہ قلبی طور پر ایمان میں قوی سے قوی تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے صبر وتقویٰ اور رضاء بالقضاء کی وجہ سے وہ محبوب عنداللہ ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نگاہوں میں بھی معزز و موقر اور ہر دلعزیز کر دیئے جاتے ہے۔ حسبِ تصریحِ حدیثِ شریف دنیا ان کے پاس ان کی ضرورت کے مطابق خود ذلیل ہو کر آ جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ کے نیک بندوں کی پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے۔ اُمت کے تمام علماء و صلحاء، اولیاء اتقیاء کے ساتھ آج تک اللہ تعالیٰ کی یہی سنت قائم رہی ہے۔

اسبابِ گناہ سے بچنا لازم ہے

دنیا کی ایسی مجلسیں اور محفلیں جہاں دل کو بہلانے والی ظاہری نقش ونگار کی چیزیں اور خوبصورت شکلیں اور پُر بہار مناظر اور پُر رونق حسین و دلکش مواقع ہوں، خاص طور پر آج کل کے زمانے میں شادیوں کی تقریب اور سمندروں کی تفریح کی جگہیں، اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور مختلف قسم کے گناہوں اور بیہودہ اور لغو قسم کے منکرات سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ کہیں فحش و بے حیائی عام ہوتی ہے، تو کہیں تصویر کشی جیسے گناہ ہوتے

ہیں، گانا بجانا اور میوزک وغیرہ خرافات کے ذریعے خوشی منائی جاتی ہے۔ایسی جگہوں میں اپنا دل بہلانے کے لیے جانا اور ایسی خوشیوں میں شریک ہونا یہی دنیا کے رنگ و بو میں محو ہونا ہے۔ خدا کا نیک اور سچا بندہ ایسی جگہوں میں جا کر اپنے دل کو خوش کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔

ہاں! اگر مجبوراً کسی خاص صلہ رحمی کے پیشِ نظر اس کی رعایت بھی کرنی پڑ جائے ورنہ بصورتِ عدم شرکت رشتہ داری کے ٹوٹنے کا خطرہ اور قرابت داری میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو تو پھر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی نصیحت کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا جائے کہ ایسی تقریب سے اوّل یا بعد میں اہلِ تقریب سے مل کر حقِ قرابت ادا کرلیا جائے۔ اگر کچھ ہدیہ تحائف پیش کرنے ہوں تو پیش کردیے جائیں تاکہ اس ناجائز تقریب میں شریک سے حفاظت بھی ہوجائے اور اپنے اللہ کی نافرمانی سے بھی بچا جاسکے۔ پھر دو ایک مرتبہ آمد و رفت رکھے تاکہ عدمِ شرکت کا اثر قرابت داروں کے دل سے کلّی طور پر زائل ہوجائے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کی محفل میں شرکت نہ کرکے اللہ کو تو راضی کرہی لیا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کو بھی اس سے راضی کردیتے ہیں۔اب اس کو دنیا و آخرت کی کامیابی ملتی ہے اور جو مخلوق کی رضا کی خاطر گناہوں کا ارتکاب کرکے خالق کو ناراض کردیتا ہے تو حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ اُس نے اللہ کو تو ناراض کردیا،عنقریب اللہ تعالیٰ لوگوں کو بھی اس سے ناراض کردیں گے اور وہ اس طرح کہ اُس کے بُرے اعمال لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آتے جاتے ہیں اور وہ لوگوں میں پھیلا دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ لوگ اس کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔

لفظِ ''محو'' کے استعمال کی وجہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ان آیتوں سے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہوجاتی ہے کہ اس دنیا کی طیبات اور حلال چیزیں ہماری خاطر بنائی گئی ہیں، اس لیے ان عمدہ اور لذیذ چیزوں کا استعمال اور اللہ کی حلال کی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہونا اچھی غذائیں کھانا، اچھے کپڑے پہننا، اچھی سواری پر سوار ہونا اور خوبصورت مکانات بنانا بلا شک وشبہ صحیح اور درست ہے اور جو اس میں کچھ قباحت سمجھے تو ایسا شخص غلو فی الدین کا مرتکب ہے۔ چنانچہ بہت سے اکابر اولیاء اُمت کے اس نوع کے واقعات ان کے حالات میں موجود ہیں۔امام مالک رحمہ اللہ خوب اعلیٰ درجے کے ہر دن نئے کپڑے پہنا کرتے تھے۔خود حضرت تھانوی اور حضرت گنگوہی وغیرہ اپنا کھانا پہننا بہت عمدہ رکھتے تھے، اس لیے کہ ہمیں ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرح ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی گئی کہ وہ اپنے اوپر بہت سی کھانے پینے کی حلال چیزوں کو حرام کردیتے تھے۔ چنانچہ دیو بند میں ہمارے پڑھنے کے زمانے میں ہندوؤں کے ایک مندر میں ہندو مذہب کا پیروکار ایک جوگی رہتا تھا جس نے دسیوں سال سے اپنے اوپر بولنے کو حرام کررکھا تھا جو کچھ کہنا ہوتا وہ لکھ کردیتا تھا۔

ایک دوسرا جوگی تھا جو ایک مدت سے زمین پر بیٹھا نہیں تھا۔ مستقل کھڑے ہونے کے مجاہدے میں مصروف تھا۔ اُس نے ایک رسّی لٹکا رکھی تھی اور اس پر اگر ضرورت پیش آتی تو لٹکتا تھا، زمین پر بیٹھتا نہیں تھا۔ اس نوع کے بے شمار واقعات ہیں لیکن میرا اصل بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا کی نعمتوں کا استعمال کرنا نہ تو بُرا ہے نہ زہد وتقویٰ کے خلاف ہے۔ البتہ اس میں محو اور مگن ہو جانا اور ایسا دھن اور دھیان کے ساتھ لگ جانا کہ ہر وقت دنیا کی چیزوں ہی کی حرص لگی رہے اور رات و دن انہی کے پیچھے دوڑتا رہے نہ تو حق و باطل کی تمیز رہے نہ جائز و ناجائز کا امتیاز رکھتا ہے۔ شب و روز اُسی کی فکر سوار ہے۔ اس طرح دنیا میں لگنا اپنے دین و ایمان اور دنیا و آخرت کو برباد کرنا ہے اور یہ بلاشک دینی طور پر ہلاک ہو جانے کے مترادف ہے ورنہ جب تک دنیا اور اس کی حلال نعمتیں ہمارے اردگرد تو موجود ہوں اور استعمال کرنے اور برتنے میں تو آتی ہوں لیکن دل سے باہر ہوں تو پھر یہ اس کشتی کی طرح ہے جس کے چلنے کے لیے پانی ضروری تو ہے لیکن اس کے اندر پانی کا داخلہ پوری کشتی اور اُس کے مسافروں کے لیے تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ جتنی روایتوں میں زہد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے سب کا خلاصہ اور مطلب یہی ہے۔ اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں ؂

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ہاں! مؤمن غیر مؤمن کا یہ فرق ہے کہ مؤمن بندہ جب ان نعمتوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کو محض اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ﴾

(سورۃ ابراھیم، آیت:۷)

ترجمہ: اور جب سنا دیا تمہارے رب نے، اگر احسان مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۲۱۷)

اور اس طرح شکر کے راستے سے ان نعمتوں کا استعمال بھی اُسے اللہ تعالیٰ کے قریب کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو نعمتیں عطا فرماتے ہیں تو یہ پسند فرماتے ہیں کہ اُس کے جسم پر اُن نعمتوں کے آثار ظاہر ہوں، اس لیے اللہ کی نعمتوں کا استعمال کرنا اور برتنا اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مزید قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔

تقویٰ کے تین درجات

علامت جذبِ پنہاں کی یہی معلوم ہوتی ہے
تری خاطر مری ہر سانس وقفِ جستجو رہنا

تفسیرِ بیضاوی میں قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے تقویٰ کے تین درجات بیان فرمائے ہیں نمبر ایک کفر وشرک سے بچنا۔ نمبر دو تمام معاصی اور گناہوں سے بچنا۔ نمبر تین ہر ایسی چیز سے بچنا جو اللہ کی یاد سے غافل کردے۔ اوّل درجہ عام، دوسرا خاص اور تیسرا اخصّ الخواص، مقرّبانِ بارگاہِ الٰہی کا ہے کہ وہ ایک سانس بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ محرمات ومکروہات سے بچتے اور دور رہتے ہیں بلکہ ایسے مباح کاموں میں بھی نہیں لگتے جو ان کو اللہ کی یاد سے غافل اور دور کردیں۔ وہ مخلوق میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، مگر اندرون سے واصل بحق رہتے ہیں۔ وہ اپنے ظاہری جسم کے اعتبار سے فرش پر ہوتے ہیں، مگر اپنے قلبی احوال وکیفیات کے اعتبار سے وہ عرش پر رہتے ہیں۔ دل دل میں وہ اللہ سے بات کرتے رہتے ہیں۔ اسی کو خواجہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں ؎

تم سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے
باتیں تو ہیں ہر دم مگر آواز نہیں ہے
ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اس ربطِ خفی سے
معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے

سچ تو یہ ہے کہ ان حقائق کا صحیح ادراک واحساس اسی بندے کو ہوتا ہے جو مقاماتِ قرب طے کرکے اللہ کو پالیتا ہے اور اپنے اپنے مجاہدات کے اعتبار سے ایسے لوگ عالمِ حضور ومشاہدے میں رہتے ہیں۔ اسی کو حضرت والا نے اس شعر میں ارشاد فرمایا کہ میری ہر سانس اللہ تعالیٰ کی تلاش وجستجو کے لیے وقف ہے اور یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا عمل نہ ہوجائے جس سے اللہ ناراض ہو اور یہ لوگ اپنے دنیا کے تمام معاملات کے حصول میں معمولی سعی اور جدوجہد کرنے کے بعد نتیجے کو اللہ کے حوالے کرکے بےفکر ہوجاتے ہیں۔ اپنے دلوں میں دنیا کی ہزاروں فکروں کو جمع نہیں کرتے۔ خواہ نتیجہ موافق ہو یا مخالف، بہرصورت وہ اس پر راضی رہتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی کہ سبب اختیار کرنے کے بعد نتیجے کے مخالف وموافق ہونے کے ساتھ دل کا اٹکا رہنا یہ توکل کے منافی ہے۔ یہی بات احقر نے حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ کے ملفوظات میں بھی دیکھی تو اگر کسبِ مال کا سبب اختیار کرکے دل کو نتیجے کے ساتھ اٹکائے رکھا سمجھ لو کہ اس کے دل کو مال کے حرص کی بیماری لگ گئی ہے۔ کامل بندہ مؤمن کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کو صرف ایک ہی فکر ہو۔ اگر نتیجہ اپنی تمنا کے مطابق ہو تو بھی اگر اس کے مخالف ہو تو اس صورت میں بھی سب کو اللہ

تعالیٰ کی طرف سے جانے۔ یہی اچھی بُری تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب ہے جو کہ ہمارے ایمان کا جز ہے۔

توفیقِ اطاعت جذبِ پنہاں کا اثر ہے

اس شعر میں حضرت والا نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان جو بھی نیکی کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ جذب کا اثر ہوتا ہے جس کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے:

﴿اَللّٰهُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۱۳)

ترجمہ: اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع لائے۔
(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۷۴)

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ﴾

(سورۃ المائدۃ، آیت: ۵۴)

ترجمہ: تو اللہ عنقریب لائے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۱۶۶)

اس آیت کے تحت علامہ سید محمود بغدادی رحمہ اللہ تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں فَاِنَّ مَحَبَّتَهُمْ اِیَّاهُ بِفَیْضَانِ مَحَبَّةِ رَبِّهٖ اِیَّاهُمْ یعنی بندوں کا اللہ سے محبت کرنا یہ خود اللہ کے بندوں سے محبت کرنے کا اثر ہے، اسی لیے یُحِبُّهُمْ کو مقدم کیا گیا یُحِبُّوْنَهٗ پر۔ گویا بندہ اللہ کی طرف جو بھی طاعت کا قدم بڑھاتا ہے اور اس کی رضاء جوئی کے لیے کوشش میں لگتا ہے گو کہ ظاہر میں وہ اُسے خود اپنی کوشش اور اپنی محنت محسوس ہوتی ہے، مگر بباطن اور در پردہ اللہ تعالیٰ کی شانِ جذب و کرم کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لیے علماء نے یہ بات لکھی ہے کہ سالک کو چاہیے کہ جتنے بھی مقامات، سلوک میں طے کرلے اور کیسے ہی مقامِ ولایت و تقویٰ پر پہنچ جائے لیکن اُسے اپنے مجاہدات کی طرف منسوب نہ کرے اور ایسا کرنا عین کفرانِ نعمت ہے۔ اس کے لیے حضرت والا کی کتابوں میں بحوالہ یہ عبارت موجود ہے فَاِنَّ بَعْضَ الْمُغْتَرِّیْنَ یَنْسِبُوْنَ کَمَالَاتِهِمْ اِلٰی مُجَاهَدَاتِهِمْ وَهٰذَا عَیْنُ الْکُفْرَانِ ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ خود ان مجاہدات کی توفیق ملنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو پھر اپنی طرف منسوب کرنے کی گنجائش کہاں۔ چنانچہ جہاں نسبتیں موجود ہیں وہ محض ظاہری طور پر بندے کے سبب بننے کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ وہی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ دل میں نیکی کرنے کا داعیہ ڈالتی ہے اور پھر اُسی کی توفیق کے سہارے بندے میں نیکی کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ اس نیکی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ جگر نے کہا ہے ؎

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب انسان کے دل میں کسی خیر اور نیکی کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو اس میں

تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اگر تم نے خیر کے اس داعیہ پر لبیک کہہ کر اسی وقت فوراً عمل کرلیا تو یہ ایسے ہے جیسے کوئی مہمان تمہارے گھر آیا اور تم نے اس کا اچھی طرح استقبال کیا، اس کو عزت سے اپنے یہاں رکھا، کھلایا پلایا تو وہ مہمان بار بار آئے گا ورنہ آنا بند ہوجائے گا۔ ٹھیک اسی طرح اس داعیۂ خیر کا معاملہ ہے کہ اگر اس کی طرف التفات نہ کیا جائے تو وہ پھر بار بار نہیں آتا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنی طرف جذب یعنی کھینچنے کے آثار اور شکلیں ہیں۔

عاشقِ صادق کی دعوتِ حال کی تاثیر

یہ دعوت بے زباں بھی ہے مگر آتش فشاں بھی ہے
گریباں چاک ہوکر عشقِ حق میں کوبہ کو رہنا

جب انسان اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنے کو مٹا ڈالتا ہے تو پھر وہ ظاہری زیب و زینت سے لاپرواہ ہوجاتا ہے اور اس کا دل اپنے ظاہر کو بنانے کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ ظاہر میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس رہتا ہے چاک گریبان ہونے سے دراصل اسی طرف اشارہ مقصود ہے گویا حق تعالیٰ کی محبت میں اس کا ایک دیوانہ وار انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے جس کو ظاہر کی فکر ہوتی ہے اس کا باطن خالی ہوتا ہے اور جسے باطن بنانے کی فکر ہو وہ ظاہر کی طرف سے پھر لاپرواہ ہوجاتا ہے اور جب انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے تب ہی اسے صحیح عشقِ حق کا مزہ آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے قلب میں اپنی محبت کا ایسا آتش فشاں عطا کرتے ہیں کہ وہ جدھر جاتا ہے اس سے عشقِ خداوندی کی آگ نکلتی ہے اگر وہ زبان سے بیان وتقریر کرے تب بھی اور اگر وہ خاموشی اختیار کرکے لوگوں کے درمیان موجود ہو تب بھی اس کا حال کسی بیان سے کم نہیں ہوتا جیسا حضرت والا کا ایک شعر ہے ؎

گو میرا وعدۂ بیان نہیں
مجھ سے ملنا بھی کیا بیان نہیں

ایک مقام پر اسی کو حضرت نے یوں فرمایا ؎

میری زبانِ حال بھی میرے بیاں سے کم نہیں
میرا سکوتِ عشق بھی میرے بیاں سے کم نہیں

اسی لیے ایسے حضرات اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنے سے بلا کسی تقریر اور بیان کے لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں اور چند ہی دن میں سالک صاحبِ نسبت بن جاتا ہے۔

آرزوؤں کو ختم کر دینا مطلوب نہیں

حقیقت بندگی کی ہے یہی اے دوستو سن لو
دل پر آرزو رکھتے ہوئے بے آرزو رہنا

یعنی سچا کامل بندہ وہی ہے جس کے دل میں سینکڑوں اور ہزاروں تمناؤں کا سمندر موجزن ہو اور طرح طرح کی آرزوئیں دل میں موجود ہوں لیکن جن آرزوؤں کی تکمیل اللہ تعالیٰ کی رضا میں مانع اور رکاوٹ بن رہی ہوں وہ ان کو پورا نہیں کرتا فوراً رک جاتا ہے اور گو کے اس کہ دل پر بہت زور پڑتا ہے مگر وہ اپنی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیتا ہے لیکن اپنے مولیٰ کو ناراض نہیں کرتا۔

اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیئے کہ جو لوگ اللہ والے ہوتے ہیں ان کے اندر سے یہ ساری تمنائیں اور آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کا فنا کرنا نہ مقصود ہے اور نہ بحیثیت بشر کے یہ ختم ہوسکتی ہیں بلکہ کمالِ عبدیت یہ ہے کہ ان کو اللہ کے حکم کے مطابق موڑ دے تمناؤں اور آرزوؤں کو ختم کرنے کی فکر میں نہ پڑے اس پر خواجہ صاحب کا شعر یاد آیا۔

بہت گو ولولے دل کے ہمیں مجبور کرتے ہیں
تری خاطر گلے کا گھونٹنا منظور کرتے ہیں

اس لیے اصل بات یہ ہے کہ ان آرزوؤں کے تقاضوں پر عمل نہ کیا جائے یہی سب سے بڑا مجاہدہ ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا راستہ طے ہوتا ہے بہت زیادہ اوراد و وظائف پڑھتے رہنا لیکن حرام آرزوؤں کو پورا کرنے سے نہ بچنا اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرت والا اگر کسی کے متعلق یہ سنے کہ اس سے بعض اوراد و وظائف میں کمی ہو رہی ہے اور معمولات پورے طور پر ادا نہیں ہو پا رہے ہیں تو حضرت کو اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا احساس اس وقت میں ہوتا ہے کہ جب یہ معلوم ہو کہ یہ گناہوں کے تقاضوں پر عمل کیے جا رہا ہے ورنہ معمولات کے متعلق تو حضرت یہاں تک فرما دیتے ہیں کہ جب طبیعت میں کچھ کمزوری محسوس ہو تو سو مرتبہ والے وظیفہ کو دس مرتبہ پڑھ لو اللہ تعالیٰ اس پر سو مرتبہ پڑھنے کا اجر دے دینگے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو دس گنا لکھتے ہیں ہاں البتہ بالکل چھوڑنا نہیں چاہیے۔ ورنہ اس سے بہت نقصان ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پھر وہ معمولات پورے طور پر چھوٹ جاتے ہیں۔

حضرت والا کی مجلس میں سامعین کا عجب کیف وسرور کا عالم

مرے احباب مجلس سے کوئی پوچھے مزہ اس کا
بشرحِ دردِ دل اختؔر کا محوِ گفتگو رہنا

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضرت والا کے قلب مبارک میں اپنا خاص دردِ محبت ودیعت فرمایا اور اس کے ساتھ ساتھ زبانِ ترجمانِ دردِ دل بھی عطا فرمائی تو حضرت ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب میں اس درد کی تشریح کرتا ہوں تو مجلس میں بیٹھنے والوں پر ایسا کیف وسرور اور لطف ومزہ طاری ہوتا ہے کہ جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور خود حضرت والا نے اس کے متعلق ایک شعر میں یوں ارشاد فرمایا ؎

اس درجہ حلاوت ہے میرے طرزِ بیاں میں
خود میری زباں اپنی زباں چوس رہی ہے

اور اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھی جوانی کے زمانے میں ایسا بھی ہوا ہے کہ حضرت والا نے رات کو بیان شروع کیا اور پوری رات بیان چلتا رہا جب فجر کی اذان ہوئی تو اچانک لوگ متوجہ ہوئے کہ صبح ہوچکی ہے ظاہر ہے کہ وہ جس خاص لطف وحلاوت کو محسوس کررہے تھے اسی کی وجہ سے وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا ورنہ فطری طور پر طبیعتیں زیادہ دیر دینی بیان سننے سے اکتاتی ہیں

اور ایسی مجالس جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو اس کی بزرگی اور بڑائی اور عظمت ومحبت کی باتیں بیان ہورہی ہوں اس میں سکون اور اطمینان یہ ایک حدیثِ صحیح سے ثابت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص سکینہ نازل ہوتا ہے اور ملائکہ ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ان کو ہر طرف سے ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا اپنے یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔ اس حدیث کے تحت جہاں ذکر وتسبیح کی بات ہے وہیں قرآن وحدیث پر مشتمل دروس اور بیانات یہ بھی اس میں شامل ہیں اس لیے حضرت والا کا یہ فرمانا کہ میرے احباب مجلس کو اس وقت میں بہت لطف آتا ہے جب میں اللہ تعالیٰ کی محبت ان کے سامنے پیش کرتا ہوں، یہ بالکل واضح ہے۔

آہِ صحرا ہو مبارک تیرے دیوانوں کو

ہم نے دیکھا ہے ترے چاک گریبانوں کو
آتشِ غم سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کو

ہم نے دیکھا ہے ترے سوختہ سامانوں کو
سوزشِ غم سے تڑپتے ہوئے پروانوں کو

ہم فدا کرنے کو ہیں دولتِ کونین ابھی
تو نے بخشا ہے جو غم ان پھٹے دامانوں کو

خلوتِ غارِ حرا سے ہے طلوعِ خورشید
کیا سمجھتے ہو تم اے دوستو ویرانوں کو

اہلِ دنیا تو چمن میں ہیں گلوں کے بندے
ان کے دیوانے تو جاتے ہیں بیابانوں کو

اہلِ دنیا کو ہے راس آئی یہ فانی دنیا
نعرۂ عشق و محبت ترے مستانوں کو

حسنِ فانی بتاں پر مرے کرگس لیکن
آہِ صحرا ہو مبارک ترے دیوانوں کو

ہم نے دیوانوں سے سیکھی ہے محبت اختؔر
ہائے یہ درد کہاں ملتا ہے فرزانوں کو

مشکل الفاظ کے معنی:۔**چاک گریبانوں**: اللہ تعالیٰ کے عشق میں گریبان کھلا رکھنا۔ **آتشِ غم**: یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ ۔**چھلکتے ہوئے**:کسی چیز کا بھر جانا۔ **پیمانوں**: مراد دِل ہے۔**سوختہ سامانوں**:......۔**سوزشِ غم**:......۔**پروانوں**:مراد جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ میں اپنے کو جلا دے۔**دولتِ کونین**: دونوں جہاں کی دولت۔**پھٹے دامانوں**: مراد اللہ والے ہیں۔**خلوت** : تنہائی۔ **خورشید**: سورج۔**ان کے دیوانے** :یعنی اللہ تعالیٰ کے عاشق۔**بیابانوں**: ویرانہ۔ **کرگس**: گدھ۔**فرزانوں**: عقل کے پیچھے چلنے والے۔

چھلکتے ہوئے پیمانوں کی قیمت

ہم نے دیکھا ہے ترے چاک گریبانوں کو
آتشِ غم سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کو

دوستو! اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے جب مومن بندہ بارگاہِ الٰہی میں آہ وزاری کرتا ہے اور ندامت کی وجہ سے خوف وخشیت کے آنسو بہاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور یہ مومن کا ایسا وصف ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا مانگی ہے۔ چنانچہ آپ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی منقول ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ ھَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدُّمُوْعِ مِنْ خَشْیَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَکُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَّ الْاَضْرَاسُ جَمْرًا﴾

(الجامع الصغیر للسیوطی، ج:۱، ص:۵۹)

(وفی روایۃ تسقیان القلب بذروف الدمع کما فی المناجات المقبول)

اے اللہ! مجھے ایسی دو آنکھیں عطا فرما جو خوب آنسو بہانے والی ہوں صرف آنسو بہانے والی آنکھوں کی دعا نہیں مانگی گئی بلکہ مبالغہ کے طور پر بہت زیادہ آنسو بہانے والی آنکھیں کیونکہ ھطا لۃ مبالغے کا صیغہ ہے۔ چنانچہ جب ہم احادیث شریفہ میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کے سلسلے میں روایات کھول کے دیکھتے ہیں تو ان آنسوؤں کی فضیلت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر دنیا کے سارے سمندروں کا پانی کسی جہنمی کی آگ کو بجھانے کے لیے کام میں لایا جائے تو وہ آگ نہ بجھ سکے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرنے والے آنسوؤں کا ایک قطرہ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کردیتا ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان آنسوؤں کے قطروں کو شہید کے خون کے قطروں کے برابر قرار دیا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ دو قطرے بارگاہِ الٰہی میں بہت پسندیدہ ہیں نمبر۱...... اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہنے والے خون کا قطرہ نمبر۲...... اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرنے والے آنسوؤں کا قطرہ۔

مبارک ہیں وہ لوگ جن کو ایسی آنکھیں عطا ہوئی ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف میں آنسو بہاتی ہیں اور کتنے قابل حسرت اور افسوس ہیں وہ شقاوتِ قلبی والے لوگ جو اس نعمت وسعادت سے محروم رہے اور دنیا کی کسی لیلیٰ اور محبوب ومحبوبہ کے چکروں میں پڑ کر شقاوتِ قلبی کا شکار ہوگئے اور گو کہ ان کو غمِ فراقِ لیلیٰ میں رونا اور تڑپنا میسر ہوا اور اپنے بستروں پر ان کی جدائیگی کے صدمے میں کروٹیں بدل بدل کر رات گذارنے کی زحمت اٹھانی پڑی مگر اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کی سعادت میسر نہ ہوئی اور دراصل غیر کو دل دینے کی یہ سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رونا میسر نہیں ہوتا کیونکہ اس کے دل کو سخت کردیا جاتا ہے اور قلب کی حالت اتنی خراب ہوجاتی ہے کہ ایک موقعہ پر دارالعلوم آزادول جنوبی افریقہ میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اس گناہ یعنی عشق مجازی کی نحوست ولعنت کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس گناہ کے نتیجے میں دل کا قبلہ بدل جاتا ہے کہ

انسان نماز میں کھڑا ہوا ہے مگر اس کا دل اپنے محبوب اور محبوبہ کے ارد گرد چکر لگا تا رہتا ہے اور دل دل میں اس کے پاس پہنچ کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہے اور نماز میں دل نہیں لگتا نہ مناجات اور دعاؤں میں لذت میسر آتی ہے ذکر و تلاوت طبیعت پر دشوار ہوتی ہے نیکی کی طرف دل مائل نہیں ہوتا غرض کہ اس کے خود دنیا میں اس قدر نقصانات ہیں کہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہی اس کو دوزخ کا عذاب محسوس ہونے لگتا ہے اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں جیتا ہے اس لیے جو لوگ اس طرح کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں کو خشک کر دیتے ہیں اور یہ آنکھوں کا خشک کر دیا جانا بطور عذاب کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو یہ نعمت گریۂ وزاری میسر ہوتی ہے اسی کے نتیجے میں جو لوگ ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور چھلکتے ہوئے پیمانوں کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کی برکت سے انہیں بھی یہ نعمت عطا کر دی جاتی ہے جیسا کے ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کی خدمت میں ایک طویل مدت تک رہ کر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔

اولیاء اللہ کی استغراقی حالت کا راز

ہم نے دیکھا ہے ترے سوختہ سامانوں کو
سوزشِ غم سے تڑپتے ہوئے پروانوں کو

تمام اللہ والوں کی یہ صفت، مشترک صفت ہے کہ وہ ظاہری ٹپ ٹاپ اور زیب وزینت میں اپنی زندگی کے قیمتی لحات ضائع نہیں کرتے ظاہری بے سروسامانی اور چاک گریبانی کے عالم میں رہتے ہوئے اصل دولتِ دوجہاں سے مالا مال رہتے ہیں اور دریائے محبتِ خداوندی میں ایسے غرق رہتے ہیں کہ کبھی کبھی اس استغراقی کیفیت میں اپنے نام تک کو بھول جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالغنی پھول پوری رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ ان کا خادم کسی چیز پر ان سے دستخط کرانے کے لئے حاضر ہوا تو دیر تک حضرت اپنا نام سوچتے رہے اور پھر اخیر میں اپنے خادم سے پوچھا کہ میرا نام کیا ہے اس پر خادم نے حضرت کا نام بتایا تو پھر دستخط فرمائے۔

اور یہ کمال استغراق خود نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ سے ثابت ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا مَنْ اَنْتِ؟ تو کون ہے حضرت عائشہ نے اپنا نام بتایا کہ میں عائشہ ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا من عائشة؟ فرمایا بنت ابی بکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سوال کیا من ابو بکر؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا ابن ابی قحافة۔

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گذر ہوا اور حضرت عمر نے سلام کیا مگر حضرت عثمان نے جواب نہیں دیا حضرت عمر اس کی شکایت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے حضرت عثمان نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا ہے۔ چنانچہ وہاں دونوں حضرات جمع ہوئے اور

حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان سے یہ سوال کیا کہ آپ نے حضرت عمر کے سلام کا جواب نہیں دیا تو حضرت عثمان نے عرض کیا کہ انہوں نے مجھے سلام نہیں کیا ہے غرض اپنی جگہ پر دونوں سچے تھے مگر سلام کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی دنیا سے رحلت فرما جانے سے پیدا ہونے والے صدمے اور غم میں مبتلاء تھے اور ایک گہری سوچ اور فکر میں مستغرق تھے۔

میرا منشاء ان واقعات کو ذکر کرنے سے یہ ہے کہ اللہ والے اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا کسی اور اہم دینی فکر میں کبھی کبھی اتنے مستغرق اور ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں اس وقت بجز مشاہدۂ حق کے نہ تو کچھ نظر آتا اور نہ ہی کچھ سنائی دیتا ہے اور یہ بات جب ہی حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے دل سے غیرِ حق تعالیٰ کو بالکل صاف کر چکے ہوں اور ظاہری سامانِ عیش و عشرت کے لحاظ سے بالکل بے سروسامانی کی حالت میں ہوں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم اپنے سینے میں لئے ہوئے اللہ تعالیٰ پر فدا ہو رہے ہوں اور جس طرح شمع کی خاطر پروانہ جان دینے کو تیار رہتا ہے وہ بھی اسی طرح پروانہ وار اپنے اللہ تعالیٰ پر سب کچھ لٹانے کو تیار ہوں اور خوش قسمت ہے وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ کے ایسے دیوانوں کی صحبت میسر آ جائے اسی کو حضرت والا فرماتے ہیں کہ بحمد اللہ مجھے ایسے سوختہ جانوں اور اللہ تعالیٰ کے پروانوں کی صحبت و خدمت میسر ہوئی اور ان کی دعائیں اور توجہات حاصل ہوئیں۔

دولتِ کونین بھی خدا تعالیٰ کی قیمت نہیں

ہم فدا کرنے کو ہیں دولتِ کونین ابھی
تو نے بخشا ہے جو غم ان پھٹے دامانوں کو

یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب بندے کو حاصل ہو جائے اور اس کی محبت نصیب ہو جائے یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ مل جائے تو اس کے بدلے دونوں جہاں بھی فدا کر دیئے جائیں تو وہ کم ہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ بندے کا اپنے مولیٰ پر دونوں جہان فدا کر دینا بھی اس کے حق کی ادائیگی کے لیے ممکن نہیں اگرچہ ہمارے پاس دونوں جہاں سے بڑھ کر فدا کرنے کو کچھ نہیں ہے اس لئے کہ مخلوق کو خالق سے کیا نسبت ہو سکتی ہے کسی کو خالقِ دونوں جہان مل جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہر نعمت حاصل ہو گئی اور اس کی ہر تمنا پوری ہو گئی جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس لئے جو بندہ اللہ پر دونوں جہان فدا کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنا کچھ بھی اللہ پر فدا نہیں کر رہا ہے کیونکہ اس کی جان و مال اس کے دولت و خزانے اس کی تمام نعمتیں اور راحتیں خدا تعالیٰ ہی کی تو عطا ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا بے انتہا کرم ہے کہ اس کریم نے خود یہ جان و مال ہمیں دے کر جنت کے بدلے میں ہم

سے ان کو خرید لیا ہے اور فرمادیا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۱۱۱)

ترجمہ: اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔

(معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۴۶۵)

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ آپ نے کسی کے پاس کوئی کتاب امانت کے طور پر رکھی اور پھر چند دن کے بعد آپ اس سے آکر اس کتاب کو سو روپے میں خرید رہے ہیں حالانکہ وہ کتاب آپ کی نہیں ہے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ اس خریدار کی طرف سے فضل کا معاملہ ہے اور اس انداز سے آپ کو سو روپے دینا مقصود ہے بس یہی معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ساتھ فرمایا کہ جان و مال خود عطاءِ الٰہی اور اللہ کی دی ہوئی امانت ہے اور پھر اللہ نے ہم سے خرید کر جنت کا وعدہ فرمالیا تو خلاصہ یہ نکلا کہ اس بہانے اللہ ہم کو جنت دینا چاہتے ہیں اسی لیے مولانا رومیؒ نے ارشاد فرمایا کہ اے اللہ دونوں جہان فدا کر کے بھی آپ ملتے ہوں تو یہ آپ کی قیمت نہیں ہے آپ سستے معلوم ہوتے ہیں۔

ایک قیمتی نصیحت

صاحبو! ہمارا مہربان اللہ کس قدر رحیم و کریم ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ پر وہ سب کچھ فدا کردے جس کا وہ مالک ہے جان و مال اور دولت و منصب ظاہری عزت و آبرو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایسا اجر لکھتے ہیں کہ گویا اس نے دونوں جہان کی ساری نعمتیں اللہ پر قربان کردیں بس دل میں اتنی تڑپ اور لگن رہے اور یہ جذبہ وولولہ موجود ہو کہ اگر مجھے ساری کائنات کی بادشاہت بھی ملجائے اور ہر طرح کی نعمت و راحت میسر آجائے اور بڑی اونچی بادشاہت و حکومت حاصل ہوجائے پھر اللہ کے کسی حکم کی خاطر اس کو قربان کرنا پڑے تو میں اسی طرح قربان کرڈالوں گا جیسا کہ معمولی مال و دولت کو قربان کررہا ہوں تو پھر اسے اللہ تعالیٰ ویسا ہی اجر دیتے ہیں اس لئے ہم سب کے لئے اس میں یہ عظیم الشان نصیحت ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہو ہم اس کو اللہ پر فدا کردیں اور یہ تمنا رکھیں کہ اور بھی جو کچھ حاصل ہوگا اور حکمِ الٰہی کا تقاضہ سامنے آئے گا تو اسے بھی بلا تأمل راہِ خداوندی میں صرف کردینگے تو پھر ہمارا شمار باعتبار اجر و ثواب مقام اور مرتبے کے دولتِ کونین فدا کرنے والوں میں ہوگا۔

یہی تو وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو مال غزوۂ تبوک کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش فرمایا تھا وہ اس مال سے کم تھا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پیش کیا تھا مگر کیا وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام اور مرتبہ زیادہ قرار پایا؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنا سب کچھ پیش کردیا تھا جو ان کے پاس تھا اور جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے اپنے گھر میں کیا چھوڑا تو جواب عرض کیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول کو گھر میں چھوڑا ہے جب کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

نے جواب عرض کیا کہ آدھا مال گھر میں چھوڑا اور آدھا لے کر آیا ہوں لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ اگرچہ مقدار اور کمیت میں قلیل ہو مگر اللہ پر سب کچھ قربان کر دینا قربانی و جانثاری اور اخلاص وللہیت میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

خلوتِ غارِ حرا سے ہے طلوعِ خورشید
کیا سمجھتے ہو تم اے دوستو ویرانوں کو
اہلِ دنیا تو چمن میں ہیں گلوں کے بندے
ان کے دیوانے تو جاتے ہیں بیابانوں کو

ان اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم نے بہت عظیم الشان نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ابتدا کا زمانہ تھا کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کئی کئی دنوں کے لئے غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور آبادی وبستی سے دور پہنچ کر پہاڑ کی چوٹی پر ایک ویرانے میں خلوت ویکسوئی اختیار فرماتے تھے وہیں سے آفتاب و ماہتابِ نبوت طلوع ہوا۔

اسی لیے اہل اللہ اور خاصانِ خدا عام طور پر دنیا کی ظاہری زیب و زینت اور چمک دمک اور رنگ و رونق لیے ہوئے مقامات اور سامانِ عیش وعشرت سے مزین بنگلے اور محلات کو پسند نہیں فرماتے بلکہ ایسی جگہیں کہ جو ظاہری طور پر ویران و بیابان ہوں لیکن اللہ کے ذکر اور یادوں سے آباد ہوں اور علائق دنیویہ سے خالی ہوں ان میں رہنا پسند فرماتے ہیں۔ کیونکہ وہ جگہیں اللہ کے ذکر و تسبیح اور تلاوت ومناجات توبہ واستغفار، گریہ وزاری، آہ وفغاں کی برکت سے رشکِ گلشن ہوجاتی ہیں چنانچہ ہمارے اکابر بزرگانِ دین ہمیشہ سیدھی سادی زندگی کو پسند فرماتے تھے مگران بوریانشین اولیاء اللہ کی عزت وعظمت بارگاہ رب العزت میں اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دنیا کے اصحابِ دولت وثروت بڑی تواضع اور عاجزی نیازمندی کے ساتھ ان کے پاس حاضر ہوتے اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے جیسا کہ خود آج کل بھی اہلِ حق مشائخ کی اللہ کی طرف سے ایسی ہی قدر ومنزلت دیکھنے میں آتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ان باتوں سے کوئی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوجائے کہ اللہ والا وہی ہوتا ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر جنگل و بیابان کا رخ کرے اور صحرا اور پہاڑوں کو اپنا مسکن بنالے اور اس کے خلاف بستی وآبادی قصبوں اور شہروں میں رہنے کو للہیت اور بزرگی کے خلاف جانے دراصل حضرت والا کا منشاء ان اشعار میں یہ نہیں ہے بلکہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ اہل اللہ کے قلوب دنیا کے چمن اور گلشن اور گلستان و بوستاں کے ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہوتے اس لیے اللہ کے ساتھ تعلق میں اور ادائے بندگی پیش کرنے میں ان چیزوں کا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ان کے قلوب ان چیزوں سے مانوس ہوتے ہیں نہ انہیں اس طرف رغبت ہوتی ہے جیسا کہ اہل دنیا انہی چیزوں

کے ساتھ دلوں کی وابستگی کی وجہ سے وابستہ اور جڑے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے جو اولیاء اللہ عمدہ مکانات اور اعلیٰ درجے کے محلوں میں رہتے ہوں ان سے بدظن نہیں ہونا چاہیئے اس لیے کہ ان کا دل ان کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک بزرگ کے یہاں کوئی زیارت کرنے کے لیے حاضر ہوا جب اس نے ان کے حالات دیکھے اور ظاہری طور پر آسائش والے انداز نظر آئے تو وہ ان سے بدظن ہوگئے اور باہر ان کے دروازے پر شعر لکھا ؎

نہ مرد انست کہ دنیا دوست دارد

جب ان بزرگ کو خادم کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے باہر دروازے پر یہ شعر لکھا ہے تو انہوں نے خادم سے فرمایا کہ اس کے نیچے یہ مصرعہ لکھ دو ؎

اگر دارد برائے دوست دارد

جس کا حاصل یہ ہوا کہ بے شک یہ تو صحیح ہے کہ جو رجال اللہ اور مردانِ خدا ہوتے ہیں وہ دنیا کو دوست نہیں رکھتے لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہے کہ اگر وہ دنیا کو رکھتے ہیں تو دوست کے لئے رکھتے ہیں اپنے نفس کی حرص و ہوا کے تحت اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں رکھتے نہ ہی لطف اندوزی، عیش پسندی ان کا مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ اہلِ دنیا کی نگاہوں میں اپنی عزت و وقعت تلاش کرتے ہیں۔

دنیا پر راضی و مطمئن ہوجانا مومن کی شان نہیں

اہلِ دنیا کو ہے راس آئی یہ فانی دنیا
نعرۂ عشق و محبت ترے مستانوں کو

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مشرکوں کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی ہے کے وہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی پر راضی اور مطمئن رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ یونس، آیت:۷)

ترجمہ: البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن ہوگئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۵۰۸)

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دنیوی زندگی کی عیش و عشرت پر راضی و مطمئن ہوجانا یہ ان لوگوں کا خاصہ ہے جو نہ تو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اللہ سے ملنے کا ان کو یقین ہے اس لیے وہ سب کچھ اسی دنیوی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والا نے ایک بیان میں ذکر فرمایا کہ ایک انگریز سے کسی نے یہ سوال کیا کہ تم کس لیے کھاتے پیتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا زندہ رہنے کے لیے پھر جب اس سے پوچھا کہ تم کس لیے جیتے ہو تو اس نے جواب دیا کھانے پینے اور عیش کرنے کیلئے۔ جب کہ مومن اشیاء دنیا کو استعمال کرتا ہے اپنے زندہ رہنے

کے لئے لیکن خود اس کی زندگی، مالکِ زندگی پر فدا ہونے کے لیے ہوتی ہے اس لیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اے مسلمانوں تمہارا مرنا جینا صرف اللہ کے لیے ہو اور عقل مندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جس نے حیات بخشی ہے اور اس کی بقاء کے لیے سامانِ حیات عطا کیا ہے اسی خالقِ حیات پر قربان ہونا چاہیے یہی اس کے دیوانوں اور مستانوں کی سوچ اور فکر ہوتی ہے اور یہی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے اگر دنیا کم ہو تو بھی وہ ایسے ہی راضی بہ رضا رہتے ہیں جیسا کے دنیا کی بہتات اور کثرت کی صورت میں ان کے دل میں بڑائی اور تکبر کا گذر نہیں ہوتا۔

مردہ حسینوں پر مرنا کرگس کی خصلت کا ترجمان ہے

حسنِ فانی بتاں پر مرے کرگس لیکن
آہ صحرا ہو مبارک ترے دیوانوں کو

حضرت والا اپنے کلام میں بتوں کا لفظ نامحرم عورت اور حسین امرد لڑکے کیلئے استعمال فرماتے ہیں اور یہ تعبیر حضرات صحابۂ کرام کے کلام میں خواہشات نفسانی کی اتباع کے لیے استعمال کی گئی جیسا کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ذم الھویٰ میں ذکر کیا ہے اسی طرح قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی اتباع کرنے کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ ﴾
(سورۃ الجاثیۃ، آیت: ۲۳)

ترجمہ: بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرالیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۸۵)

یعنی جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا مطلب یہی ہے کہ ان کی اتباعِ عشقِ مجازی کے متعلق یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ یہ خصلت ایسی ہے جیسی جانوروں میں سے گدھ کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی غذا کے لیے مردار ڈھونڈتا پھرتا ہے اور جہاں اسے مردار نظر آئے تو اس پر مرمٹتا ہے ظاہر ہے جتنے حسین معشوق اور معشوقہ ہیں یہ بھی مر کر گلنے سڑنے والے ہیں تو ان پر جان دینے کی باتیں کرنے والا اور ان کی محبتوں میں مر مٹنے والا اس گدھ سے کم نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے بدتر ہے کیونکہ گدھ اپنی غذا کو استعمال کرتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے اس کے لیے مقرر کی گئی اور اس کی وجہ سے اس پر نہ غضب الٰہی اترتا ہے اور نہ وہ اللہ کی ناراضگی کا مستحق قرار پاتا ہے جب کہ ایک مومن کی روح کی غذا اللہ نے اپنی یاد کو مقرر کیا اور اسے یہ تعلیم دی کہ وہ پاک ذات حی وقیوم پر جان دے اور اس پر فدا ہو اور اس کی یاد میں آہ وفغاں کر کے اپنی روح کو تازگی اور دل کو سکون بخشے تو جب وہ اس کے خلاف کرتا ہے تو مستحق عقاب وعذابِ خداوندی قرار پاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مردار حسین وحسیناؤں پر مرنے والا نہ صرف یہ کے اپنی قبیح خصلت میں گدھ کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔

راہِ خداوندی دیوانگی سے طے ہوتی ہے فرزانگی سے نہیں

ہم نے دیوانوں سے سیکھی ہے محبت اختر
ہائے یہ درد کہاں ملتا ہے فرزانوں کو

دورِ نبوت سے لے کر آج تک تاریخ میں دو طرح کے لوگ رہے ہیں ایک تو وہ لوگ جو اپنے اللہ اور رسول کی بات پر دیوانہ وار فدا ہوتے ہیں اور ان کو اپنی دنیوی مصالح کے فوت ہو جانے کا کوئی رنج و غم لاحق نہیں ہوتا بس ان کا ایک ہی نعرہ ہوتا ہے ؎

تیرے عشق میں کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

وہ اللہ اور رسول کی محبت میں ایسے مست ہوتے ہیں کہ دنیا کے اہل عقل ان کی دنیا فوت ہونے اور مفاداتِ دنیویہ کے متاثر ہونے پر انہیں کتنا ہی بے وقوف اور احمق و پاگل اور دیوانہ و مجنوں کہیں مگر وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے اور نہ ظاہر بیں عقل کی راہ سے چلنے والوں کے طعنہ و ملامت ان پر کچھ اثر ڈالتی ہیں بس یہی وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ کی راہ کے دیوانے ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں ایمان پہاڑ کے مانند مضبوط اور راسخ ہوتا ہے جس کی بدولت حق تعالیٰ انہیں اپنا خاص مقامِ قرب عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے پاس کسی نے آ کر اپنے فرزند کے متعلق یہ شکایت کی کہ وہ جب سے آپ کے پاس آنا شروع ہو گیا تو بالکل بے کار اور خراب ہو گیا ہے اور اب کسی کام کا نہیں رہا جیسا کہ آج کل بھی بہت سے لوگ اپنی اولاد کو دین داروں سے اس لئے ملنے نہیں دیتے کہ وہ ان کے گمان میں بے کار ہو جاتے ہیں اور بگڑ جاتے ہیں حالانکہ یہ بگڑنا ہی حقیقت میں بننا ہے اور یہ بیکار ہونا ہی واقعی معنی کے اعتبار سے کار آمد ہونا ہے کیونکہ بزرگوں اور دین داروں کے پاس رہ کر ان کے دلوں کا رخ مخلوق سے خالق کی طرف اور کائنات سے رب کائنات کی طرف پھر جاتا ہے جو اصل کامیابی اور عقل مندی ہے مگر یہ راہ دیوانہ وار طریقے سے طے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے ان کو یہ جواب دیا کہ میرے یہاں تو اسی طرح لوگوں کو بگاڑا جاتا ہے جسے ہزار بار اپنا بگڑنا منظور ہو بس وہ یہاں آئے ورنہ کہیں اور چلا جائے اور یوں فرمایا ؎

سو بار بگڑنا جسے منظور ہو اپنا
آئے وہ یہاں اور بہ چشم و بسر آئے
فرزانہ جسے بننا ہو جائے وہ کہیں اور
دیوانہ جسے بننا ہو بس وہ ادھر آئے

اور یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ چونکہ دین و دنیا کو جناب نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے دو سوکنوں

کی طرح قرار دیا ہے تو جب ایک آئے گی تو دوسری ضرور بھاگے گی اب یہ بندے پر ہے کہ وہ کس کو چاہتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دین و دنیا کے تمام مفادات بیک وقت حاصل ہوتے رہیں اور ایک کی وجہ سے دوسرے متاثر نہ ہوں اور صحیح دانش مندی اور عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آخرت کو اس کے دائمی ہونے کی وجہ سے ترجیح دے اور دنیا کو اس کے فانی و عارضی ہونے کی بنا پر چھوڑ دے یہی تمام انبیاء و اولیاء اور صلحا و اتقیاء کی دعوت اور ان کا مشن رہا ہے۔ حضرت والا نے کیا ہی پیارے انداز سے فرمایا ؎

جس دنیا سے ہمیشہ کے لیے جانا
اور پھر لوٹ کر کبھی نہ آنا
اس دنیا سے دل کا کیا لگانا

اور فرمایا ؎

میں نے مانا ہے بہار عارضی تجھ کو لذیذ
دائمی راحت کی خاطر عارضی راحت کو چھوڑ

اور جناب تائبؔ صاحب کا شعر ہے ؎

ارے عقل مندو تم عاشق نہیں ہو
اگر ہوتے عاشق تو ہوتے دیوانے

مائل غم زندگی دیگراں کرتے ہیں ہم

دردِ دل سے جب کبھی آہ و فغاں کرتے ہیں ہم
اپنی آنکھوں سے بھی اک دریا رواں کرتے ہیں ہم

اپنے سجدوں سے زمیں کو آسماں کرتے ہیں ہم
اپنے اشکوں کو بھی رشکِ کہکشاں کرتے ہیں ہم

خاکِ تن میں دردِ دل کو جب نہاں کرتے ہیں ہم
اپنے آب و گل کو رشکِ آسماں کرتے ہیں ہم

ان کے غم کی رفعتوں کو یوں بیاں کرتے ہیں ہم
مائل غم زندگی دیگراں کرتے ہیں ہم

اپنے ہر غم کو فدائے جانِ جاں کرتے ہیں ہم
اس طرح سے اپنے غم کو جاوداں کرتے ہیں ہم

رازِ دردِ دل کبھی دل میں نہاں کرتے ہیں ہم
بر سرِ منبر کبھی اس کو بیاں کرتے ہیں ہم

اپنا صحرا ان کے غم سے گلستاں کرتے ہیں ہم
اور خارستاں کو رشکِ بوستاں کرتے ہیں ہم

اہلِ دل کی صحبتوں سے اخترؔ خستہ کو بھی
دل ملا ایسا کہ شرحِ دل بیاں کرتے ہیں ہم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **کہکشاں**: ستاروں کا جھرمٹ۔ **خاکِ تن**: بدن۔ **دردِ دل**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد۔ **نہاں**: چھپانا۔ **آب و گل**: پانی اور مٹی، مراد بدن۔ **رشکِ آسماں**: یعنی آسمان پر رہنے والے فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ **رفعتوں**: بلندیوں۔ **فدائے جانِ جاں**: یعنی اللہ تعالیٰ پر فدا کرتے ہیں۔ **جاوداں**: ہمیشہ رہنے والا۔ **خارستاں**: جہاں کانٹے ہی کانٹے۔ **بوستاں**: باغ۔ **خستہ**:......۔

آہ وفغاں اور آنسوؤں کا دریا ترجمانِ دردِ دل ہے

دردِ دل سے جب کبھی آہ و فغاں کرتے ہیں ہم
اپنی آنکھوں سے بھی اک دریا رواں کرتے ہیں ہم

ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کبھی میں زبان سے آہ وفغاں کرتا ہوں تو اس کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بھی رواں ہو جاتا ہے یہ وہ چیز ہے جو تمام اولیاء و اسلافِ امت کی غذا اور ان کا شیوہ و عادت رہی ہے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کثرت کے ساتھ موجود ہے کہ رات کے آخیر حصہ میں اکثر و بیشتر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اٹھ کر اپنے اللہ کو یاد کرتے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہاتے تھے ایک روایت کا مضمون ہے کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں ہوتے اور اس کثرت سے روتے تھے کہ آپ کے سینے مبارک سے رونے کی آواز اس طرح نکلتی تھی جس طرح ہانڈی میں پانی کے کھولنے کی آواز ہوتی ہے حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری فرماتے تھے کہ دعاؤں میں آنسوؤں کا نکل آنا قبولیت کی ضمانت اور اس کی نشانی ہے۔

قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے وقت اگر غور و تدبر سے دیکھا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ کئی ایک مقامات پر جہاں آیاتِ سجدہ آئی ہیں ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر یہ وصف ذکر کیا ہے کہ وہ میرے سامنے جھکتے ہیں اور میرے ہی سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور وہ میرے سامنے بڑی عاجزی اور تواضع کے ساتھ آہ وزاری کرتے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے امت کے تمام اولیاء کی خاص صفت رہی ہے حتی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے متعلق یہاں تک منقول ہے کہ وہ اتنا روتے تھے کہ بعضوں نے ان کی حالت دیکھ کر یہ کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جہنم کا خوف انہی دونوں کو ہے حضرت مولانا رومیؒ اسی بات کو بڑے عجیب انداز سے ارشاد فرماتے ہیں۔

اے دریغا اشکِ من دریا بدے

یعنی میں اتنا اللہ کے خوف سے روتا کہ میرے آنسو روتے روتے دریا بن جاتے۔

سارے عالم کے نفسیاتی مریضوں کو احقر کا ایک اعلان

صاحبو! احقر خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے جس بندے کو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے رلاتے ہیں تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کو دوسروں کے سامنے رلائے اور جسے اپنے در کا بھکاری بنا دیتے ہیں تو پھر خدا کی غیرت سے یہ بعید ہے کہ اس کے در کا بھکاری مخلوق کے دروں پر ٹھوکریں کھاتا پھرے اور جسے اپنا غم عطا فرماتے ہیں تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ اسے اس مادی دنیا کے چھوٹے چھوٹے فانی غموں میں مبتلاء کر دیں اس لیے ایسے لوگ نہ کبھی رسوا و ذلیل ہوتے اور نہ وہ پریشان و محروم ہوتے اور نہ ٹینشن و ڈپیریشن (Tension& Depression) کے بیمار ہوتے

ہیں جس کا آج گھر گھر گلہ وشکوہ ہے خدا کے ایسے بندوں سے یہ سب اُلجھنیں اور پریشانیاں دور کردی جاتی ہیں ذرا کوئی اس کا مزہ چکھ کر تو دیکھے ہمارے ایک دوست نے اس موقعہ کی مناسبت سے بڑی قیمتی بات فرمائی کہ دنیا کے ان ممالک میں جہاں لوگ خودکشیاں کررہے ہیں اور اس کے لئے مختلف مقامات بنائے گئے ہیں کاش کوئی جا کے وہاں یہ تختی (Board) آویزاں کردے کہ آؤ تمہیں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ گلشن اقبال کا ایڈریس دیتے ہیں وہاں چند دن گزار کر پھر اپنی خودکشی کے ارادے پر نظرِ ثانی کرلینا احقر اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے اور واقعات و تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کے تذکروں میں اور اس کی محبت کی باتوں میں اسے ایسا سکون میسر آئے گا کہ وہ فوراً ان خیالات سے تائب ہوجائے گا اور اس کی زندگی کا رخ یکسر تبدیل ہوجائے گا جیسا کہ بہت سے ایسے لوگ اس خانقاہ میں رہ کر سکون پاچکے ہیں اور بہترین پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

اپنے سجدوں سے زمیں کو آسماں کرتے ہیں ہم
اپنے اشکوں کو بھی رشکِ کہکشاں کرتے ہیں ہم

جب اللہ والے اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زمین پر آنسو گرتے ہیں تو اس وقت میں وہ فرش پر ہوتے ہوئے عرش سے رابطہ کئے ہوتے ہیں اور زمین پر ہوتے ہوئے آسمان کو چھوتے ہیں کیونکہ مومن حالتِ سجدہ میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ اپنے سجدوں کے ذریعے ہم زمین کو آسمان کردیتے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے آنسو آسمان میں چمکتے ہوئے کہکشاں ستاروں کے لیے قابل رشک ہوجاتے ہیں جس طرح آسمان پر وہ ستارے چمکتے ہیں اسی طرح اللہ رب العزت کی نگاہ میں زمین کے اوپر گرے ہوئے یہ اشک ندامت چمکتے رہتے ہیں جیسا کہ حضرت والا کا ایک دوسرے مقام پر شعر ہے ۔

جو گرے ادھر زمیں پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اٹھا فلک پر مری بندگی کا تارہ

اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان آنسوؤں اور اشک ہائے ندامت سے حاصل ہونے والی تجلیات اور انوارات دل کو ایسا روشن اور چمک دار بنادیتے ہیں کہ اس کی روشنی اور چمک کے سامنے آسمان میں چمکنے والے ستاروں اور آفتاب و ماہتاب کی بھی کوئی حیثیت نہیں اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں آنسوؤں کو ستاروں کے برابر قرار نہیں دیا بلکہ رشکِ کہکشاں فرمایا ہے کیونکہ ان آنسوؤں سے بندہ کو توبہ کی حقیقت حاصل ہوتی ہے جس کہ نتیجہ میں بتصریح حدیث شریف قلب میں آنے والے سیاہ اور کالے نکتے زائل ہوجاتے ہیں اور دل چمک اٹھتا ہے اور ایسے ہی دل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے سمانے کی جگہ قرار دیا ہے جیسا کہ مولانا رومی فرماتے ہیں ۔

در دلِ مومن بگنجیدم چوں ضیف

میں مومن کے دل میں مہمان کی طرح سما جاتا ہوں اور بعض احادیث شریفہ میں بھی یہ مضمون صراحت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

کائنات کی کوئی چھوٹی یا بڑی شے ایمان کے برابر نہیں

خاکِ تن میں دردِ دل کو جب نہاں کرتے ہیں ہم
اپنے آب و گل کو رشکِ آسماں کرتے ہیں ہم

یوں تو انسان کی بذاتِ خود کوئی قیمت نہیں لیکن جب اس جسد خاکی میں اللہ تعالیٰ کی محبت آ جائے اور بقول حضرت والا اس خاک تن میں دردِ دل حاصل ہو جائے تو پھر یہ آب وگل رشکِ آسمان بن جاتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہئے کہ پھر اس کی ایسی قیمت ہوتی ہے کہ سارے زمین وآسمان اور اس کے اندر کے تمام خزانے کئی گنا زیادہ کر کے بھی اگر ایمان کا عوض بنایا جائے اور بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے تو وہ قبول نہ ہوگا اسی لیے جو انسان ایمان سے خالی بحالت کفر دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو قیامت کے دن اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾
(سورۃ المائدۃ، آیت ۳۶)

ترجمہ: جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو، تا کہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت کے دن عذاب سے، تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے۔
(معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۲۴)

اس سے ہم ایمان کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اگر ہم مختصر لفظوں میں یہ کہہ دیں کہ کوئی بھی چھوٹی یا بڑی چیز اس کا بدلہ نہیں بن سکتی اس لئے یہ اہل ایمان اور اہل محبت اس ایمان و محبت کی وجہ سے رشکِ آسمان ہوتے ہیں۔

از دل خیزد بر دل ریزد

ان کے غم کی رفعتوں کو یوں بیاں کرتے ہیں ہم
مائل غم زندگی دیگراں کرتے ہیں ہم

جس وقت حضرت والا دامت برکاتہم اللہ کی محبت کی داستان چھیڑتے ہیں اور اپنے محبوب حقیقی رب کائنات کی راہ میں اٹھائے جانے والے غموں کی رفعتوں اور بلندیوں کو پیش کرتے ہیں تو حضرت والا کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایسی زبانِ ترجمانِ دردِ دل عطا ہوتی ہے اور ایسا اندازِ بیان نصیب ہوتا ہے کہ گنہگاروں اور غفلت میں پڑے لوگوں کی زندگیوں میں یک دم تبدیلی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں کیوں کہ دراصل بات یہ ہے کہ تاثیر عمل سے پیدا ہوتی ہے تو حضرت جس بات کو پیش فرماتے ہیں اور جو دردِ محبت بیان کرتے ہیں خود اس کو اپنے سینے میں نہاں

رکھتے ہیں اس لیے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہ ہو طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ درِ دِ محبت جس کو بھی نصیب ہوا ہے وہ اہلِ درد کی صحبت اور ان کی خدمت سے ملا ہے کیونکہ مثل مشہور ہے کہ ''دل را بہ دل راہ ست'' کہ دل کو دل سے راستہ ہوتا ہے یہ چیزیں محض کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی اسی لئے بخاری شریف کی روایت ہے:

﴿اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ﴾

(شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس فی جواب)

یعنی العلم المعتبر مراد یہ کہ اللہ کی بارگاہ میں جو علم معتبر ہے وہ تعلم اور سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے محض کتابوں کے پڑھنے سے کوئی عالم نہیں بن سکتا جس طرح دنیا میں دوسری چیزیں سیکھنی پڑتی ہیں اسی طرح علم ومعرفت اور درد ِ محبت اہلِ محبت سے سیکھنا پڑھتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے جنہوں نے محض کتابیں پڑھ کر علامہ بننا چاہا گو کہ وہ کتنے ہی ذہانت وزکاوت کے مالک تھے لیکن بلاخر وہ راہ راست اور صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور افراط وتفریط کا شکار ہوگئے یا تو حد درجہ شخصیت پرستی آ گئی یا امت کے تمام بزرگوں سے ہٹ کر ان پر اعتماد نہ کر کے دین کے سلسلے میں ایک نیا راستہ ایجاد کر دیا اس لیے صحیح طریق اللہ کی محبت سیکھنے کا یہ ہے کہ جو لوگ اپنے قلوب میں محبت ومعرفت خداوندی کا خزانہ رکھتے ہیں ان کی صحبت اختیار کی جائے تو بڑی جلدی زندگی میں تبدیلی آتی نظر آئے گی اور منزل جلد حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی راہ کا غم ہمیشہ کی خوشی میں تبدیل ہو جاتا ہے

اپنے ہر غم کو فدائے جانِ جاں کرتے ہیں ہم
اس طرح سے اپنے غم کو جاوداں کرتے ہیں ہم

دنیا اور اس کی چیزوں کی محبت اور اس سے تعلق ایک دن مٹ کر ختم ہو جائے گا کیونکہ خود وہ چیزیں فنا وختم ہونے والی ہیں لیکن جو لوگ اپنے سینے میں اللہ کی محبت رکھتے ہیں اور اس کو راضی کرنے کا غم رکھتے ہیں یہ ایسی دولت ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہے اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے سارے غموں کو چھوڑ کر بس اپنا ایک غم بنالیا اور وہ ایسا غم ہے کہ جو ہمیشہ ساتھ رہے گا اور جس کے نتیجہ میں جنت کی ہمیشہ کی خوشیاں حاصل ہوں گی۔ ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، ص: ۳۷)

یعنی جو شخص اپنے سارے غموں کو ایک غم یعنی آخرت کا غم بنالے اللہ تعالیٰ اس کو دنیا کے دوسرے غموں کی طرف سے کافی ہوجاتے ہیں اور آخرت کے غم بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک کونے میں بیٹھ کر ہاتھ میں تسبیح لے کر اللہ اللہ کرتا رہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قدم پر حکمِ خداوندی پیش نظر ہو خواہ گھر میں ہو یا باہر مکان میں ہو یا دکان میں آبادی میں ہو یا جنگل میں خلوت میں ہو یا جلوت میں ہر گھڑی اللہ کا حکم بجالائے جس چیز سے اللہ ناراض ہو اس کو چھوڑ دے مثلاً دکان میں کھڑا ہوا ہے سامان بیچتے وقت نہ جھوٹ بولتا ہے نہ دھوکہ دیتا ہے نہ سامان کی تعریف میں زیادہ مبالغہ کرتا ہے نہ سامان کو بیچتے ہوئے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے حتیٰ کہ محض دنیوی مفاد کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاک نام کی سچی قسم سے بھی بچتا ہے تو ایسا بندہ اگرچہ دکان میں کھڑا ہوا ہو مگر حقیقت میں وہ غمِ راہِ خداوندی کا حامل ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذاکر ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے اگر جھوٹی قسم کھائی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری جانب نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ جیسا کے حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

﴿ثَلٰثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ قَالَ اَبُوْ ذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهٗ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب البيوع، باب المساهلة في المعاملات، ص: ۲۴۳)

تین قسم کے ایسے لوگ ہیں جن سے اللہ قیامت کے دن نہ تو کلام فرمائیں گے اور نہ ان کو نظرِ رحمت سے دیکھیں گے۔ نمبر (۱) اپنی ازار یا پاجامے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے والا نمبر (۲) احسان جتلانے والا۔ نمبر (۳) اپنے سامان کو جھوٹی قسم سے بیچنے والا۔ اس لئے خواہ سامان فروخت ہو یا نہ ہو لیکن جھوٹی قسم نہیں کھانی چاہیے حتیٰ کے علماء نے لکھا ہے کہ محض دنیوی منفعت کے لئے سچی قسم بھی اگر کھائی جائے تو اس سودے کی برکت ختم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ محض دنیوی منفعت کے لیے ہرگز قسم نہ کھائی جائے۔

غمِ راہِ خداوندی سب غموں کی طرف سے کافی ہے

راز دردِ دل کبھی دل میں نہاں کرتے ہیں ہم
بر سرِ منبر کبھی اس کو بیاں کرتے ہیں ہم

اللہ والے اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم سینے میں اٹھائے رکھتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں اپنی شہرت اور ناموری کی کوئی تمنا نہیں ہوتی اس لئے ان کی حالت اس حدیث شریف کا مصداق ہوتی ہے:

﴿نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِي الدِّيْنِ اِنِ احْتِيْجَ اِلَيْهِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُ اَغْنٰى نَفْسَهٗ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب العلم، ص: ۳۶)

بہت اچھا ہے وہ عالم آدمی کہ جب لوگ اس کے علم کے ضرورت مند ہوتے ہیں تو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے اور جب لوگ اس سے بے نیازی اور لاپرواہی برتتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ان سے مستغنی کر لیتا ہے۔ اس لیے حضرت والا

ارشاد فرماتے ہیں کہ رازِ دردِ دل کبھی تو ہم دل ہی میں چھپا کے رکھتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے اور لوگوں میں طلب ہوتی ہے تو اس کو برسرِ منبر بیان کرتے ہیں۔

صاحبو! اپنے بیانات اور تقریروں کے پروگرام بنانے کے سلسلے میں دل میں آرزو اور تمنا رکھنا اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس نیت سے یہ تمنا کرنا کہ لوگوں میں میرا نام پھیلے خوب شہرت اور چرچا ہو ہر طرف میری ہی تقریروں کا غلغلہ مچا ہو اور لوگوں کو پتہ چل جائے کہ میرے سینے میں کتنے علوم چھپے ہوئے ہیں اور میں کتنا دردِ دل رکھتا ہوں اس نیت سے یہ سارے دین کے کام اللہ کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ نیت اخلاص کے منافی ہے۔

ہاں البتہ اسی کا دوسرا پہلو اور حیثیت یہ ہے کہ بندہ اللہ سے درخواست کرتا رہے کہ اے اللہ جو دین کی صلاحیت آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے اس کے ذریعے سے مجھ سے کام لے لیجئے اور مجھے ایسے لوگوں میں پہنچا دیجئے جو آپ کے دین کی قدر کرنے والے ہوں تاکہ میں آپ کا دین ان تک پہنچا سکوں اور آپ کی دی ہوئی اس صلاحیت کا شکر ادا کرسکوں اس حیثیت سے یہ عنداللہ مطلوب ہے اور تقربِ خداوندی کا ذریعہ ہے اسی لیے صفا و مروہ کے درمیان میں پڑھی جانے والی دعاؤں میں ایک دعا یہ ہے اے اللہ مجھے اپنے دین کے لئے استعمال فرما تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ خدمتِ دین کے لئے راستے کھولتے چلے جائیں گے اور آپ کو ایسے بندوں تک اور ان کو آپ تک پہنچا دیں گے ہمارا اور آپ کا کام اپنے کو گم کرنا اور مٹانا بعد میں اپنے اللہ سے مانگتے رہنا اور اس کے در کو کھٹکھٹاتے رہنا ہے جب اللہ ہماری مصلحت سمجھیں گے تو ایسے مواقع عطا فرمادینگے اپنے دل میں یہ سارا غیر اللہ بسانا نہیں چاہیے جب تک اللہ کی مصلحت نہیں ہے تو ہمیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے اور اللہ کی عبادت اور بندگی میں یکسوئی کے ساتھ مصروفِ عمل رہنا چاہیے در کا کھولنا ہمارا کام نہیں کھٹکھٹانا ہمارا کام ہے۔ اسی کو خواجہ صاحب نے یوں فرمایا ؎

کھولیں وہ یا نہ کھولیں در
اس پہ ہو کیوں تری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر
یعنی صدا لگائے جا

یادِ خداوندی سے خارستان رشکِ گلستان ہوجاتا ہے

اپنا صحرا ان کے غم سے گلستاں کرتے ہیں ہم
اور خارستاں کو رشکِ بوستاں کرتے ہیں ہم

صحرا کا معنی یوں تو بیابان اور جنگل کے ہیں لیکن دراصل اس تعبیر کا منشاء یہ ہے کہ بے سروسامانی کے عالم میں ظاہری طور پر خستہ اور شکستہ صورتِ حال ہوتے ہوئے اور خزاں کا منظر نظر آتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی یادوں سے

اس کے صحرا کو گلستاں کر دیا جاتا ہے اور اس کے خزاں کو رشکِ بہار بنا دیا جاتا ہے اور اس کے خارستان کو دنیا کے گلستانوں اور بوستانوں سے زیادہ پُر بہار کر دیا جاتا ہے اس لئے عام طور پر اہل اللہ ظاہری طور پر خستہ حال انداز سے زندگی گزارتے ہیں ان کے رہنے سہنے کی جگہیں تکلّفات سے خالی ہوتی ہیں نہ تو ان کے بدن پر آثار تعیش نظر آئیں گے اور نہ ہی ان کے دستر خوانوں پر تنوع اور تکلف دکھائی دیتا ہے لیکن پھر بھی ان کو وہ لذتیں نصیب ہوتی ہیں اور جینے کا وہ مزہ ملتا ہے کہ جو سلاطینِ عالم کو بھی میسر نہیں وجہ صرف یہ ہے وہ اپنے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت رکھتے ہیں اور جو لوگ اس کے بغیر زندگی گزارتے ہیں وہ دنیا کے گلستان اور چمنستان سے اور یہاں کی باغ و بہار سے صرف اپنے ظاہری جسم کو محظوظ کر سکتے ہیں روح کو نہیں کیونکہ روح کی غذا اللہ تعالیٰ نے ذکر اللہ کو قرار دیا ہے۔

صحبتِ مشائخ سے حاملِ درد ہو کر بیانِ درد کا مزہ

اہلِ دل کی صحبتوں سے اخترؔ خستہ کو بھی
دل ملا ایسا کہ شرحِ دل بیاں کرتے ہیں ہم

اس شعر میں ہمارے لیے دو اہم باتیں ہیں ایک تو یہ کہ حضرت والا اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بندے کو جو کچھ بھی بزرگوں کی خدمت میں رہ کر حاصل ہوتا ہے اسے اپنے مجاہدات اور ریاضتوں کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے بلکہ ظاہری طور پر سبب کے درجہ میں اپنے بزرگوں اور مشائخ کا فیضِ صحبت سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ نے مجھ پر فضل فرمایا کہ مجھے شیخ کامل کی صحبت میسر ہوئی اور ان کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا تعلق اور معرفت کی دولت حاصل ہوئی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ شعر میں خود اپنے لیے دعویٰ محبت و معرفت کیا جا رہا ہے حالانکہ یہ صحیح اور درست نہیں ہے اس لیے اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضرت تھانویؒ نے ارشاد فرمایا اگر کسی بندے کو حسی طور پر کوئی کمال حاصل ہو تو وہ اپنی طرف اس کمال کی نسبت بطور تحدیثِ نعمت کے کر سکتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اپنے افضل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا چنانچہ انفاس عیسیٰ کتاب میں حضرت تھانویؒ کا یہ ملفوظ مذکور ہے کہ اپنے کو اکمل سمجھنا جائز ہے اور افضل سمجھنا حرام ہے جیسا کہ ایک حافظ غیر حافظ کے مقابلہ میں یا ایک ایسا ایک حافظ جو عالم بھی ہو صرف حافظ کے مقابلے میں اپنے کو اکمل سمجھے تو یہ جائز اور درست ہے لیکن افضل سمجھنا جائز نہیں کیونکہ اکمل کا تعلق محسوسات سے ہے اور افضل کا تعلق اللہ کے یہاں مقبول ہونے سے ہے اور یہ بات ہماری نگاہوں سے مخفی ہے جبکہ کسی کمال کا حصول ایک ظاہری اور واضح شے ہے اگر بندے کو اس کا بھی ادراک نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں ملنے کے باوجود وہ یہی سمجھتا رہے اور کہتا رہے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ ٹھیک بالکل اسی طرح اس موقعہ پر حضرت والا کا یہ ارشاد ہے اس لیے اس کو دعویٰ نہیں سمجھنا

چاہیے بس اتنی سی حقیقت ہے کہ جو معرفتِ قربِ خداوندی کی دولت جس درجہ عطا ہوئی اس پر اظہارِ شکر کرنا مقصود ہے۔

دوسری اہم بات جس طرف حضرت والا اشارہ فرما رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل بیان کا مزہ اور وعظ و نصیحت کی حلاوت جب ہی نصیب ہوتی ہے کہ وہ بیان محض رسمی تقریر اور قصہ گوئی نہ ہو بلکہ اندرونِ قلب اللہ کی حقیقی محبت کا درد و غم پیدا ہو جائے اور پھر اس کو ایسی بے تابی اور تڑپ کے ساتھ بیان کیا جائے کہ جس طرح ایک آدمی اگر جسمانی طور پر کسی درد و تکلیف میں مبتلاء ہو اور ڈاکٹر اس سے اس کی تکلیف جاننا چاہے تو اس کے بیان کرنے کے لیے اسے کسی تقریر کی مشق اور Practice نہیں کرنی پڑتی بلکہ بلا تکلف وہ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے اندر کی درد و کڑھن ڈاکٹر کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

درحقیقت جب کوئی اہلِ دل منبر پر بیٹھ کر تقریر کرتا ہے تو ایسی ہی شرحِ دل بیان کرتا ہے اور جیسا کہ مثل مشہور ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ یعنی ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے اس لیے ایسے دل سے جو خود حاملِ دردِ محبت ہے زبانوں کے ذریعے وہی دردِ محبت ظاہر ہوگا اس لیے ہمیں وعظ و بیان سے پہلے اپنے دل کو اس قابل بنانا چاہیے تاکہ پھر حقیقت میں شرحِ دل کا بیان ہو سکے۔ ورنہ آج کل کی تقریریں محض رسمی تقریریں بن کر رہ جاتی ہیں۔

جمع ضدین خوشی و غم

رضائے دوست کی خاطر یہ حوصلے ان کے
دلوں پہ زخم ہیں پھر بھی یہ مسکراتے ہیں
عجیب مظہرِ اضداد ہیں ترے عاشق
خوشی میں روتے ہیں اور غم میں مسکراتے ہیں

اللہ اللہ عشق کی یہ بے زبانی دیکھئے

ہے زباں خاموش اور آنکھوں سے ہے دریا رواں
اللہ اللہ عشق کی یہ بے زبانی دیکھئے

حشر سے پہلے نہیں کرتے ہیں وعدہ دید کا
ربّ ارنی پر جلالِ لن ترانی دیکھئے

لب خموشانِ محبت کی نگاہ پاک سے
اک نظر میں مردہ دل کی زندگانی دیکھئے

عاشقانِ زرد رو کی چشم نم میں صبح دم
ان کے جلووں کا یہ رنگِ ارغوانی دیکھئے

جلوہ گاہِ حق دلِ عارف کی آہِ گرم میں
بارگاہِ کبریاء کی ترجمانی دیکھئے

یوں تو عاشق بے زباں معلوم ہوتا ہے مگر
عشق کی تفسیر میں جادو بیانی دیکھئے

عاشقوں کا منبرِ دل پر بیانِ دردِ دل
وعظ میں آمیزشِ دردِ نہانی دیکھئے

داستانِ زخمِ دل اخترؔ چھپاتا تھا مگر
روزِ محشر داغِ دل کی گل فشانی دیکھئے

مشکل الفاظ کے معنی:۔دید: زیارت۔ربّ ارنی: (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا) اے اللہ! مجھے اپنی زیارت کرایئے۔ لن ترانی: (تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ لب: ہونٹ۔ خموشانِ محبت: خاموش محبت۔زندگانی: زندگی۔زرد رُو: پیلا چہرہ۔چشم نم: آنسو سے تر آنکھ۔ ارغوانی:......۔عارف: اللہ والا۔بارگاہِ کبریاء: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ۔جادو بیانی: پُراثر۔ آمیزش: شامل۔ دردِ نہانی: چھپا ہوا درد۔ گل فشانی:......۔

عشق کی بے زبانی آنسوؤں کے دریا کی صورت میں

ہے زباں خاموش اور آنکھوں سے ہے دریا رواں
اللہ اللہ عشق کی یہ بے زبانی دیکھئے

اس شعر میں حضرت والا نے اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایک خاص کیفیت و حالت کو ذکر فرمایا ہے کہ اللہ کے عاشقوں کی ایک خاص حالت یہ ہوتی ہے کہ زبان سے وہ خاموش رہتے ہیں لیکن آنکھوں سے ان کے آنسوؤں کا دریا بہتا رہتا ہے اور یہ اس محبت کی ترجمانی کرتا ہے جو ان کے سینے میں موجود ہے درحقیقت جب زبان خاموش ہوتی ہے تو دل لبریز ہوتا ہے اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم الشان صفت مبارکہ یہ تھی:

﴿کَانَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُتَوَاصِلَ الْاَحْزَانِ دَائِمَ الْفِکْرَۃِ لَیْسَتْ لَہٗ رَاحَۃٌ طَوِیْلَ السَّکْتِ وَلَا یَتَکَلَّمُ فِیْ غَیْرِ حَاجَۃٍ﴾

(الشمائل المحمدیۃ للترمذی)

یعنی دیر دیر تک آپ خاموش اور چپ چاپ رہتے تھے اور ہمیشہ دین اور امت کے بارے میں سوچ میں مبتلاء رہتے تھے حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمہ اللہ حضرت مولانا الیاس صاحب بانی جماعتِ تبلیغ کے متعلق یہ ارشاد فرماتے تھے کہ میں نے بہت سے مشائخ اور بزرگوں کو دیکھا ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وصف خاص سب سے زیادہ حضرت مولانا الیاس صاحب میں دیکھا کہ بہت غمگین اور سوچ وفکر میں خاموش رہا کرتے تھے لیکن دل کا حال وہی تھا کہ بڑے تڑپ تڑپ کے رات کی تاریکیوں میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اور تلاوت قرآن کے وقت آیات جہنم پر چہرے کا رنگ بدل جاتا اور خوب روتے تھے گو کہ حضرت مولانا رسمی مقرر اور واعظ نہیں تھے مگر ان آنسوؤں کے دریاؤں کے ذریعے سینے میں لگی ہوئی عشق کی آگ کا اس طرح اظہار فرماتے تھے کہ اسی میں بڑے بڑے صاحب زبان مقرروں کی تقریروں سے زیادہ تاثیر تھی۔ اسی لیے مشائخ اپنے متعلقین سے یہ فرمایا کرتے ہیں کہ بزرگوں کے پاس محض وعظ و نصیحت سننے کی نیت سے نہ جاؤ بلکہ ان کی زیارت و ملاقات کی نیت رکھو خواہ تقریر ہو یا نہ ہو کیونکہ ان کا بے زبان اور خاموش رہنا بھی پاس بیٹھنے والوں کے لیے نفع سے خالی نہیں ہوتا۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں

حشر سے پہلے نہیں کرتے ہیں وعدہ دید کا
ربِّ ارنی پر جلالِ لن ترانی دیکھئے

حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! مجھے اپنا دیدار کرا دیجئے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی گئی کہ اے موسیٰ تم دنیا میں رہتے ہوئے ان آنکھوں سے میرے دیدار کی طاقت نہیں رکھتے ہو اور اس کی صورت یہ اختیار فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنی خاص تجلّی ڈالی اور حضرت موسیٰ علیہ

الصلاۃ والسلام کو حکم دیا کہ اس کی طرف نظر ڈالو اور دیکھو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہ جائے تو تم مجھے دیکھ سکو گے لیکن جب اللہ نے اس پہاڑ پر تجلّی ڈالی تو وہ چورا چورا ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام بے ہوشی کی حالت میں گر پڑے اس لیے دنیا میں تو اللہ کا دیدار ممکن نہیں لیکن آخرت میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار عطا ہوگا جیسا کہ قرآن وحدیث کی مختلف نصوص اس پر دلیل ہیں اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ گمراہ ہیں ہاں البتہ خواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت خاص تجلیات کے ساتھ ممکن ہے جیسا کہ بعض بزرگوں کے صحیح اور سچے واقعات اس سلسلے میں منقول ہیں ایک واقعہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ آپ کا قرب سب سے زیادہ کس چیز کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے تو جواب ملا کہ میرے کلام کے ذریعے سے پھر امام صاحب نے یہ سوال کیا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھے تو ارشاد ہوا کہ خواہ سمجھ کر پڑھے یا بلا سمجھے مگر ظاہر ہے خواب میں اللہ کے دیدار سے مراد اللہ کی تجلی کا دیدار ہے۔

اگر نظرِ بد کی تاثیر مسلّم ہے تو نظرِ حق کی تاثیر سے انکار کیسا؟

لب خموشاں محبت کی نگاہِ پاک سے
اک نظر میں مردہ دل کی زندگانی دیکھئے

جو لوگ اہل دل اللہ والے ہیں ان کے پاس محض بیٹھنا بھی نفع سے خالی نہیں خاموش رہنے کے باوجود ان کی نظر پڑھنا زندگیوں کی کایا پلٹ دیتا ہے اور مردہ دل کو زندگی بخش دیتا ہے۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے اَلْعَیْنُ حَق والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اگر نظر بد کا لگنا حق ہے تو اہل اللہ کی نظر محبت کا لگنا کیوں حق نہ ہوگا اور اگر نظر بد سے مزاج اور طبیعت میں تغیر وتبدیلی پیدا ہوسکتی ہے تو کسی عارف ولی کامل کی نظر سے کیوں دلوں میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی اسی کو ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنَّهٗ مِنْ حَيْثُ التَّاْثِيْرِ الْاَكْسِيْرِ يَجْعَلُ الْكَافِرَ مُؤْمِنًا وَّالْفَاسِقَ صَالِحًا وَّالْجَاهِلَ عَالِمًا وَّالْكَلْبَ اِنْسَانًا﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الطب والرقی، ج:۸، ص:۳۲۵ المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرّمۃ)

اور ایک روایت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے یہ بات منقول ہے کہ:

﴿اَلنَّظَرُ اِلَيْكَ وَ الْجُلُوْسُ بَيْنَ يَدَيْكَ وَاِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ﴾

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تین چیزیں بہت پسند ہیں نمبر ایک آپ کا دیدار کرنا اور آپ کی مجلس میں سامنے بیٹھنا اور آپ کے اوپر اپنا مال خرچ کرنا! غور فرمائیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تقریر اور بیان سننے کی بات نہیں ذکر کی اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف سامنے بیٹھنا اور نائبینِ انبیاء علمائے کرام کی زیارت کرنا کس قدر اہم اور قیمتی چیز ہے چنانچہ ایک مرتبہ احقر کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ہم چند ساتھی دہلی میں حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے تو ایک شخص ہم سے پوچھنے لگے کہ یہاں دہلی کس لیے آنا ہوا ہم

نے اس پر یہی بات عرض کی تو انہوں نے اعتراضاً یہ سوال کیا کہ اگر کوئی وعظ و بیان نہیں تھا تو پھر محض ان کی زیارت اور ملاقات سے کیا فائدہ؟ تو بندے نے ان سے یہی عرض کیا کہ اللہ والوں کی محض زیارت و ملاقات بھی نفع سے خالی نہیں اور ان کی پاکیزہ نگاہیں دلوں کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی ہیں اگرچہ ان کی زبان خاموش ہو اور استدلال کے طور پر احقر نے عرض کیا کہ ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اللہ کی یہ خاص صفت ذکر فرمائی ہے:

﴿إِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ﴾

(تفسیر روح المعانی، تحت سورۃ یونس، آیت: ۳)

یعنی جب ان کی زیارت کی جاتی ہے تو دل میں اللہ کی یاد آتی ہے اور دنیا سے دوری اور بے رغبتی محسوس ہوتی ہے کیا یہ کوئی اہم فائدہ نہیں ہے؟ بالآخر وہ شخص خاموش ہوگئے اس لیے حضرت والا نے یہ بات فرمائی کہ اہلِ محبت کے لب اگرچہ خاموش ہیں مگر ان کی نگاہوں کی تاثیر سے کتنے ہی مردہ دل زندہ ہوجاتے ہیں۔

یادِ الٰہی کے جلووں کا رنگِ ارغوانی

عاشقانِ زرد رُو کی چشمِ نم میں صبح دم
ان کے جلووں کا یہ رنگِ ارغوانی دیکھئے

عام طور پر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اس کی راہ میں غم اٹھانے اور ہر قسم کی قربانی دینے کی وجہ سے ظاہری طور پر جسم میں موٹے اور فربہ نظر نہیں آتے اور رات ودن اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے لرزنے اور کانپنے کے سبب ظاہری طور پر نڈھال اور زرد رُو ہوتے ہیں لیکن ان کی گریہ وزاری کے نتیجے میں ان کے چہرے پر بہنے والے آنسوں ہر گھڑی ان کو ایک نئی فرحت ومسرت اور تازگی عطا کرتے رہتے ہیں اور ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی رونق اور نور نظر آتا ہے اور اللہ کی یاد کے جلوے ارغوانی رنگ کی طرح بڑے چمک دار اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔

جلوہ گاہِ حق دلِ عارف کی آہِ گرم میں
بارگاہِ کبریاء کی ترجمانی دیکھئے

اللہ والوں کی زبان سے نکلنے والی گرم آہیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کے قلوب جلوہ گاہِ حق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں تجلی فرماتے ہیں اس لیے یہ آہ وفغاں اور یہ گریہ وزاری اسی کی ترجمانی کرتا ہے جیسے کہ کسی جگہ پر اگر آگ موجود ہو تو اس کے اردگرد حرارت اور گرمی موجود ہوگی اور اگر ہم آگ کو نہ بھی دیکھ رہے ہوں تو حرارت اور گرمی سے ہم آگ کی موجودگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں تو یہ گاہ بگاہ کسی اللہ والے کا اپنے اللہ کی یاد میں آہیں بھرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اللہ کی تجلیاتِ قرب اس کے دل میں سما گئی ہے اور عشق خداوندی کی آگ لگی ہوئی ہے اور اس طرح یہ آہیں بارگاہِ کبریاء کی ترجمانی کررہی ہیں یہ مضمون دوسرے مواقع پر مزید تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔

عشق کی جادو بیانی

یوں تو عاشق بے زباں معلوم ہوتا ہے مگر
عشق کی تفسیر میں جادو بیانی دیکھئے

اللہ تعالیٰ کی محبت عطا ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی زبان زیادہ بولنے سے رک جاتی ہے اور بظاہر تصنع اور تکلف کے انداز میں گفتگو کا عادی نہیں رہتا نہ اس کو محض لفاظی کرنے میں مزہ آتا ہے بلکہ وہ صرف وہی بات کہتا ہے جو اس کے اندرونِ دل کی حالت کی ترجمانی کرے جیسا کہ حضرت والا نے ایک مقام پر اس کو یوں فرمایا۔

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

اس لیے اللہ کا یہ عاشق جب بھی کچھ بولتا ہے تو اپنے دل میں لگی ہوئی آگ سامنے کرتا ہے اس لیے پھر اس کے گفتگو میں اور اس کی داستان عشق میں عجیب وغریب قسم کی جادو بیانی ہوتی ہے کہ جس طرح جادو انسان کے دل کا رخ پلٹ کر رکھ دیتا ہے اسی طرح اس کے بیان کی تاثیرات زیادہ ہوتی ہیں کہ سننے والے کے دل کا رخ اللہ کی طرف پھر جاتا ہے اگر چہ وہ دل میں کتنے ہی غیر اللہ بسائے ہوئے ہو اور کیسے ہی حسین اور حسیناؤں کو اپنا دل دئے ہو لیکن اللہ کے دیوانے جب اپنے دل کی کہانی سنانے کھڑے ہوتے ہیں تو اس میں حق تعالیٰ ایسی تاثیر رکھ دیتے ہیں کہ ایسے مبتلا اور حرام کاریوں میں پھنسے ہوئے لوگ اس دلدل سے نکل کر باہر ہو جاتے ہیں اسی تاثیر کو حضرت والا نے اس شعر میں ذکر فرمایا ہے۔

اہل دل کے وعظ میں سوز وتڑپ کی دلیل

عاشقوں کا منبرِ دل پر بیانِ دردِ دل
وعظ میں آمیزشِ دردِ نہانی دیکھئے

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی زبان سے نکلنے والے جملوں میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے جس سے اہل مجلس کے دل بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے جملے اپنے اندر دلوں میں چھپے ہوئے درد کو لیے ہوئے ہوتے ہیں اور دل سے نکل کر ڈائریکٹ (Direct) اثر انداز ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر چہ بالکل سادہ الفاظ استعمال کریں اور بالکل عام فہم تعبیرات اختیار کریں لیکن پھر بھی ان کی تاثیر بہت زیادہ ہوتی ہے حتیٰ کہ ہم نے یہاں تک دیکھا کہ ایسے اہلِ دل لوگ کبھی ایک ہی مضمون کو بار بار دہراتے رہتے ہیں مگر ہر مرتبہ میں ان کی گفتگو کی تاثیر الگ ہوتی ہے اس کا راز یہی ہے کہ ان کے ان کلمات کے ساتھ دردِ نہانی کی آمیزش موجود ہے۔

چنانچہ مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ حضرت والا جنوبی افریقہ میں حضرت مفتی حسین بھیات رحمہ اللہ کے گھر پر

تشریف لایا کرتے تھے تو ہم لوگ وہاں حاضر ہوجاتے ایک دن ہم میں سے ایک بڑی عمر والے ساتھی آپس میں گفتگو کے دوران یہ کہنے لگے کہ روزانہ کالی گوری ہی کی بات ہوتی ہے اور دوسری تو کوئی بات ہوتی ہی نہیں اور اس سے اچھا بیان تو حضرت کے بیٹے مولانا مظہر دامت برکاتہم کرتے ہیں جب وہ اپنی بات پوری کر چکے تو میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ پھر آپ کو روزانہ مجلس میں جانے کی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت آپ گھر پر آرام کریں تو اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ارے میاں چھوڑو یہ بات تو اپنی جگہ پر مگر ان کے بیان میں لطف بہت آتا ہے اس لیے مجلس میں تو بہر حال جاؤں گا۔ یہی وہ بات ہے جس کو حضرت والا نے اس شعر میں پیش کیا ہے۔

داستانِ زخمِ دل اختؔر چھپاتا تھا مگر
روزِ محشر داغِ دل کی گل فشانی دیکھئے

صاحبو! اصل بات یہی ہے کہ انسان اپنے کمالات اور علمی، عملی صلاحیتوں کو خلق کی نگاہ سے مخفی رکھے تاکہ اخلاص میں خلل نہ پڑ جائے جیسا کہ ہمارے تمام اکابر اپنے حالات رفیعہ کو ہمیشہ چھپایا کرتے تھے اور جتنا انسان اپنے کو اللہ کے لئے مٹاتا اور چھپاتا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ اس کو ابھارتے اور چمکاتے ہیں اس پر ہمارے تمام اکابرِ دیوبند کے بے شمار واقعات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں خود حضرت والا کا یہ حال تھا کہ تقریباً ساٹھ سال تک اپنے کو اتنا چھپایا کہ نہ کوئی وعظ و بیان نہ کوئی شعر و شاعری اور نہ ہی کوئی تقریر سامنے آئی اکثر اشعار حضرت کے چھیاسٹھ (٦٦) سال کی عمر کے بعد ہوئے اور ایک مدت تک حضرت اس طرح رہتے رہے کہ علامہ یوسف بنوری نے حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کی خدمت میں حضرت والا کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ حضرت پھولپوری کے کوئی عام خادم ہیں کپڑے بھی بالکل عام اور معمولی درجے کے رہتے تھے، حضرت والا بالکل ساکت و صامت رہتے تھے لیکن اندر اندر سے دل اللہ کی محبت کی شراب کے نشے سے مست رہتا تھا اور راہِ خداوندی کے غم اٹھانے کی وجہ سے بڑے اونچے درجے کا دردِ محبت دل میں موجزن تھا کبھی نمایاں ہونے کی فکر نہیں ہوتی تھی اور نہ اپنے حالات ظاہر کرنے کی تمنا تھی۔

اور میر صاحب نے یہ بات بتلائی کہ شروع میں جب حضرت والا کی مجلس شروع ہوئی تو سوائے دو، تین آدمیوں کے کوئی شریک نہ ہوتا تھا جبکہ آج ہماری حالت یہ ہے کہ اندر سے ابھی خالی ہیں اور ظاہر و نمایاں ہونے کی کوششیں جاری ہیں اور روزِ اوّل ہی سے یہ تمنا رہتی ہے کہ مجلس شروع ہوتے ہی لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ ارد گرد اکھٹی ہو جائے یہ سب نیتیں غیر اللہ ہیں دل میں ایسی سوچ رکھ کر مجلسیں کرنا اخلاص پر مبنی نہیں ہے۔

اس لیے مومن کو تو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو مٹانا اور گم کرنا چاہیے اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو شہرت اور نام اور عزت و مقام لوگوں میں عطا فرمادے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا استحقاق سمجھ کر اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ الحمد للہ حضرت والا کی مجالس میں حاضر ہو کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کے قلب مبارک میں اپنی محبت و معرفت کا بڑا وافر حصہ اور عظیم خزانہ عنایت کیا ہے اور راہِ خداوندی میں اٹھائے گئے غموں اور تکلیفوں

کی بدولت دل پر ایسی چوٹیں لگی ہوئی ہیں کہ جس کی صحیح ترجمانی نظم ونثر کی کسی بھی شکل وصورت میں ممکن نہیں حقیقت میں اس کا اندازہ قیامت کے دن ہی ہوگا جب اسے بارگاہ الٰہی میں وزن کیا جائے گا اور پھر اللہ کی طرف سے اس پر خاص انعامات عطا ہونگے۔

جی اٹھو گے تم اگر بسمل ہوئے

سینکڑوں غم سے ملی ان کو نجات — جو تمہارے درد کے حامل ہوئے
تم نہیں حاصل تو کچھ حاصل نہیں — تم ہوئے حاصل تو سب حاصل ہوئے
آپ تک لائی جو موجِ رنج و غم — اس پہ قرباں سینکڑوں ساحل ہوئے
دردِ عشقِ حق بھی تم حاصل کرو — لاکھ تم عالم ہوئے فاضل ہوئے
یک زمانے صحبتِ با اولیاء — جس نے پائی ہے وہی کامل ہوئے
آشنائے دردِ جانِ سوختہ — دیکھ کر رندوں میں ہم شامل ہوئے
دیکھتے ہی دل مرا گھبرا گیا — زاھدانِ خشک جب نازل ہوئے
اختؔر بسمل کی تم باتیں سنو — جی اٹھو گے تم اگر بسمل ہوئے

مشکل الفاظ کے معنی:۔حامل: یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کو اٹھایا۔موج:لہر۔**یک زمانے صحبتِ با اولیاء**: ایک زمانہ کسی ولی کامل کی صحبت۔ **آشنائے دردِ جان سوختہ**:......۔**رندوں**:مراد اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب پینے والے۔**زاھدانِ خشک**:خشک صوفی۔**نازل ہوئے**: آئے۔ **بسمل**:زخمی۔

پرسکون زندگی کا آسان نسخہ

سینکڑوں غم سے ملی ان کو نجات
جو تمہارے درد کے بسمل ہوئے

یعنی حضرت والا زندگی گزارنے کا ایک ایسا طریقہ پیش فرماتے ہیں جس سے ہماری زندگی بہت آسان ہوجائے گی اور وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ کو راضی کرلو اور اس کو خوش کرنے کا غم اٹھالو تو سارے غموں سے (Safety) حاصل ہوجائے گی اور یہ طریقۂ حیات غم پروف (Proof) طریقہ ہے یعنی دنیا کے غموں سے چھٹی مل جائے گی اور ہم حضرت والا کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کیونکہ یہ وہ مطلوب اور مقصود ہے جس کے پیچھے دنیا کا ہر فردِ بشر دوڑ رہا ہے جتنے لوگ ہم یہاں مجلس میں بیٹھے ہیں آپ سب سے میں یہ سوال کرتا ہوں کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو رات دن کے ٹینشن (Tension) میں رہنا چاہتا ہو اور مختلف قسم کی ذہنی الجھنوں اور دماغی فکروں میں جینے کو پسند کرتا ہو نہ کوئی خوشی اس کے لئے خوشی ہو اور نہ ہی اس کو چین وسکون کی نیند آتی ہو کہیں معاش کی فکر لاحق ہو تو کہیں بیوی بچوں کی

طرف سے مختلف الجھنوں کا سامنا ہو کہیں خاندانی جھگڑے دماغ کو پریشان کیے ہوئے ہوں تو کہیں کورٹ اور کچہریوں کے مقدمات سے شب و روز کا سکون چھن گیا ہو غرض یہ کہ سینکڑوں انواع و اقسام کے غموم و ہموم اور الام و افکار کا سامنا ہو؟

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی شخص اپنے لیے دانستہ طور پر ایسی زندگی کو پسند کرے گا بلکہ ہر آدمی یہی چاہے گا کہ میں بے فکر ہو کر شب و روز مطمئن اور خوش و خرم رہوں اور اس طرح کی الجھنوں سے میری زندگی خالی ہو بس اس شعر میں ایسی ہی زندگی کے حصول کا نسخہ اور علاج پیش کیا گیا ہے اور دراصل یہ قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق آیت:۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۴۷۲)

جس کا خلاصہ یہ کہ مجھے ناراض کرنے والے تمام کاموں کو چھوڑ دو اور رضا کے کاموں میں لگ جاؤ تو ہر طرح کی پریشانی سے نجات مل جائے گی اور دنیا اور آخرت کی خوشی حاصل ہوگی اور دوسری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾

(سورۃ النحل، آیت:۹۷)

ترجمہ: جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہے تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک اچھی زندگی۔

(معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۳۸۶)

جو مومن خواہ مرد ہو یا عورت اعمالِ صالحہ اختیار کر کے زندگی گزارے گا تو ہم یقینی طور پر اس کو بالطف زندگی عطا کریں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب التوکل والصبر، ص:۴۵۳)

فرمایا کے مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے غلام! تم اللہ کی حفاظت کرو یعنی جو اللہ کے احکام ہیں ان کو بجالاؤ جس وقت کا جو حکم ہے اس کو پورا کرو ناراضگی والے عمل سے بچتے رہو اللہ تمہاری حفاظت فرمائیں گے اور تم اللہ کی حفاظت کرو یعنی ہر وقت اللہ کو یاد رکھو تو اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

مشکلات و مصائب کا حل

صاحبو! آج ہم مشکلات اور غموں سے بچنا چاہتے ہیں اور مصائب و حوادث سے حفاظت کے متلاشی ہیں مگر افسوس ناجائز طریقوں غلط سلط حرکتوں اور دین و شریعت کے مقابل راہوں میں تلاش کرتے ہیں کوئی یہ سوچ رہا ہے کہ جتنا میرا کاروبار بڑھے گا خواہ وہ سودی نظام پر مبنی ہو اور ناجائز چیزوں کو بیچنا پڑ رہا ہو اور مرد عورت کے مخلوط

نظام کاروبار کے ذریعے حاصل ہورہا ہو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کسی کو دھوکہ دے کر بیچ دیا کسی کا قرض ادا نہیں کیا کسی کے ساتھ جھوٹا وعدہ کر کے وعدہ خلافی کرلی کسی کو اصول شریعت کے خلاف سامان فروخت کردیا غرض یہ کہ جو بھی کرنا پڑا بلا تفریقِ حلال وحرام اور جائز و ناجائز سب کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنے لیے پرسکون جینے کے واسطے اور مصائب وحوادث سے محفوظ زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل طے شدہ اور مسلم بات ہے کہ اس طرح اللہ کی نافرمانیوں کے راستوں سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوسکتا۔

ضمنی طور پر یہ بات عرض کرتا ہوں زیادہ تر لوگ جنت میں اپنے معاملات کے درست ہونے کی وجہ سے داخل ہونگے اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سلوک وتصوف کے باب میں اور اصلاح وتربیت کی راہ میں صحت معاملات پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس کا بہت اہتمام تھا اور حقیقت میں کسی انسان کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے معاملات بہت اہم ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ کسی کو جانچنا اور پرکھنا ہو تو تین باتوں کے ذریعے سے پرکھو ایک تو اس کے ساتھ معاملہ کر کے دوسرا سفر کر کے اور تیسرا اس کا پڑوسی بن کر اللہ اللہ کر لینا یا کثرت سے نوافل پڑھ لینا ذکر وتسبیح میں آگے بڑھ جانا یہ سب انسان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے اور یہ اس کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار نہیں ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ اللہ کو راضی کرنے کا غم اختیار کرنے سے نہ ہمیں کسی طرح کے کاروبار کی ضرورت نہ زراعت وملازمت کی ضرورت نہ دوسرے دنیوی کام کرنے کی ضرورت یہ سب کام خود بخود ہوتے چلے جائیں گے ایسا سوچنا دراصل غلط فہمی کا نتیجہ ہے بلکہ منشاء یہ ہے کہ اپنی تجارت وملازمت اور حرفت وصنعت سب کچھ کرنے کے ساتھ اللہ کے حکم کا خیال دل میں رکھا جائے بس شریعت کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا ہی دل میں اللہ کی محبت کا درد وغم پا جانا ہے۔

مثلاً اس کو ایک مثال سے سمجھیں آپ بہ حیثیت ایک تاجر دکان پر کھڑے ہوئے ہیں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ایک بڑا خریدار آپ کی دکان پر حاضر ہوا وہ آپ سے ایک بڑی مقدار کا مال خریدنا چاہتا ہے اور آدھے گھنٹے بعد اس کی فلائٹ ہے اب اگر آپ نماز پڑھنے جاتے ہیں اور جماعت کی پابندی کرتے ہیں تو حکمِ خداوندی ادا ہو جاتا ہے اور اگر آپ اس کو سامان بیچنے میں نماز باجماعت کی کوئی پروا نہیں کرتے تو اگرچہ آپ صبح شام خوب ذکر اللہ کرتے ہوں اور تسبیحات پڑھتے ہوں مگر پتہ چل گیا کہ آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا غم موجود نہیں ہے اور ہر لمحہ اللہ پر فدا ہونے والی صفت سے آپ خالی ہیں۔

اور اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ اس عالم کے سارے معاملات چھوٹے یا بڑے خوشی کے یا غم کے موافق یا

مخالف غرض کہ کائنات کا ہر ذرہ نفع نقصان پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا محتاج ہے تو جو بندہ حق تعالیٰ کو راضی کر لیتا ہے اور جس حال میں بھی اللہ رکھے وہ اس حال کا حکم بجا لاتا ہے نعمت کی حالت ہو تو شکر کرتا ہے اور تکلیف کی حالت ہو تو صبر کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سارے فیصلے اس کے حق میں ہوتے ہیں اور وہ دنیا میں بالکل بے غم اور بے فکر ہو کر جیتا ہے۔

جس نے مولیٰ کو پالیا اس نے سب کچھ پالیا

تم نہیں حاصل تو کچھ حاصل نہیں
تم ہوئے حاصل تو سب حاصل ہوئے

دوستو! اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۴)

ترجمہ: سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔

(معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۵۷۱)

اللہ ہی نے ہم کو پیدا کیا ہے اور اسی اکیلا اللہ کا حکم ہمارے اوپر نافذ اور جاری و ساری ہوتا ہے اس لیے ہمیں جو بھی کچھ اسباب سے ہوتا نظر آتا ہے وہ در پردہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے تحت ہو رہا ہے تو بالکل واضح سی بات ہے کہ جس نے ایسے قادرِ مطلق اللہ کو پالیا تو پھر اس کو سب کچھ مل گیا اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ اگر اس ملک کا صدر کسی کا دوست ہو اور اس سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہو تو اسے اس ملک میں رہنے میں نہ تو کسی بھی موڑ پر کسی سے کوئی خوف و ڈر ہو گا اور نہ وہ کسی مقام پر اپنے کسی بھی مسئلہ میں پریشانی و دشواری محسوس کرے گا کیونکہ ملک کا سارا نظام اور اس کی حکومت کے سارے وزراء اس کے دوست کے (Order) اور فرمان کے تحت کام کرتے ہیں اس لیے اس سے سب ڈریں گے اور ہر طرف اس کے کام بہ آسانی ہوتے چلے جائیں گے اس کو جب بھی کوئی ضرورت پڑے گی تو اپنے صدر دوست کو بذریعہ فون یا کسی اور طریقے سے اس کی اطلاع دے اور سمجھو کے وہ کام فوراً وجود میں آجائے گا۔

جب کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس کی قدرت بھی کامل اس کے خزانے بھی لامحدود اور وہ فیصلوں میں بھی مکمل مختار اور ہم سے اتنے قریب کہ جب ہم چاہیں فوراً پکاریں ہر وقت ہماری پکار کو سننے والا عالم میں بسنے والی تمام مخلوقات اسکے قبضے میں تو پھر اس کو اپنا بنا لینے سے کیوں سب کچھ حاصل نہ ہو گا۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے ایک یا دو واقعے نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں واقعات ہیں کہ جنھوں نے سب کچھ اپنا اپنے اللہ پر لٹا کر اللہ تعالیٰ کو اپنا حامی و ناصر بنا لیا تو پھر ساری کائنات ان کی ہو گئی وقت کے بڑے بڑے بادشاہ ان کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور ان

کے رعب و دبدبے سے کانپ اٹھتے تھے۔

یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جس کو حضرات صحابہ وتابعین نے سمجھا اور بڑی مضبوطی اور خود اعتمادی کے ساتھ اختیار کیا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتے تھے لیکن ان حضرات کے اس نظریہ اور عقیدے میں ذرا جنبش نظر نہ آتی تھی بلکہ اَلْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِھِمْ کَالْجِبَالِ الرَّاسِیَاتِ (ایمان ان کے دلوں میں مضبوط پہاڑوں کی طرح تھا) کا جملہ ان کے اندرون دل کی حالت کا صحیح ترجمان تھا حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ ایک دن رومیوں سے جنگ کے موقعہ پر اپنے قافلے سے بچھڑ گئے سامنے شیر نظر آیا تو وہ اس کو خطاب کرکے کہتے ہیں اے شیر میں اپنے قافلے سے بچھڑ چکا ہوں تو یہاں آ اور مجھے سواری دے اور قافلے سے جاملادے تو وہ شیر دم ہلاتا ہوا حضرت سفینہ کے پاس آیا اور ان کو لے کر چل دیا حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ نے افریقہ کے جنگلوں میں صحابہ کرام کے پہنچنے کو اور وہاں کے درندوں کو اپنے خاص ایمانی لہجے میں خطاب کرنے کو یوں ذکر کیا ہے کہ ایک صحابی جنگل کے درندوں کو خطاب کرکے کہتے ہیں:

﴿اَیَّتُھَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوْا عَنَّا، فَاِنَّا نَازِلُوْنَ فَمَنْ وَجَدْنَاہُ بَعْدُ قَتَلْنَاہُ﴾

(معجم البلدان، حرف القاف والیاء ومایلیھا، ج: ۴، ص: ۴۲۱، دار الاحیاء التراث العربی)

کہ اے حشرات الارض (کیڑوں مکوڑوں) اور درندوں ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی یہاں پڑاؤ ڈال رہے ہیں اس لیے تم یہاں سے ہٹ جاؤ اور اگر ہمارے اس اعلان کے بعد ہم میں سے کسی نے تم کو یہاں پایا تو اسے قتل کردینگے۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں کہ یہ اعلان تھا کہ جو بجلی کے کرنٹ کی طرح پورے جنگل میں دوڑ گیا اور درندوں نے اس جنگل کو خالی کرنا شروع کردیا یہاں تک کے شیر اور ہاتھی اپنے بچوں کو پشت پر اٹھائے دوڑے جارہے تھے۔ ان واقعات سے مجھ کو صرف یہ بتانا ہے کہ جب کوئی دل وجان سے اللہ کا ہوجاتا ہے اور سر سے پیر تک اس کا بندہ بن جاتا ہے اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع ہوتا اور اسی کو اپنا کارساز سمجھتا ہے تو پھر ساری کائنات کا ذرّہ ذرّہ اسے اپنی حمایت میں دکھائی دیتا ہے۔ ہواؤں اور فضاؤں، جنگلوں اور سمندروں کو اس کی حمایت میں کردیا جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ساتھ نہیں ہے تو سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہیں اور اگر اللہ ساتھ ہے تو کچھ نہ ہوتے ہوئے سب کچھ ہے۔

آپ تک لائی جو موجِ رنج وغم
اس پہ قرباں سینکڑوں ساحل ہوئے

اس شعر میں بڑا عالی مضمون بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان دنیا کی مادی اور ظاہری ترقی میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور اپنی تمام ناجائز اور حرام خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں پوری کرنے پر اتر جاتا ہے کسی سے حرام محبت اور عشق کا سلسلہ قائم کیا اور اس میں اس کو کامیابی حاصل ہوگئی بلا امتیاز حلال وحرام مال و دولت

کے خزانے اور ڈھیرا کھٹے ہو گئے جاہ ومنصب کے تمام خواب شرمندہ تعبیر ہوتے دکھائی دینے لگے غرض یہ کہ جو کچھ اس نے اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا محل اپنے ذہن میں تعمیر کیا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا اور اس طرح اس کی کشتی ساحل کو لگ گئی تو اس کے متعلق حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں گو کہ یہ شخص ساحل پر پہنچ گیا اور بظاہر اس کو منزل مل گئی لیکن یہ ساحل پر پہنچ کر بھی طغیانی میں ہے اور منزل پر پہنچ کر بھی محرومِ منزل ہے ہاں وہ اللہ کا دیوانہ کہ اس نے خدا کو راضی رکھنے کے لیے مال ودولت کی زیادتی اور منصب وعہدوں کی پیش کش کو پیچھے ڈال دیا اور حسین حسیناؤں سے اپنے قلب کی پورے طور پر حفاظت کی خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی تکلیف اور مشقت اٹھانی پڑی جس کی وجہ سے اس کی ظاہری حالت خستہ وشکستہ اور فقر وفاقہ کی ہو اور بظاہر کچھ آزمائشوں کے عالم میں ہو لیکن اس سب کے باوجود یہ اللہ کا بندہ ساحل کے مزے لوٹ رہا ہے جیسا کہ حضرت والا کا دوسرا شعر ہے ؎

دشمنوں کو عیش آب و گل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا
ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
ہم کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

ان کو لڑکیاں ملی، ان کو معشوق اور معشوقائیں ملی شاندار ہوٹل اور بنگلے ملے لیکن کوئی ان کے حالِ دل کو جھانک کے دیکھے بے چینی و بے قراری کے عالم میں نظر آئے گا ان کی نیندیں اڑی ہوئی چین وسکون چھنا ہوا محسوس ہوگا یہی ساحل پر طغیانی ہے اور اللہ والے کو رنج وغم کی موجوں میں تیرتے ہوئے ساحل کا مزہ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو مٹانا حقیقی علم کی کنجی ہے

دردِ عشقِ حق بھی تم حاصل کرو
لاکھ تم عالم ہوئے فاضل ہوئے

اس شعر میں خاص طور پر اہل علم علماء اور طلباء کے لیے ایک اہم نصیحت ارشاد فرمارہے ہیں کہ مدارس میں پڑھنے پڑھانے سے علمِ نبوت تو مل جاتا ہے لیکن نورِ نبوت حاصل نہیں ہوتا جو کہ نسبتِ باطنی اور خاص تعلق مع اللہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تحفۃ العلماء کتاب میں اور التکشف میں بھی یہ مضمون تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے کہ اصل علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں حاصل ہونے والا ایک خاص نور ہے اور یہی حقیقت میں وراثتِ انبیاء ہے محض معلومات کا ذخیرہ نہیں اس لیے صرف کتابی معلومات پڑھ لینا اور سینوں میں محفوظ کر لینا علماء اور طلباء کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے مٹا کر اپنے دل کو معرفت کے نور سے روشن نہ کرلیں اور اپنے سینوں میں دردِ عشقِ حق حاصل نہ کرلیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ محض معلومات راہِ

سلوک میں ترقی کے لیے رکاوٹ اور آڑ ہے اور وہ حجاب بن کر انسان کو ایک طرح کے گھمنڈ اور بڑائی میں ڈال دیتی ہیں جو حقیقی علم اور نورِ باطنی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ درخواست کی کہ حضرت مجھے نصیحت فرما دیجئے اسی مجلس میں میرے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ بھی موجود تھے حضرت نے یہ واقعہ سنایا کہ حضرت تھانوی نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں اور آپ کو نصیحت تین مرتبہ وہ درخواست کرتے رہے اور حضرت یہی جواب دیتے رہے بالآخر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہم نے تو حضرت حاجی صاحب سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے اپنے کو مٹانا۔ بس یہ سننا تھا کہ وہ علامہ وقت عرب وعجم کے شہرت یافتہ فوراً آب دیدہ ہوگئے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور پھر اس کے بعد حضرت تھانوی سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کے نتیجہ میں ایسا دردِ محبت حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں بے قرار رہتے اور تڑپتے تھے اس ملاقات اور اس کے بعد کی حالت کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جو بعد میں خود علامہ پڑھتے تھے ؎

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی
پھر نہ پیدا شبہ باطل ہوا
آج وہ آیا مزہ قرآن میں
جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا
نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیر دور جام ہے

اور پھر حضرت تھانوی کے قدموں میں آکر پڑ گئے اور اپنے کو اللہ کے لیے مٹا ڈالا جس کے نتیجے میں علماء اور اہل اللہ کی نگاہوں میں ان کو بڑا مقام حاصل ہوا بس یہی اللہ کے لیے اپنے کو مٹانے کا نتیجہ ہوتا ہے خواجہ صاحب نے اسی کو فرمایا ہے ؎

ہاں مجھے مثل کیمیا خاک میں یوں ملائے جا
شان مری گھٹائے جا رتبہ مرا بڑھائے جا
سب ہوں حجاب برطرف دیکھوں تجھی کو ہر طرف
پردے یونہی اٹھائے جا جلوے یونہی دکھائے جا

اپنے کو مٹانے سے گو کہ ظاہری شان گھٹ جاتی ہے لیکن عند اللہ محبوبیت اور مرتبہ بلند ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں یہ وعدہ مذکور ہے:

﴿مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الاداب، باب الغضب والکبر، ص: ۴۳۴)

کہ جو اللہ کے لیے اپنی شان گھٹائے گا اور اپنے کو کمتر کرے گا اللہ اسے رفعت و بلندی عطا فرمائیں گے۔

یک زمانے صحبتِ با اولیاء
جس نے پائی ہے وہی کامل ہوئے
آشنائے دردِ جانِ سوختہ
دیکھ کر رندوں میں ہم شامل ہوئے
دیکھتے ہی دل مرا گھبرا گیا
زاھدانِ خشک جب نازل ہوئے

زہد کی اصل حقیقت دل سے دنیا کی محبت نکال دینا ہے اور غیر اللہ سے دل کو مکمل طور پر خالی کر دینا ہے جو آدمی دینی کاموں میں لگا ہوا ہو اور خوب ذکر واذکار وتسبیحات کرتا ہو لیکن اجنبی عورتوں اور امرد لڑکوں سے ملنے جلنے سے پرہیز نہ کرتا ہو اور گناہوں سے بچنے کا غم دل پر نہ اٹھاتا ہو اور اپنی حرام آرزوؤں کا خون نہ پیتا ہو یہ حقیقی زہد نہیں ہے اگر چہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر رات و دن اللہ اللہ کر رہا ہو اس لئے حقیقی زاہد وہ ہے جو دنیا کی چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور تمام شعبوں میں اللہ کی نافرمانی سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔ چاہے اس کے لیے کتنا ہی مجاہدہ اٹھانا پڑے۔

اخترؔ بسمل کی تم باتیں سنو
جی اٹھو گے تم اگر بسمل ہوئے

جس آدمی نے اللہ کے راستے میں جتنے مجاہدات اٹھائے ہوں اور اپنے دل کو غیر اللہ سے صاف کرنے میں دل کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں قربان کر دی ہوں اور کبھی ایذاءِ خلق کی صورت میں حاسدین کے حسد سے گزرنا پڑا ہو اور کبھی فقر و فاقہ اور معاش کی تنگی کی صورت حال سے دوچار رہا ہو اور حسینوں سے نظریں اور دل بچانے میں جان کی بازی لگا دی ہو اور مجرمانہ حرام لذتیں اور ناجائز خواہشات کے مزوں کے قریب نہ گیا ہو تو ایسا آدمی اس کا مستحق ہے کہ اسے بسمل کہا جائے اس لیے حضرت والا کیونکہ ان حالات سے گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ مشقتیں اٹھائی ہیں تو اپنے کو اختر بسمل سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں تڑپنا اور آہیں بھرنا عطا فرما دیا اور ایک ایسی حیات عطا کر دی جو رشکِ صد حیات ہے تو پھر یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جو حضرت والا کی عشق و محبت کی داستان سنے گا وہ خود اللہ تعالیٰ کی یاد میں تڑپ اٹھے گا اور پھر وہ ایسا مزہ پائے گا کہ اسے محسوس ہوگا کہ مجھے نئی حیات میسر ہوئی ہے اور اپنی گزری ہوئی حیات کو ننگِ صد ممات کہنے پر مجبور ہوگا کیونکہ نافرمانی اور گناہوں کے ساتھ حقیقی لذتِ حیات سے محرومی رہتی ہے جیسا کہ یہ مضمون جگہ جگہ حضرت والا کی کتاب میں موجود ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شیخ و مرشد اور مصلح و مربی جتنے مجاہدات سے گزرا ہوگا اور اس کے قلب میں

جیسی اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ لگی ہوگی تو پاس بیٹھنے والوں کے قلوب بھی اس کی حرارت وگرمی اور نور و تجلی سے اسی قدر متاثر ہونگے۔ چنانچہ ایک مقام پر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ قلوب اولیاء کی مثال پیش کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک آئینہ ہوتا ہے جب اسے سورج کے سامنے کیا جاتا ہے اور پھر اس آئینہ کے ذریعے سے سورج کا عکس اور روشنی کسی کاغذ پر پڑتی ہے تو کبھی تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ کاغذ منور اور روشن ہو جاتا ہے اور کبھی اس شیشے کی مزید حرارت وگرمی اور چمک دمک کے نتیجہ میں روشن ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں آگ لگ جاتی ہے اور دھواں اٹھنے لگتا ہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ ٹھیک اسی طرح اللہ والوں کے دلوں کی حرارت ہوتی ہے کہ بعض کے دل تو ایسے ہوتے ہیں جو پاس بیٹھنے والوں کے دلوں پر ایسی حرارت اور گرمی پہنچاتے ہیں کہ ان کے دل اس سے روشن ہو جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جو ان کے دلوں میں عشق و محبت کی آگ لگا دیتے ہیں اس کا مدار اسی پر ہے کہ جتنا جس بزرگ نے مجاہدہ اٹھایا اور دل کو چمکایا اتنا ہی اس کے قلب میں انوار و تجلیات پیدا ہوئیں۔

نہیں آتے نظر لیکن پرِ پرواز آہوں کے

محبت تیرا صدقہ ہے ثمر ہیں تیرے رازوں کے
جو میں یہ نشر کرتا ہوں خزانے تیرے رازوں کے

زمیں پر ہیں مگر کیا رابطہ ہے عرشِ اعظم سے
نہیں آتے نظر لیکن پرِ پرواز آہوں کے

جدھر دیکھو فدا ہے عشق فانی حسن فانی پر
فدا اللہ پر ہیں قلب و جاں اللہ والوں کے

تجھے دھوکہ نہ دے فانی بتوں کی عارضی رنگت
کبھی دیکھو گے تم قبروں میں ابتر حال لاشوں کے

جو اہلِ دل کے جوتوں سے لگے ہیں خاک کے ذرّے
شرف حاصل ہے ان کو موتیوں پر تاج شاہوں کے

چمن میں جیسے ہوتی ہے عنادل کی پذیرائی
کہیں وہ مرتبے ہوتے ہیں صحراؤں میں زاغوں کے

وہ سب کے ساتھ رہ کر بھی خدا کے ساتھ رہتے ہیں
مگر کچھ اہلِ دل ہی آشنا ہیں ایسے رازوں کے

وہ کرگس جو کسی مردہ پہ ہوتا ہے فدا اختؔر
وہ کیا جانے کہ کیا رتبے ہیں ان کے شاہبازوں کے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ ثمر: پھل۔ نشر: بیان۔ پرِ پرواز آہوں: آہوں کی پرواز کے پر۔ عارضی رنگت: ختم ہوجانے والی خوبصورتی۔ ابتر حال: بری حالت۔ اھلِ دل: اللہ والے۔ شرف: رتبہ۔ چمن: باغ۔ عنادل: بلبل۔ پذیرائی: عزت افزائی۔ زاغوں: کوّے۔ آشنا: واقف۔ کرگس: گدھ۔ شاھبازوں: مشہور پرندہ کا نام جو بادشاہوں کی کلائیوں بیٹھتا ہے۔

راہِ خداوندی کے مجاہدات اور ان کا ثمرہ

محبت تیرا صدقہ ہے ثمر ہیں تیرے رازوں کے
جو میں یہ نشر کرتا ہوں خزانے تیرے رازوں کے

﴿مَا زَہِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَنْطَقَ بِھَا لِسَانَہٗ وَبَصَّرَہٗ عَیْبَ الدُّنْیَا وَدَاءَ ھَا وَدَوَاءَ ھَا وَاَخْرَجَہٗ مِنْھَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص:۴۴۳)

جس کا حاصل یہ ہے کہ جب بندہ زہد اختیار کرتا ہے اور اپنے دل کو غیر اللہ سے صاف کر لیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے قلب میں خاص علم وحکمت کا درخت پیدا کر دیتے ہیں اور پھر اس کی زبان کو اس کا بیان سکھا دیتے ہیں اور اسے دنیا کی خرابیاں اور بیماریاں دکھا دیتے ہیں اور دنیا سے اس حال میں اٹھاتے ہیں کہ وہ سب سے محفوظ رہتا ہے اس لیے حقیقت میں اللہ والوں کو جو علوم عطا ہوتے ہیں وہ خاص اسرار وحِکَم خداوندی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے اور قلب کے مزکّٰی ومجلّٰی ہونے کے بعد عطا کیے جاتے ہیں پھر اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے وہ نہر جو ایسے سمندر سے وابستہ ہو جائے جس کی کوئی حد اور کنارہ نہ ہو اور ایسے خاص علمی باتیں ان کو عطا ہوتی ہیں کہ جو عام طور پر کتابوں میں لکھی ہوئی نہیں ہوتیں اور پھر ان کا طرزِ بیان بھی ایسا انوکھا اور نرالا عطا کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

اسی لیے تاریخ گواہ ہے کہ امت میں جب بھی انقلاب آیا تو وہ اولیاءِ امت اور خاصانِ خدا علمائے ربانیین کے ذریعے سے آیا کہ جن کی نگاہوں میں دنیا کے عیوب اور اس کی خرابیاں موجود ہوتی تھیں اور اس لیے وہ دنیا کی چیزوں کو اپنا دل نہ دیتے تھے تو دنیا کی محبت کی بیماری سے وہ محفوظ اور سلامت رہتے تھے یہی بات اس شعر میں مذکور ہے کہ میں نے توفیق الٰہی سے جو اللہ کی راہ میں اس کے ناز اٹھائے ہیں تو مجھے اللہ نے ایسی قوی محبت عطا فرما دی اور اپنے دین کے اسرار وحِکَم عطا فرما دیئے ورنہ میں اس قابل نہ تھا اے اللہ! سب کچھ آپ ہی کی عطا ہے۔

فرش پر رہتے ہوئے عرش سے رابطہ

زمیں پر ہیں مگر کیا رابطہ ہے عرشِ اعظم سے
نہیں آتے نظر لیکن پر پرواز آہوں کے

بندۂ مومن زمین پر رہتے ہوئے اپنی ادائے بندگی کے ذریعے عرشِ اعظم سے رابطہ کیے ہوتا ہے خاص طور پر جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اشکبار ہوتا ہے اور آہ وفغاں کرتا ہے تو اس کی یہ آہ وفغاں ڈائریکٹ اسے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے جیسا کہ ایک روایت میں ذکر لا الٰہ الا اللہ کے متعلق ارشادِ نبوی ہے کہ:

﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَيْسَ لَهَا حِجَابٌ دُوْنَ اللّٰهِ حَتّٰى تَخْلُصَ اِلَيْهِ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ثواب التسبیح والتحمید، ص ۲۰۲)

لا الٰہ الا اللہ اور اللہ کے درمیاں کوئی حجاب نہیں ہے تو اس طرح بندہ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر عرشِ اعظم سے رابطہ کر لیتا ہے اگرچہ دنیا کی مخصوص چیزوں کی طرح بندہ کی آہ وزاری اور ذکر اللہ میں پر نظر نہیں آتے اس لیے ذاکرین فرش پر ہوتے ہوئے عرش پر ہوتے ہیں۔

عشقِ مجازی ایک وبائی بیماری ہے

جدھر دیکھو فدا ہے عشقِ فانی حسنِ فانی پر
فدا اللہ پر ہیں قلب و جاں اللہ والوں کے

عام طور پر دنیا میں اللہ کو نہ ماننے والے ہر دور میں زیادہ رہے ہیں اہلِ ایمان کی تعداد کم رہی ہے جیسے کہ قرآن کی بے شمار آیات میں اس کا تذکرہ موجود ہے پھر ان مومنین میں خاص وہ لوگ جو ہر گھڑی اللہ پر فدا ہوتے ہیں اور اپنے دل و جان کو اللہ کے لیے وقف کیے ہوئے ہوں ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں اس لیے اکثریت کے اعتبار سے یہ بات فرمائی جارہی ہے کہ جدہر دیکھو تو عشقِ فانی کا دور دورہ نظر آرہا ہے خاص طور پر اس زمانے میں جب کے بے حیائی کے آلات و اسباب اور ذرائع و وسائل ہر سمت پھیلے ہوئے ہیں گندی فلمیں، ٹی وی پر چلنے والے حیا سوز مناظر اور اخبار ورسائل، انٹرنیٹ وموبائل پر آنے والی نامحرم عورتوں کی تصویریں اور ان کی حرام محبتوں کی داستانیں گھر گھر نظر آرہی ہیں اور یہی نفس وشیطان کے آلۂ کار کفار اور دشمنانِ اسلام یہود ونصاریٰ کی مسلمانوں کو دین سے دور کرنے اور ان میں بے حیائی اور بے دینی اور فسق وفجور کو رواج دینے کے لیے استعمال کی جانے والی چیزیں ہیں جس کی وجہ سے پورے معاشرے میں یہ عشقِ مجازی کی بیماری ایک سخت وبائی مرض کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور یہاں تک کے لوگ اس میں پڑ کر اپنے دین وایمان تک کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔

اس لیے اس شعر میں مقصود یہ ہے کہ اللہ کا جو صحیح بندہ ہوگا وہ حسنِ فانی کے چکر میں نہیں آئے گا بلکہ وہ تو خالقِ حسن وحسین کے اوپر فدا ہو کر اپنے قلب و جاں کو سکون دائمی اور راحتِ ابدی کا سامان فراہم کرے گا اور اسی سے یہ سبق بھی نکلتا ہے کہ مصلحین امت کو امت کے حالات سے باخبر رہنا چاہیے تاکہ جو مرض و بیماری معاشرے میں پھیلے قرآن وسنت سے اس کا علاج تلاش کر کے لوگوں میں پیش کیا جاسکے جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ دنیا بھر کے ڈاکٹرز مختلف اوقات میں جسمانی نئی بیماریوں اور ان کے علاج پر تبادلۂ معلومات وتحقیقات کے لیے سارے عالم سے وقتاً فوقتاً جمع ہوتے ہیں اللہ جزائے خیر دے حضرت والا کو کہ حضرت نے اس مرض کی سنگینی کو اور اس کے عموم و شیوع کو امت کے دین وایمان کے لیے زہرِ قاتل سمجھا اور اس سے لوگوں کو بچانے کے لیے سارے عالم میں اپنی کوششوں کا جال بچھا دیا حتیٰ کہ بعض عرب حکومتوں نے حضرت والا کی کچھ کتابیں جو خاص طور پر اس موضوع سے

متعلق تھیں چھاپنے اور ان کے تقسیم کرنے کی باضابطہ سرکاری اجازت عطا کی ہے۔

عشقِ مجازی کا ایک بہترین علاج

تجھے دھوکہ نہ دے فانی بتوں کی عارضی رنگت
کبھی دیکھو گے تم قبروں میں ابتر حال لاشوں کے

اس شعر میں ذکر کردہ مضمون گویا ان لوگوں کے لیے علاج کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اس مرض میں مبتلاء ہیں کہ ایسے حسن کو دل دینا اور فریفتہ ہونا کہ جس کو جلد ہی زوال لاحق ہونے والا ہے اور جس کی چمک دمک عنقریب ختم ہو جانے والی ہے جو قبر میں پہنچ کر گلنے سڑنے والے ہیں جن کو ایک وقت کیڑے مکوڑے کھا رہے ہوں گے تو اس عشقِ مجازی کا انجام اخیر میں پشیمانی اور ندامت وشرمندگی ہے اس لیے عارضی رنگت کو چھوڑ کر اپنے عشق ومحبت کا رخ ان کو رنگ وروغن دینے والے اللہ تعالیٰ کی طرف ہونا چاہیے یہ بہترین علاج ہے کہ بندہ اپنے معشوق و معشوقاؤں کے متعلق اس کے گلنے سڑنے اور اس کے اندر کی آلائش اور گندگی کا تصور کرے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ مضمون منقول ہے کہ اگر کسی کے حسن کی طرف نظر پڑ جائے اور دل میں میلان محسوس ہو تو اس کی آلائشوں اور گندگیوں کی طرف خیال کرے۔ خود حضرت والا نے بعض حضرات کو یہ علاج تجویز کیا کہ اگر کسی کی طرف طبیعت میں اس طرح میلان محسوس کرو تو تھوڑی دیر کو یہ تصور کرلو کہ اس کے بدن کی اندر کی گندگی اس کے جسم پر چاروں طرف لگی ہوئی ہے اور اس پر ہزاروں مکھیاں بیٹھی ہیں۔

گو کہ ظاہر میں تہذیب کے دعوے داروں کے لیے یہ بات بڑی خراب اور بھونڈی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایمان کو بچانے کے لیے اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے اس طرح کی کارروایاں بطور علاج کے کرنا انتہائی موثر اور مفید اور لازم وضروری ہے جیسا کہ اس نوع کے خاص واقعات اللہ تعالیٰ کے بندوں سے ثابت اور منقول ہیں اس لیے کہ ہمارے اکابر نے اس ظاہری حسنِ مجازی سے بچنے کے لیے اس قدر احتیاط اختیار فرمائی کے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق علامہ شامی نے لکھا ہے:

﴿وَ كَانَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ صَبِيْحًا وَّ كَانَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ يُجْلِسُهٗ فِيْ دَرْسِهٖ خَلْفَ ظَهْرِهٖ مَخَافَةَ خِيَانَةِ الْعَيْنِ مَعَ كَمَالِ تَقْوَاهُ﴾

(رد المحتار، کتاب الحظر والاباحۃ)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام محمد کی والدہ سے نکاح کیا تھا، امام محمد ان کے سوتیلے بیٹے بھی تھے لیکن پڑھائی کے زمانے میں ان کے حسن کی وجہ سے امام ابوحنیفہ ان کو اپنے پیچھے بٹھاتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب امام محمد رحمہ اللہ کے خوب ڈاڑھی آگئی اور امام ابوحنیفہ نے چراغ کی روشنی میں ان کی ڈاڑھی دیکھی تو فرمایا کہ اب سامنے بیٹھ جاؤ۔ حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مولوی شبیر علی صاحب رحمہ اللہ سے فرماتے تھے جو

خانقاہ تھانہ بھون کے مہتمم تھے کہ میری تنہائیوں میں بے ریش لڑکوں کو مت بھیجا کرو۔ یہ ہے اللہ والوں کا عمل۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ

جو اہلِ دل کے جوتوں سے لگے ہیں خاک کے ذرّے
شرف حاصل ہے ان کو موتیوں پر تاجِ شاہوں کے

حضرت والا کے ایک بیان میں احقر نے سنا کہ علامہ انور کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اولیاء اللہ کے قدموں کی خاک کے ذرّوں کو بادشاہوں کے سروں پر تاجوں کے موتیوں سے افضل سمجھتا ہوں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بادشاہوں کے سروں پر رکھا ہوا تاج اور اس کے موتی یہ دنیا کی ظاہری حکومت اور بڑائی اور جاہ و منصب کی ترجمان ہیں جب کے زمین کے وہ ذرّات اولیاء اللہ کے قدموں سے لگنے اور پچ ہونے کے سبب بڑی اونچی نسبت کے حامل ہیں اسی لیے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین جس پر کوئی اللہ والا بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا ہے قیامت کے دن اس کے حق میں اللہ کے سامنے گواہی دے گی اور یہی تفسیر مفسرین نے قرآن کریم کی اس آیت کی کی ہے:

﴿یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰی لَهَا﴾

(سورۃ الزلزال، آیت: ۴-۵)

ترجمہ: اس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا اس کو۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۸۰۰)

اور حدیث شریف میں یہ بات موجود ہے کہ بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو منجملہ دوسرے امور کے جو میت کو پیش آتے ہیں ایک بات یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ نیک بندے سے زمین یہ کہے گی جب تو میرے اوپر چلتا تھا تو تو مجھے بہت محبوب تھا آج تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کتنا اچھا سلوک کروں گی اور اس کے برعکس بدکار آدمی کا معاملہ ہے۔ اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ شاہوں کے موتیوں کو خاک کے ان ذرّوں سے کوئی نسبت نہیں۔

زاغ کو بلبل سے کیا نسبت

چمن میں جیسے ہوتی ہے عنادل کی پذیرائی
کہیں وہ مرتبے ہوتے ہیں صحراؤں میں زاغوں کے

چمن میں جو مقام بلبل کا ہوتا ہے وہ پھولوں کی خشبوؤں پر چہچہاتی پھرتی ہے اور چمن کی زینت بنتی ہے وہ مقام اور مرتبہ صحراؤں اور جنگلوں میں رہنے والے زاغ اور کوے کو حاصل نہیں ہوسکتا اس لیے اللہ والے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست و سرشار رہتے ہیں اور اس کے قرب کی لذت اور معرفت کی خوشبو سے آشنا ہوتے ہیں ان کا مقابلہ ان دنیا پرستاروں سے کیا ہی نہیں جاسکتا کہ جن کا کل مطمحِ نظر اور مقصود جدوجہد دنیا اور اس کی حرام لذتیں ہوتی

ہیں وہ حقیقت میں جہاں مرتے ہیں اور جن پر فدا ہوتے ہیں وہ صحرا و بیابان میں رہنے والے کوؤں اور ویرانوں میں بسنے والے الوؤں سے کم نہیں اور یہ بات محض سمجھانے کے لیے ایک تعبیر اور اصطلاح کے طور پر فرمائی گئی ہے ورنہ اللہ والے جو اللہ کی معرفت کے گلشن میں رہتے ہیں ان کو دنیا داروں کے ویرانوں اور صحراؤں سے تقابل کیا ہی نہیں جا سکتا اس لیے مومن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو مثل عنادل و بلبل کے بنائے اور اپنے دل کو اللہ پر فدا کرے۔

مخلوق میں رہتے ہوئے خالق کے ساتھ رہنا

وہ سب کے ساتھ رہ کر بھی خدا کے ساتھ رہتے ہیں
مگر کچھ اہل دل ہی آشنا ہیں ایسے رازوں کے

اہل اللہ کی ایک خاص شان ذکر کی جا رہی ہے ظاہر میں صبح و شام تک کے کیے جانے والے فطری بشری تقاضے پورے کرنے اور کاموں کو انجام دینے میں، اور لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے اور رہنے سہنے میں وہ بالکل عام انسانوں کی طرح نظر آتے ہیں کھانا پینا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا غرض کہ تمام بشری امور اور تقاضوں میں ہم اپنی نگاہوں سے ان کو عام انسانوں کی طرح دیکھتے ہیں اور خلقِ خدا میں رہ کر اپنا کوئی نیا مقام نئی امتیازی شان اور خاص مرتبہ کے متلاشی نہیں ہوتے مگر جو اہل دل ہوتے ہیں وہ اس راز سے خوب آشنا ہوتے ہیں کہ یہ اللہ کے دیوانے عین اسی وقت میں جب کہ مخلوق کے ساتھ واصل ہیں اللہ سے بھی واصل ہوتے ہیں جسم ان کا خلق کے ساتھ مگر دل خالق کے ساتھ رہتا ہے سو جسم سے واصل مع الخلق اور قلب سے واصل مع اللہ ہیں اس لیے بسا اوقات ظاہری بعض معاملات میں ان سے ایسے اعمال صادر ہو جاتے ہیں جس سے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نہ معلوم یہ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں جیسا کہ حضرت والا کا ایک شعر ہے ؎

نظامِ ہوش کا اخترؔ ہے اب خدا حافظ
ہماری روح کہیں ما وراء عالم ہے

اور یہ ہر بزرگ کا اندرونی اللہ سے تعلق اور فنائیت کے اعتبار سے الگ الگ نوعیت کا معاملہ ہوتا ہے بعضوں کو بکثرت اس حال میں دیکھا جاتا ہے غرض یہ ہے کہ یہ اہل دل سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی خدا کے ساتھ رہتے ہیں دکانوں اور کاروباروں میں بیوی اور بچوں میں غمی اور خوشی میں وہ خلق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں مگر دل میں خالق کے ساتھ جڑے رہتے اور اس کو یاد کرتے اور اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے دینِ اسلام میں یہ تعلیم نہیں ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لوگوں سے علیحدہ ہو جائے اور اقربا و اعزہ اور رشتہ دار اور تعلق والوں سے علیحدہ ہو کر اللہ کو یاد کرے بلکہ کمالِ بندگی یہی ہے کہ ادائے حقوقِ خلق کے ساتھ خالق سے غافل نہ رہے۔

وہ کرگس جو کسی مردہ پہ ہوتا ہے فدا اختر
وہ کیا جانے کہ کیا رُتبے ہیں ان کے شاہبازوں کے

گدھ ایک ایسا جانور ہے جس کی غذا مردار ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کو ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اسی پر فدا ہوتا ہے جب کہ شاہباز زندہ جانوروں کا شکار کرتا ہے اور ان کا متلاشی ہوتا اور ان پر فدا ہوتا ہے وہ لوگ جو اس گھٹیا دنیا اور اس کے فانی بتوں معشوق اور معشوقاؤں پر مرتے ہیں اس کی مثال اس گدھ کی طرح ہے اور جو اپنی زندگانی خاص طور پر جوانی کو جوانی کے دینے والے اللہ پر فدا کرتا ہے وہ شاہباز کی طرح ہے اس لیے اس میں یہ سبق ہے ۔

کسی خاکی پہ مت کر خاک اپنی زندگانی کو
جوانی کر فدا اس پر کہ جس نے دی جوانی کو

پریشانئ حسن وشادانئ دیوانۂ حق

ہر حسن مجھے خوابِ پریشاں نظر آیا
دیوانۂ حق بس مجھے شاداں نظر آیا
چھایا ہے جب سے دل پہ تری یاد کا عالم
ہر ذرّہ مجھے منزلِ جاناں نظر آیا

مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے

گناہوں سے جو ظالم شادماں معلوم ہوتا ہے
مٹانا نفس کا اس کو گراں معلوم ہوتا ہے

جو ڈرتا ہے خدا کی راہ میں خونِ تمنا سے
وہ ظالم ننگ روباہِ جہاں معلوم ہوتا ہے

جو کر لے نفس امّارہ کو قابو میں تو وہ سالک
فقیری میں بھی سلطان جہاں معلوم ہوتا ہے

یہ خاکی ذکر کی برکت سے ہے فوق السماء لیکن
زمیں پر بھی نزول آسماں معلوم ہوتا ہے

دوام ذکر سے سنتا ہوں مل جاتی ہے وہ نسبت
کہ ان کو بھولنا کوہِ گراں معلوم ہوتا ہے

گزرتا ہے کبھی دل پر وہ غم جس کی کرامت سے
مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے

حقیقت میں ترا ہی آستاں داتا ہے عالم کا
مگر اسباب کا پردہ یہاں معلوم ہوتا ہے

کرم ہے دل پہ مالک کا بہ فیض مرشد کامل
کہ ہر ذرّہ یہاں ان کا نشاں معلوم ہوتا ہے

چمن میں جس کی تھی تنقید ہر دم ہر نشیمن پر
دھواں دیتا اسی کا آشیاں معلوم ہوتا ہے

ہمارے نالۂ درد محبت پر تعجب کیا
یہ انعام نگاہ بزرگاں معلوم ہوتا ہے

خدا کے فضل سے نسبت جسے حاصل ہوئی اخترؔ
پھر اس کا فیض فیض بے کراں معلوم ہوتا ہے

مشکل الفاظ کے معنی:۔شادماں: خوش۔ گراں: مشکل۔ خونِ تمنا: حرام خواہشات کا خون کرنا۔ نفس امّارہ: نفس کی وہ حالت جس میں وہ گناہ کا بہت زیادہ تقاضا کرتا ہے۔ سالک: کسی مرشد کامل کی صحبت میں اللہ کا راستہ طے کرنے والا۔ سلطان: بادشاہ۔ خاکی: مٹی سے بنا ہوا، مراد جسم۔ فوق السماء: آسمان سے بھی بلند۔ دوام: پابندی۔ نسبت: اللہ تعالیٰ تعلق خاص۔ کوہِ گراں: پہاڑ جیسا بوجھ۔ آستاں:...... داتا:......۔ تنقید:......۔ نشیمن:......۔ آشیاں: گھونسلہ۔ بے کراں:......۔

مہربانیاں جیسی قربانیاں ہیں

گناہوں سے جو ظالم شادماں معلوم ہوتا ہے
مٹانا نفس کا اس کو گرا معلوم ہوتا ہے

جس آدمی کو دنیا میں رہ کر اللہ کی نافرمانیوں میں زندگی گزارنے کی عادت ہو جاتی ہے اور اسے اس میں لذت اور خوشی محسوس ہوتی ہے تو پھر اس پر نفس کو مٹانا بڑا دشوار ہوتا ہے تمنا کے باوجود نفس کے تقاضے پر عمل نہ کرنے کی ہمت کمزور پڑ جاتی ہے خطوط میں بکثرت سالکین اس طرح کی باتیں پوچھتے ہیں کہ میں کیا کروں مجھ سے فلاں گناہ چھوڑا نہیں جا رہا ہے سو ایسے ظالم کو سمجھ لینا چاہیے کہ گناہوں میں پڑھ کر خوشی حاصل کرنے کی جو عادت پڑھ گئی ہے اس کی وجہ سے گناہ چھوڑنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے اور جب تک گناہ نہ چھوڑے جائیں اور نفس کو نہ مٹایا جائے خلاف شریعت آرزوؤں کا خون نہ کیا جائے تو اس وقت تک نہ سلوک طے ہوتا ہے اور نہ کوئی خدا کا ولی بن سکتا ہے چاہے کتنے ہی حج وعمرے کر رہا ہو اور کیسے ہی چلا کشی میں مشغول ہو لیکن گناہوں کا چھوڑنا ولایت کی اصل اور جڑ ہے۔ اعلانِ خداوندی ہے:

﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾

(سورۃ الانفال، آیت: ۳۴)

ترجمہ: اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو ہیں پرہیزگار۔ (معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۲۲۵)

جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوست صرف وہ مسلمان ہیں جو گناہوں سے بچنے والے ہیں اس لیے ترک معصیت شرط ولایت ہے جو سالک گناہوں کو نہ چھوڑ کر ولایت کا خواب دیکھ رہا ہو تو یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا حضرت والا کے ایک وعظ میں بحوالہ حضرت تھانویؒ اس کی ایک بہترین مثال دی گئی ہے کہ وہ گناہ اس کے لیے عادت بن جانے کی وجہ سے لقمہ شیریں بن چکے ہیں اس لیے ان کو چھوڑتے ہوئے نفس پر بہت زور پڑتا ہے۔ سو جس طرح کسی کے منہ کو لگا ہوا لذیذ لقمہ شیریں چھڑانا بڑا مشکل ہوتا ہے اسی طرح اس وقت اس کا گناہ کو چھوڑنا مشکل ہو رہا ہے سو ایسی صورت میں اگر یہ مجاہدہ کر کے اور دل پر زور ڈال کر اللہ کے لیے قربانی پیش کرے تو پھر اللہ اس پر اپنے تک پہنچنے کی راہ کھول دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(سورۃ العنکبوت، آیت: ۶۹)

ترجمہ: اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں اور بے شک اللہ ساتھ ہے نیکی کرنے والوں کے۔ (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۷۱۲)

صاحبو! بندہ جس درجے کا مجاہدہ اختیار کرتا ہے اس پر اللہ کی طرف سے ویسا ہی انعام ملتا ہے اس لیے
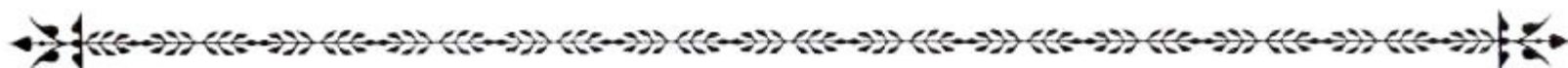
مقولہ ہے ''المشاہدۃ بقدر المجاہدۃ'' کہ جیسا مجاہدہ ہوتا ہے ویسا ہی مشاہدۂ حق عطا ہوتا ہے اس لیے جو گناہوں کا عادی ہے وہ نہ ہمت ہارے اور نہ گھبرائے بلکہ دلیرانہ اور جرأت مندانہ اقدام کر کے گناہ کو بالکل چھوڑ دے تو اسے فوراً اتنا ہی اونچے درجے کا مقامِ ولایت عطا ہوگا۔

مجھے یاد ہے حضرت والا کا ایک بیان جنوبی افریقہ میں ریڈیو اسلام (Radio Islam) پر ہوا تو احقر سن رہا تھا کہ حضرت یہ خاص بات ارشاد فرما رہے تھے کہ اے جنوبی افریقہ والو! میں سلوک اور تصوف کو بہت آسان کر کے پیش کرتا ہوں اور تم سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ فرائض و واجبات اور سنن موکدہ کی ادائیگی کے بعد (جو کہ مختصر ہیں) بس ایک کام کرلو اور وہ یہ ہے کہ نہ کرو (یعنی گناہ نہ کرو) اللہ کی نافرمانی نہ کرو تو ولایت اور تقویٰ حاصل ہوجائے گا خود قرآن اس کے تقویٰ کی ضمانت اور سرٹیفکیٹ (Certificate) دے رہا ہے جیسا کہ اوپر آیت گزری ہے نوافل و تسبیحات کی کثرت کیفیات و احوال کا طاری ہونا، کشف و کرامات کا صادر ہونا ولایت نہیں کہلاتا بلکہ ولایت کا مدار اس پر ہے کہ ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی اپنے مولیٰ کو ناراض نہ کیا جائے ایک سانس بھی کسی گناہ اور نافرمانی کی طرف التفات نہ کیا جائے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں ہے:

﴿یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ کُلَّہٗ وَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ﴾

(السنن الکبری للنسائی، کتاب عمل الیوم واللیلۃ، باب ما یقول اذا امسی، ج: ۹، ص: ۱۴۷)

کہ اے اللہ! مجھے پلک جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کے حوالے نہ کرنا یعنی اتنی دیر کے لیے بھی میں آپ سے غافل نہ ہوں اس لیے اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ بہت آسان ہے ہمارے قابو اور قدرت سے باہر نہیں ہے بس ہمت مردانہ چاہیے۔

گناہ گار شاد ماں معلوم ہوتا ہے مگر ہوتا نہیں

اس تعبیر کو اختیار کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ خدا کی نافرمانی میں ڈوبا ہوا ظالم انسان اور گناہوں میں حرام لذتیں اٹھانے والا اگرچہ دیکھنے میں شاد ماں اور خوش معلوم ہو رہا ہو لیکن حقیقی شادمانی اور خوشی کی اسے ہوا بھی نہیں لگتی ہمیں یہ کہنے میں ادنیٰ درجہ کا بھی شک نہیں۔ چنانچہ رات دن ایسے بے شمار واقعات اور مبتلائے معصیت لوگوں کے خطوط پڑھ کر اور کبھی کبھار اخبار و رسائل پر نظر ڈال کر مسلسل یہ حقائق سامنے آتے رہتے ہیں کہ عاصی و گناہگار اندر سے نہایت پریشان و بے چین رہتا ہے جس کا ظہور بہ کثرت خودکشی کے واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کہ خودکشی کی واردات اللہ کے نیک بندوں سے کبھی نہیں سنی جاتی کیونکہ انہیں زندگی کی حلاوت نصیب ہوتی ہے اسی لیے بزرگوں نے ایک بڑی قیمتی بات لکھی ہے کہ طاعات کی یہ خصوصیت ہے کہ کرتے وقت میں گو مجاہدہ ہوتا ہے لیکن عین اسی وقت میں روح کو بہت اطمینان اور قرار اور لذت وحلاوت عطا ہوتی ہے اور وہ بعد تک قائم رہتی ہے جب کہ گناہوں اور نافرمانیوں میں کرتے وقت میں ظاہری لذت اور خوشی لیکن کرتے ہی فوراً پریشانی

اور بے چینی شروع ہوجاتی ہے اسی لیے آپ یہ محسوس کریں گے کہ رمضان کے شب و روز گناہوں سے حفاظت کے ساتھ تلاوت قرآن پاک اور ذکر و مناجات کے ساتھ گزارنے والے سال بھر اس کی حلاوت اور لذت روح میں پاتے ہیں اور اس کے بے تابی سے منتظر رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے یہ بات سنی تھی کہ ایک رمضان کو اچھی طرح گذارنے کا اثر سال بھر قائم رہتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ روزانہ کے حالات میں اس کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو آدمی خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں پڑھتا ہے اور شب اخیر میں اٹھ کر کچھ آہ و زاری کرنے کا عادی ہے وہ دن بھر اوقاتِ صلوٰۃ اور رات کے اخیر حصہ کا منتظر رہتا ہے ۔

خدا کی سرکشی سے خودکشی ہے مال و دولت میں
کبھی اللہ والوں سے نہیں ایسا سنا جاتا

اور شب اخیر کی لذتِ آہ و فغاں کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ شعر ۔

وعدہ ملنے کا شبِ آخر میں ہے
صبح سے ہی انتظارِ شام ہے

راہِ خداوندی کے لیے مزاج شیر نر چاہیے

جو ڈرتا ہے خدا کی راہ میں خونِ تمنا سے
وہ ظالم ننگ روباہِ جہاں معلوم ہوتا ہے

بندۂ مومن کو گناہوں سے بچنے کے سلسلہ میں مزاج شیر نر اور ہمت مردانہ اختیار کرنی چاہیے یعنی بڑی جرات اور ہمت کے ساتھ گناہوں کو چھوڑ دے اور لومڑیانہ خصلت اور مزاج روباہی سے دور رہے جو شخص ایسا کرے گا وہ جلد اللہ کا ولی بن جائے گا کیونکہ یہ راستہ محض تمناؤں سے طے نہیں ہوتا اس لئے بغیر کسی خوف و ڈر اور اندیشۂ طعن و تشنیع کے گناہوں کو بالکل چھوڑ دے ورنہ اگر نیکیاں کرتا رہے اور جب کوئی حرام لذت اٹھانے کا وقت آئے تو اپنی اس تمنا کو پوری کر گزرے تو ایسے آدمی کو دل میں حلاوت قرب خداوندی کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے مثلاً ایک بڑی ٹنکی کو آپ نے پانی سے بھر دیا ہو مگر اس ٹنکی میں کسی جگہ چھوٹے بڑے سوراخ موجود ہوں تو ان سوراخوں کے ذریعے سے بتدریج پانی نکلتے نکلتے پوری ٹنکی پانی سے خالی ہو جائے گی ٹھیک اسی طرح طاعات و عبادات سے جو قرب خداوندی میسر آ رہا ہے اور جو انوارات اور تجلیات دل میں حاصل ہو رہی ہیں گناہوں کے چھوٹے بڑے سوراخوں کے ذریعہ سے وہ نکلتے جا رہے اور دل کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہو رہا ہے جیسے حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ حرمین میں ایک گاڑی میں سفر کر رہے تھے گرمی کی شدت تھی تو حضرت نے ڈرائیور سے یہ سوال کیا کہ تم نے ائیر کنڈیشن کھولا ہے یا نہیں؟ اس پر اس نے جواب دیا کہ جی ہاں کھولا ہے تو حضرت نے

پوچھا کہ گاڑی ٹھنڈی کیوں نہیں ہو رہی ہے تو اس نے جواب دیا کہ حضرت کوئی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اس پر حضرت والا نے اس قصہ سے فوراً ایک سبق نکالا اور یہ فرمایا کہ جو نورِ عبادتوں کے ذریعے دل میں آتا ہے وہ معاصی کی کھڑکیوں کے ذریعے نکل جاتا ہے کیونکہ معصیت کی ظلمت اور نحوست دل کے نور کو صاف کر دیتی ہے۔

روحِ سلوک احکام کی پابندی ہے کیفیات نہیں

صاحبو! احقر اس سے آگے بڑھ کر یہ عرض کرتا ہے کہ معصیت خداوندی کا اگر کوئی اور نقصان نہ بھی ہو اور بالفرض قلبی حلاوت ولذت متاثر نہ بھی ہو مگر اللہ کے ایک بندے کے لیے گناہ سے بچنے کے واسطے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک پالنے والے اللہ کی بغاوت کر رہا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں اس کا ہر سانس ہر لمحہ کی حیات اور ہر خوشی وغمی ہے اس لیے لذت وحلاوت سے صرف نظر کر کے مومن بندے کی بندگی کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کے قریب بھی نہ جائے۔ اصل ایمان کا تقاضہ یہی ہے۔

اسی لیے حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ بسا اوقات بندے کو عبادت کرنے میں مزہ نہیں آتا نہ تسبیح وتلاوت اور ذکر ومناجات میں دل لگتا ہے جسے سلوک کی اصطلاح میں قبض کہتے ہیں اور یہ صورت پیش آنے پر سالکین اکثر ذہنی الجھن اور پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں اور عبادات چھوڑ بیٹھتے ہیں حالانکہ ہمارا اصل مقصد اللہ کے حکم کی تعمیل ہے چاہے قلب کو کوئی حلاوت ولذت ملے یا نہ ملے اسی کو خواجہ صاحب نے یوں فرمایا۔

کبھی ہے دل میں جلال تیرا
کبھی ہے دل میں جمال تیرا
بس اب ہے دل اور خیال تیرا
کسی کا اس میں گزر نہیں ہے

یعنی دل پر جیسے ہی حالات وکیفیات آئیں خواہ جلالی ہوں یا جمالی پسندیدہ ہوں یا نہ پسندیدہ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں بس ہمارا مقصود تو اللہ کی ذات ہے اس لیے ایک موقعہ پر حضرت والا نے خط کے جواب میں احقر کو لکھا تھا کہ کیفیات محمود تو ہیں مقصود نہیں ہیں بنیادی چیز احکام کی پابندی ہے یہی اصل تصوف کی روح ہے۔

نفس امارہ پر قابو پالینے سے فقیری میں بادشاہی کا مزہ

جو کرلے نفس امارہ کو قابو میں تو وہ سالک
فقیری میں بھی سلطان جہاں معلوم ہوتا ہے

دوستو! نفس امّارہ کی مکاریوں اور چالاکیوں کو سمجھنا اہل اللہ کے پاس رہ کر ہی میسر آتا ہے ورنہ خواہ کتنا ہی عابد وزاہد ہو جائے مگر اس کی شرارتوں میں اس طرح الجھا رہتا ہے کہ جب کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اور کسی

شیخ برحق کی خدمت میں پہنچتا ہے تو پھر اپنی گزری ہوئی زندگی کی ان حالتوں کو سوچ کر ندامت کے آنسوں روتا اور یہ کہتا ہے کہ ہائے افسوس میری زندگی کی وہ ساعتیں کہ جن میں میں نفس وشیطان کی مکاریوں اور شرارتوں کا شکار ہوتے ہوئے اپنے کو دین دار سمجھا کرتا تھا کیونکہ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی کسی راہ کو طے کیے ہوئے ہوتو اس کے نشیب وفراز اور اتار چڑھاؤ سے خوب واقف ہوتا ہے اور نفس ایسا اندرونی دشمن ہے کہ جو ہر قدم پر انسان کو ہلاکت کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے اسی لیے ایک حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِىْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَالْغَضَبِ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الأداب، باب الغضب والكبر، ص: ۴۳۳)

یعنی حقیقی پہلوان اور بہادر وہ شخص نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ ڈالے اور شکست دے دے بلکہ حقیقی پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت میں اپنے نفس پر (Control) اور قابو کرلے ہاں اگر کبھی اس کے تقاضے پر عمل بھی ہو جائے اور نفس ہم پر غالب آجائے تو پھر بھی ہمت ہار کے بیٹھ جانا نہیں چاہیے جس کو خواجہ صاحب نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

نہ چت کر سکے نفس کے پہلواں کو
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے کشتی تو ہے عمر بھر کی
کبھی وہ دبالے کبھی تو دبالے

اور اسی کو حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی نے یوں فرمایا ؎

ہم نے طے کیں اس طرح سے منزلیں
گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

اس لیے سالک کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کے میں پہلے ہی دن نفس کے تمام تقاضوں کو پامال کردوں گا اور اس پر قابو پا جاؤں گا اور ذرا بھی کوئی چوک اور خطا مجھ سے سرزد نہیں ہوگی بلکہ یہ عزم رکھے کہ ایسا ہونے تو نہیں دوں گا لیکن اگر ہو گیا تو پھر اللہ سے توبہ کر کے دوبارہ اسی راہ پر چلنا شروع کردونگا۔

بہر حال حضرت والا فرماتے ہیں جو اپنے نفس امارہ کو قابو میں کرلے گا تو اسے دنیا جنت معلوم ہونے لگے گی اور فقیری میں سلطانی کا مزہ آئے گا گو کہ اس کے پاس ظاہری شان وشوکت، سلطنت وحکومت، مال و دولت جاہ و مرتبہ حاصل نہ ہو لیکن مقصدِ حکومت و دولت یعنی سکون واطمینان کی زندگی اس کو حاصل ہوگی اور جہاں رہے گا با عزت بن کے رہے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وعدہ ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِىْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ اَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِىَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الدُّنْيَا جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَشَتَّتَ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ وَلَا يَأْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الرقاق، باب الرياء والسمعة، ۴۵۴)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی نیت و مقصد آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غناء عطا فرما دیتے ہیں اور اس کے بکھرے ہوئے معاملات کو اس پر سمیٹ دیتے ہیں اور یکجا کر دیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور جس شخص کی نیت و مقصد دنیا کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے فقر و محتاجگی کو اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں اور اس کے معاملات اس پر منتشر ہو جاتے اور بکھر جاتے اور اسے دنیا فقط اس کے مقدر کے مطابق ہی نصیب ہوتی ہے۔

یعنی جو بندہ پورا اللہ کا ہو جاتا ہے دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اللہ کا بندہ بننا اور نیک و صالح ہونا اس نیت سے نہ ہو کہ لوگ میرے پاس آئیں ھدایا و تحائف لائیں ہر طرف مجھے عزتیں اور عظمتیں ملیں اور چونکہ میں اللہ والا ہوں تو ان دنیا والوں کو میرے پاس آ کر میرے سارے کام بنانے چاہیے اگر خود کوئی اس نیت سے نیک بنے گا تو حدیث تو اپنی جگہ سچی اور صحیح ہے لیکن اس کی نبت میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے اس کے حق میں یہ وعدہ نہیں ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو مٹا کر اللہ کا بندہ بنالیا تو پھر انہیں فقیری میں بھی بادشاہت کا مزہ مل گیا۔

نسبت مع اللہ کی حقیقت اور اس کا اثر

یہ خاکی ذکر کی برکت سے ہے فوق السماء لیکن
زمیں پر بھی نزولِ آسماں معلوم ہوتا ہے
دوام ذکر سے سنتا ہوں مل جاتی ہے وہ نسبت
کہ ان کو بھولنا کوہِ گراں معلوم ہوتا ہے

نسبت مع اللہ کا حصول مومن کے لیے بہت عظیم الشان نعمت ہے جس کا طریقہ دوام ذکر اور کثرت طاعت ہے یعنی ایک لمحہ غفلت میں نہ گزرے اور معصیت و نافرمانی غفلت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے اور طاعت و عبادت ذکر کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے حضرت شاہ احمد پرتا بگڑھی نے نسبت مع اللہ کو بیان فرماتے ہوئے ایک شعر میں یوں فرمایا۔

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پایئے

یعنی آپ جس حال میں بھی رہیں اور جو کام بھی کریں اس وقت کا جو حکم ہوا سے یاد رکھیں یہی یاد رکھنے کی حقیقت ہے خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ حضرت مفتی شفیع صاحب اور دوسرے بعض حضرات اکابر کو علماء کی مجلس میں باتوں کے ذریعہ سے ہنسایا پھر یک دم سوال کیا کہ بتاؤ کون ہے اس وقت میں جو اللہ کی یاد سے غافل نہ تھا اس پر سب خاموش رہے تو پھر خواجہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم
اور آنکھ بھی میری تر نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

اسی لیے اہل اللہ اگر ہنستے بھی ہیں تو اس میں اتنا حد سے تجاوز نہیں کرتے کہ جو قلبی غفلت کا سبب ہو کیونکہ جو لمحہ ان کا غفلت میں گزرے وہ ان کے لیے کوہ گراں سے کم نہیں ہے اسی لیے جو شخص پوری فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر وہ گناہوں کی محفل سے گزر بھی جائے تو اس کی طبیعت میں کڑہن اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے یا کوئی ایسا معاملہ سامنے آ جائے جس کی وجہ سے اس کے معمولات ذکر و تلاوت وغیرہ متاثر ہوں تو اس پر بہت دشوار گزرتا ہے اور یک گونہ معاصی سے نفرتِ شرعی، عقلی اور طبعی بن جاتی ہے جیسا کہ حضرت گنگوہی نے حضرت حاجی صاحب کے پاس رہنے کی برکت سے ان چار باتوں کے حاصل ہونے کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے طاعات کہ طبعاً مرغوب ہو گئیں اور معاصی سے نفرت پیدا ہو گئی۔

قیامت کے دن مومن کے لیے زندگی کی وہی گھڑی حسرت و افسوس کا باعث ہوگی جو اس نے خدا کی یاد سے غافل ہو کر گزاری ہو خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جنھوں نے کسی صاحب نسبت کے پاس رہ کر نسبت مع اللہ کا تحفہ حاصل کر لیا اور اپنی قیمتی زندگی کی ایک ایک منٹ سیکنڈ کو غفلت میں گزرنے سے بچا لیا۔

گزرتا ہے کبھی دل پر وہ غم جس کی کرامت سے
مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے

یہ مضمون بہت سے اشعار کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے اس جگہ حضرت والا کا منشاء یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا عظیم مجاہدہ بندہ اختیار کرتا ہے اور ایسے حالات غیر اختیاریہ سامنے آتے ہیں کہ ان پر صبر کر کے اور ان سے گزر کر دل میں اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا وصل محبوب کے سارے حجابات ہٹا دیے گئے ہوں اس قدر قرب اور نزدیکی کا مزہ ملتا ہے۔

اسباب کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی طاقت کارفرما ہے

حقیقت میں ترا ہی آستاں داتا ہے عالم کا
مگر اسباب کا پردہ یہاں معلوم ہوتا ہے

یعنی جو کچھ بھی عالم میں ہو رہا ہے اور کسی بھی انسان کو جو کچھ مل رہا ہے وہ تن تنہا اللہ وحدہ لاشریک لہ کے در سے مل رہا ہے دوسرے کسی اور در سے نہیں خواہ وہ چھوٹی چیز ہو یا بڑی سب کا تعلق اللہ کے فیصلے سے ہے بظاہر جہاں

سے بھی کچھ ملتا ہوا نظر آتا ہے وہ سب اسباب ہیں مگر ان کے پردے میں اللہ کی طاقت کارفرما ہے ہمیں جو لگتا ہے فلاں نے دے دیا یا فلاں جگہ سے آیا یا فلاں ذریعے سے میرا کام بن گیا سب کے در پردہ اللہ ہی کی قوت ہے جو کرا رہی ہے اور یہ مومن کے ایمان کی جڑ ہے۔

اسی لیے دعوت و تبلیغ کے پہلے نمبر پر اسی کی دعوت دی جاتی ہے اور یہی بتایا جاتا ہے کہ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے اگر اللہ چاہے بننے کے نقشوں میں بگاڑ دے اور اگر اللہ چاہے بگڑے ہوئے حالات میں سنوار دے اس سے ہمارے لیے ایک نصیحت یہ نکلتی ہے کہ ہمیں اپنی حمایت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو لینے کی فکر کرنی چاہیے اور کسی بھی چیز کے حصول کے ایسے ہی اسباب اپنانے اور اختیار کرنے چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب نہ ہوں اس کے برخلاف کرنے کی صورت میں اگرچہ زبان پر دعویٰ تو ہو کہ کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے مگر نافرمانی کر کے کسی چیز کے حصول کی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اپنے اس دعویٰ پر یقین نہیں ہے۔

کار دین بطریقہ دین معتبر ہے

اس لیے جو لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دعوت و تبلیغ کے کام میں نکلتے ہیں یا کسی اللہ والے کی خانقاہ کا رخ کرتے ہیں یا کسی اور دینی رفاہی کام سے گھر بار چھوڑ کر جاتے ہیں اور ان کی جوان لڑکیاں اور عورتیں دکانوں پر پھرتی ہیں اور اپنی تجارت کو سنبھالنے کے لیے صبح سے شام تک آفس (Office) اور دکان میں رہتی ہیں خاص طور پر اس صورت میں جب کہ بے پردہ غیر محرموں کے ساتھ ملنا جلنا اور ہنسنا بولنا بھی ہو رہا ہو اور اجنبی کے ساتھ خلوت بھی پائی جا رہی ہو خواہ ایسی گاڑی میں کہ جس کے شیشے کالے (Tinted) ہوں جس میں باہر سے اندر کا اور اندر سے باہر کا نظر نہیں آتا ہو یا ایسے آفس (Office) میں جہاں نوکر اور دکان کا مالک، اس طرح تنہائی میں بیٹھتے ہیں کے وہ آفس Office لوک (Lock) ہوتا ہے جس کو کھولنے کا بٹن اندر بیٹھے ہوئے مالک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کے ارادے اور اختیار کے بغیر کوئی تیسرا آدمی وہاں داخل نہیں ہو سکتا تو یہ صورت اجنبی مرد اور عورت کے خلوت میں ہونے کی - جو شریعت میں قطعی طور پر حرام ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب النكاح، باب النظر الى المخطوبة، ص: ۲۶۹)

یعنی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا یعنی یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی کہ کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ ہو اور وہاں شیطان نہ ہو بلکہ جب بھی کوئی کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہوگا تو ضرور وہاں شیطان بھی موجود ہوگا تو ایسے لوگ جو اس طرح اپنی عورتوں کو شیطان کے جال میں پھانس کر اور اللہ کے احکام کو توڑ کر گھر سے باہر سفر کرتے ہیں ان کا یہ چلے میں جانا یا خانقاہ میں رہنا اور اپنے ذہن میں سوچنا کہ میں دینی مشن (Mission) پر نکلا ہوں بہت بڑی غلط فہمی ہے پھر مزید کھڑے ہو کر تقریر میں یہ کہنا کہ دینے والی ذات اللہ کی ہے خود اپنے کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔

میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کا یہ عقیدہ تھا اور ہونا چاہیے تو آپ نے اپنی بیوی اور جوان بیٹی کو دکان پر کیوں چھوڑا تو آپ جواب میں کہتے ہیں کہ اس کے بغیر دکان نہیں چلتی اور پورے چالیس دن تک دکان کو بند نہیں رکھا جا سکتا اور کوئی بھروسہ کا آدمی نہیں مل رہا ہے اس لیے میں نے اپنی جوان بیٹی کو وہاں کھڑا کر دیا ہے تو اے میرے بھائی غور کرنے کا مقام ہے کے شیطان نے اس وقت ہمیں کتنے بڑے دھوکے میں ڈالا گویا لفظ بدل کر یوں کہیے ایک طرف تو ہم اللہ کے رزاق ہونے کی بات کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف دکان کو رزاق سمجھ رہے ہیں ورنہ کسی بھی قیمت پر محض روزی کے لیے حکم خداوندی کو توڑنے کی جرأت نہ ہوتی اور ہمارا یہ فیصلہ ہوتا کہ چاہے کچھ ہو مگر میں اللہ کے فیصلے کو توڑ کر اس کی ناراضگی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں کرتا کیونکہ ایک حکم الٰہی کو توڑنا زمین و آسمان کے ٹوٹ جانے سے بڑھ کر ہے۔

نافرمانی کے ساتھ روزی کمانا بے برکتی کا سبب ہے

اور اس سے آگے بڑھ کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کی نافرمانیاں کر کے کمائی ہوئی روزی برکت سے خالی ہوتی ہے اس لیے اس طرح سے جو روزی آپ کو حاصل ہوگی آپ برکت سے محروم رہیں گے اگر آپ اس عرصے میں دکان کو بند رکھتے یا کسی معتمد ذمہ دار شخص کو آفس (Office) یا دکان میں مقرر کر کے جاتے اگر چہ اس کے معتمد ہونے کی وجہ سے دو چار ہزار مزید آپ کو دینے پڑتے لیکن میں یہ سچ عرض کرتا ہوں کہ اس میں ایسی برکت حاصل ہوتی کہ آپ کو لاکھوں ضرورتیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتیں یہی برکت کی حقیقت ہے کہ جو قلیل ہو مگر کثیر کے لیے کافی ہے اس لیے ہر بندہ مومن کو یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ سب کچھ دینے والے اللہ ہیں لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت کو چھوڑ کر سوائے محرومی اور ناکامی کے کچھ نہ پاسکوں گا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ مجھے جو کچھ رزق و روزی بہ عافیت حاصل ہو رہی ہے گو کہ وہ دکان کے ذریعے ہے مگر اس کے پردے میں سب اللہ کا فیصلہ کارفرما ہے۔

احقر کا ایک عبرت آموز واقعہ

بحمد اللہ تعالیٰ بندہ ناچیز کے پاس بھی ایک جائز چھوٹا سا کاروبار ہے تو ایک دن ایک عالم ملنے کے لیے دکان پر تشریف لائے اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کی دکان میں سیل مین (Sales man) صرف مرد ہیں تو بہت سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کے طور پر نہ کہ محض مزاحی انداز کے ساتھ بندہ کو یہ نصیحت کرنے لگے کہ میاں تم کو دکان چلانا نہیں آتی اور آپ کو ساؤتھ افریقہ کا اسٹائل (Style) معلوم نہیں ہے آپ دکان پر کسی عورت کو رکھیں اور پھر دیکھیں دکان کتنا چلے گی اور لوگوں کی دکان سے دلچسپی بڑھ جائے گی اور خریداروں کی آمد و رفت میں نمایاں اضافہ ہوگا۔

تو بندے نے توفیق الٰہی سے ان کو یہ جواب عرض کیا کہ بھائی ہم نے دکان روزی کے لیے نہیں کھولی بلکہ

رزاق کے حکم کے تحت کھولی ہے یعنی دکان سے روزی کمانا مقصد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو حکم دیا ہے کہ تم حلال کمائی کے اسباب اختیار کرو میں تمہیں روزی دوں گا اس لیے دکان کسی کو روزی نہیں دیتی یہ محض ایک سبب اور ذریعہ ہے اور میں دکان کو رزاق نہیں سمجھتا اگر دکان چلانے کے لیے ہمیں کسی معصیت اور گناہ کا ارتکاب ضروری ہو جائے اور اس کے بغیر چارہ نہ رہے اسی دن دکان کو بند کر دینگے۔ وہ کون ہے کہ جس نے ہمیں اس وقت تک پالا جب تک کہ ہمارے پاس دکان نہیں تھی اور آج بھی سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو اللہ تعالیٰ بغیر کسی دکان کے پال رہے ہیں۔

صاحبو! ذرا اندازہ تو لگاؤ کہ آج کل نصیحت کرنے والے نہ صرف یہ کہ وہ برائی سے نہیں روکتے بلکہ برائی کا مزید حکم دیتے ہیں جیسا کے ایک روایت میں ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام کو اس بات کی خبر دی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دینگے تو صحابہ نے بڑے تعجب سے سوال کیا یا رسول اللہ کیا ایسا ہوگا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نَعَمْ وَاَشَدُّ مِنْهُ کہ اتنا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ہوگا کہ لوگ برائی کا حکم دینگے اور بھلائی سے روکے گیں۔ آج کل بظاہر ایسی ہی صورت حال نظر آرہی ہے اس لیے خاص طور پر اس زمانے میں بہت شدید ضرورت ہے کہ دوستوں کا انتخاب صحیح طور پر دین کے معیار پر ہو جو حقیقی نفع ونقصان جانتے اور سمجھتے ہوں اور بوقت ضرورت صحیح نفع اور مفید مشورہ دے سکیں۔ ایسے ہی زمانے کے لیے جناب رسول اللہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی:

﴿بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الايمان، باب الاعتصام بالكتاب السنة، ص ٢٩)

مطلب یہ ہے کہ دین اجنبیت کی حالت میں شروع ہوا کہ لوگوں کو دین اور اس کے اعمال عجیب وغریب لگتے تھے اور جس طرح وہ شروع ہوا ہے عنقریب اسی حالت میں لوٹ جائے گا اور جو اس وقت میں اس غریب دین کو اپنے سینے سے لگائیں گے ان کے لیے بڑی خوش خبری ہے جن کا خاص کام یہ ہوگا کہ لوگوں نے جو میری سنتوں اور طریقوں اور دین کے حکموں میں بگاڑ پیدا کیا ہوگا وہ اس کی اصلاح کریں گے اور ایک دوسری حدیث شریف میں ایسے آدمی کے متعلق بڑی فضیلت مذکور ہے ارشاد نبوی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِأَةِ شَهِيْدٍ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الايمان، باب الاعتصام بالكتاب السنة، ص ٣٠)

کہ جس نے امت میں بگاڑ کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اس کو سو شہیدوں کو ثواب ملے گا ظاہر ہے کہ اتنا عظیم الشان اجر ملنا اسی لیے ہے کہ ایسے پر فتن دور میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر عمل کرنا اور ان کو زندہ رکھنا بہت ہی دشوار اور مشقت پر مبنی ہوگا اپنوں اور غیروں کی ملامت اور طعن وتشنیع کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہر ذرّۂ مخلوق نشانِ خالق ہے

کرم ہے دل پہ مالک کا بہ فیضِ مرشدِ کامل
کہ ہر ذرہ یہاں ان کا نشاں معلوم ہوتا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾
(سورۃ الجاثیۃ، آیت: ۳)

ترجمہ: بے شک آسمانوں میں اور زمین میں بہت نشانیاں ہیں ماننے والوں کے واسطے۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۷۵)

اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر بہت سی نشانیاں رکھی ہیں اور خود ہماری ذاتوں کے اندر بہت سی نشانیاں موجود ہیں اگر ہم غور وفکر کریں اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر جب انسان کے دل میں معرفت کا نور آنے لگتا ہے اور غیر اللہ سے وابستگی اور تعلق دل سے دور ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر یہ مومن کائنات کے ہر ذرے میں غور وفکر کرتا ہے اور ہر چہار سو عالم کا پورا نقشہ زمین و آسمان چاند وسورج شجر وحجر، جبال و بحار غرض کہ ہر ذرہِ عالم اللہ کی طرف رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور قرآن نے حقیقی عقل مندی کا معیار اسی کو قرار دیا ہے کہ عقل مند حقیقت میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو نظامِ عالم میں غور کر کے رب العالمین تک پہنچ جاتے ہیں اور مخلوق میں غور کر کے خالق کو پا لیتے ہیں اور عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وَ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

اور بزبان فارسی یہ شعر ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اور بالآخر غور وفکر کر کے یہ اہل عقل وفہم لوگ یہ پکار اٹھتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کہ اے ہمارے رب آپ نے یہ سارا نظام عالم بے مقصد اور بلاضرورت پیدا نہیں فرمایا اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز فائدہ سے خالی نہیں بلکہ ایک ایک ذرہ کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کو لئے ہوئے ہے خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

کاش کہ سائنس داں (How) سے ہو (Who) تک پہنچتے

میرے دوستو! کیا ہم نے کبھی سائنس (Science) اور جدید ٹکنالوجی (Technology) کے علم پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا ہے یا نہیں؟ اگر غور نہیں کیا ہے تو آج احقر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ ہم سب مل کر یہ سوچیں کہ

پوری سائنس از اوّل تا آخر اسی حقیقت کی تو ترجمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرے ذرے کی تخلیق میں کس قدر بے شمار منافع رکھے ہیں۔ سائنس دان کا کام صرف اتنا ہی تو ہے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے اشیاء میں رکھی ہوئی قیمتی اور نفع بخش تاثیر سامنے لے آتے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں تو اگر ہم غور کریں تو یہ پتہ چلے گا کہ پوری سائنس (How) کے جواب پر مبنی ہے اے کاش کے یہ سائنسداں اپنی ان جدید تحقیقات کے ذریعے (Who) کا جواب بھی پا لیتے۔

میرا مطلب ان دو جملوں سے یہ ہے کہ دنیا بھر کے سائنسدان اپنی جدید تحقیقات اور ریسرچ کے ذریعے چیزوں میں رکھے گئے فوائد کا پتہ لگا کر اس سے کوئی بھی نفع بخش سامان تیار کر لیتے ہیں مگر ان کو اس کے ساتھ ساتھ اس پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ ان چیزوں میں یہ اثرات اور خصوصیات اور فوائد و منافع کس ذات عالی نے رکھیں ہیں اور ان چیزوں کو اس ذات تک پہنچنے کا ذریعہ بنانا چاہیے اگر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کر دیں تو دنیا کے ہر سائنسدان کو ایک احکم الحاکمین علیم و خبیر قادر و مقتدر ذات پر ایمان لانا پڑے گا یہی تمام قرآنی آیاتِ تدبر و تفکر کی دعوت اور ان کا تقاضہ ہے۔ اس پر احقر کو ایک مثال یاد آئی بچپن کا واقعہ ہے جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری والدہ کو ایک بیماری لاحق ہوئی اور بدن کے اندر ایک خاص قسم کی گٹھلی سی محسوس ہوتی تھی تو ایک ہندو ڈاکٹر ہمارے شہر کے سرکاری ہسپتال میں بڑے درجے کی ڈاکٹر تھی اس کا نام تلوار تھا والدہ کا بڑا اکرام کرتی تھی برابر اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ اس کا ایک مختصر سا آپریشن کرنا پڑے گا مگر اس کے لیے ہماری والدہ بالکل تیار نہیں ہوئیں بالآخر دیو بند میں ایک حکیم تھے جن کا نام حکیم محمود تھا انہوں نے ہماری والدہ کے لیے یہ تجویز کیا کہ ایک چھوٹا سا درخت ہے جو عام طور پر پانی کی نالیوں کے پاس اُگتا ہے اس کا نام اگر چہ ابھی اس وقت راقم سطور کے ذہن میں نہیں مگر انہوں نے اس کے پتے تجویز کیے اور یہ بتایا کہ چند دن ان پتوں کو ان پر تیل لگا کر اور ذرا گرم کر کے رات کو لیٹتے وقت اپنے بدن پر لگا لو چنانچہ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اندر سے وہ گٹھلی بالکل ختم ہوگئی۔

احقر کا مقصد واقعہ ذکر کرنا نہیں بلکہ بنیادی بات یہ پیش کرنی ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار فوائد رکھے ہیں کچھ پر انسان مطلع ہو پاتے ہیں اور زیادہ پر مطلع نہیں ہو پاتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قیامت آنے تک انسان آتے رہیں گے اور میرے اللہ کی بنائی ہوئی اشیاء عالم سے مختلف انواع کے فائدے اٹھاتے رہیں گے۔ سمجھداری اور عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کے ہم کائنات میں گم ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ اس میں غور کر کے خالق کائنات تک پہنچیں۔ ہائے افسوس آج کا سائنسدان اسی مرض میں مبتلاء ہے کہ وہ کائنات کی ریسرچ (Research) و تحقیق میں ایسا گم ہوا کہ وہ اپنے کو بالکل بھول گیا۔

فکر خلق و ذکر خالق

اس مقام پر ایک اہم بات یہ بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خلق میں فکر کا حکم ہے اور خالق کے ذکر کا حکم ہے یعنی بندہ مخلوقات میں غور کرے اور خالق کا ذکر کرے کیونکہ اگر بندہ خالق میں غور کرے گا اور اپنی عقل سے سمجھنا چاہے گا تو سوائے الجھنے کے وہ کبھی سلجھ نہیں سکتا اور سوائے بھٹکنے کے اسے کبھی سیدھی راہ میسر نہیں ہوسکتی اسی لیے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے

﴿تَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ اللہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللہِ﴾

(کنزل العمال، رقم الحدیث:۵۷۰۸)

یعنی اللہ کی مخلوقات میں غور کرو خود اللہ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو یہی تو وجہ ہے کہ فلسفیوں کو آج تک راہ حق نہیں مل سکی کیونکہ انہوں نے اللہ کو عقل سے سمجھنا چاہا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

غرض یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور کرے تو خالق کو پا جائے گا چنانچہ ایک مرتبہ حضرت والا ساؤتھ افریقہ کے بہت بڑے جنگل "Crugo National Park" تشریف لے گئے تھے تو احباب سے یہ فرمایا کہ تم یہ مت سمجھنا میں وہاں شیر اور ہاتھیوں کو دیکھنے جا رہا ہوں بلکہ میں تو شیروں اور ہاتھیوں کے ذریعے ان کے خالق کو پانے کے لیے جا رہا ہوں اسی لیے فرمایا گیا تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ اَلْفِ سَنَةٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں تھوڑی سی دیر کا تدبر اور تفکر ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

اہل دل پر اعتراض کے بجائے اعتقاد و اتباع لازم ہے

چمن میں جس کی تھی تنقید ہر دم ہر نشیمن پر
دھواں دیتا اسی کا آشیاں معلوم ہوتا ہے
ہمارے نالۂ دردِ محبت پر تعجب کیا
یہ انعامِ نگاہِ بزرگاں معلوم ہوتا ہے

خلاصہ ان اشعار کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے خاص بندوں کے ساتھ ربط و تعلق نہیں رکھتے اور ان کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی تو دور دور رہتے ہوئے ان کے ذہنوں میں اشکالات و اعتراضات آتے رہتے ہیں اور تنقید و تبصرے ان کی زبانوں پر جاری رہتے ہیں لیکن جب ان کو اس راہ سے کچھ مناسبت پیدا ہوتی ہے اور وہ کسی شیخ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس راہ کو طے کرنا شروع کرتے ہیں تو انہیں خود اپنے دلوں کے اندر اللہ کی عشق و محبت کی

آگ لگتی دکھائی دیتی ہے اور پھر اس کے آثار خلق پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں وہ خود زبان حال سے یوں کہتے ہوئے ہوتے ہیں ؎

تو نے مجھ کو کیا سے کیا شوق فراواں کردیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کردیا

اس کی گفتار، کردار، رفتار سب بدل جاتی ہیں جو آنکھیں کل تک خشک تھیں انہیں سے نالۂ درد محبت جاری ہو جاتا ہے اور جو کل تک بالکل گمنامی اور یکسوئی کی زندگی گزار رہا تھا اب چاروں طرف لوگوں میں اس کا فیض جاری و ساری ہو جاتا ہے مگر یہ سب کچھ جب ہی حاصل ہوتا ہے کہ کسی شیخ کامل کے سامنے اپنے کو فنا کردے اور اس کی خدمت و صحبت کو لازم پکڑ لے اور اخلاص و اتباع اور اطلاع و انقیاد کے ساتھ اپنے شیخ کے ساتھ تعلق رکھے تو اگرچہ وہاں بیانات اور تقریریں نہ ہوتی ہوں لیکن شیخ کامل کی صحبت و معیت اور نظر عنایت ہی اس کی ترقی کے لیے کافی ہے کیونکہ اللہ والوں پر جو رحمتیں آسمان سے اترتی ہیں تو ان کے پاس بیٹھنے والے بھی محروم نہیں رہتے۔ چنانچہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ایک خادم تھے اور گرمی کے زمانے میں حضرت کو پنکھا جھل رہے تھے اسی دوران انہوں نے حضرت سے یہ سوال کیا کہ اللہ والوں کے پاس دفن ہونے سے نفع پہنچنے کی کیا وجہ ہے جب کے دونوں اپنی قبر میں الگ الگ لیٹے ہوئے ہیں تو حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے خادم سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ اس وقت تم پنکھا کس کو جھل رہے ہو اور کس کی نیت سے ہوا کر رہے ہو تو اس نے جواب میں کہا کہ حضرت میرا مقصود تو آپ ہیں اس پر حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ جو لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ان کو ہوا پہنچ رہی ہے یا نہیں اس نے جواب دیا کہ جی ہاں! بالکل پہنچ رہی ہے اور کہنے لگا کہ حضرت میرے سوال کا جواب بھی مجھے سمجھ آ گیا ہے۔

اس لیے اس واقعہ سے مقصد یہ ہے کہ بزرگوں کی نگاہوں اور توجہات اور ان کی صحبتوں اور دعاؤں کے اثرات ساتھ رہنے والے پر ضرور پڑتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جس محلے اور بستی میں کوئی اللہ والا موجود ہو تو اس کی برکت سے پوری بستی بہت سے فتنوں سے محفوظ رہتی ہے۔

جس دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کو دل میں یہ محسوس ہوا کہ ایک عجیب قسم کی روشنی غائب ہوگئی اور دل بجھ گیا خاص قسم کی دل پر ایک کیفیت محسوس ہوئی خود خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں یہ سمجھ گیا کہ حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ کا وصال ہو چکا ہے اور فوراً گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹھیک اس وقت جب دل کی وہ کیفیت ہوئی تھی وہی حضرت کے وصال کا وقت تھا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی حکومت انتہائی درجہ عدل و انصاف پر قائم تھی جس کا اثر یہ تھا کہ بھیڑیا بکری کو نہ چھوتا تھا مگر جس دن لوگوں نے یہ حالت دیکھی کہ اب بھیڑیا اور بکری ایک جگہ جمع نہیں ہو رہے ہیں تو انہوں نے اندازہ لگالیا کہ امیر المومنین حضرت عمر ابن عبدالعزیز اب روئے زمین پر موجود نہیں ہیں۔

بہر حال میرا منشاء یہ بتانا ہے کہ جب اہل اللہ کے وجود سے علاقے اور بستی والے محروم نہیں رہتے تو جوان کے ساتھ زندگی گزارے گا وہ کیسے محروم رہ سکتا ہے۔

نسبت مع اللہ کی خوشبو خود مہک اٹھتی ہے

خدا کے فضل سے نسبت جسے حاصل ہوئی اختؔر
پھر اس کا فیض فیض بے کراں معلوم ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام اپنے ایسے خاص بندوں سے لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوب اور پسندیدہ ہوں اور ان کی زندگی میں اور موت کے بعد ان کا فیض عام اور تام فرمادیتے ہیں جیسا کہ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں کہ جنہوں نے نسبت مع اللہ حاصل کی اور اولیاء صدیقین کی نسبت پا گئے خواہ وہ اچھے مقرر فصیح و بلیغ متکلم اور فن شعر و شاعری کے ماہر نہ ہوں اور نہ ہی انہوں نے مختلف علوم و فنون پر تصنیف و تالیف کی ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے فیض کو جاری کر کے کفر و شرک اور فسق و فجور کی ظلمتوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو وہاں سے نکال لیا اور معاصی کی ظلمت کو روشنی سے مبدل کر دیا اور ان کے ذریعے بڑے انقلابات رونما ہوئے گفتگو کا سیدھا سادہ انداز دلوں کی کایا پلٹ دینے کے لیے کافی ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کے بارے میں کسی نے کہا تھا ؎

مردوں کو زندہ کیا اور زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھو ذرا ابن مریم

اس شعر کا منشاء نعوذ باللہ ابن مریم حضرت عیسیٰ قرار دینا نہیں ہے بلکہ شاعر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے مردوں کو زندگی مل جاتی تھی اسی طرح حضرت شیخ الہند کے ذریعہ مردہ دلوں کو ایمانی حیات نصیب ہوئی اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ حضرت شیخ الہند کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ لوگ میرے استاد کو شیخ الہند کہتے ہیں اور حقیقت میں اس طرح ان کے مرتبہ کو گھٹاتے ہیں وہ صرف شیخ الہند نہیں بلکہ شیخ العالم تھے۔

میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ نسبت مع اللہ حاصل ہونے کے بعد اس کا فیض اللہ تعالیٰ چاروں طرف پہنچاتے ہیں لوگوں کے قلوب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس بندے کی نسبت اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں محبت ڈالتے ہیں تو پھر لوگ جوق در جوق اس کے پاس آ کر دین بھی سیکھتے ہیں اور اس کی عزت و اکرام بھی کرتے ہیں اور خود بہ خود اس کے چاہے بغیر مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

قرب کیا جانے جو دیدہ اشک باریدہ نہیں

احتسابِ روزِ محشر سے جو لرزیدہ نہیں
ایسے ظالم نفس میں انجام بیں دیدہ نہیں

عشق ظالم سے یہ ناممکن ہے وہ صابر رہے
پھر تعجب کیا جو درد عشق سنجیدہ نہیں

کس قدر مسرور ہیں اللہ والے ذکر سے
کوئی بھی ان کے سوا دنیا میں خندیدہ نہیں

نام روشن کر گئے مر کر کے حق پر عارفیں
مر گئے جو مرنے والوں پر وہ حق دیدہ نہیں

پالیا جس نے خدا کو پالیا سارا جہاں
کون کہتا ہے کہ اہل دل جہاں دیدہ نہیں

لذت قرب ندامت گریہ و زاری میں ہے
قرب کیا جانے جو دیدہ اشک باریدہ نہیں

جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہوگئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

جب بصارت کی حفاظت سے بصیرت مل گئی
ہو کے نادیدہ بھی اس کی آنکھ نادیدہ نہیں

برکت تقویٰ سے جس کے ساتھ ہے فضل خدا
اس کے پیچیدہ مسائل کوئی پیچیدہ نہیں

اہل دل کی صحبتوں سے جو حقیقت بیں ہوا
لذت دنیائے فانی کا وہ گرویدہ نہیں

روزِ محشر اے خدا رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

کیف تسلیم و رضا سے ہے بہار بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **احتساب**: حساب وکتاب۔ **روزِ محشر**: قیامت کا دن۔ **لرزیدہ**: خوف زدہ۔ **انجام بیں دیدہ**: انجام دیکھنے والا۔ **صابر**: صبر کرنے والا۔ **تعجب**: حیرانگی۔ **مسرور**: خوش۔ **خندیدہ**: خوش وخرم۔ **عارفیں**: اللہ والے۔ **حق دیدہ**: حق دیکھنے والی آنکھ۔ **دیدہ اشک باریدہ**: اشک بہانے والی آنکھ۔ **بصارت**: آنکھ۔ **بصیرت**: مراد حلاوت ایمانی۔ **نادیدہ**: نہ دیکھنے والی آنکھ۔ **پیچیدہ**: مشکل۔ **گرویدہ**: عاشق۔ **کیف تسلیم و رضا**: اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنے کا مزا۔ **رنجیدہ**: غمگین۔

انجام بیں نظریں کون سی ہیں

احتساب روز محشر سے جو لرزیدہ نہیں
ایسے ظالم نفس میں انجام بیں دیدہ نہیں

اس شعر میں ذکر کیا جانے والا مضمون قرآن کریم کے اندر سینکڑوں جگہوں میں مذکور ہے یعنی آخرت کا خوف قیامت میں اللہ کے سامنے پیشی اور حساب وکتاب اور پل صراط سے گزرنے جیسے معاملات کی وجہ سے دل کا لرزنا اور کانپنا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىo﴾

(سورۃ النازعات، آیت: ۴۱-۴۰)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرا ہوا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خوش کرنے سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۶۶۱)

اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جس آدمی کے دل میں روزِ محشر حساب و کتاب کا خوف نہیں اور جو اس کو سوچ کر کانپ نہیں اٹھتا تو ایسا ظالم انسان ظاہری آنکھیں تو رکھتا ہے لیکن انجام دیکھنے والی آنکھیں اس کے اندر نہیں ہیں۔

دوستو! یوں ظاہری آنکھیں تو اکثر سب کو حاصل ہیں لیکن وہ آنکھیں جو انجام پر نظر رکھنے والی ہوں جسے در حقیقت بصیرت کہتے ہیں وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہے جس طرح کے ایک تو وہ دل ہے جو جسم کی حیات ظاہری کی بقاء کے لئے لازم اور ضروری ہے وہ تو سب انسانوں کو حاصل ہے لیکن ایک وہ دل ہے جس میں اللہ کا خوف ہو اور ایمان و اخلاص ہو ایسا دل بہت کم لوگ اپنے سینوں میں رکھتے ہیں اور جس کے پاس یہ دل نہیں اور بصیرت والی آنکھیں نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ وہ بینا ہوتے ہوئے نابینا ہے اور اس کے سینے میں دل ہوتے ہوئے دل کہلانے کے لائق نہیں اسی کو قرآن میں یوں تعبیر کیا ہے:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾

(سورۃ الحج، آیت: ۴۶)

ترجمہ: سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۲۷۴)

اور اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے اگر وہ اس گناہ سے توبہ کر لے تو اس کے دل سے اس نکتہ کو صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ اس سے باز نہیں آتا تو پھر وہ بڑھتے بڑھتے اتنا سیاہ ہوتا ہے کہ پورا دل بالکل تاریک اور ایسا زنگ آلود ہو جاتا ہے کہ اب قبولِ نصیحت کے قابل نہیں رہتا بلکہ اگر اسے نصیحت بھی کی جائے تو وہ اس کو اچھی نہیں لگتی یہاں تک کہ ناصح کو اپنا بدخواہ اور دشمن تصور کرتا ہے اور بزبانِ حال یہ کہتا ہوا ہوتا ہے ۔

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے
میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

چنانچہ اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ایک ساتھی تھے جن کا نام سر سید احمد خان ہے دونوں ساتھ پڑھتے تھے وہ خود بہت ذہین تھے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ دین کی بہت سی باتوں میں ان کو سمجھاتے اور نصیحت کیا کرتے تھے کیونکہ انہوں نے بہت سے ایسے عقائد اختیار کیے تھے جو صحیح اسلام سے بالکل متضاد اور منافی تھے مگر ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے حضرت مولانا کو یہی اوپر والا شعر جواب میں لکھا کہ اب آپ مجھے نصیحت کرنا بند کر دیں اور اب مجھے نصیحت اچھی نہیں لگتی یہی وہ مقام ہے کہ اس پر پہنچنے کے بعد نصیحت نافع اور کارگر نہیں رہتی اسی لیے دوستو کبھی بھی گناہ یہ سوچ کر نہ کرنا چاہیے کہ بعد میں توبہ کر لونگا اس لیے کہ توبہ کی توفیق ملنا

یہ ہمارا اختیاری معاملہ نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوتے ہوتے گناہ کرنے کی ایسی عادت پڑ جائے کہ پھر دل تاریک ہوتا چلا جائے اور توبہ کی توفیق ہی نہ رہے۔

بہرحال عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ اپنے سینوں میں حقیقت میں دل رکھتے ہیں اور بصیرت کی نگاہیں موجود ہیں وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اسی لیے حضرات صحابہ کرام کا یہ خاص وصف تھا کہ وہ اللہ سے بہت ڈرنے والے تھے ان کی راتیں اکثر گریۂ وزاری میں گزر جاتی تھیں حتیٰ کہ وہ عشرہ مبشرہ جن کو خود زبان نبوت سے جنت کی بشارت ملی تھی ان کا بھی حال خوف خداوندی میں کم نہ تھا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصیدہ کوئی پڑھ کر دیکھے اس لیے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیا میں جیتے ہوئے اپنے دلوں میں آخرت کا خوف رکھتے ہیں اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا اور آخرت کے دو خوف اللہ تعالیٰ کسی آدمی پر جمع نہیں فرماتے یعنی جو دنیا میں اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت کے خوف سے بے خوف کر دینگے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

(سورۃ یونس، آیت ۶۲)

ترجمہ: یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۵۴۵)

عشق ظالم ہے یہ ناممکن ہے وہ صابر رہے
پھر تعجب کیا جو درد عشق سنجیدہ نہیں

جو لوگ غیر اللہ سے عشق کرتے ہیں اور حرام محبتوں میں پھنستے ہیں ان کا یہ عشق حقیقت میں عشق ہے ہی نہیں بلکہ فسق ہے حقیقی عشق تو وہ ہے کہ بندہ اپنے مالک کو دل دے اور اس پر فدا ہو اور یہ درد عشق صرف اہل اللہ کو حاصل ہوتا ہے فساق و فجار حرام عشق بازی کر کے اپنے چین و سکون کو خود اپنے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں اس لیے یہ درد عشق سنجیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔

حقیقی خوشی اللہ والوں کو ہی حاصل ہے

کس قدر مسرور ہیں اللہ والے ذکر سے
کوئی بھی ان کے سوا دنیا میں خندیدہ نہیں

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اللہ والے بنیں گے اور پورے دین پر عمل کریں گے تو ہماری زندگی کی ہنسی خوشی سب ختم ہو جائے گی جب کہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے کہ اللہ والوں کے سوا دنیا میں کوئی حقیقت میں خندیدہ ہے ہی نہیں اہل دنیا ہنستے تو ہیں لیکن ان کے دل کو ہنسی کا لطف نہیں ملتا خود آپ ان کی زبان سے سنیں گے کہ دل میں ایک طرح کی بے چینی اور پریشانی سے محسوس ہو رہی ہے اور طبیعت اداس اور بور (Bore) ہو رہی ہے تو

چلو ذرا کہیں جا کے ہنسی خوشی کریں تاکہ دل بہل جائے اس لیے صورتاً وہ ہنستے نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل میں بے چینی اور پریشانی اور قلق واضطراب کی آگ لگی ہوتی ہے بہت سے لوگ اس سے دھوکہ کھاجاتے ہیں ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اہل اللہ، اللہ تعالیٰ کی خاطر جس گھڑی آنسو بہا رہے ہوتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں چین وسکون کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے ان کے چہروں پر دل کے چین وسکون کے آثار بالکل واضح اور نمایاں ہوتے ہیں کبھی بھی ان کے چہروں پر اداسی اور مایوسی کے آثار نظر نہیں آئیں گے ہمیشہ خوش وخرم اور تروتازہ ہشاش وبشاش دکھائی دیتے ہیں ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ آئے کہ رونے کے ساتھ خوشی کیسے جمع ہوسکتی ہے کیونکہ رونا غم اور فکر کا اثر ہے اور ہنسنا مسرت وشادمانی کا اثر ہے اسی سوال کا جواب حضرت والا نے اس طرح سے دیا ہے کہ دیکھو ہماری آنکھوں میں سیاہ پتلی ہے جس سے ہمیں نظر آتا ہے اور دکھائی دیتا ہے حالانکہ سیاہی اور روشنی میں تضاد ہے بظاہر اس سے نظر نہیں آنا چاہیے تائب صاحب کے ایک شعر میں یہی مضمون اس طرح سے آیا ہے ؎

بے چینیوں نے چین سے رہنا سکھا دیا
جب سے ملا ہے مجھ کو تیرا اضطراب غم

اور اگر ہم بغور دیکھیں تو اللہ والوں کی خوشی کا عالم کیا ہوسکتا ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جاسکتا ہے جس میں یہ مذکور ہے:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾
(شعب الایمان)

یعنی جو اللہ کے ذاکر بندے ہیں اللہ ان کا ہم نشین ہے ہمارا اس پر ایمان ہے کہ دنیا کی ساری خوشیوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے تو جس آدمی کا ہم نشین خود اللہ ہو جو سارے عالم کی خوشیوں کا مرکز ہے تو اس کے دل کی خوشی کا کیا عالم ہوگا حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے اگر کسی کمرے میں ایک برف کا بڑا ٹکڑا رکھ دیا جائے اور کوئی آدمی اس کے پاس بیٹھا ہو تو وہ خودبخود اس کی ٹھنڈک کو محسوس کرے گا اور اس کی گرمی سے ہونے والی پریشانی دور ہوجائے گی حالانکہ یہ تو محض ایک برف ہے صرف سمجھنے کے لیے اتنی مثال کافی ہے اس لیے ذکر سے اللہ والوں کو کیا خوشی حاصل ہوتی ہے یہ ہمارے تصور سے باہر ہے قرآن نے اس معاملے میں بڑا صاف اور واضح اعلان فرمایا کہ:

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾
(سورۃ الرعد، آیت: ۲۸)

ترجمہ: سنتا ہے! اللہ ہی کی یاد سے چین پاتے ہیں دل۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۱۸۲)

یہ اعلان قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کے لیے ہے اس لیے حضرت والا کا یہ فرمانا کہ حقیقت میں خوش اور مسرور صرف اللہ والے ہیں بالکل درست اور صحیح ہے۔

اہل اللہ کے بے چین و پریشان نہ ہونے کی بنیادی وجہ

ایک دوسرے انداز سے اس کو اس طرح سمجھئے کہ چونکہ اللہ والے لوگ راضی بہ رضا رہتے ہیں یعنی ان کے مالک اور خالق اللہ کی طرف سے جس طرح کا بھی ان کے حق میں فیصلہ ہو وہ اس پر خوش اور راضی رہتے ہیں تو بھلا ان کو بے چینی اور پریشانی کیسے لاحق ہوسکتی ہے ان کے دل میں ہر وقت یہ عقیدہ حاضر رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اگر صحت دی ہے اس میں کوئی خیر اور بھلائی ہے اور اگر مرض میں مبتلاء کیا ہے میرے لیے اسی میں کوئی خیر چھپی ہے بس ہر وقت عافیت کی بھیک مانگتے رہتے ہیں لیکن پریشان نہیں ہوتے اگر رزق میں وسعت حاصل ہو تو بھی شکر گزار رہتے ہیں اور اگر کچھ تنگی اور کمی کا سامنا ہو تو بھی وہ پریشان نہیں ہوتے ان کے سامنے اپنے اللہ کا کلام اور فیصلہ رہتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ ﴾

(سورة الزخرف، آیت: ۳۲)

ترجمہ: ہم نے بانٹ دی ان میں روزی ان کی دنیا کی زندگانی میں اور بلند کردیئے درجے بعض کے بعض پر۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۲۶)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ﴾

(سورة الشوری، آیت: ۲۷)

ترجمہ: اور اگر پھیلا دے اللہ روزی اپنے بندوں کو تو دھوم اٹھادیں ملک میں۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۹۵)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾

(سورة الحجر، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور اتارتے ہیں اندازِ معین پر۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۲۷۷)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے خزانوں میں سے روئے زمین پر ہر چیز کی اتنی ہی مقدار اتارتے ہیں جس کا خیر ہونا اللہ کو معلوم ہے اسی طرح حدیث قدسی میں ہے کہ اے میرے بندوں میں یہ جانتا ہوں کہ تم میں سے کس کو کب تک صحت مند رکھنا ہے اور کب تک بیمار رکھنا ہے اور کس کو کب تک غریب رکھنا ہے اور کب اس کو مال دار بنانا ہے بندوں کے لیے جو جس وقت مصلحت ہوتا ہے اس وقت میں اس کو وہی دیتا ہوں میری غرض ان تمام آیات وروایات سے یہ ہے کہ اللہ والے دل سے بے چین کبھی نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ اللہ کے ہر فیصلے پر دل سے راضی رہتے ہیں تو انہیں بے چینی اور پریشانی لاحق کبھی نہیں ہوگی۔

چین وسکون کا قیمتی نسخہ حدیث نبوی سے

حضرت عمر بن شعیب عن ربیہ عن جدہ کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

﴿خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاقْتَدٰى بِهٖ وَ نَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهُ عَلٰى مَا فَضَّلَهٗ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص:۴۴۸)

یعنی جس بندے میں یہ دو باتیں جمع ہوں تو اللہ اسے اپنے یہاں شاکر اور صابر بندہ شمار کرتے ہیں نمبر ایک کہ جو شخص دین کے سلسلے میں تو اسے دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہو اور اس کی اقتدا کرے اور دنیا کے سلسلے میں اس کو دیکھے جو اس سے کم درجہ کا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو اس پر فضیلت بخشی ہے اس پر وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے یعنی دین کے سلسلے میں تو وہ بڑے مقربین بارگاہِ الٰہی اور اولیاء صدیقین پر نظر رکھ کر ان کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے اور یہ تمنا کرتا ہے کہ میں بھی ان جیسا بن جاؤں اور دنیا کے سلسلے میں جو اس سے کم درجہ دنیوی مال و دولت رکھتا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے رات دن اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے اور اس طرح دل کی ایک سنگین بیماری یعنی جمع مال کی حرص سے محفوظ رہتا ہے تو اللہ ایسے بندے کو اپنا شکر گزار بندہ بھی قرار دیتے ہیں اور صبر کرنے والا بھی شمار کرتے ہیں۔

اس کے بالکل برخلاف وہ شخص کہ جو دین کے سلسلے میں تو اس پر نظر رکھے جو اس سے کم درجہ ہے اور دنیا کے سلسلے میں اس پر نظر ہو جو اس سے بڑھا ہوا ہے اور پھر اس سے جو دنیا چھوٹ گئی ہے اور اسے حاصل نہ ہو سکی اس پر افسوس کرتا رہے اس بندے کو اللہ تعالیٰ نہ شاکر لکھتے ہیں اور نہ ہی صابر اور ایسا آدمی کبھی سکون سے زندگی نہیں گزار سکتا خواہ وہ کتنا ہی مال دار اور دولت مند ہو جائے اور کیسا ہی (Millionaire & Billionaire) بن جائے کیونکہ جب وہ ہمیشہ دنیا کے سلسلے میں اوپر والے کو دیکھتا رہے گا تو اس کے دل کو ہر وقت مزید کی فکر لاحق رہے گی اور اس سے ایک طرح کی بے چینی اور پریشانی کا شکار رہے گا۔

آہ! میرے دوستو قربان جائیں ہم اپنے سب سے بڑے محسن، مشفق اور خیر خواہ و ہمدرد حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے اپنی امت کو ہر بھلائی سے آگاہ کیا اور ہر برائی پر متنبہ کیا آپ نے کیا ہی عمدہ سکون سے جینے کا نسخہ عطا فرمایا ہے۔

اس سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بعض لوگ جب ہم ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہے اور وہ زبان سے یہ کہتے ہیں کہ شکر ہے جب کہ دل میں ہر وقت جمع دنیا کی فکر لیے رہتے ہیں اور دنیوی امیدوں کے مکمل طور پر حاصل نہ ہونے سے کف افسوس ملتے رہتے ہیں اور دین کے سلسلے میں (At least) کا جملہ یاد کئے ہوئے ہیں یعنی کہ میں کم سے کم اتنے دین پر تو عمل کرتا ہوں بس یہی میرے لیے کافی ہے۔ ایسے لوگ حقیقت میں شکر گزار نہیں ہیں اور وہ شکر کے معنیٰ اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

نام روشن کر گئے مر کر کے حق پر عارفیں
مر گئے جو مرنے والوں پر وہ حق دیدہ نہیں

یعنی دنیا و آخرت کی سرخروئی اور عزت انہیں لوگوں کا مقدر ہوئی جنہوں نے اپنے خالق و مالک اللہ کی معرفت حاصل کی اور اس کے حکموں پر اپنی ساری آرزوئیں اور تمنائیں قربان کرڈالیں اور اپنے مالک پر فدا ہو گئے اسی کی محبت کے گیت گاتے سنتے سناتے دنیا سے رخصت ہو گئے اور جو لوگ مرنے والوں پر مرے ہیں وہ مٹی پر مر کر مٹی ہو گئے اور حقیقت میں وہ انجام سے بے خبری کی زندگی گزار کر اپنا سب کچھ خاک میں ملا گئے ظاہر ہے کے ناجائز محبتوں میں رات و دن مرنے والے اور جان دینے والے یا دنیا کے عہدوں اور منصبوں نام و نمود اور شہرت و عزت کی خاطر مرنے والے یہ بھی اپنے آپ کو مٹی میں ملا گئے اور بالآخر جس کے لیے انہوں نے اپنے قیمتی لمحات حیات ضائع کیے مرنے کے بعد وہ سب معدوم و فنا ہو گئے۔

اللہ کا مل جانا سارے عالم کا مل جانا ہے

پالیا جس نے خدا کو پالیا سارا جہاں
کون کہتا ہے کہ اہل دل جہاں دیدہ نہیں

حضرت والا کی اس نظم کا ایک ایک شعر ایسا ہے کہ اس کی تشریح میں صفحات کے صفحات بھر جائیں اور حضرت والا کی اس نظم کے سب اشعار جنوبی افریقہ میں ہی موزوں ہوئے ہیں اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ جس بندۂ خدا نے اللہ کو پالیا سمجھ لو کہ اس نے سارا جہان پالیا وجہ یہ ہے کہ جس کی کسی ملک کے صدر اور وزیر اعظم سے گہری دوستی ہو جائے تو سمجھو کہ اس ملک کے سارے خزانے اور سرکاری محکمے اس کے ہو گئے ہیں التکشف میں حضرت تھانویؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو اس کی خبر دیتے ہیں کہ اے جبرئیل میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو تو حضرت جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر حکم ہوتا ہے کہ سارے فرشتوں میں اعلان کر دو تو سب فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بالآخر اہل زمین کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اسی طرح اس کے برخلاف صورت ہے کہ جب اللہ کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو بتا دیتے ہیں کہ میں فلاں بندے کو ناپسند کرتا ہوں۔ چنانچہ تم بھی اس کو ناپسند کرو تو حضرت جبرئیل اس کو ناپسند فرماتے ہیں اور پھر اسی طرح فرشتوں میں اعلان کیا جاتا ہے یہاں تک کے تمام فرشتے اس بندے سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور پھر اہل زمین کے دلوں میں اس کی نفرت ڈال دی جاتی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا﴾

(سورۃ مریم، آیت: ۹۶)

ترجمہ: کہ جو مومنین اعمالِ صالحہ اختیار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک روایت ترمذی شریف میں آئی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہے:

﴿مَا اَقْبَلَ عَبْدٌ بِقَلْبِهٖ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اِلَّا اَقْبَلَ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ اَهْلِ الْاِيْمَانِ اِلَيْهِ حَتّٰى يَرْزُقَهٗ مَوَدَّتَهُمْ وَرَحْمَتَهُمْ﴾

(الزھد الکبیر للبیھقی)

یعنی جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دلوں کو اس کی جانب مودت و محبت اور الفت و رحمت کے ساتھ پھیر دیتے ہیں یعنی اہلِ ایمان کے دلوں میں اس اللہ والے کے لیے جذبات محبت و مودت رکھ دیے جاتے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ ہر خیر اور بھلائی اس بندے کی طرف جلد پہنچا دیتے ہیں۔ لوگوں کی زبانوں پر اس کے لیے ثنائے حسن اور تعریفی کلمات اور دعائیہ جملے عطا کیے جاتے ہیں۔

جیسا کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی ایک تفسیر بعض مفسرین کے نزدیک یہی ہے۔ اس لیے بندہ کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ میں دنیا میں رہتے ہوئے اپنی سب حرام آرزوؤں کو چھوڑ دوں اور اللہ کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کر کے اللہ کو پا جاؤں اور اس کو راضی کرلوں ہر عمل میں اخلاص اور للّٰہیت اختیار کروں میری خلوتیں اللہ سے آہ وزاری اور گریہ وبکاہ میں گزریں اور میری جلوتیں اس کی عظمت و محبت کی داستانیں سنانے اور توحید و رسالت کی باتیں پھیلانے میں خرچ ہوں ہماری محنتوں اور کوششوں کا رخ اسی طرف ہونا چاہیے کیوں کہ مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوگیا کہ محبت زمین سے آسمان کی طرف نہیں چلتی بلکہ آسمان سے زمین پر اترتی ہے اس لیے ہمیں ریا کاری کر کے اور اپنے نام کی شہرت کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں عزت تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ورنہ اس کا نتیجہ سوائے خسر الدنیا والاخرۃ کے اور کچھ نہیں یعنی دنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد ہو کر رہ جائے گی۔

اور خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کو راضی کرلینے سے بس یہ سمجھ لو کہ دونوں جہاں اپنے ہوگئے بس اللہ راضی ہو جائے پھر چاہے وہ شہرت دے یا گمنامی، مالداری دے یا فقیری، وسعت دے یا تنگی، صحت دے یا بیماری غرض کہ اصل بنیاد ہماری زندگی کی رضائے الٰہی پر ہے باقی ساری چیزیں اس کے بعد کے درجہ کی ہیں گو کہ ہم کو دنیا میں رہتے ہوئے دنیوی حاجات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم اللہ سے عافیت اور راحت مانگیں۔

لیکن ہر عقل مند جانتا ہے کہ حاجت اور مقصد دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسا کہ کوئی بیت الخلاء میں جا کر بیٹھتا ہے تو وہاں بیٹھنا حاجت ہے مقصد نہیں اس لیے ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد اپنا مزید وقت وہاں بیٹھ کر کوئی ضائع نہیں کرتا۔ بس میرے بھائیو! دنیا کی جتنی چیزیں اور حاجتیں ہیں ان سب کی مثال ٹھیک اسی طرح ہے اور عبادتِ خداوندی اور معرفتِ الٰہی اور رضائے مولیٰ اصل ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہماری پوری توجہ اسی مقصد پر خرچ ہونی چاہیے جس کی بدولت انشاء اللہ ہماری جملہ حاجات خود بخود پوری ہوتی رہیں گی۔

گریہ وزاری میں قربِ خداوندی کی ایک خاص مثال

لذتِ قربِ ندامت گریہ وزاری میں ہے
قرب کیا جانے جو دیدہ اشک باریدہ نہیں

اس مضمون کو ہم ایک حسی مثال سے اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جب چھوٹا بچہ اپنی ماں کے سامنے کسی بات پر روتا اور چلاتا ہے تو ماں اسے محبت وشفقت کے ساتھ گود میں لینے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب تک وہ روتا نہیں تو ٹال مٹول کرتی ہے یہاں تک کہ اگر ماں گہری نیند میں سوئی ہو اور بچہ کو کسی چیز کی طلب ہو تو وہ جب تک بیدار نہیں ہوتی جب تک کہ بچہ رونا شروع نہ کر دے اسی طرح بندے کا اللہ تعالیٰ سے معاملہ یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے سامنے رونے لگتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو خاص محبت ہو جاتی ہے اور خاص قرب کی لذت محسوس ہوتی ہے دل کو سکون اور ٹھنڈک میسر آ جاتی ہے اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ جن آنکھوں کو اللہ کے لیے رونا نصیب نہیں ہے وہ قرب خداوندی کی لذت کیا جانے۔ چنانچہ ہم نے حضرت والا کی زندگی میں یہ دو باتیں خاص دیکھی ہیں قلب بریاں اور چشم گریاں بکثرت دوران مجلس حضرت والا کے چہرے پر آنسوؤں کے قطرے جاری رہتے ہیں۔

یہی تو وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ تم اللہ کے سامنے رویا کرو اور اگر تم کو رونا نہ آئے تو بہ تکلف رونے والوں کی شکل بنالو اور رونا کیوں نہیں آتا اس کی فکر ہونی چاہیے آج کل عام طور پر عریانیت و بے حیائی کی وجہ سے لڑکے لڑکیوں کی محبت اور ننگی تصویروں، فلموں میں دیکھے جانے والے بے حیائی کے مناظر کی وجہ سے دلوں میں شقاوت پیدا ہوگئی اور غفلت کا زہر چڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے آنکھ آنسو بہانے سے خشک ہے اور حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان گناہوں کی ایک نقد سزا دنیا میں یہ ہے کہ عبادت کی حلاوت اور مناجات کی لذت چھین لی جاتی ہے دل مردہ اور آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ بسا اوقات ہوتے ہوتے فرائض وواجبات کے ترک تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

آنکھیں خشک ہونے کا سبب

اسی طرح آنکھیں خشک ہو جانے کا ایک بڑا سبب فضول کاموں اور لغو باتوں اور لایعنی حرکتوں میں مشغول ہونا اور اپنے اوقات کو ضائع کرنا بالخصوص عشاء کے بعد دیر تک بیٹھ کر ایسی مجلسیں منعقد کرنا اسی لیے تسامر بالیل سے خاص ممانعت کی گئی ہے کہ رات کو بیٹھ کر ادھر ادھر کے قصے اور قیل وقال میں اپنا وقت بے کار کرنا حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿ لَا تُكْثِرِ الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ ﴾
(ضعیف سنن الترمذی)

یعنی اللہ کے ذکر کے بغیر فضول اور لایعنی باتیں زیادہ نہ کرو کیونکہ اس سے قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے اور دل میں سختی آتی ہے اور جو دل سخت ہوتا ہے وہ اللہ سے بہت دور ہے تو جو سخت دل والا ہے وہ بھی دور ہوگا۔ اسی کو عربی کا شاعر کہتا ہے ؎

لِقَآءُ النَّاسِ لَیُسَ یُفِیُدُ شَیْئًا
سِوَی الْهَذْیَانِ مِنْ قِیْلٍ وَّ قَالٍ
فَاقْلُلْ مِنْ لِقَاءِ النَّاسِ اِلَّا
لِتَعْلِیْمِ عِلْمٍ اَوْ اِصْلَاحِ حَالٍ

یعنی لوگوں سے ملنا سوائے قیل وقال کی بکواس کے اور کچھ فائدہ نہیں دیتا اس لیے لوگوں سے ملاقات کے سلسلے کو کم کردے ہاں اگر علم سیکھنا ہو یا اصلاح وتزکیہ کے لیے ملنا ہو تو ملے۔

اس لیے خاص طور پر ہم خانقاہ میں وقت لگانے والوں کے لیے اس سے بہت شدت سے پرہیز کرنا چاہیے کے عشاء کے بعد بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنے اوقات کو ضائع کریں اور پھر اس کی نحوست سے جو دل میں سختی پیدا ہو یا تو صبح کو جلد اٹھ کر شب اخیر میں کچھ دعاؤ مناجات کا موقعہ ہی میسر نہ آئے یہ اگر موقعہ بھی مل جائے تو اللہ کے سامنے گریا وزاری کی لذت سے محروم رہے اور یہ چیز مقصد میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اسی لیے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے یہاں خانقاہ میں قیام کے دوران علمی مجالس کی بھی ممانعت رہتی تھی اور حضرت کی خانقاہ کا دار و مدار دو چیزوں پر ہوتا تھا ایک سکوت اور دوسرا سکونِ اول کا تعلق زبان سے ہے اور دوسری کا تعلق قلب سے ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مفتی شفیع صاحب اور حضرت قاری محمد طیب صاحب خانقاہ تھانہ بھون قیام کے دوران بعض علمی مسائل کے سلسلے میں گفتگو کیا کرتے تھے تو اس کی اطلاع حضرت کو ہوگئی بس اس کے بعد بلا کر پابندی لگا دی گئی اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خانقاہ میں رہتے ہوئے خاص طور پر یہ مجالس ہمارے قلب کی حالت کے لیے کس قدر مضر اور نقصاندہ ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بندہ کا مقصود اس گفتگو سے یہ نہیں ہے کہ ہم خانقاہ میں رہتے ہوئے دوسروں کے نقائص اور عیوب پر مطلع ہوں اور ان کی تلاش وجستجو میں لگیں کہ کون اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اور کون دوسرے کسی نامناسب کام میں لگا ہوا ہے بلکہ محض سامنے نظر آنے والی ایک مضر صورت حال کی طرف خیر خواہانہ اور ہمدردانہ توجہ دلانا مقصود ہے تاکہ ہم سب یہاں رہنے والے حضرت والا کی خدمت میں رہ کر پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں اور خانقاہ سے جانے کے بعد حسرت وافسوس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے عیوب اور نقائص کے تفحص اور تتبع سے ہم کو سختی سے منع

فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے التکشف میں روایت نقل کی ہے:

﴿ لَا تَنْظُرُوْا فِیْ ذُنُوْبِ النَّاسِ كَاَنَّكُمْ اَرْبَابٌ وَانْظُرُوْا فِیْ ذُنُوْبِكُمْ كَاَنَّكُمْ عَبِيْدٌ ﴾

(موطا مالک، کتاب الجامع)

یعنی تم لوگوں کے گناہوں میں اس طرح مت دیکھو کہ تم ان کے مالک ہو اور وہ تمہارے نوکر ہیں اور مالک کو یہ حق ہوتا ہے کہ اگر نوکر میں کوئی خرابی ہو اور وہ کوئی غلط کام کرے تو اس پر اس کو متنبہ کرنا ہوتا ہے بلکہ تم اپنے گناہوں میں دیکھو کہ جیسے کہ تم غلام ہو تم کو کسی مالک کو حساب دینا پڑے گا اور مالک کے سوالات کا سامنا ہوگا تم اپنے گناہوں کو دیکھو اور غور کرو پھر حضور نے ارشاد فرمایا کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہے کہ جو کسی مصیبت و معصیت میں مبتلاء ہیں اور دوسرے وہ ہیں جن کو عافیت دی گئی ہے تو جو بچارے معصیت میں مبتلاء ہیں ان پر رحم کھاؤ اور اگر اللہ نے تم کو عافیت وسلامتی دی ہوئی ہے اور گناہوں سے بچا رکھا ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اس لیے گناہ گار پر رحمت وشفقت اور الفت کی نگاہ ڈالنی چاہیے اور اس کو نکیر بلاتحقیر کرنی چاہیے اور اپنے گناہوں سے حفاظت پر اپنا کمال نہ سمجھ کر اللہ کی توفیق پر اسی کا شکر ادا کرنا چاہیے آج یہ ہمارا بڑا مرض ہے کہ کسی بھی دین کے شعبے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد اور اس سے کچھ مناسبت ہونے کے بعد جذبات ابھرتے ہیں اور دوسروں کے حالات کے تتبع اور تلاش میں لگ جاتے ہیں اور ان پر تحقیرانہ انداز سے تحریریں اور تبصرے شروع کر دیتے ہیں۔

بہر حال میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دل کو سخت کرنے والی اور آنکھوں کو خشک کر دینے والی باتوں سے ہم پرہیز کریں اور کسی کو کسی بھی نامناسب بات میں اگر دیکھیں تو ان پر نکیر بلاتحقیر کرنے کی عادت ڈالیں اور گریہ و زاری میں جو لذت قرب ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کریں۔

توفیقِ توبہ دلیلِ مغفرت ہے

جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہوگئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

خلاصۂ شعر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بندے کو توبہ استغفار کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول بھی کریں گے گویا توبہ واستغفار کی توفیق اسی کو دی جاتی ہے جس کی توبہ اللہ تعالیٰ کو قبول کرنی ہوتی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ڈھیل دینے کا ہوتا ہے اور وہ ڈھیل اس طرح دی جاتی ہے کہ گناہوں میں مشغول ہونے کے باوجود بظاہر سب حالات ٹھیک ٹھاک چلتے رہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم اپنی جس حالت میں مشغول ہیں بالکل ٹھیک ہیں۔ اسی کو قرآن نے یوں ذکر کیا ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۱۸۲)

ترجمہ: اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۳۳)

یعنی اللہ کے مبغوض اور ناپسندیدہ بندے کفار اور مشرکین اور فاسق اور فاجر لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس طرح ڈھیل دیتے ہیں کہ ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور جن کو معاف کرنا ہوتا ہے ان کے دل میں ندامت و شرمندگی کی کیفیات پیدا فرماتے ہیں بالآخر وہ بندے تائب ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت:۱۱۸)

ترجمہ: پھر مہربان ہوا ان پر تا کہ وہ پھر آئیں بے شک اللہ ہی ہے مہربان رحم والا۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۴۷۷)

بندے کو ایک مرتبہ حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خط کے جواب میں جس میں احقر نے لکھا تھا کہ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے زندگی کہ جن گناہوں سے کلی طور پر تائب ہوچکا ہوں اور ان کا خیال بھی دل سے نکل چکا ہے۔

لیکن پتہ نہیں کہ یہ توبہ اللہ کی بارگاہ میں قبول بھی ہوئی ہوگی یا نہیں اس پر حضرت نے سختی سے یہ بات لکھی کہ خبردار! اس طرح کی سوچ بھی کبھی دل میں نہ لانا جب اس نے توبہ کی توفیق دی ہے تو ضرور توبہ قبول بھی ہوئی ہے۔

اور اس مقام پر ایک اور بات سمجھ لینی چاہیے کہ توبہ کی حقیقت محض زبان سے یہ کہنا نہیں ہے یا اللہ میری توبہ بلکہ اس کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے نمبر (۱) ماضی میں کیے ہوئے گناہ پر ندامت اور نمبر (۲) آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم اور ارادہ اور نمبر (۳) فی الحال اس گناہ کو چھوڑ دینا اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی قیمتی بات تحریر فرمائی ہے کہ دل میں یہ رکھے کہ اللہ جان دے دوں گا مگر اب تیری نافرمانی نہیں کروں گا لیکن اگر نفس و شیطان کے بہکانے سے مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو فوراً آپ ہی کے در پے آکر آپ ہی سے معافی چاہوں گا اور آپ کو کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔

توبہ میں تاخیر اور ٹال مٹول کرنا شیطانی چال ہے

اور اگر آپ غور کریں تو یہ بات معلوم ہوگی کے یہ تینوں باتیں ایک لمحہ میں پائی جاسکتی ہیں لمبا چوڑا وقت درکار نہیں ہے اسی لیے جو بندہ ابھی مجلس میں بیٹھے بیٹھے کسی گناہ کے چھوڑنے کے سلسلہ میں پختہ فیصلہ کرلے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تائب ہوچکا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مجلس میں جاکر پہلے غسل یا وضو کرے پھر نماز پڑھے پھر توبہ کرے یا یہ کہ میں جمعہ کے دن سے توبہ کروں گا یا رمضان سے توبہ کروں گا یا فلاں بزرگ کے ہاتھ پر جس دن سے بیعت ہونگا اس دن سے تائب ہوجاؤنگا۔

یاد رکھنا چاہیے یہ سب نفس و شیطان کی چالیں ہیں جن کے ذریعے ہمیں توبہ سے دور رکھا جاتا ہے یہاں

تک کے ہوتے ہوتے اسی سوچ میں ہماری ساری عمر گزر کر زندگی کا آخری لمحہ آپہنچتا ہے جب کے سوائے حسرت اور سوچ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اس مضمون پر وہ قصہ دلیل ہے جس کو ایک روایت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جو ۹۹ قتل کر چکا تھا اس نے ایک را ہب سے سوال کیا کیا میرے لیے توبہ ہے تو اس راہب نے جواب دیا کہ تجھ جیسے ظالم اور پاپی کے لیے کہاں توبہ ہوسکتی ہے تو جب اس نے یہ دیکھا کہ توبہ ہے ہی نہیں تو اس راہب کو بھی قتل کر دیا اور پھر وہ ایک عالم کے پاس پہنچا اور ان سے یہی سوال کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ تیرے اور توبہ کے درمیان کون حائل ہوسکتا ہے اور ان کو یہ ہدایت کی کے تم فلاں بستی میں جاو وہاں اللہ کے خاص نیک بندے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ اس طرف چلنے لگا راستے میں جاتے ہوئے اس کی موت کا وقت آپہنچا اب روایت میں آتا ہے کہ ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب دونوں میں اس کی روح نکالنے کے سلسلے میں مباحثہ ہونے لگا بالآخر اللہ کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ جس سرزمین سے یہ چلا تھا اور جہاں تک یہ پہنچا تھا اس کی مسافت اور جس سرزمین توبہ وطاعت میں یہ جارہا تھا اس کی مسافت کو ناپا جائے اور ادھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو یہ حکم دیا کہ تو ایک طرف سمٹ جا تو بالاخرارض توبہ وطاعت سے وہ بندہ قریب پایا گیا اور اس طرح ملائکہ رحمت نے اس کی روح نکالی اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس کے توبہ کے پختہ عزم کو اللہ نے اپنے یہاں توبہ شمار کرلیا اس لیے دین کی بات سن کر جب بھی توبہ کا جذبہ پیدا ہو تو اس میں ذرہ برابر تاخیر نہ کرنی چاہیے۔

حفاظت بصارت پر بصیرت ملنے کا وعدہ ہے

جب بصارت کی حفاظت سے بصیرت مل گئی
ہوکے نادیدہ بھی اس کی آنکھ نا دیدہ نہیں

جو آدمی اپنی نگاہوں کو حرام جگہ ڈالنے سے بچاتا ہے اور اپنی ظاہری بینائی کو اللہ کے حکم کے خلاف استعمال نہیں کرتا اور چوری چھپے خیانت میں مبتلاء نہیں ہوتا اگرچہ دل میں خوب تقاضہ اور داعیہ پیدا ہو مگر یہ ایک لمحہ کے لیے غلط نظر نہیں اٹھاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بدنظری کرنے سے اللہ کی طرف سے لعنت برستی ہے اور میں رحمت کے سایہ سے نکل کر لعنت کے سایہ میں آجاتا ہوں اور میں اس بری حرکت سے اللہ کی نگاہ میں آنکھ کا زانی قرار پاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑنے والا اور اس کا نافرمان شمار ہوتا ہوں کیونکہ اللہ نے مجھ کو حکم دیا کہ نگاہ کو نیچی رکھو اس لیے اگر میں نے نامحرم پر نگاہ اٹھائی تو میں خدا کا نافرمان قرار پاؤں گا۔

تو گویا نظر بازی کے نتیجہ میں حقیقت کے لحاظ سے مجھے تین برے لقب ملیں گیں (۱) ملعون (۲) آنکھوں کا زناکار (۳) خدا کا نافرمان اس لیے پھر میری تباہی اور بربادی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔

صاحبو! اس دور میں خاص طور پر بصارت کی حفاظت کا معاملہ بہت اہم اور سنگین ہے کیونکہ ہر طرف عریانیت و بے حیائی اور ننگا پن پھیلا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ جس کے دل میں خوف خداوندی موجود ہو وہ اس سب کے باوجود اپنی نگاہوں کی حفاظت کرتا ہے اور بقول حضرت والا نگاہ بچانے میں جتنا مجاہدہ اٹھاؤ گے اتنی ہی مقدار کا حلوہ ایمانی عطا ہوگا اس لیے ہمت کر کے نگاہوں کی پوری طور پر حفاظت کرنی چاہیے۔

اور غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نگاہ بچانے کا جنت میں داخل ہونے کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے چنانچہ قرآن میں اللہ نے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نگاہ بچانے سے شرم گاہ کی حفاظت ہوگی اور اس کی بدولت قلب کی طہارت وصفائی مل جائے گی اور جسے قلب کی صفائی وطہارت مل جائے وہ فلاح وکامیابی پا جائے گا اور جسے فلاح وکامیابی مل گئی اسے جنت میں داخل کر دیا گیا اور جہنم سے بچا لیا گیا تو خلاصہ یہ نکلا کہ نگاہ کا بچانا اتنا قیمتی عمل ہے کہ مومن کو جنت میں داخل کرا دیا اسی لیے حضرت والا نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جب تم بصارت کی حفاظت کرلو گے تو تمہیں بصیرت مل جائے گی، اسی پر تائب صاحب کا شعر ہے۔

کر کے بصارتیں فدا ہم کو بصیرتیں ملیں
سوچ خدا کو کیا دیا دیکھ خدا سے کیا لیا

اس لیے کہ قلب کی مثال دارالخلافہ اور راجدھانی کی ہے اور نگاہ کی مثال بارڈر کی اور سرحد کی ہے راجدھانی (Capital) کی حفاظت جب ہی ہوسکتی ہے جبکہ ملک کے بارڈر اور سرحدیں پورے طور پر محفوظ ہوں اسی لیے نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ النَّظْرَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ﴾

(کنز العمال)

یعنی نظر شیطان کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے تو ظاہر ہے کہ نظر بازی کے نتیجہ میں دل میں پہنچ کر دل کی حیات کو ختم کر دے گا اور اسی کا نام بصیرت ہے اس لیے ایسا آدمی ظاہر میں حرام چیزوں کو دیکھنے سے نابینا بن جاتا ہے مگر اللہ کی طرف سے اس کو حقیقی بینائی عطا ہوتی ہے اسی کو بصیرت کہتے ہیں اور یہ دل کا ایک نور اور خاص جلاء وروشنی ہے جو نظر کو بچانے اور گناہوں سے دور رہنے سے حاصل ہوتی ہے اس مسئلہ پر حضرت والا کا مستقل ایک رسالہ ہے جس کا نام ہے ''بدنظری کے چودہ نقصانات'' اس کو خود پڑھنا اور دوستوں کو پڑھوانا چاہیے۔

تقویٰ ہر مسئلے کا حل ہے

برکت تقویٰ سے جس کے ساتھ ہو فضل خدا
اس کے پیچیدہ مسائل کوئی پیچیدہ نہیں

یعنی جو آدمی تقویٰ اختیار کرے گا اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال ہوگا تو اس کی ساری مشکلات آسانیوں میں تبدیل ہوجائینگی اور اس کے پیچیدہ مسائل پیچیدہ نہیں رہنگے اور ہر نوع کے الجھے ہوئے معاملات سلجھ جائیں گے اس کا اعلان خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾
(سورۃ الطلاق آیت: ۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۷۲)

دنیا کا کوئی تعویذ اور جھاڑ پھونک یا کوئی وظیفہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں تمام مشکلات سے حل کی ضمانت موجود ہو گناہوں میں مبتلاء رہنے کے ساتھ کوئی تعویذ اور وظیفہ اس مقصد کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ احقر ہندوستان میں ایک جگہ سفر کر رہا تھا راستہ میں ایک جگہ بعض احباب کے یہاں چند منٹ کے لیے ٹھہرنا ہوا تو ان کے کمرے میں دیوار پر ایک تعویذ لٹکا ہوا تھا جس کے اوپر یہ لکھا تھا ''برائے حل جمیع مشکلات'' کہ یہ تعویذ صبح شام دیکھنے سے تمام مشکلات حل ہوجاتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ تعویذ بنا کر بیچنے والا خود اس تعویذ کو صبح شام دیکھ لیا کرے اور اس کی ساری مشکلات حل ہوجائیں تو آخر اسے تعویذ بنانا پھر فریم کرانا پھر لوگوں کو بیچنا ان سب کاموں کی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ سب دھوکہ اور فریب ہے اور اس میں کوئی سچائی نہیں ہے ہاں احقر پورے رسوخ اور یقین کے ساتھ یہ بات کہتا ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے گا یعنی تمام گناہوں کو چھوڑ کر اور اللہ کے احکام پورا کرتے ہوئے زندگی گزارے گا تو بلا کسی شک وشبہ کے اس کی دنیا اور آخرت کی ہر نوع کی مشکلات آسان ہو کر رہیں گی مگر بات یہ ہے کہ گناہوں سے کلی اجتناب ہو آج کل عام طور پر لوگ نماز روزہ کر لینے کو تقویٰ سمجھتے ہیں جب کہ زندگیوں میں تصویر کشی، نامحرم سے میل جول اور تعلقات، ٹی وی، وی سی آر پر گندے مناظر دیکھنا، سودی کاروبار میں مبتلاء رہنا، رشتوں ناتوں کو توڑ دینا، داڑھی کٹانا اور وغیرہ جیسے گناہ بھی موجود ہیں۔ ورنہ خدا کا یہ فیصلہ شروع سے قیامت تک قائم رہے گا بعض لوگ گناہوں میں مبتلاء رہتے ہیں اور جب ان کو ان کی خرابی بتائی جاتی ہے اور مشکلات ومصائب اور آفات وبلیات سے حفاظت کے لیے گناہ سے بچنے کی بات کہی جاتی ہے تو پھر وہ اللہ کے غفور الرحیم ہونے کی بات کرنے لگتے ہیں اور اس تمنا میں رہتے ہیں کہ گناہوں میں مبتلاء رہنے کے ساتھ ان کو کوئی وظیفہ بتا دیا جائے یا کوئی ایسا تعویذ دے دیا جائے جو اندرونی بیرونی مشکلات سے بچنے کے لیے کافی ہو۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو اللہ کے غفور الرحیم ہونے پر ایسا ایمان اور یقین ہے تو اللہ کے رب اور رزّاق ہونے پر ایسا یقین کیوں نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح غرض یہ کہ رات و دن آپ مال و دولت کمانے کے لیے اس قدر سرگرداں و پریشان کیوں دکھائی دیتے ہیں اللہ کے رزاق اور رب ہونے پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو اپنے ظن وگمان کے مطابق گھر سے باہر نکلنا نہیں چاہیے تھا اس لیے درحقیقت بات اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا دھوکہ ہے جس میں ہم مبتلاء ہیں۔

دوسری بات بھی قابلِ غور ہے کہ بندہ گناہوں کو اس سہارے پر کر رہا ہے کہ اللہ غفور الرحیم ہے تو آخر اللہ تعالیٰ کی صفات میں یہ بھی تو ہے کہ میں قہار اور ذوانتقام، سریع الحساب، شدید العقاب ہوں اور میرا عذاب دردناک عذاب ہے تو پھر ہم نے کس بنیاد پر اپنے لیے یہ طے کرلیا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک صفت والا معاملہ کریں گے دوسری صفت والا نہیں ہاں کوئی اللہ کا نیک بندہ ہو اور گناہوں سے بچتا ہو پھر وہ یہ فیصلہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ دل میں یہی گمان قائم کرے کہ میرے لیے اللہ غفور الرحیم ہونگے تو بے شک اس کی یہ بات درست اور بجا ہوگی کیونکہ اس کی ایک بنیاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ اعلان فرمادیا:

﴿اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے نیک کام کرنے والوں سے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۵۷۵)

اور دوسری قرآن کی آیت کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء پر نہ کوئی رنج ہوگا نہ کوئی غم اور وہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جو اللہ سے ڈرتے تھے۔ نیکی اور تقویٰ کے بغیر نجات وفلاح کی امید رکھنا یہ بے بنیاد آرزوئیں اور تمنائیں کہلاتی ہیں جیسے کہ کوئی شخص نکاح تو نہیں کرتا اور یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے اولاد کا امیدوار ہوں اس لیے اس شعر کا خلاصہ یہ نکلا کہ جس کو ایسی زندگی مطلوب ہو کہ جو مشکلات سے خالی ہے اور الجھنوں سے محفوظ ہے تو وہ تقویٰ اختیار کرلے ایک لمحہ اللہ کو ناراض نہ کرے تو ان شاء اللہ اس کو کسی بھی نوع کی اندرونی اور بیرونی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی اور اگر لاحق ہوگی بھی تو اس کا دل بالکل پریشان اور بے چین نہیں ہوگا بلکہ وہ سب کچھ ترقی درجات کے لیے ہوگا۔

لذاتِ دنیویہ کا گرویدہ ہونا حقیقت بینی نہیں ہے

اہل دل کی صحبتوں سے جو حقیقت بیں ہوا
لذت دنیائے فانی کا وہ گرویدہ نہیں

جو شخص دنیا کے ظاہری نقشوں سے دل نہ لگائے اور ان سے دھوکہ نہ کھائے اور خزاں کو بہار نہ سمجھے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت کو پاگیا ہے اور دنیا کے اصل رنگ وروپ کو سمجھ گیا ہے اس لیے وہ دنیائے فانی کی لذت پر گرویدہ اور فریفتہ نہیں ہے اور حضرت والا نے جو تعبیر فرمائی ہے (یعنی حقیقت بیں ہونا) یہ نہایت عمدہ تعبیر

ہے کیونکہ دنیا درحقیقت دھوکے کا گھر ہے جیسا کہ قرآن کریم کے اندر جگہ جگہ یہ بات بیان فرمائی گئی ہے اور دھوکے کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز نظر کچھ آرہی ہو اور اندر سے کچھ اور ہو چنانچہ دنیا کا یہی معاملہ ہے کہ بظاہر بہت خوبصورت اور عمدہ نظر آتی ہے اس کی شہرتیں اور عزتیں بڑی اچھی لگتی ہیں اور اس کی چمک دمک دل کو خوب بھاتی ہیں لیکن میں قربان جاؤں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ امت کو اس کے مکر وفریب سے مختلف انداز اور طریقوں سے آگاہ فرمایا ہے بڑے خوش نصیب اور سعادت مند ہیں وہ لوگ جو دنیا سے اپنے منہ موڑ لیں اور اپنی نظریں حقیقت کی طرف پھیرلیں۔

اور تجربہ یہ ہے کہ دنیا کی لذتیں اس قدر جاذب نظر اور پرکشش ہیں کہ ان سے بچنا اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور اولیاء اللہ کی صحبتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے اور عام طور پر جتنے جھگڑے اور فسادات اور آپسی رنجشیں اور اختلافات ہیں ان سب کی جڑ یہی دنیا کی محبت ہے اور اس کے عیش وعشرت میں پڑ جانا ہے اسی لیے میں بہت شرح صدر کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اللہ کے نبی کے صحابہ میں سے ایک بھی دنیا کے عیش وعشرت کا شیدائی نہ تھا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر یہ نصیحت فرمائی:

﴿ ایاک والتنعم فان عباد اللہ لیسوا بالمتنعمین ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص: ۴۴۵)

اے معاذ عیش وعشرت میں پڑنے سے بچنا کیوں کہ اللہ کے خاص بندے عیش پسند نہیں ہوتے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آرام کی زندگی عطا فرمائے اور عزت وعافیت کے ساتھ رہنا مقدر فرمادے تو یہ کوئی بری چیز ہے بلکہ مقصد اس کا عادی ہوجانا اور اس کے درپے ہوجانا ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ جو رجال اللہ ہیں وہ دنیوی لذتوں کے گرویدہ نہیں ہوتے عمدہ اور اعلیٰ درجے کا کھانا پینا اور رہنا سہنا مل گیا تو بھی الحمد للہ اور اگر سیدھا سادھا میسر آیا تو بھی اسی طرح خوشی کے ساتھ الحمد للہ کہتے ہیں۔

نجات کا سہارا صرف فضلِ خداوندی ہے

روزِ محشر اے خدا رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

اس شعر میں حضرت والا ہم سب متعلقین کے لیے عبدیت کاملہ اور حقیقی تواضع کا درس دے رہے ہیں یعنی بندے کو ہر گھڑی اپنے اللہ کے سامنے اسی طرح پیش ہونا چاہیے کہ اے اللہ! جیسی ہمیں آپ کی معرفت حاصل کرنی چاہیے تھی ہم نہیں کرسکے اور جیسی ہمیں آپ کی عبادت کرنی چاہیے تھی ہم نہ کرسکے اور جیسا آپ جیسے رحیم و کریم اللہ پر ہمیں فدا ہونا چاہیے تھا ہم نہیں ہوسکے غرض کے ہماری کوئی ادا اور کوئی عمل اس کا حق دار نظر نہیں آتا کہ جس کے سہارے اور امید پر ہم یہ تمنا کریں کہ ہماری بخشش ہوگی اور معاف کیا جائے گا بس آپ کی بارگاہ میں اتنا

عرض ہے کہ ہمارا حال تو بہت خراب ہے آپ اپنی شان رحیمی و کریمی سے ہمیں محروم نہ فرمایئے گا اور قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے گا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت والا کی پوری زندگی کس طرح گزری ہے اور اللہ کی راہ میں کتنے مجاہدات اٹھائے اور کس قدر مشقتیں اور تکلیفیں سہی تین تین اپنے زمانے کے بڑے اولیاء اللہ کی صحبت و خدمت معیت و رفاقت حاصل رہی اور عمر بھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور عظمت خلوت وجلوتوں میں بیان کرتے کرتے گزار دی مگر اس کے باوجود جب حضرت والا یہ فرمار ہے ہیں تو ہم حضرت کے خدام اور متعلقین کے لیے اس میں کتنا بڑا اہم سبق ہے اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی حقیقت وفہم عطا فرمائے اور اپنی رحمت سے کامل عبدیت عنایت فرمادے۔

تسلیم و رضا سے بہار بے خزاں ملتی ہے

کیف تسلیم و رضا سے ہے بہار بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختر روح رنجیدہ نہیں

یہ شعر تفویض وتوکل اور رضا بالقضا کے مضمون پر مشتمل ہے کے اے اللہ میں نے اپنے ہر معاملے کو آپ کے حوالے کر دیا ہے اور سب کچھ آپ کو سونپ دیا ہے جو کچھ آپ کو میرے لیے پسند ہے وہی مجھے بھی پسند ہے جس حالت میں آپ مجھے رکھنا چاہیں میں اس میں خوش ہوں اور میں آپ کے ہر فیصلے سے راضی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جب آپ ایسے اللہ ہیں کہ جو حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں تو اولاً تو ہمیں آپ کے کسی فیصلے کو چوں و چراں کا حق ہی نہیں کیونکہ ہم آپ ہی کے مملوک ہیں اور غلام کو آقا کے سامنے کچھ اختیار وحق نہیں ہوتا پھر ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ آپ حکیم ہیں آپ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہے آپ مجھے مالدار رکھیں یا غریب صحت مند رکھیں یا مریض، شہرت دیں یا گمنامی غرض یہ کہ جس حال میں بھی آپ رکھیں میں اس پر راضی ہوں۔

بس اتنی بات ہے کہ میں آپ کی آزمائش اور امتحان کے لائق نہیں ہوں اس لیے آپ سے عافیت اور راحت دنیوی واخروی کی بھیک مانگتا ہوں یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے کہ بندہ اللہ سے عافیت مانگے اور پھر جو کچھ حالت اللہ کی طرف سے آئے اس پر راضی ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ تم اللہ سے کیا دعا مانگتے ہو جب کے ان کا رنگ بالکل زرد اور پیلا پڑ چکا تھا اور ان کی حالت مثل چوزے کے ہوگئی تھی تب صحابی نے یہ بات بتائی کہ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر اے اللہ آپ مجھے سزا دینے والے ہیں تو بس دنیا ہی میں دے دینا آخرت میں نہ دینا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ تم یہ دعا کیوں نہیں کرتے کہ اے اللہ مجھے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی حسنة عطا فرما۔ چنانچہ پھر ان کی حالت درست ہوگئی۔

بہر حال رضا بالقضاء مومن کے لیے پرسکون زندگی گزارنے کے واسطے ایسا نسخہ ہے کہ جو اس طرح زندگی گزارے گا اسکے دل میں کبھی بے چینی اور پریشانی پیدا ہو ہی نہیں سکتی اسی کو حضرت نے بہار بے خزاں سے تعبیر کیا ہے کہ دنیا کے چمن و باغوں کو موسم بہار کے بعد موسم خزاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر یہ دل کی ایسی بہار ہے جسے کبھی خزاں لاحق نہیں ہوگی۔

چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے یہ پوچھا کہ کیا حال ہے؟ کہنے لگے کہ بہت اچھا ہے، سارے عالم کا نظام ہماری مرضی کے مطابق چل رہا ہے سننے والوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی مرضی کو اپنے اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے اس لیے جو بھی اللہ کا فیصلہ میں اس پر راضی رہتا ہوں اس لیے گویا سارا عالم میری مرضی کے مطابق چل رہا ہے اس پر حضرت والا نے اپنے ایک بیان میں یہ واقعہ سنایا کہ حضرت حسن بصری اپنے غلام سے یہ پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ غلام نے جواب دیا کہ غلام کا کوئی نام نہیں ہوتا جس نام سے آقا پکارے وہی نام ہے پھر یہ پوچھا کہ تم کیا کھاتے پیتے اور پہنتے ہو اس نے پھر وہی جواب دیا تو حضرت حسن بصری غلام کا یہ جواب سن کر بے ہوش ہو کر گر گئے جب ہوش آیا تو غلام سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے غلام تو نے ہمیں صحیح معنوں میں بندا اور غلام ہونا سکھا دیا ہم تو اللہ کے ساتھ اپنی بے شمار تجویزیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے ویسا ہونا چاہیے یہ ملنا چاہیے وہ ملنا چاہئے درحقیقت یہ سب کچھ تفویض کی شان کے خلاف ہے اور تسلیم و رضا کے منافی ہے۔

میرے طوفانوں میں بھی ساحل رہے

دردِ دل کے فیض یوں شامل رہے
میرے طوفانوں میں بھی ساحل رہے

آہ جو محرومِ دردِ دل رہے
ان کے آب و گل بس آب و گل رہے

بعض ناداں عمر بھر قائل رہے
فائدہ کیا جب نہ وہ گھائل رہے

جو بھی اہل اللہ سے تھے بدگماں
عمر بھر نابالغ منزل رہے

علم کا پندار جن کے دل میں تھا
ہو کے قابل بھی وہ ناقابل رہے

دامن رہبر تھا جن کے ہاتھ میں
بس وہ رہرو فائز منزل رہے

عمر بھر پیتے رہے جو خون دل
راہ الفت میں وہی کامل رہے

راہ حق میں گو بلا آتی رہی
میرے نالے حاصل منزل رہے

میرا جو غم دافع غفلت ہوا
آپ کے غم میں وہ غم شامل رہے

داستانِ درد اے اختؔر سنو
کس طرح دنیا میں اہل دل رہے

مشکل الفاظ کے معنی:۔محرومِ دردِ دل: جواللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کو نہ پا سکے۔ آب و گل: یعنی پانی اور مٹی کے جسم پانی و مٹی ہی رہے۔ قائل: معتقد۔ گھائل: یعنی اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت سے محروم رہے۔ نابالغ منزل: یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے محروم رہے۔ پندار: تکبر۔ دامن رھبر: مرشد کامل کا ہاتھ۔ رھرو: سالک۔ فائز منزل: یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات مل گئی۔ خون دل: اپنے دل کی حرام خواہشات کا خون پیتے رہے۔ راہِ الفت: اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کا راستہ۔ بلا: مصیبت۔ نالے: بہت زیادہ آنسو بہانا۔ حاصلِ منزل: یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب خاص۔ غم دافع غفلت: جس غم سے غفلت دور ہوگئی۔ داستانِ درد: اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کے حصول کی مشقت وتکالیف کی کہانی۔ اھلِ دل: اللہ والے۔

دردِ دل کا فیضان خاص

دردِ دل کے فیض یوں شامل رہے
میرے طوفانوں میں بھی ساحل رہے

اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو اس کی بندگی اور اطاعت کی وجہ سے طوفانوں مین بھی ساحل کا مزہ دیتا ہے گو کہ اس کی کشتی مختلف ناموافق حالات کے طوفانوں میں پھنسی ہوئی ہو لیکن اس کے قلب میں اس گھڑی بھی مکمل چین اور سکون رہتا ہے یعنی یہ ایسا انعام ہے کہ جو بندے کو اسی وقت حاصل ہوتا رہتا ہے اور کیوں حاصل نہ ہو جب کے حق تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو بندے میری یاد میں مشغول رہیں گے، ان کے دلوں میں اطمینان ہر وقت

قائم اور باقی رہے گا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الا بذکر اللہ تطمئن القلوب﴾

(سورۃ الرعد، آیت: ۲۸)

ترجمہ: سنتا ہے! اللہ ہی کی یاد سے چین پاتے ہیں دل۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۱۸۲)

صاحب تفسیر مظہری یہاں پر باء کو فی کے معنی میں لکھتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ دلوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد ہی میں اطمینان میسر آتا ہے جب کہ انسان سر سے پیر تک ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے حکم میں ڈوبا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ آدھا یا دو تہائی جسم اللہ تعالیٰ کے حکم میں لگا رہے اور جسم کا کچھ حصہ اللہ کی نافرمانی میں مشغول ہو نوافل وتسبیحات تو بہت لیکن بذریعہ فون وانٹرنیٹ یا بذریعہ وی سی آر گندے مناظر دیکھ کر آنکھیں خراب کرتا ہے حسین لڑکے اور لڑکیوں سے باتیں کر کے اپنی زبان اور کان کو خراب کرتا ہے اور دل میں گندے گندے خیالات پکاتا ہے ایسا شخص ساحل پر پہنچ کر بھی طغیانی میں رہتا ہے اور اس کی مثال اس طرح سے ہے کہ جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے نہ کہ پانی کے ذریعے كَمَا اَنَّ السَّمَكَةَ تَطْمَئِنُّ فِى الْمَاءِ لاَ بِالْمَاءِ یعنی جس طرح مچھلی اگر پورے طور پر پانی کے اندر ہو تو اسے سکون ملتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ پانی میں ہو اور باقی باہر نکلا ہوا ہو اسے آرام نہیں ملتا چاہے اکثر بدن اس کا پانی میں ڈال دو اس لیے مومن بندے کے اکثر اعضاء بدن طاعت میں لگے ہوں اور کچھ اعضاء معصیت میں مبتلاء ہوں تو ان بعض اعضاء کی نحوست سے اسے چین حاصل نہ ہوگا اور وہ ایسے ہی تڑپے گا جیسے مچھلی بغیر پانی کے۔

آب وگل بلا دردِ دل بے قیمت ہے

آہ جو محروم دردِ دل رہے
ان کے آب وگل بس آب وگل رہے

یعنی جن کے سینے میں اللہ تعالیٰ کا دردِ محبت نہ ہو تو پھر وہ بجز مٹی کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں ہیں اسی لیے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا﴾

(سورۃ الفرقان، آیت: ۴۴)

ترجمہ: اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۴۷۴)

یعنی وہ لوگ جو اپنے سینے میں ایمان نہیں رکھتے جانوروں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ بھٹکے ہوئے ہیں کہ جانور بھی مالک کا اتنا وفادار ہوتا ہے اگر اسے کہیں چھوڑ دو تو وہ چل کے سیدھا اپنے مالک کے مکان پر پہنچتا ہے کسی دوسرے کے در پر نہیں پہنچتا لیکن یہ انسان جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، غیر اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور اس کو اپنی حاجات کے لیے پکارتا ہے۔

اور اگر ایمان رکھتا بھی ہو مگر اللہ کی سچی محبت دل میں نہ ہو تب بھی وہ اسی طرح ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے اور ناجائز جگہوں پر مرتا ہے جینے کی حلاوت ولذت سے محروم رہتا ہے اس لیے اپنے آب وگل کو قیمتی بنانے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ دل کو اللہ کی محبت سے لبریز کیا جائے اور ہر لمحہ اس کو راضی کرنے کی فکر میں اپنی تمام ناجائز تمناؤں کا خون کر دے۔

قائل تو ہو گھائل ہو کے دیکھو

بعض ناداں عمر بھر قائل رہے
فائدہ کیا جب نہ وہ گھائل رہے

یعنی بعض لوگ عمر بھر اس بات کے تو قائل رہتے ہیں کہ واقعی دردِ دل حاصل کرنا چاہیے اصلاحِ نفس اور تزکیہ باطن کرانا چاہیے اور اللہ کی محبت سیکھنی لازم وضروری ہے اس کے بغیر انسان ادھورا اور ناقص رہتا ہے مگر حضرت والا فرماتے ہیں کہ اگر کوئی انسان اس بات کا قائل ہو کہ دہن العود کی خوشبو بہت اچھی ہے، گلاب اور شمامۃ العنبر بہت عمدہ عطر ہے لیکن اس کو استعمال نہیں کرتا اس بات کا قائل رہتا ہے اور مانتا بھی ہے اور زبان سے تسلیم بھی کرتا ہے اور مدح بھی کرتا ہے لیکن وہ عطر اسے کسی طرح کا کوئی نفع نہیں پہنچائے گا جب تک کہ اس کو استعمال نہ کرے بس یہی معاملہ یہاں کا ہے کہ اپنے قلب کو اللہ کی محبت سے گھائل کر کے دیکھے صرف قائل ہونے پر اکتفا نہ کرے۔

بعض اہل علم احباب سے جب ملاقات ہوتی ہے اور اس موضوع پر بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ آپ کی بات بالکل صحیح ہے اور واقعی اللہ کی محبت سیکھے بغیر کام نہیں بنتا اور ہر لحاظ سے تسلیم کرتے ہیں لیکن خانقاہی نظام اور اصلاح وتزکیہ سے پیچھے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ لا حاصل صورت حال ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی صداقت وسچائی کا بہت سے کافر اپنی زبان سے اقرار کرتے تھے جب ان کی آپس میں باتیں ہوتی تھیں ایک دوسرے کو یہی کہا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں تو بالکل صحیح اور برحق ہیں مگر تسلیم وانقیاد سے دور رہتے تھے تو محض ان کا یہ جان لینا ان کے لیے کارآمد اور نافع نہیں ہوا۔

اہل کتاب کے متعلق تو قرآن نے یہاں تک فرمایا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں یعنی جس طرح کسی کا بچہ ہزاروں بچوں میں کھڑا ہوا الگ نظر آتا ہے اور اس کا چہرہ اور شکل تمام بچوں میں بالکل جانا پہچانا ہوتا ہے بس اسی طرح یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو پہچانتے ہیں مگر جب انہوں نے تصدیق نہیں کی اور انقیاد واتباع سے دور رہے تو اس سے انہیں کوئی نفع نہ پہنچا اس لیے معلوم ہوا کہ اصل نفع اس راہ میں قدم رکھ کر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنے اور دل کو محبت خداوندی سے گھائل

کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

پیاسا ساری عمر پانی کے لیے پکارتا رہے اور بھوکا کھانے کے لیے جب کہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اس سے بھوک اور پیاس دور ہوگی مگر جب تک اسے استعمال نہیں کریں گے تو بھوک اور پیاس دور ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لیے محض کسی چیز کا قائل ہوجانا نافع نہیں اس کو برتنا اور اس سے فائدہ اٹھانا اصل چیز ہے۔

بالغ منزل اور عالم منزل کا فرق

جو بھی اہل اللہ سے تھے بدگماں
عمر بھر نابالغ منزل رہے

ایک ہوتا ہے عالم منزل ہونا اور ایک ہوتا ہے بالغ منزل ہونا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے جیسے مثال کے طور پر کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ کراچی سے لاہور جانے کے لیے فلاں ٹرین یا ایروپلین (ہوائی جہاز) فلاں وقت میں لاہور کی طرف جاتا ہے یا وہ خود اپنی گاڑی سے جانا چاہتا ہے اور اسے راستے کی تمام تفصیلات کا علم ہے اور اس کے سب نشیب وفراز اور مثبت ومنفی احوال سے واقف ہے مگر وہ راستہ پر چلتا نہیں ہے اور اس کو طے کرنا شروع نہیں کرتا تو ایسا شخص عالم منزل تو ہے لیکن پوری عمر کبھی بھی بالغ منزل نہیں ہوسکتا، بالغ منزل جبھی ہوسکتا ہے کہ اپنی گاڑی راستہ پر ڈال دے اور چلنا شروع کردے اور راستہ کے جو بھی موانع اور رکاوٹیں ہیں ان کو ہمت وجرأت سے دور کرتا رہے اور جو رہبر ہے اس کی بات مان کر آگے بڑھتا رہے تو بہت جلد راستہ طے ہوجائے گا اور منزل مل جائے گی۔

اور اگر اپنے راہبر پر اعتماد نہ ہو اور اپنی رائے سے راستہ چلنا شروع کردے جب کہ اسے راستے کے نشیب وفراز سے واقفیت نہیں ہے یا واقفیت ہے مگر اس نے خود چل کر دیکھا نہیں ہے تو راستے میں کہیں نہ کہیں بھٹک جائے گا اس کی سہل اور آسان صورت یہی ہے کہ کسی معتمد رہبر کو ساتھ لے لو اور اس کے کہنے پر اعتماد کرکے چلتے رہو پھر دیکھو کتنی جلدی منزل ہاتھ آتی ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ عالم منزل ہونے میں کیا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ رشید احمد گنگوہی جیسے حضرات کے بارے میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے جن کو ہمارے سارے طبقے متفقہ طور پر اپنا بڑا اور بزرگ تسلیم کرتے ہیں خواہ تبلیغ والے ہوں یا جہاد والے، مدرسے والے ہوں یا خانقاہ والے ان کو سب متفقہ طور پر بزرگ اور بڑا مانتے ہیں آخر کیا وجہ تھی کہ ان کو بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک رہبر کی ضرورت پیش آئی اور اہل اللہ کی صحبت کو انہوں نے فرض قرار دیا سچ تو یہ ہے کہ صحبت صالحین کے بغیر جسے ہم منزل سمجھتے رہتے ہیں ان سے جڑنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ابھی تو منزل بہت دور ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ساری عمر کی ہماری دین کے نام پر کی جانے والی محنتیں اخلاص سے عاری اور خالی تھیں تو پھر منزل کا حصول کیسے ممکن اسی لیے خانقاہوں کی سب سے زیادہ

ضرورت اخلاص سیکھنے کے لیے ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ایک بڑے عالم نے سوال کیا کہ تصوف کیا ہے؟ اور وہ اس کے قائل نہیں تھے تو حضرت نے جواب ارشاد فرمایا کہ اس تصوف کی حقیقت تصحیح نیت ہے سلوک طے کر کے اور صحیح اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر ایسا استحضار باری تعالیٰ عطا ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں اپنے کو ایسا پاتا ہے کہ اگر ملک الموت آپہنچے تو اب اس کی مزید کوئی آرزو اور تمنا باقی نہیں رہتی جس کے لیے وہ یوں کہے کہ:

﴿لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾

(سورۃ المنافقین، آیت: ۱۰)

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے دیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۴۵۹)

جس کو اس طرح جینا نصیب ہو جائے کہ دنیا میں جیتے جی اس کی کوئی تمنا نہ رہے سمجھ لو کہ اس کو منزل مل گئی ہے اس لیے اس شعر کی تعلیم ہمارے لیے یہ ہے کہ کسی شیخ کامل متبع سنت وشریعت سے اصلاحی تعلق قائم کر کے راہ سلوک کو طے کیا جائے یہی بالغ منزل ہونیکا راستہ ہے اور اگر کسی بزرگ سے مناسبت نہ ہو تو اس سے بدگمان نہ رہے کیونکہ ہر آدمی کو ہر ایک سے مناسبت ضروری نہیں بس اس کو نیک اور صالح سمجھتے ہوئے جہاں مناسبت ہو وہاں رابطہ پیدا کرے مگر صرف عالم منزل ہونے پر اکتفا نہ کرے ایسے شیخ کی تلاش جاری رکھے کہ جس سے باہمی مناسبت ہو کیونکہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اصل نفع کا مدار مناسبت کے اوپر ہے۔

جہاں تک اہل اللہ سے بدگمانی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی سے بھی بدگمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اہل اللہ سے بدگمانی رکھنا خاص طور پر ناراضگی خداوندی کا باعث ہے جیسا کہ یہ مضمون تفصیل سے دوسرے مقام پر گزر را ہے ہاں کچھ باتیں اگر سنت وشریعت کے خلاف معلوم ہوں تو نہ تو ان کی اتباع ہم پر لازم ہے اور نہ ہی اولیاء اللہ معصوم ہوتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کی شان میں تنقیص اور کمی یا ان سے بدگمانی قائم کی جائے۔

بعض اہل علم احباب ایسے بھی ملتے ہیں جو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس زمانے میں اولیاء اللہ موجود نہیں کہ جن سے ہم اصلاحی تعلق قائم کریں اور جو اصل لوگ تھے وہ تو دنیا سے چلے گئے اس لیے اب نظروں میں کوئی آتا نہیں ہے تو پہلی بات تو یہ عرض کرتا ہوں جب اللہ تعالیٰ نے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کا حکم دیا ہے کہ تم اولیاء صدیقین کے ساتھ رہو تو یہ بات ضروری ہے کہ قیامت تک اولیاء صدیقین کا وجود بھی ہو اگر اولیاء صدیقین کا وجود نہ ہو تو پھر ان کی معیت اور ساتھ رہنے کا حکم بے معنی ہو کر رہ جائے گا اس لیے اللہ تعالیٰ جب حکم دے رہے ہیں تو ضرور اس کا انتظام بھی فرما دیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے ہمارا کبر اور اپنے گمان میں اپنا ذہن میں سوچا ہوا ایک مقام اور پھر اس

کے مطابق یہ تصور کہ مجھ جیسے کی اصلاح کے لیے ایسا ویسا بزرگ ہونا چاہیے یہ سب چیزیں رکاوٹ بن جاتی ہیں اور پھر ہر طرف خرابیاں اور عیوب ہی نظر آتے ہیں اور بالآخر یہ شخص عمر بھر نابالغ منزل رہتا ہے۔

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی اس طرح تلاش وجستجو کرے جیسا بھوکا کھانے کو اور پیاسا پانی کو چاروں طرف ڈھونڈتا پھرتا ہے اسی طلب کے ساتھ اللہ کی محبت کا پیاسا کسی رہبر ورہنما شیخ کامل کو تلاش کرے تو یہ ناممکن ہے کہ تلاش کے بعد بھی اسے کوئی نہ مل سکے اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ نے امراض جسمانی کے لیے ڈاکٹروں کا انتظام کیا ہے تو اسی طرح امراض باطنی وروحانی کے لیے بھی روحانی ڈاکٹروں کا انتظام فرمایا ہے جب ہم تلاش شروع کرتے ہیں اور اللہ ہماری طلب کو دیکھتے ہیں تو پھر راستے کھلتے نظر آتے ہیں اور یہی اللہ کی شان ربوبیت کا مقتضا ہے۔

قابل ہوکرنا قابل رہنا...... کیوں؟

علم کا پندار جن کے دل میں تھا
ہو کے قابل بھی وہ ناقابل رہے

جولوگ کتابی معلومات کو اپنے سینے میں جمع کر لینے سے اپنے کو عالم سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور علم کے زعم اور گمان میں رہتے ہیں تو ہوسکتا ہے وہ ظاہری کتابی صلاحیت میں بہت آگے نکل گئے ہوں لیکن ان کی یہ قابلیت بارگاہ خداوندی میں قبول نہ ہونے کی وجہ سے نا قابلیت کے درجے میں ہے حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفۃ العلماء کتاب میں ملفوظات کے تحت یہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں کہ اگر علم جمع معلومات کا نام ہوتا تو بہت سے یہود و نصاریٰ جو بڑی بڑی دینی کتابوں کے حافظ ہیں سب سے بڑے عالم ہوتے مگر حقیقت میں عند اللہ نہ وہ قابل ہیں نہ عالم اور بہت سے نصاریٰ نے ہمارے فنِ حدیث کے موضوع پر ایسے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں کہ جس کا تصور بھی ان سے نہیں کیا جاسکتا تھا جیسے مثلاً **المعجم المفهرس** مگر اس کی وجہ سے وہ مقبولین بارگاہ نہیں ہیں تو اگر جمع معلومات ہی سے قابلیت ومقبولیت ہوتی تو پھر تو یہ لوگ بھی مقبول قرار پاتے اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ علم کا پندار اور گھمنڈ خود بڑا حجاب بن جاتا ہے آدمی سوچتا ہے کہ میں تو بڑا قابل ہوں میں کسی اور کے ہاتھ میں ہاتھ کیوں دوں۔

اس پر مجھے واقعہ یاد آیا کہ حضرت مفتی رفیع عثانی صاحب دامت برکاتہم نے ہمارے یہاں دارالعلوم آزادول میں ایک بیان میں یہ بات ذکر فرمائی کہ ہمارے والد کی ہم دونوں بھائیوں کے متعلق یہی خواہش تھی کہ ہم ڈاکٹر عبدالحی صاحب سے بیعت ہوں تاکہ ہمارے علم کا غرور ٹوٹے کیونکہ وہ باقاعدہ عالم نہیں تھے اس لیے ہمیں انہیں سے بیعت کرایا یہود ونصاریٰ اپنی علمی قابلیت میں اور معلومات میں کافی زیادہ تھے لیکن قرآن نے ان کے متعلق فرمایا لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کے وہ علم رکھتے۔

حسرتوں کا خون پیے بغیر دامن رہبر کار آمد نہیں

دامن رہبر تھا جن کے ہاتھ میں
بس وہ رہ رو فائزِ منزل رہے
عمر بھر پیتے رہے جو خونِ دل
راہِ الفت میں وہی کامل رہے

ان دونوں شعروں میں حضرت والا نے راہ سلوک کے سلسلے میں صحیح مسلک کو پیش کیا اور اعتدال والی راہ ذکر کی یعنی پہلے شعر میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ اگر آسانی کے ساتھ منزل تک پہنچنا ہے تو کسی رہبر کا دامن مضبوطی سے پکڑ لو اور دیکھو کہ یہ راستہ آسان ہی نہیں بلکہ لذیذ ہو جائے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازم اور ضروری ہے کہ گناہوں سے مکمل پرہیز ہو اپنے ارمانوں اور حرام تمناؤں کا جتنا بھی خون کرنا پڑے اس میں ذرہ برابر پیچھے نہ ہٹے اگر کوئی کتنے ہی بڑے شیخ کامل سے بیعت ہو لیکن وہ گناہوں اور حرام لذتوں کو نہیں چھوڑتا تو یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ ایسے آدمی کو کچھ حاصل نہیں یہی صحیح اعتدال والی راہ ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر حضرت والا نے یوں فرمایا۔

شیخ کامل سے جو ہے مستغنی
پائے گا کیسے ظل رحمانی
فسق کرتا ہے دور منزل سے
پیر تیرا ہو گرچہ لاثانی

سالک کے لیے کوئی بلا سدِ راہ نہیں

راہِ حق میں گو بلا آتی رہی
میرے نالے حاصلِ منزل رہے

یہ راہِ عشقِ خداوندی طے کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء و آزمائش تو آیا کرتی ہے لیکن نہ تو میں ہمت ہار کے بیٹھتا ہوں اور نہ تو میں مایوس ہوتا ہوں بلکہ رو رو کر اللہ کو مناتا ہوں اور مجھے منزل کا مزہ ملتا ہے کوئی گناہ ہو جائے یا کوئی نامناسب بات پیش آجائے یا کوئی معمول یا وظیفہ چھوٹ جائے یا کبھی دل میں غفلت آجائے تو میں اس کی وجہ سے سست ہو کر ہمت ہار کر بیٹھ نہیں جاتا بلکہ مجھے ہر قدم پر منزل کا مزہ ملتا ہے اور وہ اس طرح کہ میں فوراً اللہ کو رو رو کر مناتا ہوں بالآخر وہی پیش آمدہ حالت میری ترقی کا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے سالک کو راہ سلوک میں پیش آمدہ آزمائشوں سے گھبرا کر اپنا سفر ترک نہ کرنا چاہیے غالب نے جب یوں کہا۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ شعر نا امیدی دلاتا ہے اور اللہ کی راہ میں چلنے والے کیلئے مایوسی کا پیغام لیے ہوئے ہے اس لیے حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی نے اس کو بدل کے یوں فرمایا۔

میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا
شرم کو خاک میں ملاؤں گا
ان کو رو رو کے میں مناؤں گا
اپنی بگڑی یونہی بناؤں گا

اس لیے راہ حق میں جب بھی کوئی آزمائش سامنے آئے تو سالک کو چاہیے کہ ہمت سے آگے قدم بڑھائے اور اللہ کے سامنے کچھ آنسو گرا دے۔

غمِ راہِ خدا سے بے غم رہیے

میرا جو غم دافعِ غفلت ہوا
آپ کے غم میں وہ غم شامل رہے

انسان کو دنیا میں دو قسم کے غم لاحق ہوتے ہیں ایک تو وہ رنج و غم اور حزن و ملال جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پیش آئیں یعنی ایسی خوشیاں جو اللہ کو ناراض کر دیں ان کو پامال کرنے سے دل کو غم لاحق ہوتا ہے مگر اللہ کا قرب بڑھتا ہے مختلف قسم کے حالات اور مجاہدے جو راہ خداوندی میں بندہ کے سامنے آتے ہیں اور وہ ان پر صبر کر کے ان کو سہہ لیتا ہے یہ سب ایسے غم ہیں جو انسان کے قلب میں لقائے مولیٰ کی خوشی پیدا کرتے ہیں اور ان کو دل پر برداشت کرنے سے بندہ اس حدیث کا مصداق ہو جاتا ہے:

﴿اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، باب عیادۃ المریض)

یعنی اللہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتے ہیں تو اس سے قرب و معرفت خداوندی بڑھتی ہے اور یادِ الٰہی نصیب ہوتی ہے اور ظلمت و غفلت دور ہوتی ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ میرا ہر وہ غم جس کے ذریعے دل سے غفلت دور ہو وہ لاکھ خوشیوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ وہ آپ کی راہ کا غم ہونے کی وجہ سے مجھے آپ سے قریب کرتا ہے۔ خواجہ صاحب کا شعر ہے۔

سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے ترے دل شاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹا دوں خانۂ دل آباد رہے

اور شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی نے اسی کو یوں کہا ہے ؂

خوشی کو آگ لگا دی خوشی خوشی ہم نے
زہے نصیب کسی کا ملا ہمیں غم ہے

داستانِ درد اے اختر سنو
کس طرح دنیا میں اہلِ دل رہے

اس کا مفہوم و مطلب واضح ہے یعنی اہل اللہ کے جینے کا انداز اہلِ دنیا سے بالکل جدا اور نرالا ہوتا ہے کیونکہ اہلِ دنیا دنیا کی خوشیوں پر مرتے ہیں اور اپنی زندگی کے قیمتی اوقات انہیں کی نظر کر کے مرجاتے ہیں اور اہلِ دل اہل اللہ راہِ خداوندی کے غم اٹھاتے ہیں اور ہمیشہ کی خوشی حاصل کرتے ہیں اور اپنے غم کو غمِ جاوداں کرتے ہیں۔

حقیقتِ خانقاہ

اہلِ دل کے دل سے نکلے آہ آہ
بس وہی اختر ہے اصلی خانقاہ

دل نہ وقفِ غمِ مجاز کرو

ناز چھوڑو سر نیاز کرو　　نفس کو اپنے شہباز کرو
ان کا دامن اگرچہ دور سہی　　ہاتھ اپنا بھی تم دراز کرو
حسنِ فانی سے کیوں ہے سرگوشی　　منہ سراپا سکوتِ راز کرو
ان حسینوں پہ ڈال کر نظریں　　دل نہ وقفِ غمِ مجاز کرو
حسنِ فانی سے کر کے صرفِ نظر　　چشمِ دل کو تم اپنی باز کرو
کیمیاء کی بھی کیا حقیقت ہے　　خوفِ حق سے جو دل گداز کرو
نفرتوں کے یہ تذکرے کب تک　　واعظو! وعظ دل نواز کرو
دوستو اہلِ دل کی صحبت سے　　روح کو آشنائے راز کرو
ہر نفس ذکرِ حق کرو اختر　　غفلتوں سے نہ ساز باز کرو

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **ناز**: فخر۔ **نیاز**: تواضع۔ **شہباز**: باز شاہی۔ **دراز**: آگے بڑھانا۔ **حسنِ فانی**: ختم ہوجانے والے حسین نامحرم عورتیں اور امرد لڑکے۔ **سرگوشی**: چھپکے سے ملنا۔ **سراپا**: سر سے پاؤں تک۔ **سکوتِ راز**: اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ۔ **صرفِ نظر**: نظر کی حفاظت۔ **چشم**: آنکھ۔ **باز**: روکنا۔ **کیمیاء**:……۔ **گداز**:……۔ **نواز**: نوازنا۔ **آشنائے**: جاننا۔ **نفس**: سانس۔ **سازباز**:……۔

نیاز مندی اور جدو جہد سے منزل سامنے ہے

ناز چھوڑو سر نیاز کرو
نفس کو بیچ شہباز کرو
ان کا دامن اگر چہ دور سہی
ہاتھ اپنا بھی تم دراز کرو

اللہ تعالیٰ کا راستہ دیوانگی کا راستہ ہے یہ نازوں سے طے نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے نیاز مندی عاجزی اور تذلل وانکساری کی ضرورت ہے اللہ کے لیے اپنے کو مٹانا اور اللہ پر اپنے کو فدا کرنا کرگس اور گدھ کی خصلتوں سے بچ کر شاہبازی کا راستہ اختیار کرو ایک حی وقیوم اللہ جس پر مر کر حقیقی زندگی نصیب ہوتی ہے اور عزت وسرخروئی ملتی ہے اس پر اپنی زندگی اور جوانی کو فدا کرنا چاہیے مردوں پر مرنا اور حسین حسیناؤں کو دل دینا اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ خاک پر مر کر خود بھی خاک اور مٹی ہو جانا اس لیے حضرت والا ہمیں شاہ بازی سکھا رہے ہیں اور شاہ باز بنانا چاہتے ہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس نے شاہبازی سیکھی ہے اور جو اس راہ کو طے کئے ہوئے ہے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لو اور انانیت اور خودی کا پندار کچھ وقت کے لیے ختم کردو تبھی اس راستہ کا لطف اٹھاؤ گے جدوجہد اور کوشش سے منزل مل کے رہتی ہے اس لیے اس طرح کے حیلے بہانے پیش کرنا کہ اب زمانے میں ایسے اولیاء اللہ نہیں ہیں جو میرے معیار کے ہوں اور جو میرے معیار کے ہیں ان تک ہماری رسائی مشکل ہے یہ سب بے فائدہ ہے جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں اور کچھ مصالح دنیویہ فوت ہو جانے کی پرواہ کئے بغیر اس طرف قدم بڑھانے سے مقصود ضرور حاصل ہو جائے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے۔

عشق مجازی سے حفاظت کا ایک قیمتی نسخہ

حسن فانی سے کیوں ہے سرگوشی
منہ سراپا سکوت راز کرو
ان حسینوں پہ ڈال کر نظریں
دل نہ وقفِ غمِ مجاز کرو
حسن فانی سے کر کے صرفِ نظر
چشمِ دل کو تم اپنی باز کرو

سبحان اللہ! حضرت والا نے ان شعروں میں عشق مجازی کی بیماری میں مبتلاء لوگوں کو ایسا راستہ بتایا ہے کہ جس پر عمل کر لینے کے بعد بڑے سے بڑا عشق مجازی کا مصیبت زدہ اس کی دلدل میں پھنسا ہوا آسانی نکل سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس پر نظریں ڈالنا بند کردو اور ان سے گفتگو کا سلسلہ بالکل کلی طور پر ختم کردو جب نظریں ڈلتی ہیں تو

اندر سے دل ان کی محبت میں بے چین و پریشان ہوتا ہے اور چونکہ دل پورے بدن کا بادشاہ ہے تو پھر وہ ان سے گفتگو پر زبان کو مجبور کرتا ہے یا نئے انداز سے یوں کہیے کہ sms بھیج کر لطف اندوزی پر مجبور کرتا ہے۔

افسوس ان لوگوں پر جو اپنے محبوب اور محبوبہ سے چپکے چپکے گفتگو کرتے رہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری رازدارانہ گفتگو ہے جس کی کسی کو خبر نہیں اس لیے سلسلۂ گفتگو کو طویل سے طویل تر کرتے ہیں یا چپکے چپکے نظریں ڈال کر دل میں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے محبوب و محبوبہ کو دیکھ لیا ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔

مگر آہ! ان کی نادانی کہ انہیں یہ تک خبر نہیں کہ تمہیں ہر گھڑی کوئی دیکھنے والا اور تمہاری باتوں کا کوئی سننے والا ہے اور انہیں یہ خبر نہیں:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾

(سورۃ ق، آیت: ۱۸)

ترجمہ: نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۱۳۶)

جس زمین پر اللہ کی نافرمانی کا جملہ بول رہا ہے اور عشق مجازی کی حرام باتیں کر رہا ہے وہ زمین کل قیامت کے دن یہاں تک کہ خود وہ زبان گواہ بن کر سامنے آنے والی ہے۔

افسوس اسے اپنے مسلمان ہونے کی بھی خبر نہ رہی کہ میں نے جس دن کلمہ پڑھا تھا اس دن سے میں نے یہ اقرار کیا تھا کہ **لا الہ الا اللہ** جہاں کوئی نہیں وہاں اللہ ہے کوئی نہ سنے مگر اللہ سن رہا ہے کوئی نہ دیکھے مگر اللہ دیکھ رہا ہے جس کے دیکھنے اور سننے کا تجھے خوف اور ڈر ہے اور جس سے تو رازداری کئے ہوئے ہے وہ تو نہ تیری زندگی کا مالک ہے نہ موت کا، نہ تیری صحت کا مالک ہے نہ بیماری کا، نہ خوشی کا مالک ہے نہ غمی کا، نہ تیری عزت کا مالک ہے نہ ذلت کا، کس قدر افسوس ناک اور غمناک ہے یہ حالت کہ تو نے ان کے ہونے اور نہ ہونے اور جاننے نہ جاننے کی تو پرواہ کی مگر جس کے قبضہ میں تیرا سب کچھ ہے اور جس نے تجھے یہ وجود دے کر دیکھنے اور بولنے کی قوت عطا کی اچھے برے کو سوچنے اور سمجھنے اور نفع نقصان کو پہچاننے کی تمیز کے لیے دل و دماغ عطا کیا......اس کا تجھے کوئی خیال نہیں۔

کاش! ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے اور اپنی نگاہ اور زبان اور دل، دماغ کو عشق مجازی کی اس تباہ کن مہلک بیماری سے محفوظ رکھے اور اپنے دل کی آنکھیں کھول کر بصیرت کے نور سے اس کی مضرتوں کو پہچانے جس کا ملنا جب ہی ممکن ہے جب بصارت کی حفاظت ہو جاتی ہے ورنہ دل بھی تاریک اور تاریک تر ہوتا چلا جاتا ہے اور **ظلمات بعضها فوق بعض** کا مصداق ہو جاتا ہے حضرت والا کا شعر ہے ؎

جو کرتا ہے تو چھپ کے اہل جہاں سے
کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

اور حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی کا شعر ہے ؎

چوریاں آنکھوں کی اور سینوں کے راز
جانتا ہے سب کو تو اے بے نیاز

وعظ وہ ہے جو خدا سے قریب کردے

کیمیاء کی بھی کیا حقیقت ہے
خوفِ حق ہے جو دل گداز کرو
نفرتوں کے یہ تذکرے کب تک
واعظو! وعظ دل نواز کرو

اگر اللہ تعالیٰ کا خوف مومن کے دل میں پیدا ہو جائے تو پھر وہ دل اللہ کے قرب اور معرفت کے انوار سے چمک اٹھتا ہے اور کیسا ہی سخت سے سخت دل ہو وہ کیمیاء کی طرح ہو جاتا ہے صحابہ کرام کو یہ خاص صفت حاصل تھی اس لیے دین پر عمل ان کے لیے بالکل سہل اور آسان ہو گیا تھا تو منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کو بیان کر کے جب دلوں میں خوف اترے گا اور شقاوت وسختی دور ہوگی اور دل گدازی حاصل ہو جائے گی تو پھر یہ منزل بالکل آسان اور سہل ہے اور یہ مومن کے لیے عظیم الشان تحفہ ہے کہ جس کے دل کو خوفِ حق میسر آجائے کیمیاء سے حاصل کیے جانے والے فوائد صرف دنیاوی ہیں اور فانی ہیں مگر خوفِ حق کے نتیجہ میں جو دولت عطا ہوتی ہے وہ ابدی اور دائمی ہے لیکن جب بندوں کے سامنے اللہ کا خوف بیان کیا جائے تو اس کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ دین سے دوری اور نفرت اور اللہ کی رحمت سے مایوسی نہ پیدا ہو جائے اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو صحابہ کو ایک موقعہ پر خطاب کر کے یہ بات ارشاد فرمائی:

﴿اُدْعُوَا النَّاسَ وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَ يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا﴾

(صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب بیان ان کل مسکر خمر)

کہ دین کو اس طریقے سے پیش کرو کہ ان لوگوں کے دل مانوس ہو جائیں اور انہیں اللہ کی رحمت سے جوڑ دیا جائے ان میں نفرت اور دوری نہ آجائے اور انہیں یہ محسوس ہو جائے کہ دین پر چلنا مشکل نہیں بلکہ آسان اور سہل ہے اس کو حضرت والا نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ہے کہ اے واعظو ایسا وعظ کرو جو دل لبھانے والا ہو اپنی باتوں کو محبت کے رس میں گھول کر پیش کرو کہ اس کی مٹھاس سے سامعین کے قلب وجگر مٹھاس محسوس کریں اور جس دین کو انہوں نے بہت مشکل سمجھ رکھا تھا انہیں بالکل آسان نظر آنے لگے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اپنے بیان میں گناہوں کا تذکرہ نہ کیا جائے اور گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعید اور عذاب ہیں ان کو نہ بتایا جائے جیسا کہ بعض لوگ اس دھوکے کے شکار ہو گئے اور انہوں نے

کہنا شروع کیا کہ اب امت میں صرف نیکیاں اور ان کا اجر بیان کرو لوگوں کو گناہ اور ان کی نحوستیں اور ان پر اللہ کی طرف سے اترنے والا عذاب یہ سب باتیں بیان نہ کرو احقر بڑے ادب سے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ گناہوں کا بیان اور اس پر وعیدوں اور عذابوں کا بتانا اگر یہ کوئی بری چیز ہوتی تو نہ تو یہ سنت اللہ ہونی چاہیے تھی اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی نہ سلف صالحین کا طریقہ ہوتا جب کہ قرآن پاک کے اندر جہاں طاعات کا ذکر ہے وہاں معاصی اور سیئات سے ممانعت بھی موجود ہے اور ان پر عذابوں کا بھی تذکرہ ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں دونوں باتوں کو جمع کر کے ذکر فرمایا ہے۔

یہی وہ راستہ ہے جس سے خوف و رجا کے درمیان توازن اور بیلینس (Balance) برقرار رہ سکتا ہے ورنہ دین محض ایک حصہ کا نام رہ جائے گا اور آدھا دین معاشرہ سے اور زندگیوں سے خارج ہو جائے گا جیسا کے آج کل اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ لوگوں نے دین کے کچھ مثبت کاموں کو سب کچھ سمجھ لیا اور گناہوں میں ابتلاء سے جن شدید نقصانات کا وہ شکار ہیں اور ان کی دین و دنیا تباہ ہیں اس کو سننے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں اسی لیے صحیح بات یہی ہے کہ خدا و رسول کی مرضی کے مطابق وہی بیان ہوگا جس میں لوگوں کے سامنے دین کی صحیح حقیقت یعنی طاعات اور منکرات کو پیش کیا جائے مگر انداز و اسلوب عالمانہ اور حکیمانہ ہو اور لوگوں کے مزاجوں اور طبیعتوں کے لحاظ سے جو اسلوب اور اندازِ بیان موثر اور نافع ہو اسے اختیار کیا جائے۔

نہی عن المنکر (برائی سے روک ٹوک) پر ایک شبہ اور اس کا جواب

بعض لوگ اس مضمونِ بالا پر یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ ظلمت اور اندھیرا نور اور اجالے سے خود بخود چھٹ جاتا ہے تو آپ دین اور سنتوں کی روشنی لوگوں میں پیدا کر دو تو اندھیرا خود بخود چھٹ جائے گا۔ اس لیے بس طاعات آجائیں تو معاصی کا اندھیرا خود چھٹ جائے گا اور روشنی پھیل جائے گی۔

یا بعض لوگ اسی شبہ کو یوں پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی کتے نے تمہارے پیر کو پکڑا اور تم اس سے اپنا پیر چھڑانا چاہتے ہو تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کے سامنے گوشت کا ٹکڑا لاکر ڈال دو جب اس کی نظر اس گوشت کے ٹکڑے پر پڑے گی تو وہ خود ہی تمہارا پیر چھوڑ دے گا بس ٹھیک اسی طرح یہ گناہوں کی لذتیں جب مسلمان کے منہ کو شیریں لقمے کی طرح لگی ہوئی ہیں کے اس کو چھڑانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کے شیریں لقمے یعنی طاعات اور بھلائیاں ان کے منہ کو لگا دو۔

صاحبو! یوں تو بولنے اور سننے میں یہ دونوں مثالیں بہت عمدہ لگتی ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں بہت بڑے دھوکے پر مشتمل ہیں اور اپنے اندر خطرناک زہر لیے ہوئے ہیں جس کو آپ اس طرح سمجھئے کہ اول تو یہ کہ اگر یہ انداز مفید ہوتا تو اللہ اور رسول اس کو اختیار فرماتے دوسری بات اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے سامنے اپنی رائے چلانا اور قیاس کرنا اگرچہ فی نفسہٖ وہ صحیح بھی ہو لیکن اللہ کے حکم کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے وہ بالکل بعینہٖ شیطان کے اس قیاس کی طرح ہے جو اس نے حضرت آدم کو سجدہ نہ کرنے کے لیے کیا تھا اور کہا تھا کہ مٹی

کو چاہیے آگ کے سامنے جھکے باعتبار اس کی خصوصیت کے، مگر اس قیاس کی وجہ سے شیطان مردود ہو گیا۔

اس مقام پر بھی معاملہ اسی طرح ہے کہ اللہ نے حکم دیا تم امر بالمعروف او نہی عن المنکر دونوں کرو اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کو صاف صاف واضح فرما دیا کہ منکر سے روک ٹوک کے تین درجے ہیں اول درجہ تو قوت وطاقت کا استعمال اور دوسرا درجہ زبان سے روک ٹوک اور تیسرا درجہ دل سے اس کو برا سمجھنا لہٰذا یہ بات خود اپنی گھڑی ہوئی ہے کہ حکمت کے ساتھ دعوت کا یہ مطلب بیان کیا جانے لگا کہ گناہوں کا تذکرہ بالکل ختم کر دو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شخص بظاہر اپنے کو دین دار سمجھ رہا ہے اور اکثر طاعات اس کی زندگی میں موجود ہیں لیکن دکان میں نامحرم جوان لڑکیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا، سود پر کاروبار کرنا، کاروبار اور زندگی کا انشورنس (Insurance) کرانا جیسے بے شمار خطرناک اور مہلک گناہوں میں مبتلاء ہو کر رات دن پریشانی کے گیت گاتا ہے۔

اس سے بڑھ کر خطرناک بات یہ ہے کہ جو دین کا فائدہ اس نے سنا اور پڑھا تھا کہ دین پر چل کر پرسکون زندگی ملتی ہے اس کو ویسی زندگی نہ ملنے پر اپنے دل میں دین کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات کا شکار ہو جانا اور پھر ہر قسم کے صحیح غیر صحیح عاملوں کے پاس چکر لگاتے پھرنا وغیرہ وغیرہ۔

کاش ! اسے کوئی یہ بات بتاتا کہ گناہوں میں مبتلاء ہونے کے نتیجے میں دنیا ہی میں انسان اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب اور غصے اور ناراضگی کا مستحق قرار پاتا ہے اور ان بداعمالیوں پر کچھ نہ کچھ عذاب اور سزائیں دنیا ہی میں انسان پر ڈالی جاتی ہیں انہیں میں سے ایک سزا یہ ہے کہ زندگی کا چین اور سکون چھین لیا جاتا ہے آخر سوچیے تو صحیح کہ ہمارے محسن وخیر خواہ حضرت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی کوئی شخص حکمت کے ساتھ دعوت الی اللہ کام کرسکتا تھا یا آپ سے زیادہ ہمدردی انسانوں کے ساتھ کسی اور کو ہوسکتی تھی یا آپ سے زیادہ تبشیر و تیسیر کا کمال کسی اور کو حاصل ہوسکتا تھا تو پھر کیا وجہ ہے؟ کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے گناہوں کی برائی سے اور ان پر آنے والی لعنت وعذاب سے امت کو آگاہ اور خبردار کیا تاکہ دنیا میں بھی عافیت نصیب ہو اور آخرت میں بھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کبھی گناہوں کے متعلق نہ بتاتے۔

یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پورے قرآن پاک کے اندر جہاں جہاں امر بالمعروف کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی نہی عن المنکر کا بھی ذکر موجود ہے اگر اوّل صرف کافی ہوتا تو ثانی کے تذکرے کی ضرورت ہی نہ تھی یہ واضح دلیل ہے کہ یہ فریضہ جب ہی ادا ہوتا ہے جب مامورات کا حکم اور منکرات پر نکیر کی جائے۔ بس اتنی بات ماننے کی نیت سے پڑھنے والے اور غور کرنے والے کے لیے کافی ہے۔

ہر لمحہ اللہ کی یاد روح کی غذا ہے

دوستو اہل دل کی صحبت سے
روح کو آشنائے راز کرو
ہر نفس ذکر حق کرو اخترؔ
غفلتوں سے نہ ساز باز کرو

یہ مضمون حضرت والا اکثر نظموں کے اخیر میں ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق اہل اللہ کی صحبت ہی سے ملتا ہے جس کی بدولت روح کو اس کی غذا ملنی شروع ہو جاتی ہے اور اس کی روح رازِ قربِ خداوندی سے آشنا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہر نفس اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں قائم رہتی ہے اور غفلتیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں دل کے اندر اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھنے والی کیفیت اولیاء صدیقین اور مشائخ عظام کے ساتھ رہ کر عام طور پر حاصل ہوتی ہیں پھر اسے غفلتوں میں زندگی گزارنا گوارا نہیں رہتا شب و روز اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں اس کے تذکرے اس کی روح کی غذا اور دل کا قرار بن جاتا ہے۔

کیا اثر ہے تیری داستاں میں

گر نہ ہو دردِ دل قلب و جاں میں — کیا اثر ہوگا اس کے بیاں میں
لذت ذکر ہے قلب و جاں میں — کیسی لذت ہے آہ و فغاں میں
حسن فانی پہ جو بھی مرا ہے — ہے ندامت اسے دو جہاں میں
درس عبرت ہے چشمِ عنادل — کس طرح غم سے نم ہے خزاں میں
حیف حسرت ہو یا کیف عشرت — خواب ہے خواب سب اس جہاں میں
قلب جن کا تھا ننگ بیاباں — ان کا شہرہ ہے اب گلستاں میں
آپ کے قرب کا کیف لذت — ہے کہاں عشرت دو جہاں میں
آہ نکلی ہے بے چین ہو کر — کیا اثر ہے تیری داستاں میں
بال میں آ گئی جب سفیدی — کچھ نہیں چہرۂ ارغواں میں
اس جوانی کو پیری میں دیکھا — راکھ تھی راکھ آتش فشاں میں
مجھ کو دھوکہ نہ دے رنگ گلشن — آہ صحرا بھی ہے گلستاں میں
حاصلِ زندگی ہے یہ اخترؔ — ہر نفس یاد ان کی ہو جاں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **دردِ دل**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد۔ **آہ و فغاں**: اللہ تعالیٰ کی یاد میں رونا۔ **درس عبرت**: عبرت کا سبق۔ **چشم عنادل**: بلبل کی آنکھ۔ **نم**: تر۔ **خزاں**: جھاڑ۔ **حیف حسرت**: خواہش پوری نہ ہونے کا افسوس۔ **کیفِ عشرت**: آرزو پوری ہونے کی لذت۔ **ننگ بیاباں**: جو ویرانے کو شرما دے۔ **شہرہ**: شہرت۔ **گلستاں**: باغ۔ **داستاں**: کہانی۔ **چہرۂ ارغواں**:......۔ **پیری**:......۔ **آتش فشاں**: لاوا۔ **نفس**: سانس۔

داستانِ اہل دل کی تاثیر جدا ہوتی ہے

گر نہ ہو دردِ دل قلب و جاں میں
کیا اثر ہوگا اس کے بیاں میں

اللہ تعالیٰ واعظ اور مقرر کے بیان میں جو تاثیر رکھتے ہیں وہ خود اس کے عمل کے مطابق ہوتی ہے یعنی خود بندہ دین پر جس قدر عمل کرنے والا اور اللہ کی راہ میں جتنے مجاہدے اٹھانے والا ہو اور پھر وہ لوگوں کو دین کی طرف دعوت دے تو پھر اس کے بیان میں بالکل نمایاں تاثیر دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ صرف رسمی مقرر ہو اور اس کا دل خون آرزو پیے ہوئے نہ ہو تو اس کا انداز بیان وہ سوز و تڑپ اپنے اندر لئے ہوئے نہیں ہوگا اور نہ اس سے لوگ اتنے متاثر ہونگے یہی خصوصیت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں پائی جاتی تھی کہ آپ کی جتنی دعوت تھی اس سے زیادہ عمل اس لیے جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے تھے وہ دلوں میں اترتی چلی جاتی تھی۔

لذت ذکر ہے قلب و جاں میں
کیسی لذت ہے آہ و فغاں میں

ذکر اللہ سے قلب و جاں کا لذت پانا یہ قرآن سے ثابت ہے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد ہی کو دلوں کے اطمینان کا ذریعہ قرار دیا ہے گویا جس طرح آدمی اگر اسے ظاہری طور پر کھانا پینا نہ ملے تو وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو جاتا ہے اسی طرح اگر روح کی غذا نصیب نہ ہو تو اس کی روح بھوکی اور پیاسی ہو جاتی ہے اور ذکر اللہ کے ساتھ ساتھ جب آدمی گناہوں سے بچتا ہے تو پھر اسے آہ و فغاں کی لذت نصیب ہوتی ہے وہ ٹوٹا ہوا دل لے کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو دل کے اندر کی گرمی آہ و فغاں اور گریہ و بکا کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔

عشق مجازی کا انجام دو جہاں کی ندامت ہے

حسن فانی پر جو بھی مرا ہے
ہے ندامت اسے دو جہاں میں
درس عبرت ہے چشم عنادل
کس طرح غم سے نم ہے خزاں میں

اب گویا حضرت والا اس شعر میں یہ بتا رہے ہیں کہ جن لوگوں کو ذکر میں لذت محسوس نہیں ہوتی اور وہ آہ و فغاں کی لذت وحلاوت سے محروم ہیں تو وہ یہ بات سن لیں کہ حسن مجازی پر فریفتہ ہونا یہ اس دور کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس عاشق مجازی کو نہ ذکر اللہ میں کوئی لذت آئے گی نہ عبادت و مناجات میں کوئی حلاوت نصیب ہوگی بلکہ ایسے لوگوں کی زندگی تنگ اور تلخ کردی جاتی ہے اور اس کا سارا مزہ مکدر ہو جاتا ہے کیونکہ جس زبان سے

اللہ تعالیٰ کا نام لینے میں قلب وزبان لطف محسوس کرتے ہیں اس نے اس زبان اور دل کو گناہوں کا زہر چڑھا دیا ہے تو اب اس کے صحیح ذائقے سے وہ محروم ہوگیا ہے اس لیے حضرت والا نے بڑی حکمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ حسن فانی پر مرنے والوں کو ندامت کا سامنا کرنا کیوں پڑے گا اس کو بیان کیا ہے کہ جس طرح فانی اور وقتی موسم بہار آتا ہے اور عنادل یعنی بلبل اپنا آشیانہ اور گھر بنا کر دیوانہ وار خوشی میں جھومتی پھرتی ہے اور اسے ایسا لگتا ہے کہ اب کبھی خزاں سامنے نہیں ہے مگر اچانک جب موسم خزاں آتا ہے تو وہ بڑی اداسی کے ساتھ اور غمناکی کی حالت میں روتی پھرتی ہے اور موسم بہار پر فدا ہونے کی وجہ سے اسے حسرت وندامت کا سامنا ہوتا ہے بس ٹھیک اسی طرح حسن فانی کا عارضی ہونا دونوں جہاں میں انسان کے لیے ندامت کا باعث ہوگا اور وہ پھر پچھتائے گا اور روئے گا مگر اس وقت کا پچھتانا اور رونا اس کے لیے کارگر اور نافع نہ ہوگا اس لیے دنیا میں رہتے ہوئے بلبل کی حالت سے سبق لے کر عاشق مجازی کو اپنی اس حرکت سے باز آجانا چاہیے۔

دنیا کی ہر شئی عارضی ہے

حیف حسرت ہو یا کیف عشرت
خواب ہے خواب سب اس جہاں میں

یعنی دنیا کی ہر شے عارضی ہے خوشی ہو یا غم، حسرت ہو یا عشرت، راحت ہو یا زحمت، سب مثل خواب کے ہے جس طرح ایک سونے والا آدمی خواب کے اندر کسی عمدہ دسترخوان پر بیٹھا ہوا نہایت لذیذ قسم کی غذاؤں کے کھانے میں مصروف ہو اور عمدہ قسم کے جوس اور مشروبات پی کر خوب مزے لے رہا ہو یا اس کے بالکل برخلاف کوئی شخص خواب کے اندر گرفتار ہو کر جیلوں میں بھیجا جا رہا ہو اور اسے پھانسی کی سزا سنائی جا رہی ہے اور انتہائی بے چینی کے عالم میں ہے لیکن بہر دوصورت جیسے ہی سونے والے کی آنکھ کھلے گی تو فوراً اسے پتہ چل جائے گا کہ نہ وہ خوشی خوشی تھی نہ رنج رنج تھا بالکل اسی طرح اس دنیا سے نکلتے ہی محسوس ہو جائے گا کہ سب کچھ خواب ہی خواب تھا اور ساری عزت وذلت، رنج وغم، راحت وتکلیف، خیالی ہی خیالی تھی یک دم دوسرے عالم میں آنکھ کھلے گی تو حقیقت سامنے آجائے گی جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
رہ گیا عز وجاہ کا جھگڑا
یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی
یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

اس لیے دنیا کی خوشی وغمی اور عزت وذلت اور رنج وراحت کے پیچھے اپنی عمر ضائع نہ کرے۔

قلب جن کا تھا ننگ بیاباں
ان کا شہرہ ہے اب گلستاں میں

جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آئی تو مردہ دل ایسا زندہ ہوا اور فسق وفجور کی تاریکیاں اور ظلمتیں دل سے چھٹتی چلی گئیں اور قلب منور اور روشن ہوگیا اور اس میں اللہ کی معرفت ومحبت کے پھول کھل گئے اور وہ رشک گلستان و بوستاں بن گیا اور اس کی خوشبو ہر چہار طرف پھیلنے لگی جس کی بدولت ہر طرف اس کا چرچہ اور شہرت ہوتی چلی گئی جبکہ کل تک اس کی حالت یہ تھی کہ اس کا دل ننگ بیاباں تھا مگر اللہ کی محبت حاصل ہونے کی بدولت اللہ نے چاروں طرف اس کا چرچہ پھیلا دیا جیسا کہ روایات واحادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوجاتا ہے تو پھر ہر سمت اس کا چرچہ اور نیک نام روشن کردیا جاتا ہے۔

آپ کے قرب کا کیف لذت
ہے کہاں عشرت دو جہاں میں

یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب میں اور اللہ کو پالینے سے انسان کو جو پرسکون زندگی ملتی ہے اور جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ دونوں جہاں کی نعمتیں اور دولتیں ملنے سے بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خالق یعنی اللہ کی ذات عالی مرکز لذات دو جہاں ہے یعنی دنیا وآخرت کی ساری نعمتوں میں لذت اور لطف دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو بھلا جس کو اس کی نزدیکی اور قرب حاصل ہوگیا تو دونوں جہان کی نعمتوں اور عشرتوں کے مل جانے پر بھی وہ بات حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جس کو حضرت والا نے اپنے خاص دل نشیں انداز میں یوں ارشاد فرمایا۔

وہ شاہ دوجہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے پائے

اور مولانا رومی نے اسی کو یوں ارشاد فرمایا۔

اے دل ایں شکر خوشتر یا آنکہ شکر سازد
اے دل ایں قمر خوشتر یا آنکہ قمر سازد

اس لیے یہ بات بالکل بجا اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قرب کی لذت دونوں جہان کی نعمتوں میں ممکن نہیں خواہ کتنا ہی اور کیسا ہی عیش وعشرت حاصل ہوجائے اور سامان راحت وسکون جمع ہوجائے۔

داستانِ انبیاء و اولیاء میں چھپے ہوئے سبق

آہ نکلی ہے بے چین ہو کر
کیا اثر ہے تیری داستاں میں

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنی تمناؤں کا خون کیے ہوتے ہیں اور غمہائے راہ خداوندی اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں تو انکی داستانیں بھی عجیب وغریب پر تاثیر ہوتی ہیں کہ جب وہ داستانیں لوگوں کے سامنے آتیں ہیں تو کتنے ہی لوگوں کے لیے باعث ہدایت اور وجہ موعظت ونصیحت بن جاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے انبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کے واقعات اور قصے اوران کی داستانیں عبرت ونصیحت کے لیے ذکر فرمائی ہیں اوران واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہ الصلاۃ والسلام اللہ کے دین کی خاطر کس طرح تکلیفیں اورغم اٹھاتے رہے اوران کی قوموں کی طرف سے مسلسل ایذاؤں اورتکلیفوں کے باوجود وہ سب کچھ سہتے رہے اور اپنے دل پرغم اٹھاتے رہے تو پھران کی داستانوں میں اللہ تعالیٰ نے عجیب تاثیر رکھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان اوران کا قصہ ہو یا حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سب کے سب قیامت تک کے آنے والی قوموں اورنسلوں کے لیے رشد وہدایت کا سامان فراہم کرتے ہیں اور ہم قصوں میں اگر غور سے دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پالتے ہیں اور کن کن حالات سے گزارا جاتا ہے لیکن ان حالات میں بھی جب بندہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جمارہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس سے چھوٹتی نہیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوان کی والدہ نے حکم الٰہی سے دریا میں ڈال دیا تھا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ سے اس وقت اللہ کی مدد چھٹی ہوئی تھی جب حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں ڈالے گئے تھے تو کیا ہم یہ سوچ بھی سکتے ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی مدد حضرت یوسف علیہ السلام سے چھٹی ہوئی تھی۔ میرے دوستوں نہیں اور ہرگز نہیں۔

تو میرا منشاء عرض کرنے کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے رب ہیں اور ہمیں جس انداز سے پالتے ہیں اور ہماری تربیت فرماتے ہیں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ہماری مراد اور منشاء ہے اس کے مطابق معاملہ ہوتا ہے اور کبھی ہم خیر سمجھتے ہیں اچھا سمجھتے ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے رب ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بندے کی مصلحت اس میں نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ہمیں ویسا نہیں دیتے بلکہ اپنی شان ربوبیت، شان رحیمی، شان کریمی کے اعتبار سے لیکر چلتے ہیں اور اللہ وہ چیز دیتے ہیں جو اس سے افضل، اچھا اور بہتر ہو۔

ماں کا محبت کے باوجود بیٹے کی مراد پوری نہ کرنا

ایک ماں، ماں ہونے اور باپ، باپ ہونے کی حیثیت سے اگر اس کا چھوٹا سا بچہ ہو اور وہ بچہ سامنے آگ کا کوئی شعلہ دیکھ کر اس کی طرف لپکے بڑھے اور چلے یا چمکتی ہوئی چھری دیکھے اور اس کو جا کر ہاتھ میں اٹھانا چاہے اور وہ اس کی خاطر رو رہا ہے اور چلا رہا ہے تڑپ بھی رہا ہے خوب رو رہا ہے اس کا رونا بھی مسلّم اس کی آہیں بھرنا بھی مسلّم اور والد و والدہ کی شفقت و محبت بھی مسلّم، کیا کوئی انکار کر سکتا ہے اس کے باوجود آخر وہ والد اور والدہ آگ کا شعلہ یا وہ تیز دھاردار چمکتی ہوئی چھری والی اپنے اس بیٹے کے ہاتھ میں کیوں نہیں دیتے۔ کیا ہم یہ کہیں گے کہ والد کے دل میں شفقت و محبت نہیں یا یہ کہیں گے کہ بچہ ابھی اتنا رویا نہیں جتنا رونا چاہیے۔

بلکہ میرے دوستو اخیر میں ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ ابھی وہ بچہ نادان ہے اور عقل و شعور کے اعتبار سے اسے بلوغ حاصل نہیں وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ یہ چھری اور آگ کا یہ شعلہ ابھی اس کیلئے مضر ہے اور جب وقت آئے گا اور ضرورت ہوگی تو والد خود کہے گا کہ یہ چھری ہے تم اس سے صحیح کام لو، یہ آگ کا شعلہ جہاں ضرورت ہے وہاں اس کو استعمال کرو تو وباوجود والدین کی بہت زیادہ شفقت والفت اور مودت و محبت مسلّم ہونے کے اور باوجود اس بچے کا تڑپنا رونا مسلّم ہونے کے پھر بھی ان کے ہاتھ میں وہ والدین کیوں چھری نہیں پکڑاتے؟ کیوں آگ کا شعلہ نہیں دیتے؟ تو میں اور آپ یہی فیصلہ کریں گے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس کے ہاتھ میں دیدیا تو اس کا انجام تباہی بربادی اور ہلاکت ہے۔

میرے بھائیو! ہم کتنی ہی دعائیں کرتے ہیں کبھی ازالہ مرض اور صحت کی دعا کرتے ہیں تو کبھی وسعت رزق کی دعا مانگتے ہیں اور کتنے ہیں جو اپنے فقر کے ازالے کی دعا کرتے ہیں کہ مال مل جائے کتنے ہیں کہ جو اولاد کے حق میں دعائیں کرتے ہیں اور کتنے کتنے مسائل کے لئے اللہ سے مانگتے ہیں اور روتے دھوتے ہیں اب وہ سمجھتا ہے کہ میں دعائیں کرا بھی رہا ہوں اور کر بھی رہا ہوں صدقہ بھی نکال رہا ہوں سارے کام کر رہا ہوں اور بظاہر معاصی اور نافرمانیوں سے بھی دور ہوں لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ میری مراد پوری نہیں ہو رہی ہے تو بس میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انبیاء کرام علیہ السلام کی تربیت فرمائی کہ کچھ وقفہ سال دو سال چار سال، دس سال، بیس سال، چالیس سال صبر آزما حالات رہے اور وقفہ تربیت آیا جو اللہ تعالیٰ کی بہت ساری مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی تھا اور اس وقفہ تربیت میں دل کی سطح قرب خداوندی کو اونچا کرنا تھا جس کے لیے کتنی مدت کی ضرورت تھی اس کا علم اللہ ہی کو تھا۔

مومن کی کوئی دعا ردّ نہیں ہوتی

اس لیے مومن بندے کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری تمام دعائیں سنتے ہیں اور حالات کو جانتے ہیں اور ہماری آہ وزاری اور گریہ وبکا پر حق تعالیٰ کی رحمت بھی جوش میں آتی ہے مگر اللہ کے علیم وحکیم

ہونے کی وجہ سے اس کے علم وحکمت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ابھی ہماری وہ دعائیں اور مرادیں ہمیں عطا نہ ہوں کیونکہ اگر ابھی دے دی گئی تو میری وہ خاص رحمتیں و برکتیں اور نعمتیں و عنایتیں جو اس درمیان اس بندے پر برس رہی ہیں وہ اس سے محروم ہو جائے گے اور اس کی آہ وزاری کی وجہ سے اسے جو قرب ملتا جا رہا ہے اور اس کے درجات بلند ہوتے جا رہے ہیں جس کا علم اسے آنکھیں بند ہونے کے بعد ہو گا وہ اس سب سے محروم ہو جائے گا۔

لہٰذا حاشا وکلّا...... مومن بندے کو کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ مجھے میری مرادیں نہ ملنا اس لیے ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے یا دعاؤں کے قبول نہ ہونے کے سلسلے میں وساوس کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دعاؤں کی قبولیت کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہے کہ ہم جو کچھ مانگے وہ فوراً مل جائے جیسا کہ بعض لوگ اس طرح سوچتے ہیں بلکہ قبولیت کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ وہی چیز عطا فرماتے ہیں خواہ فوراً ہو یا کچھ مدت کے بعد ہو یا کبھی اس کا نعم البدل عطا فرماتے ہیں اور کبھی بندے سے بہت زیادہ محبت و پیار ہونے کی وجہ سے اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر لیتے ہیں اور اسی طرح مسلسل اپنے در سے دعاؤں کے بہانے وابستہ کیے رہتے ہیں کیونکہ دعا مستقل خود ایک عبادت ہے جتنی دعا کرتا ہے اتنا عبادت کے ذریعے اس کا قرب اللہ سے بڑھتا رہتا ہے اگر اسے اس کی مراد دے دی جاتی تو ظاہر ہے کہ پھر وہ اس دعا کا مانگنا چھوڑ دیتا تو ایک عبادت سے محرومی ہوتی جس کا نقصان ہونا واضح اور ظاہر ہے یہی تو وجہ ہے کہ بعض اللہ کے ایسے بندے جن سے اللہ کو محبت نہیں ہوتی جب ان کی آواز اللہ تک پہنچتی ہے اور وہ اللہ سے کچھ مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اس کی یہ مراد جلد دے دو کیونکہ مجھے اس آواز سے محبت نہیں ہے اور میں اس کو اپنی بارگاہ میں بار بار سننا نہیں چاہتا اس کے برخلاف جو اللہ کا محبوب بندہ ہے اس کے بارے میں فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ ابھی اس کو اس کی مراد نہ دینا کیونکہ میں اس آواز کے سننے سے محبت رکھتا ہوں اور دعا کے واسطے اس کی یہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے۔

قرآن پاک میں انبیاء کے قصوں اور داستانوں کے تذکرے کا منشاء

صاحبو! اصل بات حضرت کے اس جملے سے شروع ہوئی (کیا اثر ہے تیری داستاں میں) اسی کے تحت احقر عرض کر رہا ہے کہ جو لوگ مقربین بارگاہ خداوندی ہوتے ہیں یعنی انبیاء اولیاء ان کی داستانوں میں بڑا اثر اور نفع اور بے شمار عبرتیں اور نصیحتیں مخفی ہوتی ہیں یہی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے بندوں کے واقعات قرآن کریم میں باقاعدہ طور پر مقصود بنا کر ذکر فرمائے اس لیے کے سب سے زیادہ اپنی آرزوؤں کا خون پینے والے اور اللہ کے لیے دل پر صدمہ وغم اٹھانے والے انبیاء کرام علیہ السلاۃ والسلام ہی ہوتے ہیں جنہیں خود ان کی قوموں کی طرف سے بڑی سخت قسم کی ایذاؤں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کی داستانوں میں اہل ایمان کے لیے بڑی موعظت و نصیحت مخفی ہوتی ہے اور دین پر جمنے اور قائم رہنے والوں کے لیے تثبیت قلب (دل کا جماؤ اور قرار و

اطمینان) کے واسطے بڑا سامان موجود ہوتا ہے اور ان کے قصوں میں اللہ تعالیٰ اپنی خاص شان تربیت کے نرالے اور انوکھے انداز ظاہر فرماتے ہیں۔

دیکھئے اور غور کیجئے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ جن کے خطرے اور ڈر سے فرعون بنی اسرائیل کے تمام لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دئے ہوئے ہے اور قتل عام مچائے ہوئے ہے خود حضرت موسیٰ کو اسی فرعون کے گھر میں پالا جارہا ہے اور اس کے لیے ہر طرح کے انتظامات کیے جارہے ہیں کہ خود گھر میں فرعون کی بیوی کہتی ہے کہ یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس لیے اسے قتل مت کرو شاید یہ ہمارے لیے نفع کا سامان بنے اور یہاں اس کو ہم اپنا بیٹا بنا کر رکھیں اور اللہ کے غیبی نظام کے تحت حضرت موسیٰ کی والدہ کا انتظام خود ان کے لیے عجیب وغریب انداز سے کردیا جاتا ہے کہ وہ کسی کا دودھ پینے کے لیے تیار نہیں ہوتے بالآخر اس کام کے لیے خود حضرت موسیٰ کو ان کی والدہ کے حوالے کردیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ فرعون کے گھر میں ہی فرعون کے سب سے بڑے دشمن کو پالا اس لیے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

فَمُوْسَى الَّذِىْ رَبَّاهُ جِبْرَئِيْلُ كَافِرٌ
وَمُوْسَى الَّذِىْ رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

ایک اسی دور کا وہ موسیٰ ہے کہ جس کو جبرئیل نے پالا وہ تو کافر بنا اور دوسرے وہ موسیٰ جن کو خدا کے دشمن فرعون نے پالا وہ اللہ کے پیغمبر اور نبی بنے۔

اسی طرح ایک ہلکی سی نظر حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے پر ڈالیں کہ وہی یوسف جن سے ان کے بھائیوں نے حسد کیا اور بہانا بنا کر ان کو کنوئیں میں ڈال آئے اللہ تعالیٰ نے اپنے غیبی نظام کے تحت ان کو کنوئیں سے نکال کر مصر کے بازاروں میں بکوا کر اس مقام پر پہنچا دیا کہ مصر کی حکومت و وزارت ان کو عطا ہوئی اور جو کچھ اس دوران حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا یہاں تک کہ زلیخا کی طرف سے غلط اور ناجائز کام کی دعوت دی گئی مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اللہ کا حکم توڑنے کے بجائے صاف لفظوں میں یہ اعلان کردیا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے اور اس غلط حرکت میں مبتلاء ہونے سے جس کی طرف مجھے بلایا جارہا ہے میرا قید خانہ زیادہ بہتر ہے غرض یہ کہ ایک طویل مدت یہی وقفہ تربیت چلتا رہا بالآخر اللہ تعالیٰ نے وہ دن بھی سامنے دکھائے کہ وہی بھائی سجدے کی حالت میں سامنے گر پڑے اور معافی مانگنے لگے اور اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ کر دکھایا اور ان سازش اور حسد کرنے والے بھائیوں کو اپنے کئے ہوئے پر پچھتانا اور شرمندہ ہونا پڑا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ثابت کردیا کہ اللہ کی راہ کا قید خانہ اور جیل عاشق کو اپنے آزاد گھر سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اور ایسا بہت سی مرتبہ دیکھا گیا کہ گھر پر رہتے ہوئے دین کے وہ کام نہیں ہوئے جو بسا اوقات جیل خانوں میں بزرگوں سے لئے گئے ہیں۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کا جیل میں ایک ماہ میں حفظِ قرآن

چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ احقر کو یاد آیا کہ جب وہ آزادیٔ ہند کی خاطر اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ساتھ انگریز کی جیل میں ڈالے ہوئے تھے اب جیل ہی میں رمضان کا مہینہ آگیا تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہ پوچھا کہ تراویح میں قرآن سنانے کا کیا نظم ہوگا اس پر حضرت مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت آپ دعا فرمائیں میں ایک پارہ حفظ کر کے روزانہ تراویح میں سنادوں گا۔ چنانچہ صبح سے یاد کرنا شروع کرتے اور شام تک پورا پارہ یاد کر لیتے اور تراویح میں سناتے تھے۔

غور فرمائیں کہ شروع سے حافظ نہ ہونے کے باوجود جیل میں رہ کر پورے قرآن کے حفظ کا معاملہ آسان ہوگیا ورنہ عامۃً دوسال، تین سال میں حفظ قرآن کی منزل طے ہوتی ہے اس لیے اللہ کی راستہ کی جیل میں بظاہر مشقت ہوتی ہے لیکن بسا اوقات وہ دین کے کاموں کے لیے نافع ثابت ہوتی ہے۔

اب میں اپنی بات کو سمیٹ کر مختصر کرتا ہوں اور پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جو حضرت والا نے شعر میں ذکر فرمایا آہ نکلی ہے بے چین ہو کر یعنی اللہ کی محبت کے عجب عالم اضطراب میں جو آہیں نکلیں گی اور حامل دردِ محبت کے دل کی گہرائی سے جو باتیں ظاہر ہونگی تو پھر اس کی تاثیر ہی کچھ الگ قسم کی ہوا کرتی ہے اور بسا اوقات وہ آہ بے اضطرابی پورے مجمع کے اوپر عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے اور لوگوں کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔

چنانچہ حضرت والا کے وعظ میں احقر نے یہ قصہ سنا کہ ایک بار حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کسی جگہ پر وعظ فرمارہے تھے تو دوران وعظ عجیب قسم کی ایک چیخ نکلی اور بڑے درد بھرے انداز میں آہ بھرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ ''ہائے امداد اللہ'' یعنی اس وقت اتنے مضامین وعلوم دل میں القاء ہو رہے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کون سے بیان کروں کون سے چھوڑ دوں اور یہ سب کچھ حضرت حاجی صاحب سے تعلق ونسبت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل شامل حال ہوا تھا اور حضرت حاجی صاحب کے فیوض وبرکات تھیں اس لیے اس طرح حضرت نے اظہار فرمایا اور بس یہ آہ نکلنی تھی کہ پورا مجمع رونے لگا اور چیخیں نکل گئیں۔

چنانچہ ایسا ہی ایک قصہ حضرت گنگوہی کے متعلق ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک مرتبہ حضرت سے تقریر کی درخواست کی تو حضرت گنگوہی نے معذرت کر دی اور فرمادیا کہ میں تقریر نہیں کرتا لیکن جب زیادہ اصرار بڑھا تو حضرت نے منبر پر بیٹھ کر حمد وصلوٰۃ کے بعد جب لفظ ''اللہ'' زبان سے نکالا تو کچھ ایسے درد بھرے انداز سے کہا اور ایسی خاص کیفیت اور آہوں کے ساتھ لفظ اللہ زبان پر آیا کہ پورے مجمع پر گریہ طاری ہوگیا اس لیے اصل بات یہ ہے کہ تاثیر کلام آہ وزاری ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

حسنِ مجازی کی فنائیت کا خاص تذکرہ

بال میں آ گئی جب سفیدی
کچھ نہیں چہرۂ ارغواں میں
اس جوانی کو پیری میں دیکھا
راکھ تھی راکھ آتش فشاں میں
مجھ کو دھوکہ نہ دے رنگِ گلشن
آہ صحرا بھی ہے گلستاں میں

ان تینوں اشعار میں حضرت والا نے دنیا کے فنا ہونے اور خوب صورت چہروں کے حسن کے مٹ جانے کا حال ذکر فرمایا ہے کہ بظاہر چمکتا چہرہ بالوں میں سفیدی آنے کے زمانے میں بگڑ چکا ہوتا ہے اور بظاہر سرخ رنگ خوبصورت جوانی کے عالم میں آتش فشاں معلوم ہونے والے چہرے پیری میں پہنچ کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں بس دنیا اور اس کے حسن و خوبصورتی کی اتنی سی حقیقت ہے اور جسے آہِ صحرا میسر ہو اور وہ کسی گلشن کے گلوں پر عاشق اور فریفتہ نہ ہو اور رنگِ گلشن پر اس نے نظر نہ اٹھائی ہو تو پھر اس کی رونق اور تر و تازگی اسے دھوکہ نہیں دے سکتی۔

حاصلِ زندگی ہے یہ اختؔر
ہر نفس یاد ان کی ہو جاں میں

یعنی مومن کے جینے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ کسی لمحہ اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو جس کی صورت یہ ہے کہ جو طاعات ہیں ان پر عمل کیا جائے اور جو معاصی اور گناہ ہیں ان سے بچا جائے اسی طرح دنیا کے ایسے مشاغل سے جو دل کو اللہ کی یاد سے دور کر دیتے ہیں اپنے کو علیحدہ اور یکسو رکھا جائے تاکہ جو اعلیٰ مقامِ عبدیت و بندگی ہے وہ حاصل ہے جس کو مقامِ حضور و مشاہدہ کہتے ہیں جسے اس طرح اللہ کی یاد حاصل ہو جائے سمجھ لو وہ مقصدِ زندگی کو پا گیا۔

عالم خاک ہے آسماں میں

ان کی منزل کبھی گلستاں میں
اور کبھی غم کے کوہ گراں میں

تربیت کا یہ راز نہاں ہے
خار بھی تو ہیں اس گلستاں میں

نغمہ زن ہے بہاروں میں بلبل
اور کبھی چشم نم ہے خزاں میں

عبدیت کا توازن ہے قائم
صبر سے شکر سے اس جہاں میں

دونوں مرکب سے چل کر کے سالک
جا پہنچتا ہے باغ جناں میں

ہے خوشی یاں تو غم بھی ہے اے دل
ایک حالت نہیں اس جہاں میں

ہاں مگر ان کا اک ذرۂ غم
ہر نفس مست رکھتا ہے جاں میں

کیف پایا ہے دونوں جہاں کا
میں نے عاشق کے درد نہاں میں

آب و گل میں اگر درد دل ہے
عالم خاک ہے آسماں میں

ان کی یادوں کے صدقے میں اختؔر
پرسکوں زندگی ہے جہاں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ گلستان: باغ۔ کوہِ گراں: بھاری بھرکم پہاڑ۔ نہاں: پوشیدہ۔ خار: کانٹا۔ چشم نم: آنسو سے تر آنکھ۔ عبدیت: بندگی۔

پھول اور کانٹوں کے باہم ہونے میں ایک سبق

ان کی منزل کبھی گلستاں میں
اور کبھی غم کے کوہ گراں میں

تربیت کا یہ راز نہاں ہے
خار بھی تو ہیں اس گلستاں میں

ان اشعار میں حضرت والا یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بندے کی تربیت ہوتی ہے تو اس میں کبھی موافق طبیعت چیزیں پیش آتی ہیں اور کبھی مخالف طبیعت کبھی وہ شادمانی مسرت اور خوشی کے ساتھ رہتا ہے جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اپنی مراد کو پاتا ہے اور کبھی غم کے کوہ گراں میں یعنی کبھی طبیعت کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے اور اس پر وہ راضی بقضاء اللہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اللہ کو پاتے ہوئے اپنی مراد میں کامیاب نظر آتا ہے اور حضرت نے فرمایا کہ جس گلستان میں پھول ہوتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں کانٹے بھی ہوتے اور اوپر پھول ہوتے ہیں اور اس کی جڑوں میں کانٹے تو اللہ تعالیٰ کا نظام تربیت بھی اسی طرح ہے کہ ایک طرف پھول ہیں تو دوسری طرف کانٹے ہیں یعنی جب پھول ملیں گے یعنی

خوشیاں پیش آئیں گی تو تو دوسری طرف کانٹے یعنی پریشانی اور طبیعت کے ناموافق حالات بھی پیش آئیں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں سے گزار کر انسان کو گلستان اور آفتاب ومہتاب بناتے ہیں جس کی وجہ سے اس بندے کی خوشبو چہار دانگ عالم میں پھیل جاتی ہے۔

نغمہ زن ہے بہاروں میں بلبل
اور کبھی چشم نم ہے خزاں میں

بلبل پر جب موسم بہار آتا ہے تو وہ بہار میں خوب نغمہ زن ہوتی ہے اور موسم بہار کے وقت گویا کہ اس کی عید آئی ہے اور وہ اس کی خوشی کا سامان ہے لیکن جب موسم خزاں آتا ہے تو وہ چشم نم ہوتی ہے اور روتی پھرتی ہے تو حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا کے نظام پر غور کرو تو تقریباً اسی طرح کی صورت انسانوں کے لیے دنیا کی ظاہری بہار کی ہے کہ وہ اس کو موسم بہار سمجھ کر اس سے دل لگا بیٹھتا ہے لیکن اخیر میں اسے ندامت و شرمندگی کے آنسوؤں سے رونا پڑتا ہے کیونکہ دنیا کے زوال وفنا کے ساتھ ہی اس پر یہ حقیقت عین الیقین کے درجے میں روشن اور واضح ہو جاتی ہے کہ میں نے جس کو بہار سمجھا وہ دراصل موسم خزاں تھا۔

مومن ہر حال میں خدا کو پاتا ہے

عبدیت کا توازن ہے قائم
صبر سے شکر سے اس جہاں میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَہٗ کُلَّہٗ خَیْرٌ وَلَیْسَ ذَالِکَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْہُ سَرَّاءُ شَکَرَ فَکَانَ خَیْرًا لَّہٗ وَاِنْ اَصَابَتْہُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَکَانَ خَیْرًا لَّہٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب المؤمن امرہ کلہ خیر)

یعنی مومن بندے کا معاملہ کیا ہی خوب ہے اگر اسے خوشحالی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور اگر کوئی تنگی اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

تو گویا بندہ دونوں راستوں سے اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے نعمتوں پر شکر کرنے کے ذریعے اور مصیبتوں پر صبر کرنے کے ذریعہ یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ کسی بھی حالت میں بندہ کو محروم نہیں رکھا اس لیے نعمتوں اور راحتوں کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو بھولنا نہیں چاہیے اور پریشانی اور تکلیف کی حالت میں بے صبر ہو کر مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے لیے دونوں قسم کی حالتوں کو خیر جانے اور صحیح عبدیت و بندگی کا توازن برقرار رکھنے کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ اللہ تعالیٰ دونوں طرح کے حالات کا سامنا کرائیں ورنہ عامۃ انسان کی فطرت یہ ہے جیسا کہ حضرت والا نے اپنی کتاب ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی حقیقت'' میں یہ بات لکھی ہے کہ عامۃ انسان کو

جب مال و دولت اور عیش وعشرت ملتی ہے تو وہ تکبر، ریا، بغض، حسد، غرور وغیرہ جیسی بیماریوں میں مبتلاء ہو جاتا ہے اس لیے ایسے موقعہ پر بھی اللہ کی طرف سے بندے کو آزمایا جارہا ہے کہ یہ مجھ سے غافل ہو رہا ہے کہ نہیں اور مال و دولت کے نشے میں مجھے فراموش کررہا ہے کہ نہیں۔

اس طرح عامۃ جب انسان پر کوئی مصیبت اور تکلیف آتی ہے یا فقر وفاقہ درپیش ہوتا ہے تو ایسے موقعے پر وہ ناشکری میں مبتلاء ہوتا ہے اور بظاہر اللہ کے فیصلے سے راضی دکھائی نہیں دیتا شکوہ وشکایت کا انداز اختیار کرتا ہے حالانکہ یہ حالتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی ہوئی ہیں خوب بخود کسی کو پیش نہیں آتی اس لیے مومن کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال کا حکم بجالائے اور عبدیت کے توازن کو قائم اور برقرار رکھے یعنی کبھی شکر کرے تو کبھی صبر اختیار کرے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

اس لیے مومن بندے کا کمال یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ کو یاد رکھے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾

(سورۃ ابرٰھیم، آیت: ۷)

ترجمہ: اور جب سنا دیا تمہارے رب نے، اگر احسان مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۲۱۷)

ایمان پر خاتمہ کا قیمتی نسخہ از حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اسی کے ضمن میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان پر خاتمہ کی ایک بہترین صورت تحریر فرمائی ہے کہ اگر بندہ حاصل شدہ ایمان پر روزانہ شکر ادا کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا رہے گا تو گویا حاصل شدہ ایمان میں مزید ترقی ہوتی رہے گی اور ہوتے ہوتے اللہ تعالیٰ اسے کمال ایمان عطا فرمادینگے اور اس طرح اس کو خاتمہ ایمان پر نصیب ہو جائے گا کیونکہ نعمت کا چھین لیا جانا شکر نہ کرنے کی صورت میں ہے لہٰذا ثابت ہوگئی یہ بات کہ ایمان پر شکر کرنے کے نتیجے میں اس کو ان شاء اللہ کامل ایمان پر خاتمہ نصیب ہوگا جو کہ ہر مومن کے دل کی آخری اور انتہائی آرزو ہے۔

صاحبو! اس سے ایک نہایت قیمتی بات سمجھ لینی چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندہ مومن کے لیے ہر حالت میں اپنے ملنے کا وعدہ فرمایا اور اپنی رضا کے حصول کا طریقہ بتایا اور تمام حالتوں کے احکام عطا فرمادیے تو پھر مسلمان

مسلمان ہوکر کسی بھی صورت میں ٹینشن اور ڈیپریشن کا شکار نہیں ہوسکتا نہ فخر وغرور کا شکار ہوسکتا ہے اس لیے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ جب کوئی رنج وغم اور مصیبت وتکلیف مجھ پر ڈالی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے مجھے اللہ اس راہ سے ملے گیں لہٰذا میرا کام اس پر صبر کرنا ہے اور یہ حالات محض اتفاقی نہیں ہیں بلکہ میری کسی خیر اور بھلائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ڈالے گئے ہیں لہٰذا مجھ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرما رہے ہیں **اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ** کہ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور فرمارہے ہیں **اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ** کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا غرض یہ کہ مجھے ان حالات میں نہ اداس و مایوس ہونے کی ضرورت اور نہ بے چین و پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ اسی بات کو حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں اس طرح ذکر کیا کہ ''مریض کو مرض میں خدا ملتا ہے اور صحت مند کو صحت میں'' اور مال دار کو مال داری میں خدا ملتا ہے تو فقیر کو فقر میں حاکم کو حکومت میں خدا ملتا ہے تو رعایا کو بلا حکومت ملتا ہے غرض یہ کہ ہر حالت میں اللہ کا ملنا یقینی ہے۔

سبحان اللہ! کیا ہی کریم ہے اللہ کی ذات عالی کہ کسی بھی حالت میں اپنے بندے کے لیے اپنے در کو بند نہیں کیا کہ کوئی بندہ یہ کہہ سکے کہ میں اس حالت میں پہنچ گیا ہوں کہ اس حالت میں پہنچ کر میں اللہ کو راضی نہیں کرسکتا یہاں تک کہ شدید بیماری میں مبتلاء شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس کی صحت میں کیے جانے والے اعمال کے اجر کا وعدہ فرمایا ہے مسجد میں جانے سے معذور شخص کو گھر کے اندر ہی نماز پڑھ لینے پر جماعت سے نماز پڑھنے کا ثواب مقرر فرمایا ہے ، جہاد پر نہ جانے والے معقول عذروں میں مبتلاء حضرات کے لیے اپنے گھر میں رہتے ہوئے ہی جہاد میں شرکت کا ثواب مقرر کیا ہے تو جو بندہ دنیا میں جس حال میں ہے وہ اسی حال میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو پاسکتا ہے اللہ تعالیٰ کا دروازہ پوری زندگی کے چوبیس گھنٹے ہر لمحہ کھلا ہوا ہے

اسی لیے ساری عمر بھر کا کافر ومشرک جب بھی اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹادے اور نادم وشرمسار ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اسے دھتکار کر دربار سے نکال نہیں دیتے بلکہ اس کی قدر دانی فرماتے ہیں اور اس کا سب کچھ معاف کردیتے ہیں ورنہ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ تو اتنا بڑا گنہگار ساری عمر کا باغی جا میں اب تیرے لیے اپنا در نہیں کھولوں گا اور تجھے معاف نہیں کروں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک عبرت آموز واقعہ

اس پر مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ یاد آیا جس کو حضرت والا نے اپنے مواعظ میں نقل کیا ہے کہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دسترخوان پر بٹھا کر کھلانے کے لیے کوئی نہ ملا تو ایک کافر کو پکڑ کر لائے اور

کھانے پر بٹھایا اور اس نے کھانا شروع کیا تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اس سے کہا کہ تم ایمان قبول کیوں نہیں کرتے ہو ایمان لے آؤ تو وہ اس بات کی وجہ سے بھاگ گیا ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر عتاب ہوا اور وحی آئی کہ اے ابراہیم میں اس کافر کو پچاس ساٹھ سال سے کھلا رہا ہوں اور کھلانے کے بدلے میں نے اس سے ایمان کی پیش کش نہیں کی اور آپ نے ابھی ایک لقمہ ہی کھلایا اور فوراً ایمان کی پیش کش کر بیٹھے جاؤ اس کو پکڑ کے لاؤ اور اس کو کھانا کھلاؤ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے لگے اور باہر کسی جنگل سے اس کو پکڑ کر لائے اور اس کو سارا قصہ سنایا کہ تیری وجہ سے مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب نازل ہوا تو اس کافر کے دل کو اس بات کی وجہ سے ایک چوٹ لگی اور کہنے لگا کہ اچھا اللہ تعالیٰ اتنے کریم ہیں کہ مجھ جیسے کافر و نافرمان کی وجہ سے اپنے خلیل پر عتاب نازل کر دیا اور کھانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر کہنے لگا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلُ اللّٰہِ اس لیے خلاصہ یہ نکلا کہ کسی بھی حال میں بندہ اللہ تعالیٰ سے دور اور اس سے جدا اور کٹا ہوا اور علیحدہ نہیں ہے پس جس حال میں بھی ہو اس حال کے تقاضہ کو اور حکم کو بجا لائے اسے ضرور اللہ تعالیٰ مل جائیں گے۔

فائنل ڈسٹنیشن وایا (Via) صبر ہو یا شکر، جنت ہے

دونوں مرکب سے چل کر کے سالک جا پہنچتا ہے باغ جناں میں
ہے خوشی یاں تو غم بھی ہے اے دل ایک حالت نہیں اس جہاں میں

سالک کا مطلب ہے جو بندہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والا ہے اور اس کے لیے صبر و شکر گویا کہ دو سواریاں ہیں ایک خوشی کے موقعہ پر اور ایک غم کے موقعے پر ان دونوں سواریوں میں سے کسی پر بھی سوار ہو کر سالک اللہ کی جنت و رحمت تک پہنچ جاتا ہے اور جب تک ہم دنیا میں ہیں تو یہ دونوں حالتیں ضرور پیش آتی رہیں گی اس لیے کہ دنیا جنت و جہنم دونوں کا مظہر ہے لہٰذا یہاں خوشی کے ساتھ غم ہے، راحت کے ساتھ مصیبت ہے، سکون کے ساتھ پریشانی ہے، خوشحالی کے ساتھ بدحالی ہے، وسعت کے ساتھ تنگی ہے، اچھائی کے ساتھ برائی ہے، وغیرہ وغیرہ اس لیے اس دنیا میں ایک حالت نہیں ہو سکتی۔

تو جب یہ بات طے ہے کہ اس دنیا میں دونوں قسم کے حالات ہونگے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ ان دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی سواری اور کوئی راستہ ضرور ہوگا اسی کو ہم صبر و شکر سے تعبیر کرتے ہیں اور قربان جائیں ہم اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ نے اپنی امت کو ہر چھوٹی بڑی بات سے آگاہ اور خبردار کر دیا کہ ہم اگر واقعی معنی میں حضور کے غلام بن جائیں تو دنیا اور آخرت کی عزت و راحت اور عافیت ضرور مقدر ہو کر رہے گی اور ناکامی اور رسوائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن وکافر کی مثال اس طرح بیان فرمائی:

﴿مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الزَّرْعِ لَا تَزَالُ الرِّيحُ تُمِيلُهُ وَلَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ يُصِيبُهُ الْبَلَاءُ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ شَجَرَةِ الْأَرْزِ لَا تَهْتَزُّ حَتَّى تَسْتَحْصِدَ﴾

(صحيح مسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب مثل المؤمن كالزرع)

کہ مومن کی مثال اس کھیتی کی طرح ہے جس کو ہوائیں ادھر سے ادھر گراتی ہوں اور ادھر سے ادھر تو مومن بھی اپنے حالات میں کبھی ادھر گرتا ہے تو کبھی ادھر مگر پھر سے اٹھ کر ایسے ہی سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے جس طرح کہ وہ کھیتی سیدھی ہو جاتی ہے اور منافق وکافر کی مثال صنوبر کے اس درخت کی طرح ہے کہ جو ہلتا نہیں ہے مگر جب ہلتا ہے تو جڑ سے اکھڑ کر گر جاتا ہے اور اس کو کاٹ کر صاف کر دیا جاتا ہے جبکہ مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب تکالیف میرے اوپر اس لیے ڈالی جا رہی ہیں تاکہ میں اللہ سے اس حال میں ملوں کہ گناہوں سے بالکل پاک وصاف ہو جاؤں جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ہے:

﴿لَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ أَوِ الْمُؤْمِنَةِ فِي جَسَدِهِ وَفِي مَالِهِ وَفِي وَلَدِهِ حَتَّى يَلْقَى اللّٰهَ وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيئَةٍ﴾

(مسند احمد)

کہ مسلمان کو اس کی جان اور اس کے مال اور اس کی اولاد کے سلسلے میں ابتلاء آزمائش پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے اوپر ایک گناہ بھی نہیں باقی رہے گا۔

یہاں تک کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی:

﴿يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيضِ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الزهد، باب ما جاء في ذهاب البصر)

دنیا میں عیش وعشرت میں رہنے والے لوگ جب مصیبت زدہ لوگوں کے بلند درجات اور عظیم اجر وثواب کو قیامت کے دن دیکھیں گے تو ان کی یہ تمنا ہوگی کہ کاش ان کو دنیا میں ایسی تکلیف ملتی کہ ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں تاکہ آج یہ عظیم اجر وثواب ہمیں حاصل ہو جاتا لہٰذا مومن کو کسی بھی حال میں بے چین اور پریشان اور مایوس وناامید نہیں ہونا چاہیے ان شاء اللہ جس حال میں بھی اللہ نے رکھا ہے اسی کے ذریعے اس کی اللہ تک رسائی ہو جائے گی اور منزل مقصود حاصل ہو جائے گی۔

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ بندے کا تعلق تفویض وتوکل کا ہو جائے اور اپنی تجویزیں اسکی مرضی پر فنا کر دے تو اس کو جینے میں بڑی حلاوت نصیب ہوگی خواجہ صاحب نے کیا ہی خوب کہا ہے ۔

اجر لے ناکام ہو کر بھی نہ ربّ کام چھوڑ
وقت ہے جدوجہد کا راحت و آرام چھوڑ
کیا نتیجہ ہوگا کیونکر ہوگا یہ اوہام چھوڑ
کام کر اور جس کا ہے کام اس پہ تو انجام چھوڑ

اہل اللہ سارے عالم سے مست و بے خبر رہتے ہیں

ہاں مگر ان کا اک ذرۂ غم ہر نفس مست رکھتا ہے جاں میں
کیف پایا ہے دونوں جہاں کا میں نے عاشق کے درد نہاں میں
آب و گل میں اگر درد دل ہے عالم خاک ہے آسماں میں

یعنی بندہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی راہ کا غم اٹھا تا ہے اور اس کی نافرمانیوں سے بچ کر حرام لذتیں نہ اٹھانے سے دل پر آنے والی حسرت اور صدمہ برداشت کر کے چلتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے قلب میں ایسی حلاوت ولذت اور ایسا سرور و کیف عطا فرماتے ہیں کہ جو دونوں جہان کے مزوں سے بڑھ کر ہے جس کے نتیجے میں یہ اللہ کا سچا عاشق ایسا مست اور مگن رہتا ہے کہ اسے کائنات کی چیزوں سے کوئی مطلب واسطہ باقی نہیں رہتا اس کے قلب میں خود ایک عظیم کائنات قائم رہتی ہے اور بڑا عالم رچا بسا ہوتا ہے یہی سب سے عظیم الشان تحفہ ہے اور مومن کو ملنے والا عطیۂ خداوندی ہے جو اللہ کے خاص اولیاء صدیقین کا حصہ ہے جس کی بدولت یہ ذرہ آب و گل فرش پر رہتے ہوئے عرش سے جڑا رہتا ہے اور خاک پر رہتے ہوئے آسمان سے رابطہ کئے ہوتا ہے۔

ان کی یادوں کے صدقے میں اخترؔ
پر سکوں زندگی ہے جہاں میں

یہ بات اس کتاب میں جگہ جگہ ذکر کی گئی ہے کہ مومن کو اس وقت تک سکون نہیں مل سکتا جب تک کہ اس کی زندگی اللہ کی یاد سے دور ہو اور غفلت میں گزر رہی ہو کیونکہ قرآن نے سکون کا ایک ہی راستہ مقرر فرمایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری والا راستہ ورنہ سامان سکون تو جمع ہو سکتے ہیں لیکن سکون میسر نہیں آسکتا۔

انقلاب زندگی

خوبرویوں سے ملا کرتے تھے میر
اب ملا کرتے ہیں اہل اللہ سے
مت کرے تحقیر کوئی میر کی
رابطہ رکھتے ہیں اب اللہ سے

فدا اُن پر کرو ہر لمحہ جاں کو

نہیں پائے گا جو زخمِ نہاں کو
وہ کیا جانے گا پھر آہ و فغاں کو

ترستا ہے وہ تاثیرِ بیاں کو
نہ پائے جو محبت کی زباں کو

نہ پاؤ گے خرد کی بندگی سے
جو حاصل ہے گروہِ عاشقاں کو

مٹا دے نفسِ امارہ کو اے دل
اٹھا دیں گے حجابِ آسماں کو

یہ ہے ہر لمحہ فرمانِ محبت
فدا ان پر کرو ہر لمحہ جاں کو

نہ پاؤ گے کبھی جامِ محبت
نہ ڈھونڈو گے اگر پیرِ مغاں کو

گناہوں سے نہ باز آئے اگر تم
عطا نسبت نہ ہوگی قلب و جاں کو

جو صحرا میں ہے سناٹے کا عالم
کہاں حاصل ہے یہ ہو گلستاں کو

خداوندا مجھے توفیق دے دے
فدا کردوں میں تجھ پر اپنی جاں کو

گناہگاروں کے اشکوں کی بلندی
کہاں حاصل ہے اختؔر کہکشاں کو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **زخمِ نہاں**: چھپا ہوا زخم، مراد وہ چوٹ ہے جو اللہ تعالیٰ کے عاشق گناہوں سے بچنے میں اپنے دل پر کھاتے ہیں۔ **آہ و فغاں**: اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا اپنے گناہوں پر ندامت سے رونا۔ **تاثیرِ بیاں**: بیان اور تقریر میں اثر ہونا۔ **خرد کی بندگی**: عقل کی غلامی۔ **گروہِ عاشقاں**: اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کی جماعت۔ **نفسِ امارہ**: نفس کی وہ حالت جس میں وہ گناہوں کا بہت زیادہ تقاضہ کرتا ہے۔ **حجابِ آسماں**: آسمان کا پردہ، مراد اللہ تعالیٰ کی نزدیکی اور قرب کا ملنا ہے۔ **فرمانِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضہ۔ **جامِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب۔ **پیرِ مغاں**: مرشد کامل۔ **نسبت**: اللہ تعالیٰ کو بندے سے اور بندے کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جانا۔ **صحرا**: ریگستان۔ **ھو**: سناٹے کی حالت۔ **گلستاں**: باغ۔ **بلندی**: اونچائی۔ **کہکشاں**: ستاروں کا مجموعہ۔

آہ و فغاں اور تاثیرِ بیان اندرونی محبت کی نشانی ہے

نہیں پائے گا جو زخمِ نہاں کو
وہ کیا جانے گا پھر آہ و فغاں کو
ترستا ہے وہ تاثیرِ بیاں کو
نہ پائے جو محبت کی زباں کو

یعنی جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت حاصل نہ ہو اور اس کے دل میں گناہوں سے بچنے کا غم زخمِ نہاں کی صورت میں موجود نہ ہو تو پھر اسے آہ و فغاں کا مزہ بھی نہیں ملتا، دراصل یہ آہ و فغاں اسی زخمِ نہاں کا اثر ہوتی ہے جس

نے اللہ کی راہ میں جتنے مجاہدے اٹھائے ہوتے ہیں اور جتنی تکلیفیں سہی ہوتی ہیں اس کو اتنا ہی اللہ تعالیٰ اپنی محبت کا درد عطا فرماتے ہیں اور وہ پھر چہرے سے جھلکنے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتا ہے اور یہ اسی دل میں چھپے ہوئے درد کا ترجمان ہے اور جو گریہ وزاری آنکھوں کو عطا ہوتی ہے اور جو آہ وفغاں زبان سے جاری ہوتی ہے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ بیان میں ایسی تاثیر رکھ دیتے ہیں کہ سننے والوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

اور جو اس دردِ محبت سے خالی ہو اگرچہ اس کو ظاہری فصاحت و بلاغت خوب عطا ہوئی ہو اور لوگوں میں بہت اچھا مقرر جوشیلا خطیب اور بے مثال واعظ جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہو لیکن اس کے بیان کو اللہ تعالیٰ وہ تاثیر عطا نہیں فرماتے اس لیے ایسا آدمی تاثیر بیان کے لیے ترستا رہتا ہے وقتی طور پر لوگ اس کے بیان سے خوش اور متاثر ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن دیرپا اثر زندگیوں میں پیدا نہیں ہوتا۔

حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کی دو خصوصیتیں

اس کی دلیل اور وجہ وہ ہے جس کو شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی نصاب تعلیم کے موضوع پر لکھی ہوئی کتاب میں یوں ذکر کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ کی دو بنیادی خصوصیتیں تھیں جن سے آج واعظین اور مقررین عام طور پر خالی ہوتے ہیں اس لیے ان کی تعلیمات اور ہدایات یا تو زبانوں پر رہتی ہیں یا تو اوراق کے سپرد ہوتی ہیں وہاں سے آگے نہیں جاتی اور دلوں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی ہے (۱) خصوصیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بیان فرماتے تھے تو صحابہ کرام کو قریب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر بڑی نرمی اور محبت و مودت شفقت و رحمت اور الفت و پیار رکھا تھا۔ کیسا ہی ناراض کرنے والا اور غصہ دلانے والا واقعہ ہوا و غمگین و بے چین کرنے والی بات ہو لیکن حضور علیہ الصلاۃ والسلام صحابہ کرام کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتے تھے، جیسا کہ ایک موقع پر ایک اعرابی آیا اور مسجد کے اندر کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا جب صحابہ کرام نے دیکھا تو اس کی طرف لپک کر اسے ڈانٹنے ڈپٹنے کا ارادہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں ایسا نہ کرو اور اس وقت اس کے پیشاب کو قطع نہ کرو اور پھر پانی بہا کر اس کو صاف کرا دیا اسی طرح ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ قرض لیا تھا، تو قرض خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ نامناسب باتیں کہنے لگا جو واقعہ کے خلاف اور غلط تھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس بات سے منع کر دیا کہ وہ اسے کچھ کہے اور پھر یہ جملہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً﴾

(صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب من استسلف شيئًا فقضى خيرا منه)

یعنی حق والے کو کچھ کہنے کی گنجائش ہوا کرتی ہے۔

اسی طرح ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زنا کی اجازت چاہنے کے لیے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو بڑے پیارے انداز سے سمجھایا اور ان سے یہ دریافت کیا کہ بتاؤ اگر کوئی تمہاری بیٹی بہن کے ساتھ ایسا معاملہ کرے تو تم گوارا کرو گے تو اس نے جواب دیا ''یا رسول اللہ نہیں''، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو کسی کی بیٹی اور بہن ہے۔

غرض یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑی ہی شفقت و محبت اور نرمی رکھی گئی تھی جس کے نتیجے میں آپ کی دعوت بڑی موثر اور نافع تھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(سورة ال عمران، اٰية: ۱۵۹)

ترجمہ: بعد اس کے (کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملامت اور مواخذہ کرنے کا حق تھا) خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم (خدانخواستہ) تندخو سخت مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیوض و برکات کہاں نصیب ہوتے)

لہٰذا معلم اور مقرر اور مبلغ و داعی کے مزاج میں سب سے پہلی صفت نرمی اور محبت و مودت ہونی چاہیے اور جس کو یہ چیز عطا ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ من جانب اللہ عطا ہوئی ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ میں اس کو اپنی رحمت خاصہ کا اثر قرار دیا ہے میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ اسی بات کو بڑے پیارے انداز میں یوں فرماتے تھے:

ارے ارے! باپ بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔
شیخ بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔
استاد بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔
شوہر بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔

اسی طرح چند چیزیں گنتی کرانے کے بعد اخیر میں مختصر لفظوں میں آہستہ سے ارشاد فرماتے تھے کیونکہ شفقت نہیں ہے۔

تعلیمِ قرآن کے ساتھ صفتِ رحمٰن استعمال کرنے کی حکمت

اسی لیے ہمارے حضرت والا کے ایک وعظ میں یہ بات مذکور ہے کہ تعلیم قرآن کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رحمٰن کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾

(سورة الرحمن، اٰية: ۱-۲)

جب کہ دوسرے اسماء صفات میں سے کوئی اور نام بھی لایا جا سکتا تھا جیسے کہ "اَللّٰہُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" "اَلرَّبُّ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" "اَلْخَالِقُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" وغیرہ۔

لیکن رحمٰن کی صفت تعلیم قرآن کے موقع پر استعمال کرنے میں یہی خاص حکمت ومصلحت مخفی ہے کہ اے معلمین قرآن (اے قرآن کے سکھانے والو) تمہارے اندر قرآن کی تعلیم کے وقت صفت رحمت غالب ہونی چاہیے اگر ایسا ہوگا تو تم آسانی سے تعلیم قرآن کر سکو گے۔ اسی لیے ایسے بہت سے بچوں کے واقعات ہیں کہ جو استاذ کی شفقت والفت اور نرمی ومہربانی نہ ملنے کی وجہ سے اور ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے اثر سے حفظ قرآن چھوڑ بیٹھے مگر پھر ان کو جب کسی مشفق مہربان استاذ کے پاس بھیجا گیا اگر چہ کچھ وقت زیادہ خرچ ہوا مگر انہوں نے عمدگی کے ساتھ قرآن حفظ کر لیا۔

غرض یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت میں نرمی والا پہلو غالب تھا یہ اوّل درجہ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔

اور دوسری خصوصیت یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی دعوت دیتے تھے اس سے زیادہ خود عامل ہوتے تھے جیسے دوسروں کو پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کا حکم دیتے جب کہ خود اشراق وچاشت تہجد واوابین وغیرہ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اسی طرح دوسروں کو چالیسواں حصہ خرچ کرنے کا حکم دیتے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سب کچھ خرچ کر دیتے تھے یہی معاملہ روزہ اور دوسری عبادات کا تھا۔ اس لیے تعلیم اور تربیت میں تاثیر لانے کے لیے خود دین پر اس سے زیادہ عامل ہونا چاہیے جس کی دوسروں کو تعلیم دے رہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی باتوں میں خاص تاثیر عطا فرماتے ہیں ورنہ حقیقی اور سچی بات یہ ہے کہ تقریر برائے تقریر ہو کر رہ جاتی ہے اور سوائے وقتی اثر اور جزوی نفع کے کوئی خاص انقلاب اور نمایاں تغیر لوگوں کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ اسی کو حضرت والا نے فرمایا ہے کہ جسے محبت کی زبان حاصل نہ ہو اسے تاثیر بیان بھی حاصل نہیں ہوتی وہ اس کے لیے ترستا رہتا ہے۔

راہِ سلوک کے لیے دیوانگی چاہیے نہ کہ فرزانگی

نہ پاؤ گے خرد کی بندگی سے
جو حاصل ہے گروہ عاشقاں کو

حضرت والا کے کلام میں اہل خرد اور اہل عشق کی دو تعبیریں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ ہر وقت ظاہری عقل کے فیصلوں پر چلتے ہیں اور وہ اللہ پر مر مٹنے کا جذبہ نہیں رکھتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں اور دیوانوں کا مزاج ہوا کرتا ہے تو پھر ایسے لوگوں کو قربانیاں دینا اور مجاہدے اٹھانا بڑا مشکل ہوتا ہے اور ان پر اللہ کے لیے مرنا مٹنا دشوار ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس دولت سے محروم رہتے ہیں جو اللہ کے عاشقوں کو نصیب ہوا کرتی ہے۔

اگر اس فرق کو سمجھنا ہو تو ہم حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو دیکھ لیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے یہی مقام دیوانگی حاصل تھا اس لیے جب جان و مال کی قربانی کا موقع سامنے آتا تو اس پر اپنی ظاہری عقل کے پہلو سے نہیں سوچتے تھے بلکہ وہ اللہ کی راہ کے دیوانے تھے جو بھی تقاضہ سامنے آتا فوراً سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے اور اگر، مگر، کے لفظوں سے ان کے ذہن بالکل پاک وصاف تھے جو درحقیقت بچنے اور پہلوتہی کرنے والوں کے عذر و بہانے کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ ہیں ورنہ مومن کی شان یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا جو بھی حکم سامنے ہو اس پر بلا کچھ سوچے سمجھے، دیوانہ وار قربان ہو جائے۔ نہ کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کا ڈر ہو اور نہ ہی کسی مصلحت و منفعت کے فوت ہونے کا، اندیشہ لاحق ہو یہی مزاج عاشقاں ہوا کرتا ہے اور اسی کی طرف حضرت شعر میں اشارہ فرما رہے ہیں۔ جس کو حضرت والا نے ایک دوسرے شعر میں یوں ذکر کیا ہے ۔

خرد کے سامنے گرچہ ہیں صد ہزار عالم
نگاہ عشق میں تیرا ہی ایک عالم ہے

اور فرمایا ۔

رہِ عشق میں عقل کانٹا ہے کانٹا
جو ہے کام کی بس تو دیوانگی ہے

اس پر احقر کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک قیمتی ملفوظ یاد آیا جس میں یوں ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی طبیعت کو عقل کے تابع کر دیا اور بحمد اللہ عقل کو شریعت کے تابع کر دیا تو اب طبیعت اور عقل کی چاہت شریعت کی چاہت کے ماتحت ہوتی ہے اور یہی کل پورے دین کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اور شریعت کا حاصل بلا چوں و چراں اللہ تعالیٰ کے حکم کی خاطر اپنی جان اور سب کچھ لٹانا ہے۔

مدار محبت اتباعِ محبوب اور مخالفتِ نفس پر ہے

مٹا دے نفس امارہ کو اے دل
اٹھا دیں گے حجاب آسماں کو
یہ ہے ہر لمحہ فرمان محبت
فدا ان پر کرو ہر لمحہ جاں کو

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ﴾
(مشکوۃ المصابیح، ص: ۷)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی طاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے جو کہ ہر وقت کا ساتھی ہے اور متعدد روایات میں نفس امارہ کا دشمن ہونا مذکور ہے بالکل ٹھیک اسی طرح جیسا کہ شیطان ہمارا خارجی دشمن ہے، نفس داخلی دشمن ہے اور عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ دشمن کو دشمن سمجھا جائے اس کے ساتھ دوستوں والا سلوک نہ کیا جائے اس لیے ہر موقع پر نفس و شیطان کے تقاضوں کو پامال کرنا چاہیے اور اللہ کے حکم پر جان دینی چاہیے۔

یہی حقیقت ہے نفس امارہ کو مٹانے کی ورنہ اگر کوئی یہ سوچے کہ میرے اندر سے گناہوں اور نافرمانیوں کے تقاضے ختم ہوجائیں اور ان کی طرف طبیعت میں کسی درجہ بھی رغبت باقی نہ رہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ملائکہ اور فرشتوں کی خصوصیت ہے اس لیے انسان کے لیے اصل یہ ہے کہ سب تقاضوں کے باوجود ان پر کنٹرول کرے خواہ دل پر کتنا ہی زور پڑے اور کیسی ہی تکلیف اٹھانی پڑے کیونکہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں اور معصیتوں کو دنیا کے اندر نفس کی مرغوب غذا بنایا گیا اور طبیعت کی چاہت اور میلان ان کی طرف رکھا گیا ہے اور طاعات کا انجام دینا اور برائیوں سے رکنا یہ طبیعتوں میں ناگوار رکھا گیا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾

(صحيح مسلم، كتاب الجنة، وصفة نعيمها واهلها)

یعنی جنت کو ایسی چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے جو طبعی طور پر انسان کو ناگوار ہیں اور مشقت آمیز ہیں اور جہنم کو ایسی چیزوں سے گھیرا گیا ہے جو طبعی طور پر انسان کی چاہت ہیں اور اس کو مرغوب ہے۔

لہٰذا اگر مومن بندے کو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہیے اور جنت میں داخلہ مطلوب ہو تو نفس امارہ کے تقاضوں کو مغلوب کرنا پڑے گا اس کے بعد اسے خود محسوس ہوگا کہ جیسے بندے اور اللہ کے درمیان سے سارے حجابات اٹھا دئے گئے ہوں بس ہر لمحہ یہ خیال رہے کہ جو بھی میرے محبوب خالق و مالک اللہ تعالیٰ کا حکم ہے میرے دل کے سارے ارمان اسی پر قربان ہیں اور اس کے خلاف ایک قدم اٹھانا مجھے منظور اور گوارا نہیں ہے یہی صورت ہے۔ کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے صحیح محبت کر کے خود اس کا محبوب بن جائے اور یہی تقاضائے دعویٰ محبت بھی ہے کیونکہ محبّ اپنے محبوب کی ہر ادا پر جان دینے والا ہوا کرتا ہے جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے کہ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيْعٌ یعنی محبّ اپنے محبوب کی ہر بات ماننے والا ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو بس زبانی دعویٰ محبت تو ہے لیکن حقیقی محبت نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کے شب و روز آپ کی سنتوں اور طریقوں سے ہٹ کر یہود و نصاریٰ کے طریقوں میں گزر رہے ہیں تو یہ دعویٰ محبت بارگاہ خداوندی میں معتبر نہیں ہے۔

صحبتِ شیخ سے عطائے نسبت اجتنابِ معصیت پر موقوف ہے

نہ پاؤ گے کبھی جام محبت
نہ ڈھونڈو گے اگر پیر مغاں کو
گناہوں سے نہ باز آئے اگر تم
عطا نسبت نہ ہوگی قلب و جاں کو

حضرت والا نے اصلاح وتربیت کے لیے اعتدال پر مبنی مسلک وموقف پیش کیا ہے کہ جس طرح راہِ محبت طے کرنے کے لیے گناہوں کا چھوڑنا اور اللہ کی نافرمانیوں سے باز آنا از حد ضروری ہے اس کے بغیر یہ راہ طے ہو ہی نہیں سکتی اور قلب و جاں کو خاص نسبت مع اللہ نہیں مل سکتی۔ ٹھیک اسی طرح نسبت مع اللہ کے حصول اور جام محبت پینے کے لیے کسی شیخ کامل، مرشد برحق کے ساتھ اصلاحی تعلق بھی از حد لازم وضروری ہے۔

سنت اللہ یہی جاری ہے کہ کتاب اللہ پر عمل رجال اللہ کے ذریعے ہی آسان ہوتا ہے اس لیے بندہ مومن گناہوں کو چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرے اور اپنا ہاتھ کسی اللہ والے کے ہاتھ میں دے دے جب ان دو پہیوں پر آپ کے عشق ومحبت کی سواری چلے گی تو ان شاء اللہ جلد ہی بڑی عافیت اور راحت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ کر محبوبِ حقیقی سے ملا دے گی اور اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی کمی اور نقصان ہو تو پھر نسبت مع اللہ کے حصول کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جو لوگ اپنی انانیت وتکبر اور عجب وخود پسندی کی بنیاد پر رجال اللہ یعنی اولیاء اللہ سے دور رہتے ہیں اور طرح طرح کے اوہام اور شکوک وشبہات میں مبتلا رہتے ہیں وہ ساری عمر راہ سلوک طے کرنے کے باوجود اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے، کبھی جوش وجذبے میں افراط کا شکار ہوتے ہیں، تو کبھی تفریط کا۔ اس طرح ان کو رسوخ اور بقا حاصل نہیں ہو پاتی اور استقامت کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح دوسری قسم کے وہ لوگ کہ جو کسی شیخ برحق سے وابستہ تو ہیں اور اصلاحی تعلق بھی رکھتے ہیں مگر یہ وابستگی اور تعلق محض برائے نام ہوتا ہے نہ گناہوں کو چھوڑنے کا عزم وارادہ، نہ تعلیمات شیخ کی اتباع کی کوئی فکر، نہ ہی اپنے شیخ کی تعلیمات کو اپنے اوپر منطبق کرکے اپنے حالات کو جانچنے پرکھنے کا کوئی خیال ہوتا ہے بس ایک رسمی انداز سے پیری مریدی کی صف میں اپنے کو لاکر کھڑا کردیا اور اپنے ذہن کی مفروضہ برکتیں حاصل کرنے کا دل میں خیال جمالیا یا کچھ دنیوی منافع کاروبار میں ترقی یا الاؤں بلاؤں کا ٹل جانا اس نوع کے ضمنی اور جزئی فوائد سامنے رکھ کر کسی سلسلے سے وابستہ ہوگئے اور جو بنیادی مقصد تھا اس کو نگاہوں سے اوجھل کردیا تو ایسے لوگ بھی ساری عمر گزر جانے کے باوجود نسبت مع اللہ حاصل نہیں کرپاتے۔

اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں دونوں قسم کے لوگوں کی اصلاح فرمائی جس کا حاصل یہ ہوا کہ کسی شیخ

کامل کی ہدایات وتعلیمات کی پوری پوری اتباع اور تمام گناہوں سے مکمل اجتناب ہی عطائے نسبت کا ضامن ہے اگر ان میں سے ایک کا بھی فقدان ہوتو پھر تا حیات حصول نسبت کا تصور محض ایک خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

صحرا میں جو مزہ ہے وہ گلستاں میں نہیں

جو صحرا میں ہے سناٹے کا عالم
کہاں حاصل ہے یہ ہو گلستاں کو

اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق دنیا کے رنگ وبو اور اس کی زیب وزینت میں اتنے خوش نہیں ہوتے جتنی خوشی ایسے صحراؤں اور سیدھی سادھی جگہوں میں ہوتی ہے جہاں نہ یہ نقش ونگار ہوں اور نہ انواع واقسام کے پھول بوٹے ہوں اور نہ وہاں کوئی خاص زیبائش وآرائش ہو یعنی غرض یہ کہ ایسی جگہیں جو علائق دنیویہ سے خالی ہوں ان میں اللہ والوں کا دل زیادہ لگتا ہے اور ایسے مقامات پر بیٹھ کر جب وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو وہ صحرا ان کے لیے رشک گلستان بن جاتا ہے کیونکہ اللہ کی یاد سے وہ حقیقت میں آباد ہوتا ہے اور یہ دنیا کی عیش وعشرت کی جگہیں اللہ کی یاد سے غافل ہونے کی وجہ سے حقیقت میں ویران ہوتی ہیں اس لیے اہل اللہ ہمیشہ ایسی جگہوں سے دور رہتے ہیں کہ جہاں علائق دنیویہ کا شکار ہو جانا پڑے۔

دین کا ہر کام محض توفیق الٰہی کا نتیجہ ہے

خداوندا مجھے توفیق دے دے
فدا کردوں میں تجھ پر اپنی جاں کو

اللہ تعالیٰ کی راہ کا ایک قدم بھی اس کے فضل وکرم کے بغیر اٹھایا نہیں جا سکتا سارے مدارج سلوک توفیق باری تعالیٰ کے مرہون منت ہیں سو جسے جس درجے میں اللہ تعالیٰ دین پر چلنے کی توفیق دے دے اس کو اسی کا کرم سمجھنا چاہیے اس لیے حضرت والا اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ مجھے تو ہی توفیق دے دے کہ میں اپنی جان تیرے اوپر قربان کردوں اور ہر لحہ حیات اپنے دل کی ہر تمنا تیری مرضی کے مطابق ڈھال دوں کیونکہ میں کتنے بھی مجاہدے کرلوں اور اپنی طرف سے کتنی ہی کوششیں کرڈالوں اور یہ سوچتا رہوں کہ یہ میری کوششیں اور مجاہدے ہیں جن کی وجہ سے میں اس کا مستحق ہوں کہ مجھے آپ کا قرب ملے تو سوائے آپ سے دور ہونے کے کچھ اور حاصل نہ ہوگا کیونکہ میرے مجاہدے اور میری سعی وکوشش درحقیقت آپ ہی کی توفیق کا ثمرہ ہے تو جس طرح آپ سے ہم اپنی منزل مقصود مانگتے ہیں اور آپ کے قرب اور معرفت ومحبت کے بھکاری ہیں اسی طرح اس کے حصول کے لیے ہر لحہ آپ کی ذات عالی پر قربان کرنے کی بھیک بھی ہم آپ ہی سے مانگتے ہیں۔

گناہگاروں کے اشکِ ندامت کی رفعت

گناہگاروں کے اشکوں کی بلندی
کہاں حاصل ہے اختؔر کہکشاں کو

اس آخری شعر میں حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے گناہوں اور غفلتوں پر گریہ وزاری کرتے ہیں اور ان کی آنکھیں اللہ کے لیے اشک بار ہوتی ہیں تو بارگاہ خداوندی میں ان اشکوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے اور وہ اللہ کی نگاہ میں اس قدر چمکتے موتیوں اور ستاروں کی طرح ہیں کہ آسمان میں جو چمکتے ہوئے کہکشاں ستارے ہیں ان کو بھی ان سے کوئی نسبت نہیں۔

ظاہر ہے کہ ان ستاروں سے صرف ظاہری روشنی حاصل کی جارہی ہے مگر گنہگاروں کے اشکہائے ندامت اندرون مومن روشنی پیدا کررہے ہیں جو دل کو مزکی ومجلیٰ اور صاف ستھرا اور چمک دار وروشن بنادیں گے اور ان کی چمک اور روشنی سے قلب کی تاریکی دور ہوتی ہے اور اللہ کے یہاں بندے کا مقام بندگی عروج پر پہنچ جاتا ہے جو اس کے لیے ہزار اور لاکھ کہکشاں سے بہتر ہے جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

جو گرے ادھر زمین پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اٹھا فلک پر مری بندگی کا تارا

اس مضمون سے متعلق کتاب میں مختلف مقامات پر احادیث شریفہ مذکور ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ ایک گنہگار بندے کے آنسو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔

کبھی ہے رابطہ آہ سحر سے

کبھی تو دردِ دل دردِ جگر سے کبھی ہے رابطہ آہِ سحر سے
نہ ہو دل میں تری یادوں کا جلوہ تو پھر کیا فائدہ شمس و قمر سے
نہیں محتاج دردِ دل زباں کا وہ خود ظاہر ہے اپنی چشمِ تر سے
اگر تو چاہتا ہے ان کی منزل نکل خوف اگر خوف مگر سے
ملا ہے جب سے لطف آہ صحرا کہاں وہ ربط ہے پھر اپنے گھر سے
خدا کے نور ہی سے دل ہے روشن ستاروں سے نہ خورشید و قمر سے
اگر طوفاں کی زد میں ہے سفینہ دعا مانگے خدائے بحر و بر سے
ہر اک مجبور ہے آہ و فغاں پر بیاں کرتا ہوں جب زخمِ جگر سے
زباں سے تو بیاں کرتا ہے لیکن ہوئی نسبت کی بارش بھی نظر سے
چھپاتا ہے وہ اپنا دردِ نسبت مگر مجبور ہے اپنی نظر سے
جو ان کی یاد سے غافل ہے اخترؔ ملے گا اس کو کیا شام و سحر سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ دردِ جگر: مراد وہ تکلیف ہے جو گناہوں سے بچنے میں اللہ تعالیٰ کے عاشق اپنے دل اور جگر پر اٹھاتے ہیں۔ **آہِ سحر:** تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور فریاد کرنا۔ **جلوہ:** روشنی / چمک۔ **شمس و قمر:** سورج اور چاند۔ **چشم تر:** آنسو بہاتی ہوئی آنکھ۔ **خورشید:** سورج۔ **سفینہ:** کشتی۔ **بحر و بر:** تری اور خشکی / سمندر اور زمین۔ **آہ و فغاں:** رونا دھونا۔ **زخمِ جگر:** وہ چوٹ جو اللہ تعالیٰ کے عاشق گناہوں سے بچنے میں غم اور تکلیف کی وجہ سے اپنے جگر پر کھاتے ہیں۔ **نسبت:** اللہ تعالیٰ کو بندے سے اور بندے کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جانا۔ **دردِ نسبت:** اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق کی وجہ سے گناہوں سے بچنے میں دل پر تکلیف اٹھانا۔ **شام و سحر:** رات اور صبح۔

آہ سحر کے ذریعہ اپنے مالک سے رابطہ کیجئے

کبھی تو دردِ دل دردِ جگر سے
کبھی ہے رابطہ آہِ سحر سے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''کہ جو میرے متقی بندے ہیں جن کے لیے میں نے جنت تیار کی ہے ان کی ایک خصوصیت یہ ہے **وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ** کہ میرے یہ خاص بندے صبح سویرے اٹھ کر مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور میرے سامنے گریہ و بکا اور آہ و زاری کرتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝﴾

(سورۃ الذاریات، ایات:۱۸-۱۷)

ترجمہ: وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے (یعنی زیادہ حصہ رات کا عبادت میں صرف کرتے تھے) اور (پھر باوجود اس کے اپنی عبادت پر نظر نہ کرتے تھے بلکہ) آخری شب میں (اپنے کو عبادت میں کوتاہی کرنے والا سمجھ کر) استغفار کیا کرتے تھے۔

یھجعون، ھجوع سے مشتق ہے جس کے معنی رات کو سونے کے آتے ہیں، اس میں مؤمنین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارتے ہیں، سوتے کم ہیں، جاگتے زیادہ ہیں اور وہ اپنا وقت نماز وعبادت میں گذارتے ہیں۔ یہ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے یہی منقول ہے کہ متقین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اٹھاتے ہیں، اور بہت کم سوتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف ما کو اس میں نفی کے لیے قرار دے کر یہ بتلایا ہے کہ رات کو تھوڑا سا حصہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں بلکہ عبادتِ نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہوجاتے ہیں، جو رات کے کسی بھی حصہ میں عبادت کرلیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں، اسی لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا ہے جو مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ اور امام ابوجعفر باقر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوویں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر)

اسی طرح حدیث پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْاٰخِرُ فَيَقُوْلُ مَنْ يَّدْعُوْنِيْ فَأَسْتَجِيْبَ لَهٗ وَمَنْ يَّسْأَلُنِيْ فَأُعْطِيَهٗ وَمَنْ يَّسْتَغْفِرُنِيْ فَأَغْفِرَ لَهٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب الترغیب فی الدعا والذکر فی اخر اللیل)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا اللہ ہر رات آخری تہائی حصہ میں سمائے دنیا کی طرف اترتا ہے اور پھر یہ اعلان کرتا ہے، کیا ہے کوئی مجھ سے دعا مانگنے والا؟ کہ میں اس کی دعا قبول کرلوں اور کیا ہے کوئی مجھ سے اپنی کسی ضرورت کا سوال کرنے والا؟ کہ میں اس کو دے دوں اور کیا ہے کوئی مجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہنے والا؟ کہ میں اس کو بخش دوں اور یہ اعلان فجر کے طلوع ہونے تک مسلسل ہوتا رہتا ہے۔

ان آیات اور حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بندہ مومن کو آہ سحر گاہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑا قوی اور مضبوط رابطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ وقت ادائے بندگی کے لیے نہایت مقبول اور خاص وقت ہے کہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں اپنے مومن بندوں پر اترنے کے لیے تلاش میں رہتی ہیں اور گویا خود اللہ تعالیٰ

اپنے بندوں کو نوازنے کے لیے بہانا ڈھونڈتے رہتے ہیں اس لیے اہل اللہ کبھی دل دل میں اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اپنے دردِ دل اور دردِ جگر سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق قائم کیے رہتے ہیں اور ایسے ذکرِ خفی میں مشغول رہتے ہیں کہ جس کے متعلق حدیث پاک میں آیا ہے:

﴿اَخْرَجَ اَبُوْیَعْلٰی عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَفْضُلُ الذِّکْرُ الْخَفِیُّ الَّذِیْ لَا یَسْمَعُہُ الْحَفَظَۃُ سَبْعُوْنَ ضِعْفًا اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ وَجَمَعَ اللّٰہُ الْخَلْقَ لِحِسَابِھِمْ وَجَآءَتِ الْحَفَظَۃُ بِمَا حَفِظُوْا وَکَتَبُوْا قَالَ لَھُمْ اُنْظُرُوْا ھَلْ بَقِیَ لَہٗ شَیْءٌ فَیَقُوْلُوْنَ مَا تَرَکْنَا شَیْئًا مِّمَّا عَلِمْنَاہُ وَحَفِظْنَاہُ اِلَّا وَقَدْ اَحْصَیْنَاہُ وَکَتَبْنَاہُ فَیَقُوْلُ اللّٰہُ اِنَّ لَکَ عِنْدِیْ حَسَنًا لَا تَعْلَمُہٗ وَاَنَا اَجْزِیْکَ بِہٖ وَھُوَ الذِّکْرُ الْخَفِیُّ﴾

(ذکرہ السیوطی فی البدور السافرۃ فی احوال الاخرۃ و التکشف ص ۲۲۸)

ترجمہ: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ذکرِ خفی جس کو حافظانِ اعمال فرشتے بھی نہیں سنتے، ذکرِ جلی پر ستر حصے فضیلت رکھتا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ خلق کو اُن کے حساب کے لیے فرمائیں گے اور حافظانِ اعمال فرشتے اپنی یادداشت اور نوشتۂ اعمال کو لائیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے فرمائیں گے کہ ان صحیفوں میں لکھے ہوئے اعمال کے علاوہ اس شخص کا کوئی عمل تو باقی نہیں رہ گیا۔ وہ عرض کریں گے کہ ہم نے اپنی معلومات اور محفوظات میں سے کوئی چیز بے ضبط کیے ہوئے اور لکھے ہوئے نہیں چھوڑی تب اللہ اُس شخص سے فرمائیں گے کہ میرے پاس تیرا ایک ایسا نیک عمل ہے کہ تجھ کو بھی اس کا اس وقت علم نہیں، اگرچہ دنیا میں جب تجھ سے صادر ہوا تجھے اطلاع تھی، اب میں تجھ کو اس کی جزا دوں گا اور وہ ذکرِ خفی ہے۔ سیوطی نے اس روایت کو **بدور السافرد فی احوال الاخرۃ** میں ذکر کیا ہے۔

اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہے حتیٰ کہ کراماً کاتبین بھی اس کو نہیں جانتے ہیں اسی طرح کبھی صبح کی آہ وفغاں کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے خالق سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔

اصل قلب کا یادِ خداوندی سے روشن ہونا ہے

نہ ہو دل میں تیری یادوں کا جلوہ
تو پھر کیا فائدہ شمس و قمر سے

ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا کے چاند وسورج سے ظاہری کائنات روشن ہوتی ہے جو خود فانی ہے اور اس کی روشنی بھی فانی ہے اور جس سے صرف ظاہر روشن ہوتا ہے، باطن نہیں اس لیے اس روشنی سے کافر ومومن، فاسق وفاجر سب لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور انوارات جن سے دل کی دنیا روشن ہوتی ہے وہ صرف اہل ایمان کا خاصہ ہے اور وہی اصل دنیا وآخرت میں نجات وفلاح اور کامیابی کی ضامن ہے اس کے بغیر ظاہر خواہ کتنا ہی

روشن و چمکدار ہو مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دل کی روشنی حاصل کیسے ہوتی ہے اور دل کو منور کس طرح کیا جاتا ہے تو یاد رکھئے کہ دل کی روشنی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد کو ذریعہ بنایا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ صَقَالَةٌ وَصَقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللهِ﴾

(المشکوٰۃ، باب ذکر اللہ عزّ وجلّ والتقرّب الیہ، ص: ۱۹۹)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ فرماتے تھے کہ ہر شے کا ایک صیقل ہے (جس سے اُس شے کو صاف کیا جاتا ہے) اور قلوب کا صیقل ذکر اللہ ہے۔

اور دوسری حدیث شریف میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَآءُ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللهِ وَمَا جَلَاءُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح: ص: ۱۸۱، التکشف: ص: ۲۱۱)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان دلوں کو بھی لوہے کی طرح جبکہ اُس کو پانی پہنچتا ہے، زنگ لگ جاتا ہے۔ عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! اور اس کا جلاء کس چیز سے ہوتا ہے۔ فرمایا موت کو بکثرت یاد کرنے سے اور قرآن مجید کی تلاوت سے۔ روایت کیا اُس کو بیہقی نے۔

جس قدر بندہ غیر اللہ کو دل سے دور رکھے اور اپنے اللہ تعالیٰ کو دل میں یاد کرتا رہے اس کا قلب اتنا ہی روشن رہتا ہے اور جتنا دل میں غیر اللہ کو بسائے اور فانی بتوں کے گندے خیالات سے دل کو گندہ کر کے رکھے اتنا ہی وہ دل تاریک اور سیاہ ہو جاتا ہے۔

اس لیے دراصل اس شعر میں حضرت والا یہ سبق دے رہے ہیں کہ مومن بندے کو اپنے قلب کو مزکی و مجلی کر کے اس دل میں اللہ تعالیٰ کی یادوں کو بسانا چاہیے اور اسے تجلیات خداوندی سے روشن کرنا چاہیے جس کے نتیجے میں دل و دماغ چمک اٹھیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں اس خاکی کی قیمت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور زیب و زینت کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے جیسا کہ آج کل ہمارا حال بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم اپنے ظاہر کو بنانے اور اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں اس قدر منہمک اور مشغول دکھائی دیتے ہیں کہ باطن کی طرف التفات اور توجہ بالکل نظر نہیں آتی جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معاملہ بالکل اس کا الٹا تھا بالآخر ہمارے روز و شب ظاہر کے بنانے میں اس طرح خرچ ہوتے ہیں کہ اگر ہم ساری زندگی کا ٹوٹل اور خلاصہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پانچ فیصد وقت بھی ہمارا اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کی خاطر دین پر چلنے کے کاموں میں خرچ نہیں ہوا جو کہ ہمارا اصل مقصد حیات تھا اور جس کے لیے اللہ نے ہمیں بھیجا تھا اور جو کام محض ضرورت کے درجے کے تھے ان پر ہم اپنی

زندگی کا پچانوے فیصد سے زیادہ حصہ خرچ کر کے دنیا سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

زیب وزینت میں محو ہونا مقصدِ حیات سے بے خبری کا اثر ہے

صاحبو! ذرا غور تو کرو اور سوچو تو صحیح۔ اگر آقا نے اپنے غلام کو بازار میں دودھ لینے کے لیے بھیجا اور اس کو بازار جانے کے لیے بطورِ سواری کے ایک گھوڑا دے دیا کہ وہ اس پر سوار ہو کر جلد دودھ لا کر آقا کو پیش کرے اب یہ غلام گھوڑے کو لے کر گھر سے باہر نکلا اور ایک گھنٹہ گھوڑے کے بدن کو خوب صاف کرتا اور چمکاتا رہا اور اس کو نہلا دھلا کر خوب صاف ستھرا کر دیا اس کے بعد لوٹ آیا اب آقا نے سوال کیا کہ میں نے تمہیں دودھ لینے کے لیے بھیجا تھا کیا تم دودھ لے آئے؟ غلام کہتا ہے کہ آقا میں دودھ تو نہیں لا سکا ہوں مگر میں نے آپ کا گھوڑا نہلا دھلا کر خوب صاف ستھرا کر دیا اور نہایت چمکا دیا ہے تو آپ خود فیصلہ کیجئے کہ یہ غلام انعام واکرام کا مستحق ہو گا یا تعزیر وتنبیہ کا؟ اور کسی جزا اور بدلے کا مستحق ہو گا یا سزا وملامت کا؟

ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آقا کے حکم کی فرمانبرداری نہیں کی جس کی وجہ سے ہر عقل مند آدمی یہی کہے گا کہ وہ سزا کا مستحق اور زجر وتوبیخ کے لائق ہے۔ آج ہمارا حال بالکل اسی طرح ہے خاص طور پر وہ مسلمان جو مغربی ملکوں میں رہ کر غیروں کے طریقوں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کو اپنے ظاہر کو روشن رکھنے اور صاف ستھرا بنانے کی تو فکر ہے لیکن باطن کی کوئی خبر نہیں اور اسی تکلف وتصنع میں اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ خرچ کر دینے کو انہوں نے اپنے ذہنوں میں انسانی تہذیب سمجھا ہے جبکہ انسان کا مقصد پیدائش خود ان کی نظروں سے اوجھل ہے اور وہ بالکل اس اوپر ذکر کردہ مثال میں اس ناسمجھ غلام کی طرح ہیں کہ اپنے آقا کے اصل حکم سے تو صرف نظر کر لیا جس کی خاطر اس کو گھوڑا دیا گیا تھا اور اس کی صفائی وستھرائی میں لگ گیا۔

سو یہ لوگ بھی اپنے اس مقصد کو تو بھول گئے جس کے ادا کرنے کے لیے ہمیں یہ جسم اور اس کے مختلف اعضاء بڑے مرتب اور منظّم شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے تھے اور مقصد سے ہٹ کر اس ظاہری جسم کو بنانے سنوارنے کی فکر میں رات دن لگ کر ساری عمر گزار ڈالی اور انہی ظاہری فکروں میں محو ہو کر رہ گئے بالآخر جب اپنے اللہ کی طرف واپس لوٹے تو ہمارا حال بالکل اس غلام کی طرح تھا جو اس گھوڑے کو چمکا کر آقا کے پاس لے آیا مگر آقا کا حکم پورا نہ کرنے کی وجہ سے مستحق سزا قرار پایا۔

اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس اس پر ہے کہ آج کا مغربیت زدہ مسلم جوان نہ صرف یہ کہ اپنی اس حالت کو غلط سمجھ کر اس کی اصلاح کی فکر کرتا بلکہ صورت حال اس سے زیادہ ابتر ہے کہ اسے اپنی اس حالت پر فخر اور گھمنڈ ہے اور وہ اپنے تہذیب یافتہ ہونے کا مدعی ہے جو کہ سراسر دھوکا ہے اور اپنے انجام سے بے خبری اور مقصد حیات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے وہ اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے اپنے مقصد

حیات کو جان لیا تھا اور دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہوگئے تھے وہ لوگ تکلف میں سب سے زیادہ کم تھے اور تصنع و بناوٹ سے بالکل پاک تھے اور ظاہری زیب و زینت کی فکروں سے ان کے قلوب خالی تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں ایسا ایمان تھا کہ جو مضبوط بلند پہاڑوں کی طرح ثابت اور راسخ تھا جس کی برکت سے سارے عالم میں انہیں عزت و سرخروئی نصیب ہوئی۔

﴿عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ فَاِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا اخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَ لِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى اٰثَرِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۳۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ارشاد فرمایا جس کو کوئی طریقہ اختیار کرنا ہو تو وہ اُن حضرات کے طریقے کو اختیار کرے جو دنیا سے اسلام اور ہدایت پر وفات پاچکے ہیں کیونکہ زندہ انسان پر فتنے میں مبتلا ہوجانے سے اطمینان نہیں کیا جاسکتا، اور وہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو اس پوری اُمت میں سب سے افضل ہیں، وہ دلوں کے اعتبار سے بہت زیادہ پاکیزہ تھے اور علم کے اعتبار سے بہت گہرائی والے تھے، اور اُن کی زندگیوں میں تکلف بہت ہی کم تھا، اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے منتخب فرمایا تھا لہٰذا تم دوسروں پر اُن کی فضیلت کو پہچان لو اور علم و عمل میں اُن کے نقشِ قدم کی اتباع کرو اور جہاں تک ہوسکے اُن کے اخلاق و عادات کو مضبوطی سے پکڑلو کیونکہ وہ لوگ راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر تھے۔

نہیں محتاج دردِ دل زباں کا
وہ خود ظاہر ہے اپنی چشمِ تر سے

جو مومن بندہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتا رہتا ہے تو یہ رونا خود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں اپنا دردِ محبت عطا فرمادیا ہے اسے زبان سے بولنے اور بتانے کی ضرورت نہیں، کتنا بھی ضبط کیا جائے لیکن وقتاً فوقتاً اہلِ دل کی آنکھوں سے خوفِ خداوندی کے نتیجہ میں آنسو بہہ پڑتے ہیں جو دل کی اندرونی حالت کی ترجمانی کرتے ہیں جیسا کہ سوفیصد اہل اللہ کی راتیں اسی حال میں گزرتی ہیں۔

''اگر، مگر'' دل میں شکوک وشبہات کے اندھیروں کا پتہ دیتے ہیں

اگر تو چاہتا ہے ان کی منزل
نکل خوف اگر خوف مگر سے

ارشادفرماتے ہیں کہ اے سالک اگر تجھے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا ہے یعنی اللہ کوراضی کر کے جنت کا مستحق بننا ہے تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پورا یقین اور مکمل اعتماد کر کے اللہ کی طرف فرار اختیار کر اور قوت وہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر اس راہ میں اگر اور مگر تمہیں چلنے سے باز نہ رکھے کیونکہ یہ دونوں لفظ ان لوگوں کا شیوہ اور عادت ہوتی ہے جو صرف آرزوؤں اور تمناؤں سے راستہ طے کرنا چاہتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے غیبی وعدوں پر پورا یقین اور اعتماد نہیں ہوتا ورنہ اعتماد و بھروسہ رکھنے والے لوگ اپنے ظاہری نفع ونقصان کی پرواہ کیے بغیر اور لوگوں کی ملامت وطعن وتشنیع سے صرف نظر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ ایک شادی شدہ شخص ناجائز اور حرام تدبیروں سے بچوں کی پیدائش کی کثرت سے بچنے کے طریقے اختیار کر کے اپنی تمنا پوری کرتا ہے اور جب اس کو کوئی اس برے عمل سے روکتا ہے تو وہ جواب میں یہ کہتا ہے کہ اگر میں یہ طریقہ اختیار نہ کروں اور اولاد کی کثرت ہو جائے تو ان کے معاش کا اور تعلیم وتربیت کا اور دوسرے بہت سے مسائل کا حل میرے ذریعے ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس کی اس غلط سوچ اور فکر پر جب کوئی اللہ کا بندہ اس کو سمجھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول کے وعدوں پر یقین دلاتا ہے تو وہ اپنی ایمان کی کمزوری اور اللہ کے وعدوں پر یقین کی کمی کو لفظ مگر کے ذریعہ اس طرح چھپاتا ہے کہ وہ یوں کہتا ہے۔

مولانا آپ کی بتائی ہوئی آیتیں اور حدیثیں اور ان میں کئے ہوئے وعدے تو اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں مگر میرا معاملہ یوں ہے، مگر میری صورت حال ایسی ہے، اگر میں آپ کی بات مان لوں تو بے شک درست اور صحیح ہے مگر میرے فلاں مسئلے کا کیا ہوگا، فلاں معاملے کا کیا ہوگا، تو غرض یہ کہ اس طرح مگر اور لیکن بول کر انسان محض دین پر عمل سے بچنے کے لیے حیلے اور بہانے تلاش کرتا ہے۔

احقر نے اس کی صرف ایک مثال پیش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین پر پورے طور پر عمل کرنے کی راہ میں اور منکرات اور گناہوں سے مکمل بچنے کی صورت میں زندگی میں قدم بقدم ایسے نازک موڑ آتے ہیں کہ جن میں سچے عاشق کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے اگر وہ اپنے دل میں یقین کی روشنی رکھتا ہو تو اس کے نور سے اسے صحیح راہ نظر آتی ہے اور وہ اس سے بال برابر بھی ہٹنا گوارا نہیں کرتا اور اگر اس کے دل میں شکوک و شبہات کے اندھیرے ہوں تو پھر وہ اگر مگر کے ذریعہ سے دین کی صحیح راہ سے نکل جاتا ہے اور اپنی منزل کھو بیٹھتا ہے۔

گو کہ اگر مگر کو سمجھنے کی مثالیں بہت ساری ہیں مگر ایک مختصر سی مثال اور عرض کیے دیتا ہوں جب جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں شرکت کے لیے صحابہ کرام سے اعلان فرمایا تو جو دل میں کامل ایمان رکھتے تھے اور انہیں اللہ کے وعدوں پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا تو وہ بلا چوں و چراں فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہہ کر میدان میں نکل آئے اور ان کو دنیوی و اخروی عزت و سرخروئی حاصل ہوئی۔ اس کے برخلاف جو منافقین تھے وہ اپنی اگر اور مگر میں لگے رہے مثلاً کہیں تو یوں کہتے:

﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ﴾

(سورۃ آل عمران، آیۃ: ۱۶۷)

ترجمہ: اور ان سے یوں کہا گیا کہ (میدانِ جنگ میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یا (ہمت نہ ہو تو گنتی ہی بڑھا کر) دشمنوں کی مدافعت کرنا (کیونکہ بہت سی بھیڑ دیکھ کر کچھ تو اُن پر رعب ہوگا اور اس سے شاید ہٹ جاویں) وہ بولے کہ اگر ہم ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گنے زیادہ پھر اُن کے پاس سامان بھی زیادہ ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑنا ہے۔

یعنی اگر ہم واقعی جانتے کہ کوئی جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے مگر چونکہ کوئی واقعی حقیقی با مقصد جنگ نہیں ہے اس لیے ہم تمہارے ساتھ نہیں جاتے اور اسی طرح کے دوسرے اگر مگر کا شکار ہو کر رہ گئے اور ان کے نفاق نے ان کو منزل پر پہنچنے سے روک دیا۔

اور ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس میں ابتلاء عام ہے مثلاً نماز با جماعت کا وقت ہے کوئی آپ کا دوست آپ کو آکے یہ سمجھاتا ہے کہ اس وقت نماز پڑھو اور دکان کو بند کر دو اگر چہ تمہاری دکان پر لاکھوں کے گاہک کھڑے ہوئے ہوں۔ اس کے جواب میں آپ یوں کہتے ہیں کہ اگر میں دکان بند کر دوں اور آپ کی بات مان لوں تو بے شک بہت اچھا ہے لیکن میرا یہ نقصان فلاں نقصان ہو جائے گا۔ جس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔

پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں جو لوگ اگر مگر کا شکار ہو کر رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کر کے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے بس اللہ کو پانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کے وعدوں پر پورا یقین کر کے راستہ پر قدم ڈال کر چلنا شروع کر دے چاہے بظاہر سامنے سے راستہ کھلا نظر آئے یا بند نظر آئے جب آپ چلتے رہیں گے خود بخود راستہ سامنے کھلتا جائے گا یہاں تک کے آپ اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

نسبت مع اللہ کا قلب پر ایک خاص اثر

ملا ہے جب سے لطفِ آہ صحرا
کہاں وہ ربط ہے پھر اپنے گھر سے

اللہ والے اپنی گھریلو حاجات اور ضروریات پوری تو ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ اس طرف جڑے نہیں ہوتے بلکہ اپنے دل سے ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں محو ہوتے ہیں اور انہیں صحرا و جنگل اور بیابانوں

میں رہ کر جہاں دنیوی مصروفیات سے ذہن بالکل فارغ اور خالی ہو زیادہ لطف اور مزہ آتا ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جس کے دل کی دنیا اللہ تعالیٰ کی خصوصی تجلیات کے ساتھ آباد ہو جاتی ہے پھر دنیا کی زیب و زینت میں اس کا دل لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لوگ پوری پوری عمریں اپنے گھروں اور بنگلوں کو خوب سے خوب تر کرنے میں خرچ کر دیتے ہیں اور اپنی عمر بھر کی صلاحیتوں کو دنیا کی فانی لذتوں کے حصول اور عیش وعشرت کو پانے کے لیے گنوا دیتے ہیں لیکن ایک صاحب نسبت اللہ والے کے دل کا رخ ہی کسی اور سمت میں ہوتا ہے جیسا کہ خود حضرت والا کا شعر ہے ؎

مجھے اس عالم صد رنگ و بو سے کیا مطلب
میری حیات تو بس آپ ہی کا اک غم ہے

جس کشتی کا ناخدا خود خدا ہے اسے طوفاں کا ڈر نہیں

خدا کے نور ہی سے دل ہے روشن
ستاروں سے نہ خورشید و قمر سے
اگر طوفاں کی زد میں ہے سفینہ
دعا مانگے خدائے بحر و بر سے

مومن کو کسی بھی حال میں مایوس نہیں ہونا چاہیے اگر وہ ناموافق حالات سے دوچار ہوتا رہے اور مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزرتا رہے تو مایوس ہو کر اللہ کے راستے میں چلنا نہ چھوڑ دے اگر کبھی گر پڑے تو پھر سے اٹھے کبھی کوئی خطا و چوک ہو جائے تو پھر سے اپنے اللہ کو پکارے ٹھیک ہے ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آج ہر طرف فسق و فجور اور ظلم و سرکشی عام ہو رہی ہے اور چاروں طرف فتنوں کا ایک طوفان ہے اور ہماری کشتی اس طوفان کی زد میں محسوس ہو رہی ہے تب بھی ہمیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خداوند قدوس جس کے قبضے میں بحر و بر ہے اسی کے قبضے میں ہماری یہ کشتی بھی ہے ہم اسی قادر مطلق اللہ کو پکارتے رہیں گے اور ان شاء اللہ اسی کی مدد سے بعافیت و سلامت طوفان سے نکل کر ہماری کشتی ساحل پر جا لگے گی اس لیے خواہ کیسے ہی ناخوشگوار حالات ہوں سالک کو گھبرا کر راستہ چھوڑنا نہیں چاہیے۔

بلکہ احقر اس سے آگے بڑھ کر ایک بات عرض کرتا ہے کہ جب کشتی کا ملاح کوئی طوفانی حالت سامنے دیکھتا ہے اور کشتی کے طوفان میں پھنسنے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے تو پھر اسے اور زیادہ مستعد (Alert) اور چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے تاکہ کشتی کو اس سے بچایا جا سکے لہٰذا آج کے زمانے میں معصیت و نافرمانی کا طوفان آیا ہوا ہے تو ہر دین کے چاہنے والے کو لازم اور ضروری ہے کہ وہ پورے طور پر خبردار اور متنبہ رہے تاکہ ہر لمحہ قدم بہ قدم اپنے دین

کے سفینہ اور کشتی کو طوفان سے مکمل طور پر بچایا جا سکے اور ساحل پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی جنتوں و نعمتوں میں مزے لوٹے اور ایسے موقع پر مومن کا متنبہ اور خبردار رہنا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے ایک لمحہ غافل نہ ہو اور ہر گھڑی اسی کو پکارتا رہے کیونکہ وہی ہر مشکل میں کام آنے والا اور ہر پریشانی سے نجات دینے والا اور ہر قسم کے فتنے سے بچانے والا ہے کوئی کتنی ہی مصیبتوں اور الجھنوں میں پھنسا ہوا ہو لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کو پکارے گا تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کو نجات عطا فرما دیں گے۔

ہر اک مجبور ہے آہ و فغاں پر
بیاں کرتا ہوں جب زخمِ جگر سے

یعنی جب سامعین میرا بیان سنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس میں کچھ ایسی تاثیر رکھی ہے کہ ہر سننے والا آہ و فغاں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ میں زبان محض سے بیان نہیں کرتا بلکہ میرا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے گھائل اور زخمی ہے میں تو بس اس زخم کو پیش کرتا ہوں تو جیسے کوئی شخص کسی درد میں مبتلا انسان کی باتیں سن کر اس کی حالت زار پر رحم کھاتا ہے اور اس کے درد میں شریک ہوتا ہے تو میں بھی چونکہ یہ زخمِ محبت کی شرح کرتے ہوئے زبان کھولتا ہوں تو سامعین آہ و فغاں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی نظر سے نسبت کی بارش

زباں سے تو بیاں کرتا ہے لیکن
ہوئی نسبت کی بارش بھی نظر سے

یعنی کوئی اللہ کا ولی جب بیٹھ کر بیان کرتا ہے تو سننے والے اس کی زبان سے کیا جانے والا بیان سنتے رہتے ہیں لیکن یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ اللہ والوں کی نظر میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ جو کافر کو مومن اور فاسق کو صالح بنا دیتی ہے اور عام مومنین پر وہ نظر پڑنے سے انہیں قلب میں نسبت مع اللہ محسوس ہونے لگتی ہے جیسا کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اَلْعَیْنُ حَقٌّ والی حدیث کی شرح کے تحت یہ بات لکھی ہے کہ جس طرح نظر بد برحق ہے اسی طرح نظر عارفین کی تاثیر بھی بالکل برحق ہے اور ایک سچی حقیقت ہے:

﴿فَاِنَّهٗ مِنْ حَیْثُ التَّاْثِیْرِ الْاَکْسِیْرِ یَجْعَلُ الْکَافِرَ مُؤْمِنًا وَّالْفَاسِقَ صَالِحًا وَّالْجَاهِلَ عَالِمًا وَّالْکَلْبَ اِنْسَانًا﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتابُ الطب والرقی، ج:۸، ص:۳۲۵ المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرّمۃ)

ترجمہ: عارفین کی نظر کی تاثیر اس قدر اکسیر ہے کہ جو کافر کو مؤمن اور فاسق کو نیک صالح اور جاہل کو اور کتے کو انسان بنا دیتی ہے۔

چھپاتا ہے وہ اپنا دردِ نسبت
مگر مجبور ہے اپنی نظر سے

اللہ تعالیٰ کا دردِ محبت اور خاص نسبت مع اللہ دل میں حاصل ہوتی ہے اور دل کے احوال و کیفیات مخفی چیز ہیں جو خود بخود ظاہر نہیں ہوتے اور عام طور پر اہل اللہ اپنے دل کے صحیح حالات کو لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ حتیٰ الامکان چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر بقول حضرت والا کہ نظر سے یہ دردِ نسبت ظاہر ہو جاتا ہے لوگ اس پر نظر ڈالیں یا وہ لوگوں پر نظر ڈالیں دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ عجیب وغریب تاثیر رکھ دیتے ہیں جو کہ مجبوراً ظاہر ہو جاتی ہے۔

غافل و ذاکر کی شام و سحر کا فرق

جو ان کی یاد سے غافل ہے اختؔر
ملے گا اس کو کیا شام و سحر سے

یعنی جو لوگ اپنے دنیا کے مشغلوں میں اس قدر مصروف ہیں کہ وہ اللہ کی یاد سے بالکل غافل ہیں تو ان کی شام وسحر اسی طرح غفلت میں گزر جاتی ہے اور قرب کے بجائے بعد ہوتا جاتا ہے لیکن اللہ والے زندگی کے ہر دن میں اور ہر دن کی شام وسحر میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے اور یاد کرتے ہیں جس سے ان کا قرب اور معرفت دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے اس لیے قرآن کریم کے اندر صبح شام کے ذکر کی خاص طور پر تلقین فرمائی گئی اور انہیں اوقات میں غذائے ارواحِ اولیاء کا خاص انتظام ہوتا ہے، اسی لیے تمام اہل اللہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہوئے صبح وشام کے یہ لمحات ذکر اللہ اور توبہ واستغفار اور تلاوت ومناجات میں خرچ کرتے ہیں احادیث شریفہ میں بھی شام وسحر کے مطابق خاص خاص دعاؤں اور اوراد و وظائف کا تذکرہ آیا ہے۔

میں پوچھوں گا شہیدوں کے لہو سے

کوئی پوچھے گلوں کے رنگ و بو سے　　میں پوچھوں گا شہیدوں کے لہو سے
وفا کی راہ مت پوچھو خرد سے　　مگر عاشق کی راہِ جستجو سے
ملی تاثیر بھی آہِ سحر کو　　کیا ہے رابطہ جب حق و ہو سے
نہیں ہوتی ہے تکمیلِ محبت　　مگر اے دوست خونِ آرزو سے
محبت ہو خدا کی یا نبی کی　　کوئی سیکھے صحابہ کے لہو سے
کہاں لگتا ہے دل ان عاشقوں کا　　انہیں مطلب ہے اپنی ہاؤ ہو سے
نہ پہنچا منزلِ عشقِ خدا تک　　لگایا جس نے دل کو غیر ہو سے
اگر رہنا ہے اختؔر ان کا بن کر　　لگانا دل نہ فانی خوبرو سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **خرد**: عقل۔ **تاثیر**: اثر کرنا۔ **آہِ سحر**: رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ **حق وھو**: اللہ تعالیٰ کا ذِکر۔ **تکمیل محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت مکمل ہونا۔ **خونِ آرزو**: اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل کی حرام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کر دینا یعنی انہیں پورا نہ کرنا۔ **لھو**: خون۔ **ھاؤ ھُو**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں اللہ کی محبت میں ڈوب کر کرنا یا اللہ تعالیٰ کا محبت کے ساتھ ذکر کرنا۔ **غیر ھو**: غیر اللہ۔ **خوبرو**: خوبصورت،حسین۔

وفا کی راہ خرد سے نہیں دیوانگی سے طے ہوتی ہے

کوئی پوچھے گلوں کے رنگ و بو سے
میں پوچھوں گا شہیدوں کے لہو سے
وفا کی راہ مت پوچھو خرد سے
مگر عاشق کی راہِ جستجو سے

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ بہت اونچا مضمون بیان فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو دنیا کو اپنا دل دئے ہوئے ہیں اور ان کو ہر طرح کی راحت وچین دنیا کے رنگ و بو میں نظر آتی ہے اور ایسی ہی جگہوں میں وہ چین وسکون کو تلاش کرتے پھرتے ہیں اور بظاہر کچھ وقتی لذت اور مزہ پاتے ہیں مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں جان دینے والے شہداء کے خون کے قطروں میں کچھ اور سبق مل رہا ہے میں جب شہیدوں کے لہو سے پوچھتا ہوں داستان کچھ اور ہی ہے مجھے یوں جواب ملتا ہے کہ اللہ کے نام پر اپنی جان قربان کرنے میں اور اس کی رضا کے لیے اپنی خواہشات نفسانیہ کا خون کرنے میں ہی سارا مزہ رکھا ہوا ہے، اسی لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہید کے خون کا قطرہ اور اللہ کے خوف سے ڈرنے والے کے آنسوؤں کا قطرہ یہ دو قطرے اللہ کو بہت پسند ہیں:

﴿لَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى اللهِ مِنْ قَطْرَتَيْنِ وَاَثَرَيْنِ قَطْرَةُ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ وَقَطْرَةُ دَمٍ تُهْرَاقُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾

(سننُ الترمذی، کتابُ فضل الجهاد عن رسول الله ﷺ، ج: ۱، ص: ۲۹۶)

اس کے خون کا رنگ بظاہر خون کا رنگ ہے لیکن اس کے اندر سے نکلنے والی خوشبو مشک کی خوشبو ہے تو اے دنیا کے پرستارو اور مادی عیش وعشرت کے دیوانو! تم اگر سچا مزہ اور لطف پانا چاہتے ہو تو ان سے پوچھو جنھوں نے دیوانہ وار راہ خداوندی میں چل کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ان کے خون سے یہ سبق سیکھو کہ لطف حیات کس چیز میں ہے تو یہی آواز آئے گی اور یہی جواب ملے گا کہ دنیا وآخرت کا لطف اور مزہ بلا چوں وچراں اپنے اللہ کے حکم پر جان لٹا دینے اور خواہشات کا خون کر دینے میں ہے اگر چہ عقل تمہارے لیے ہزار موانع اور رکاوٹیں راستہ طے کرنے کے سلسلے میں لا کر کھڑا کر دیگی لیکن اللہ کی ذات عالی سے دیوانہ وار تعلق ان سب رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوئے اپنے مولا پر فدا ہونے کا سبق دے گا اس لیے یہ راستہ اہل خرد کے لیے دشوار اور اہل جنوں کے لیے آسان ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ میں یہ سبق موجود ہے:

﴿قَالُوْا مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ﴾

(سورہ یٰس: ۱۵)

ترجمہ: وہ بولے تم تو یہی انسان ہو جیسے ہم اور رحمٰن نے کچھ نہیں اُتارا، تم سارے جھوٹ کہتے ہو۔

کہ جب انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کو دعوت دی تو کچھ لوگ تو عقلی دلیل پیش کر کے کہتے تھے کہ تم ہماری طرح ایک بشر ہی تو ہو ہم تمہیں کیوں بڑا تسلیم کر لیں اس طرح بظاہر یہ عقل مندی ان کے لیے وبال جان ہوئی اور جنھوں نے عقل کو پیچھے ڈال دیا اور عشق ومحبت کی راہ سے نبی پر نظر ڈالی ان کو ہر بات کا ماننا اور قبول کرنا آسان ہو گیا اس لیے یہ راہ وفا اہل وفا کی اداؤں کے ذریعہ سے طے ہوتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنے شیخ کے اوپر محض اپنی طرح اپنے انسان ہونے کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں تو وہ حقیقی نفع سے محروم رہتے ہیں۔

کیونکہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اَلشَّيْخُ فِيْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيْ اُمَّتِهٖ شیخ اپنی قوم میں اس طرح ہوتا ہے جیسے کہ نبی اپنی اُمت میں۔ یعنی باعتبار ادب واحترام اور اکرام وتعظیم کے شیخ کا وہی درجہ ہے جو نبی کا ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے تو باعمل علماء کو نبی کی نیابت عطا کی گئی ہے۔

رابطۂ حق اور تاثیرِ آہِ سحر

ملی تاثیر بھی آہ سحر کو
کیا ہے رابطہ جب حق و ہو سے

جب اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو پھر بندے کو وقت سحر کا انتظار رہتا ہے صبح ہی سے انتظار سحر شروع ہو جاتا ہے کہ وہ گھڑی کب آئے گی جب میں اپنے اللہ سے راز ونیاز کی باتیں کروں گا اور اس وقت کا خاص لطف اور کیف اسے دن بھر اس کی یاد پر بے قرار رکھتا ہے ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ جنت میں داخل ہونے کا آسان راستہ یہ ہے:

﴿اَیُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ﴾

(مشکاة المصابیح، کتاب الزکوة، باب فضل الصدقة)

ترجمہ: اے لوگو! سلام کو خوب پھیلاؤ اور عام کرو اور کھانا کھلاؤ اور رشتے جوڑو اور جب لوگ سوئے ہوں تم راتوں میں نمازیں پڑھو تو تم بسلامت وعافیت جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہی مضمون ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ جب لوگ اپنے بستروں میں سونے کے لیے لیٹ جاتے ہیں تو یہ بندہ اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا ہے اور مجھ سے فریاد کرنے لگتا ہے۔ اور یہ اُن تین شخصوں میں ہے جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں اور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَقَوْمٌ سَارُوْا لَیْلَتَهُمْ حَتّٰی اِذَا کَانَ النَّوْمُ اَحَبَّ اِلَیْهِمْ مِمَّا یُعْدَلُ بِهٖ نَزَلُوْا فَوَضَعُوْا رُءُوْسَهُمْ فَقَامَ اَحَدُهُمْ یَتَمَلَّقُنِیْ وَیَتْلُوْا اٰیَاتِیْ﴾

(سنن الترمذی، صفة الجنة عن رسول اللہ، باب ماجآء فی کلام الحور العین)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو رات میں سفر کرتے رہے یہاں تک کہ جب نیند اُن کو ہر مقابل شے سے زیادہ محبوب ہوگئی کہ جسے نیند کے برابر قرار دیا جاسکتا تھا یعنی میٹھی نیند ہر چیز سے زیادہ شیریں ہوگئی تو وہ اُترے اور انہوں نے اپنے سروں کو رکھا اور سو گئے لیکن اُن میں سے ایک کھڑا ہو کر میرے قرآن کی آیات پڑھ کر مجھ سے فریاد کرنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کی صفات میں قرآنِ پاک میں یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ وہ رات کو کم سوتے ہیں اور صبح سویرے سحر کے وقت استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت اپنے متقی بندوں کے لیے تیار کی ہے اور اُن کی صفات ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ **وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ** کہ وہ لوگ سحر کے وقت میں استغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر ابن کثیر میں ایک صحابی کے متعلق نقل فرمایا ہے کہ:

﴿سَمِعْتُ رَجُلًا فِی السَّحَرِ فِیْ نَاحِیَةِ الْمَسْجِدِ وَهُوَ یَقُوْلُ یَارَبِّ اَمَرْتَنِیْ فَاَطَعْتُکَ وَهٰذَا السَّحَرُ فَاغْفِرْلِیْ فَاِذَا هُوَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ﴾

(تفسیر ابن کثیر، ج: ۱، ص: ۳۷۱)

وہ سحر کے انتظار میں رہتے تھے اور جب سحری کا وقت آجاتا تو جلدی سے اٹھتے اور یہ کہتے **اَللّٰهُمَّ هٰذَا السِّحْرُ** اے اللہ! یہ سحری کا وقت ہے اور آپ نے قرآن میں یہ اعلان فرمایا کہ میرے متقی بندے وہ ہیں جو صبح سویرے اٹھ کر اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں تو میں بھی آپ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں میرے گناہوں کو معاف کردیں اور مجھے مستغفرین بالاسحار میں شامل فرمادیں۔

نہیں ہوتی ہے تکمیل محبت
مگر اے دوست خون آرزو سے

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ سے کامل اور سچی محبت اسی وقت شمار کی جاتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا جائے اور جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے ان سے مکمل پرہیز کیا جائے چاہے آرزوؤں اور تمناؤں کے خلاف کر کے ان کا کتنا ہی خون کرنا پڑے اور طبیعت پر بوجھ اور گرانی اٹھانی پڑے۔

محبتِ خدا اور رسول اور صحابہ کا خون

محبت ہو خدا کی یا نبی کی
کوئی سیکھے صحابہ کے لہو سے

اس شعر میں حضرت والا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیوں اور جاں نثاریوں کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آنے کے بعد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اشارہ ملتے ہی اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور کسی تامل اور چوں وچراں کے بغیر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینا ان کے لیے بالکل آسان کھیل تھا چنانچہ بے شمار غزوات اور جنگوں میں صحابہ کرام نے اپنی جانیں پیش کر کے اسلام کے اس باغ کو اپنے خون سے سیراب کیا ہے، اسی لیے قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بہت ساری جگہوں پر صحابہ کرام کی تعریف کی گئی ہے اور ان حضرات کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا سٹیفکیٹ (Certificate) بارگاہ خداوندی سے حاصل ہوا ہے ستر صحابہ کرام نے دامن احد میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اتنے محبوب اور پیارے ہیں کہ ان کی خاطر اپنی سب سے پیاری چیز یعنی جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔

ایک صحابی حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کو جب اللہ کے راستے میں زخم آئے اور اُن کی شہادت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے اللہ کے لیے جان دے دینے کو اپنی کامیابی سے تعبیر کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ کہ رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا جس میں ہمارے لیے ایک عظیم الشان سبق یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک کامیابی اور ناکامی کا معیار ان کی دنیا کا بننا اور بگڑنا نہیں تھا یا دنیوی لحاظ سے دشمن پر غالب آجانا ہی کامیابی نہیں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ آج کا مسلمان کامیابی اسی کو سمجھتا ہے جو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ مسلمان کے لیے کامیابی تو یہ ہے کہ اس کا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان ہو جائے یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر اس کی عزیز جان بھی اس راہ میں استعمال ہو جائے خواہ دنیا کے اعتبار سے غالب ہوں یا مغلوب فاتح وحکمراں ہوں یا محکوم ورعایا ہوں اور سلطنت وحکومت باقی ہے یا چھوٹے مگر اللہ کا حکم نہ چھوٹے اور نہ ٹوٹے اس لیے

حضرت والا نے فرمایا کہ خدا کی محبت اگر دیکھنی ہو یا محبت رسول سمجھنی ہو تو صحابہ کرام کے لہو سے پوچھ کر دیکھو۔

اللہ کے عاشقوں کا دل قیل وقال کی محفلوں میں نہیں لگتا

کہاں لگتا ہے دل ان عاشقوں کا
انہیں مطلب ہے اپنی ہاؤ ہو سے

بلاشبہ یہ ایک سچی حقیقت ہے محض تکلف اور بناوٹ کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے سچا اور صحیح تعلق رکھنے والے غیر اللہ کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتے اور وہاں ان کا دل نہیں لگتا ہے جیسا کہ آج کل کے جوان کہیں کرکٹ (Cricket) کا میچ ہو، یا سوکر (Soccer) یا اور دوسری قسم کے دنیا کے کھیل تماشے ہو رہے ہوں تو یہ جوان ان جگہوں میں خوب مست رہتے ہیں مگر اللہ والوں کے لیے یہ سب جگہیں ان کا دل لگنے کی نہیں ہیں وہ تو ان سب کو فضولیات قرار دیتے ہیں اور انہیں ان سے وحشت ونفرت اور دوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں انہیں اپنے محبوب کا قرب میسر نہیں آتا ہے۔

اسی لیے اہل اللہ کی ایک شان یہ ہوتی ہے کہ وہ لہو ولہب میں تو کیا محض بے فائدہ باتوں اور کاموں سے بھی دور رہتے ہیں۔ چنانچہ میرے شیخ حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سالک کے لیے لایعنی قول وفعل سے بچنا از حد ضروری ہے جس کی آسان ترکیب یہ ذکر فرمائی ہے کہ جب بھی کوئی بات کرنی ہو یا کوئی کام انجام دینا ہو تو یہ غور وفکر کرے کہ اس میں میرا دینی یا دنیوی نفع کا حصول یا ضرر کا دفع ہو رہا ہے یا نہیں بس یہی معیار ہے اس کے لغو ہونے کو سمجھنے کا اگر اس میں کسی قسم کا دینی یا دنیوی نفع ہو رہا ہو یا دینی یا دنیوی ضرر دفع ہو رہا ہو تو اس کو کر گزرے ورنہ سمجھ لے کہ اس کا یہ قول وعمل لغو وبے کار ہے اس سے اعراض کرے جب انسان سوچ کر کرنے کا عادی ہو جائے گا اور اپنا یہ مزاج بنا لے گا کہ پہلے سوچوں پھر کروں نہ کہ پہلے کروں پھر سوچوں تو ان شاء اللہ بہت جلد فضول اور لغو باتوں اور کاموں سے محفوظ ہو جائے گا جس کا آج کل عام طور پر عوام وخواص سبھی شکار رہتے ہیں اور اس کا چھوڑنا طبیعتوں پر بڑا دشوار ہوتا ہے لیکن اگر حضرت کے اس نسخے پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ بہت جلد اس مرض سے نجات مل جائے گی۔

اور یہ مومن کا بہت بڑا وصف ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے لاکھوں ذخیرۂ حدیث میں سے اپنے بیٹے حماد کو خاص وصیت کے طور پر عمل کے لیے جن پانچ حدیثوں کا انتخاب کیا تھا ان میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے۔ جیسا کہ وصایا الامام الاعظم کے صفحہ:۶۴ پر ہے کہ:

﴿وَالتَّاسِعُ عَشَرَ اَنْ تَعْمَلَ بِخَمْسَةِ اَحَادِيْثَ جَمَعْتُهَا مِنْ خَمْسَةِ الْاٰفِ حَدِيْثٍ
وَمِنْهَا مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، ج:۲، ص:۳۰۵)

یعنی انسان کے اسلام کی خوبی سے یہ بات ہے کہ وہ تمام بے کار اور لایعنی قول وعمل سے دور رہے اور اس کو چھوڑ دے اور صحیح تو یہ ہے کہ جب کسی کو اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات عالی کے ساتھ گہرا تعلق قائم ہوجائے گا تو اسے اس میں ایسا لطف اور مزہ حاصل ہوگا کہ پھر اس کا دل لایعنی اور فضول کاموں میں لگے گا ہی نہیں اور ادھر ادھر قیل وقال کی محفلوں میں اسے مزہ ہی نہیں آئے گا اور اگر کبھی وہ اس طرح کی مجلسوں میں الجھ جائے تو اندر اندر گھٹتا اور کڑھتا رہے گا لیکن دل میں اسے قرار میسر نہیں آئے گا بس اس کا دل ایسی مجلسوں میں شاداں اور فرحاں رہے گا جہاں کچھ اللہ والے اپنے مولیٰ کی یاد میں مست ہوں یا خلوت ویکسوئی کے ساتھ تلاوت وذکراللہ کا شغل ہو اور بس یہی پہچان ہے نسبت مع اللہ مل جانے کی ورنہ جب تک آدمی قیل وقال کی مجلسوں میں مزہ پاتا رہتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ابھی اس کے قلب میں تعلق مع اللہ کی پوری حلاوت پیدا نہیں ہوئی ہے جیسا کہ حضرت شاہ احمد پرتا بگڈھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

نہیں رہتے ہیں ہم کیوں چاہیے ہم کو جہاں رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہاں رہنا وہاں رہنا

دل کو غیر اللہ سے لگانا، بہت بڑی رکاوٹ ہے

نہ پہنچا منزلِ عشقِ خدا تک
لگایا جس نے دل کو غیر ہو سے

ہمارے کلمۂ توحید کی بنیاد ہی اس پر قائم ہے کہ غیرحق تعالیٰ کو مکمل طور پر اپنے دل سے نکال کر باہر کردیں تب اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق قائم ہوگا۔ کفار ومشرکینِ مکہ نے عقیدہ کے درجہ میں عبادت اور نفع وضرر وغیرہ کے معاملات میں دوسروں کو حق تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا اور غیراللہ، اصنامِ باطلہ سے دل لگایا تو وہ مشرک قرار پائے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوگئے۔ لیکن مومن بندہ وہ اس درجے میں تو نہیں مگر جس درجے میں بھی غیروں سے دل لگا کر رکھے گا اتنے ہی درجے عشقِ خداوندی میں کمی باقی رہے گی اور وہ اللہ سے دور رہے گا جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَآءِ عَنِ الشِّرْکِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَکَ فِیْہِ مَعِیْ غَیْرِیْ تَرَکْتُہٗ وَشِرْکَہٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب من اشرک فی عملہ غیر اللہ)

یعنی میں اتنا بے نیاز ہوں کہ تم نے جن شرکاء کو میرا شریک ٹھہرا رکھا ہے ان سب میں سب سے زیادہ بے نیاز ہوں اور میں شریک ٹھہرانے والوں کو ان کے شرکاء پر چھوڑ دیتا ہوں میں اپنے ساتھ کسی کی معیت گوارہ نہیں کرتا ہوں۔

حضرت جنید بغدادی کا ایک قصہ

صاحبو! جب ایک بیوی اپنے شوہر کے لیے یہ گوارہ نہیں کرتی کہ میرا شوہر کسی دوسری عورت سے شادی کر کے میرے ساتھ محبت میں کسی کو شریک کرلے اگر آپ اس سے پوچھ کے دیکھو تو آپ کو یہی جواب ملے گا کہ پہلے مجھے دنیا سے رخصت کردو پھر ایسی سوچ دل میں لاؤ۔

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا ایک قصہ خطبات مسیح الامت میں مذکور ہے کہ ایک عورت ان کے پاس آئی اور ان سے عرض کرنے لگی کہ میرا شوہر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے تو حضرت نے اس سے فرمایا کہ پھر کیا بات ہے مرد کو تو دوسرے نکاح کی اجازت ہے۔ اس پر اس عورت نے سرد آہ بھری اور کہا کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں اپنا نقاب اٹھا کر تم کو اپنا چہرہ دکھاتی اور پوچھتی کہ جب مجھ جیسی عورت کسی کے نکاح میں ہو تو کیا اس کو دوسری طرف نظر کرنا چاہیے۔ اس میں اس نے اپنے حسن و جمال کی طرف اشارہ کیا۔ جب حضرت جنید نے یہ سنا تو غش کھا کر گر گئے۔ کسی بے تکلف نے پوچھا کہ حضرت آپ کو یہ حال کیوں آیا تو فرمایا کہ اس عورت کے اس کہنے پر مجھے حدیث یاد آگئی، حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندو! اگر تم کو میرا دیکھنا ممکن ہوتا تو تم کو دکھا کر پوچھتا کہ جس کا مجھ جیسا خدا ہو کیا اس کو دوسرے کی طرف نظر کرنا روا ہے؟ (خطبات مسیح الامت، جلد:۱، صفحہ:۱۰۲)

آہ! اس عورت کو اپنے حسن پر اتنا ناز ہے کہ وہ فخر سے کہتی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے میرے شوہر کو دوسری شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہیے تو غور کرو اور سوچو کہ ہمارا اللہ اس قدر حسن و جمال والا اس اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کو مانتے ہوئے ہم ان دنیا کی حسین اور حسیناؤں پر اپنا دل دینے کی باتیں کریں تو یہ کس قدر بے غیرتی کی بات ہوگی کاش کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال کو پہچان جاتے تو پھر ان مردہ حسینوں پر کبھی نہ مرتے ایک عورت کے حسن کو تو کیا نسبت۔ ابتدائے دنیا سے لے کر قیامت تک آنے والی ساری حسین عورتوں کا حسن اور جنت کی تمام حوروں کا حسن اور جتنی روئے زمین پر حسین شکلیں اور صورتیں ہیں ان سب کا حسن اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال کے مقابلہ میں کوئی نسبت نہیں رکھتا جس نے ان ساری چیزوں کے مجموعہ کو حسن بخشا ہے انہیں حسن عطا کیا ہے تو خود اس کے جمال کا کیا عالم ہوگا۔

واللہ حقیقت تو یہی ہے کہ اگر ہماری بصیرت کی آنکھ کھل جائے اور پھر ہم اللہ کے حسن و جمال کا مشاہدہ کر لیں تو سارے غیر اللہ کو بھول جائیں گے مگر چوں کہ ہماری دل کی بینائی سلب ہو چکی ہے اس لیے ہم اپنے خالق پر فدا ہونے کے بجائے مخلوق کے فانی اور عارضی حسن پر فدا ہو رہے ہیں۔

دیدارِ خداوندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے

جب قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ جنتیوں کو تمام نعمتیں اور آرائشیں اور حور وقصور دے چکے ہوں گے تو

پھر حق تعالیٰ اہل جنت سے سوال کریں گے کہ کسی اور نعمت کی تمہیں تمنا ہے تو اہل جنت بارگاہ خداوندی میں عرض پیرا ہوں گے کہ یا اللہ! آپ نے تو ہر طرح کی نعمتیں عطا فرمادیں اور ہر قسم کا عیش و آرام عطا کر دیا ہے تو اب مزید اور کون سی نعمت باقی ہے جس کی ہم تمنا کریں تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے اور بندے کے درمیان سے حجابات ہٹا دیں گے۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہو چکیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے خطاب فرمائیں گے کہ کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ، ہم اس کو پورا کریں گے۔ اہلِ جنت جواب دیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کیے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں۔ اس وقت درمیان سے حجاب اُٹھا دیا جائے گا اور سب اہلِ جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو رب العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی۔ بقول مولانا رومی رحمہ اللہ ؎

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود
لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

اور پھر اہل ایمان اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور اس دیدار کا یہ اثر ہوگا کہ جنتی اس نعمت دیدارِ خداوندی کے سامنے جنت کی ساری نعمتوں کو بھول جائیں گے جس کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾

(سورة يونس، اية: ۲٦)

کہ جو لوگ صفت احسان سے متصف تھے اور نیکو کار تھے ان کے لیے جنت ہے اور مزید ایک نعمت ہے اور وہ اللہ کا دیدار ہے بھلا حوروں کو حسن بخشنے والا اور چاند کو چاندنی اور خوبصورتی عطا کرنے والا اللہ جب اپنا دیدار کرائے گا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور نعمت کا ذہن میں خیال باقی رہے اس لیے چند دن کی بات ہے ہر ایمان والے کو اپنی نگاہوں کو غیر حق تعالیٰ سے محفوظ رکھنا چاہیے ان شاء اللہ عنقریب جب دنیا سے روانہ ہوں گے تو پھر مزے ہی مزے سامنے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی محبت اور فانی خوب رو کی محبت جمع نہیں ہوسکتی ہے

اگر رہنا ہے اختؔر ان کا بن کر
لگانا دل نہ فانی خوبرو سے

یہ مضمون کثرت سے حضرت والا کی کتابوں میں مذکور ہے اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ آج کل یہ بیماری ایک وبائی مرض کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور سالکین کے اکثر خطوط دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نوے بلکہ پچانوے فیصد سالکین اس مہلک اور خطرناک مرض میں مبتلا ہوکر بے چین و پریشان رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے محبت چاہنے کی وجہ سے اس سے چھٹکارے کے متلاشی ہوتے ہیں تو اس شعر میں بھی حضرت والا یہ بات ارشاد فرمارہے ہیں کہ اگر واقعی پورے طور پر اللہ کا بندہ بننا ہے تو کسی فانی خوبصورت شکل والے سے دل مت لگانا گویا کہ دلیل بھی خود شعر میں مذکور ہے کہ جب کائنات کے ہر حسین کا حسن فانی ہے اور اسے مٹ کر ختم ہوجانا ہے تو پھر یہ نادانی اور جہالت ہے کہ ایسے مٹنے اور فنا ہونے والوں پر دل دے کر اپنے آپ کو فنا اور ختم کردینا۔

یہ ایک اہم بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضرت والا نے خوبرو کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی حسین عورت ہی ہو یا حسین امرد بے ریش لڑکا ہی ہو بلکہ اگر ایسا بھی کوئی لڑکا ہو جس کے چہرے پر کچھ ڈاڑھی کے بال اُگ آئے ہوں مگر اس سے باتیں کرنے میں نفس کو مزہ ملتا ہو اور اس کو دیکھنے میں طبیعت کی رغبت ہوتی ہو تو پھر ایسی شکلوں سے دور رہنا بھی لازم اور ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق یہ بات تحریر فرمائی ہے:

﴿ فَاِنَّ بَعْضَ الطَّبَائِعِ يُقَدِّمُ ذَا اللِّحْيَةِ الْقَلِيْلَةِ عَلَى الْاَمْرَدِ الْحَسَنِ ﴾

(رد المحتار)

یعنی کہ بعض خبیث طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو تھوڑی داڑھی نکلے ہوئے لڑکے کے ساتھ محبت کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے اور اس سے میل جول رکھنے میں طبیعت کا زیادہ میلان ہوتا ہے بس جس سے بات کرنے میں دل کا میلان ہوتا ہو اور قلب پر گندگی اور ظلمت محسوس ہونے لگے تو سمجھ لو کہ یہ تعلق چھوڑ دینے کے قابل ہے ورنہ اس میں بڑی ہلاکت اور خسارہ ہے۔ جس کو حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے بڑے درد بھرے انداز سے اس طرح فرمایا:

''جس مرد سے اگر چہ وہ امرد نہ ہو گفتگو میں اس کی آواز اور اس کے نقشے اور چہرے سے اور آنکھوں سے نفس کو لطف ملنا شروع ہو فوراً اس سے ہٹ جائے اور پھر یوں ارشاد فرمایا کہ غیر محرم عورت یا مرد (خوبصورت لڑکا) سے کسی قسم کا تعلق رکھنا خواہ اس کو دیکھنا یا اس سے دل خوش کرنے کے لیے ہم کلام ہونا یا تنہائی میں اس کے پاس بیٹھنا یا اس کے پسند طبع کے موافق اس کے خوش کرنے کو اپنی وضع یا کلام کو آراستہ یا نرم کرنا یعنی آواز میں عورتوں کی سی لچک اس کو بہلانے پھسلانے کے لیے، مائل کرنے کے لیے پیدا کرنا میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اس تعلق سے جو جو خرابیاں پیدا

ہوتی ہیں اور جو جو مصائب پیش آتے ہیں احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔ (روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج، صفحہ:۶)

اجنبیہ سے خلوت کے لیے خوبصورتی شرط نہیں ہے

یہاں احقر مناسب سمجھتا ہے کہ شریعت کے ایک اہم مسئلے پر تنبیہ کرے جس سے عام طور پر غفلت برتی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی عورت غیر محرم ہو اور وہ خوبصورت نہ ہو تب بھی اس عورت سے حجاب اور پردہ کرنا اور دور رہنا از روئے مسئلہ لازم اور ضروری ہے اور اس کے ساتھ بھی اختلاط اور میل جول کرنا اور تنہائی اختیار کرنا بالکل ناجائز ہے ورنہ بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے اور ہم نے کئی واقعات ایسے دیکھے ہیں کہ احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے باہم مرد و عورت میں عشق پیدا ہوگیا اسی لیے جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب النكاح، باب النظر الى المخطوبة، ص: ۲۶۹)

کہ کسی مرد کو کسی عورت کے ساتھ تنہائی ہرگز اختیار نہیں کرنی چاہیے ورنہ ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے تو اس موقع پر خوبصورت یا بدصورت ہونے کی کوئی تفصیل نہیں ہے خواہ کوئی بھی غیر محرم عورت ہو اس کے ساتھ تنہائی کو منع قرار دیا گیا ہے۔

صاحبو! جب ایسی صورت میں وہاں شیطان موجود ہوتا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ شیطان ہمارا دشمن ہے دوست نہیں ہے تو پھر غور فرمائیں کہ وہ اپنی دشمنی نکالنے میں کوئی کسر چھوڑے گا؟ نہیں! بالکل نہیں وہ اپنی پوری دشمنی نکالے گا تو دشمن کو دشمن سمجھنا عقل مندی ہے اور اس سے بچنا اور دور رہنا سلامتی کا راستہ ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾

(سورة يوسف، اٰية:۵)

ترجمہ: بلاشبہ شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

اور ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾

(سورة فاطر، اٰية:۶)

ترجمہ: بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن سمجھو۔

قربان جائیں ہم اپنے پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ ہم کو ہمارے دشمن کی بھی خبر دے دی اور دشمن سے بچنے کا راستہ بھی بتادیا اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو مان کر اس دشمن سے کتنا بچتے ہیں اسی لیے احقر تو یہاں تک عرض کرتا ہے کہ جو ہمارے ملک جنوبی افریقہ میں گھروں

میں کام والی آیا کرتی ہیں ان کے ساتھ بھی مرد کو گھر میں خلوت کی صورت میں نہیں رہنا چاہیے جب بیوی یا بچے موجود ہوں تو ان کو گھر میں کام کرنے دے اور اگر کسی وجہ سے گھر میں کوئی موجود نہ ہوں تو پھر یا تو اس کی چھٹی کردے اور یا جب تک وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو تو خود کو گھر سے باہر کسی کام میں مشغول رکھے۔

بلکہ بقول ہمارے حضرت والا تقویٰ والی صورت اختیار کرے کہ اس کی مکمل چھٹی کر دے ورنہ چونکہ قدرت کا تعلق ضدین سے ہوتا ہے تو جس طرح آپ اس پر قادر ہیں کہ گھر سے باہر بیٹھے رہیں تو یہ بھی آپ کی قدرت میں ہے کہ گھر کے اندر چلے جائیں اس لیے افضل پر عمل کرے اور مستقل طور پر جب تک آپ کے اہل و عیال گھر میں نہ ہوں تو اس کی چھٹی کر دے لیکن ایسی صورت نہ ہونے دے کہ بند مکان کے اندر پورے گھر میں اس کے ساتھ تنہا موجود ہو۔ ورنہ یاد رکھئے کہ ایسی صورت میں شیطان خطرناک دشمن کی موجودگی ہمارے ایمان کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے اگر چہ عامۃً طبیعتیں ان کی طرف راغب نہیں ہوتی مگر ہمیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانتے ہوئے ایمان کی حفاظت کے لیے بھرپور تدبیر اختیار کرنی چاہیے ورنہ کئی مرتبہ ایسا دیکھا گیا کہ بعض لوگ ایسے چہروں پر عاشق ہو گئے جن کی طرف عامۃً طبیعتوں کی رغبت نہیں ہوتی عشق و محبت تو بہت دور کی بات ہے مگر پھر بھی شیطان نے ان کو اس جال میں پھنسا دیا اس لیے ہمارے ایمان کا اصل تقاضہ یہی ہے کہ ہم زیادہ علتوں اور حکمتوں کے پیچھے نہ پڑیں بلکہ آنکھ بند کر کے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر بھرپور اعتماد اور یقین رکھتے ہوئے ان باتوں کو تسلیم کریں۔

مجھے اس موقع پر اسی مضمون سے ملتی جلتی ایک حدیث شریف یاد آ رہی ہے اور اس سے متعلق ایک عبرت آموز قصہ جو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

﴿إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُسَافِرِ امْرَأَةٌ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ﴾

(صحيح مسلم، كتاب الحج، سفر المرأة مع محرم الى حج وغيره)

ترجمہ: کسی عورت کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے مگر جب کہ اس کے ساتھ کوئی اس کا محرم موجود ہو۔

یہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدار سفر شرعی تنہا طے کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ اب اصل ہمارے ایمان کا مقتضا یہ ہے کہ ہم اس کو بلا چوں و چرا قبول کر لیں اور اس کی حکمتوں کے تلاش کرنے میں نہ پڑ جائیں مگر جو لوگ عقل کو اپنا مقتدا سمجھتے ہیں اور ہر چیز کی عقلی دلیل اور حکمتیں تلاش کرتے ہیں تو ان کو اس راہ میں بڑی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جہاز میں عورت کے تنہا سفر پر ایک عبرت ناک قصہ

چنانچہ اسی کے اوپر احقر کو ایک قصہ یاد آیا کہ ایک جوان لڑکی جہاز میں سفر کر رہی تھی جس کو آج کل لوگ اپنے ذہن میں بالکل (Safe) اور محفوظ سمجھتے ہیں۔ بہر حال صورت یہ پیش آئی کہ وہ جہاز میں جس کے پاس بیٹھی تھی

اس نے اس سے بات چیت شروع کر دی اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد مزید گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اس لڑکی نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے اس لڑکے سے اس کی مالی حالت دریافت کی تو اس نے ایسے ہی فرضی اور جھوٹ اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اس سے کہنے لگا کہ میری ساؤتھ افریقہ میں (Takkies Shoes) کی کمپنی ہے اور مجھے زیادہ تر اپنی تجارت کے سلسلہ میں بیرونی ممالک کے سفر واسفار پر رہنا پڑتا ہے اور اس طرح باتوں باتوں میں اس لڑکی کے ذہن میں عجیب وغریب نقشہ اس کے متعلق قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر وغیرہ بھی لے لیے اور دونوں اپنے اپنے وطن پہنچ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد اس لڑکی نے ادھر فون کرنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خیر اس لڑکے نے ٹال مٹول کر دی اور اس مصیبت سے اپنے کو بچالیا۔

پھر اتفاق سے یہ لڑکا ایک مرتبہ سفر کرتے ہوئے اس ملک میں پہنچا جہاں کی وہ لڑکی رہنے والی تھی اور حسن اتفاق یہ کہ جو اس لڑکے کے میزبان تھے ان کے اور اس لڑکی کے والد کے آپس میں تعلقات تھے تو اس مہمان کے دو چار دن قیام کے دوران ایک دن ان کو دعوت کے لیے اس لڑکی کے والد اپنے گھر لے گئے۔ یہ صاحب جب گھر میں داخل ہونے لگے تو اس لڑکی کی ان پر نظر پڑی تو جیسے ہی ان کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ان کو دیکھتے ہی فوراً کہا کہ تم تو وہی ہو جن سے میری ملاقات جہاز میں ہوئی تھی، اب یہ لڑکا سب کے سامنے نہایت شرمندہ اور رسوا ہوا۔ وقتی رسوائی سے بچنے کے لیے اس نے برجستہ یہ جھوٹا جواب دیا کہ بہن ایسا نہیں ہے، تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب اس نے پوری ملاقات کی تفصیل بتائی اور اس کے کاروبار وتجارت کے متعلق معلومات ذکر کی تو انہوں نے فوراً جھوٹ پر ایک جواب تیار کر کے کہا کہ او ہو! تم کو دھوکا ہو گیا ہے، ہم دو جڑواں بھائی ہیں اور وہ میرا بھائی ہے جو بہت زیادہ سفر واسفار کرتا ہے، اسی کی وہ سب تجارتیں ہیں، میں وہ شخص نہیں ہوں۔ اور یہ قصہ خود صاحبِ قصہ نے احقر کو سنایا اور ان کا مقصد محض ایک مزاح کرنا تھا لیکن شرعی طور پر ایسے مزاح حرام ہیں۔

صاحبو! اس قصہ میں غور کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات خواہ ہمیں اس کی حکمت ووجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے بلا چوں وچراں قبول کر لینی چاہیے۔ جو لوگ اس نقطے سے غافل ہیں وہ زندگی بھر بے چین وپریشان رہتے ہیں اور ساری عمر اپنی منزل تلاش کرنے کے باوجود انہیں منزل نہیں ملتی۔

نئے جام و مینا عطا ہو رہے ہیں

جو ہر دم خدا پر فدا ہو رہے ہیں
وہ فانی بتوں سے جدا ہو رہے ہیں

وہ خمرِ کہن تو قوی تر ہے لیکن
نئے جام و مینا عطا ہو رہے ہیں

کبھی قلب دے کر کبھی جان دے کر
رہِ عشق میں با وفا ہو رہے ہیں

خوشی اپنی ان کی خوشی پر لٹا کر
ہم اب اہل صدق و صفا ہو رہے ہیں

کبھی پی رہے ہیں لہو آرزو کا
مٹا کر خودی با خدا ہو رہے ہیں

تجھے ہو مبارک یہ اشکِ ندامت
نئے باب الفت کے وا ہو رہے ہیں

یہ شانِ کرم ہے کہ نالائقوں پر
کرم ان کے ہر دم عطا ہو رہے ہیں

محبت کی اختؔر کرامت تو دیکھو
کہ سلطان ہو کر گدا ہو رہے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **بتوں**: بت کی جمع، مراد تمام نامحرم خواتین اور وہ لڑکے جن کی طرف جنسی میلان ہوتا ہو۔ **خمر کھن**: پرانی شراب۔ **قوی تر**: طاقتور۔ **جام و مینا**: شراب کا پیالہ اور بوتل۔ **قلب**: دل۔ **رہِ عشق**: اللہ تعالیٰ کے عشق کا راستہ۔ **اھل صدق**: اللہ تعالیٰ کی محبت اور اخلاص کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنا۔ **صفا**: دل کا روحانی بیماریوں سے پاک ہونا۔ **لھو آرزو**: دل کی حرام خواہشات کا خون پینا۔ **خودی**: خود کو کچھ سمجھنا۔ **اشکِ ندامت**: ندامت کے آنسو۔ **باب**: دروازہ۔ **الفت**: محبت۔ **وا**: کھلنا۔ **سلطان**: بادشاہ۔ **گدا**: فقیر۔

جو خدا پر فدا وہ فانی بتوں سے جدا

جو ہر دم خدا پر فدا ہو رہے ہیں
وہ فانی بتوں سے جدا ہو رہے ہیں

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرنا اور اللہ کے ہر حکم پر ہر لحہ فدا ہونا اور جان دینا یہ بندے کو اللہ سے قریب بلکہ قریب تر کر دیتا ہے اور جس قدر بندہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اتنا ہی فانی بتوں (حسین، حسیناؤں سے) دور اور علیحدہ ہو جاتا ہے اور جو لوگ ہمت کر کے اپنی ناجائز خواہشوں کو پامال نہیں کرتے بلکہ ان کو بھی پوری کرتے رہتے ہیں کہ کبھی نظر بازی کر لی کبھی غیبت کر لی کبھی جھوٹ بول دیا وغیرہ وغیرہ تو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ سے درمیانی درجہ کا تعلق تو رکھتے ہیں لیکن ان لوگوں میں فدا ہونے والی شان نہیں ہے تو پھر ان کے دلوں سے ان فانی بتوں کی محبتیں رخصت نہیں ہوتیں بلکہ ان کے دل ان کی محبتوں میں اٹکے رہتے ہیں لہٰذا اس شعر میں ہمیں راستہ بتا دیا گیا ہے کہ سب کچھ اپنے اللہ پر قربان کرنا سیکھ لو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہمت کو استعمال کرو تو یہ سارا غیر غبار کی طرح ہو کر فضا میں اڑتا نظر آئے گا۔

شرابِ محبت خداوندی کا نشہ دن بدن بڑھتا رہتا ہے

وہ خمرِ کہن تو قوی تر ہے لیکن
نئے جام و مینا عطا ہو رہے ہیں

اللہ تعالیٰ نے جو ایمان بندہ مومن کے قلب میں رکھا ہے اور اس کی برکت سے اسے محبت خداوندی کا انعام ملا ہے وہ خود انسان کو اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلنے کے لیے مست و دیوانہ کرنے والا ہے مگر جب آدمی مجاہدات کرتا ہے اور گناہوں سے بچنے میں مشقتیں سہتا ہے تو ہر قدم پر اسے خاص قسم کا لطف اور عجیب قسم کی ایمانی حلاوت نصیب ہوتی ہے اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ مرتے دم تک قائم رہتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ ہر دن و ہر گھڑی اپنے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کے سامنے آہ وزاری کرنے میں اپنے مقام قرب کو مزید سے مزید پاتے ہیں اور تجلیات قرب میں دن بدن اور لحہ بلمحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی لیے اللہ والے اپنی ہر پچھلی حالت کو اگلی حالت کے مقابلے میں غفلت سے بھری ہوئی تصور کرتے ہیں اور اس پر ہر آن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نادم و پشیمان ہو کر تائبانہ حاضر رہتے ہیں جس کی بدولت ان پر حق تعالیٰ کا خصوصی فضل شامل حال رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی محبت کے مزید جام و مینا عطا فرماتے رہتے ہیں۔ اور جس طرح شراب جتنی پُرانی ہوتی ہے اتنا ہی اس میں نشہ بھی زیادہ ہوا کرتا ہے۔ بس اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کی شرابِ کہن بھی بڑی قوی تر ہوتی ہے۔

کبھی قلب دے کر کبھی جان دے کر
رہِ عشق میں باوفا ہو رہے ہیں

اگر ضرورت پڑے تو اللہ کے یہ عشاق راہ خداوندی میں اپنی جانیں لے کر حاضر ہو جاتے ہیں اور اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کر کے بارگاہ رب العزت میں باوفا اور سچے قرار پاتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾

(سورۃ الاحزاب، اٰیۃ: ۲۳)

ترجمہ: ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اُترے پھر ان میں بعضے تو ایسے ہیں کہ جو اپنی نذر پوری کر چکے، مطلب یہ کہ شہید ہو چکے اور اخیر دم تک منہ نہیں موڑا۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۹۸)

اور جب اللہ تعالیٰ کے لیے دل دینا پڑتا ہے تو پھر اپنے دل کو پیش کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ دل میں صرف ایک اکیلے اللہ کو رکھتے ہیں اس کے غیر کو دل میں جگہ نہیں دیتے اور اگر دل میں غیر کی طرف کچھ میلان نظر آتا ہے تو اسے اللہ کے لیے قربان کر دیتے ہیں جو لوگ زبانی محبت کے دعوے دار ہوتے ہیں مگر ساتھ ساتھ نفسانی حرام

خواہشات کے تقاضے بھی پورے کرتے رہتے ہیں تو یہ اللہ کے باوفا بندے نہیں ہیں۔

اہلِ صدق وصفا کون لوگ ہیں

خوشی اپنی ان کی خوشی پر لٹا کر
ہم اب اہل صدق و صفا ہو رہے ہیں

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ مومن بندے کی اپنی خوشی درحقیقت علیحدہ سے کوئی ہے ہی نہیں اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ خوش ہوتے ہیں انہی باتوں میں اس مومن بندے کی بھی خوشی ہے اور جو اللہ رب العزت کو ناپسند ہیں وہ مومن بندے کو بھی ناپسند ہو جب ہم اس طرح سے اپنی خوشی اللہ کی خوشی پر قربان کردیں گے پھر ہمارے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم اہل صدق وصفا ہیں جیسا کہ قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ کے اندر ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیۃ:۱۷۷)

ترجمہ: کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو، یا مغرب کو (کرلو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات پر) یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی (بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد واعمال کے ساتھ (یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکۂ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں، غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں نماز کسی سمت کو منہ کرنا انہی کمالات مذکورہ میں سے ایک کمال

خاص یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں بھی حسن آ گیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔ (معارف القرآن، جلد:۲،ص:۷۷ا)

اس آیت میں تمام احکام شریعت، اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاق کا اجمالی طور پر ذکر کرنے کے بعد جو لوگ ان سب میں اللہ تعالیٰ کی مرضی پر چلنے والے ہیں اور اپنی طبعی چاہت کو چھوڑ دینے والے ہیں ان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ کہ یہی وہ لوگ ہیں جو واقعی میں اہل صدق ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی کہے جا سکتے ہیں۔

اس لیے مومن کے لیے بنیادی چیز دین کے ہر شعبے میں اپنی من مانی نہ کرنا بلکہ اپنے مولیٰ کی مرضی پر چلنا ہے اور اپنی ہر خوشی کو اللہ کی خوشی پر فنا کرنا ہے۔ اسی کو خواجہ صاحب نے یوں فرمایا ۔

یاد میں تیری سب کو بھلا دوں کوئی نہ مجھ کو یاد رہے
سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے ترے دل شاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹادوں خانہ دل آباد رہے
سب کو نظر سے اپنی گرا دوں تجھ سے فقط فریاد رہے

باخدا بننے کے لیے خودی کو مٹانا ضروری ہے

کبھی پی رہے ہیں لہو آرزو کا
مٹا کر خودی با خدا ہو رہے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی آرزوؤں کا خون پی کر (جس کا مفہوم جگہ جگہ اشعار میں ذکر کیا جا رہا ہے) انسان اپنی انانیت کو مٹاتا ہے اور خود اپنے مقام اور وجود کو اپنی نگاہوں میں کچھ نہیں سمجھتا جو کہ تمام اولیاء اللہ کی خصوصیت ہے اب جب تک آدمی کچھ سمجھتا رہے گا تو اپنی انانیت اللہ تعالیٰ تک وصول میں بہت بڑی رکاوٹ رہے گی جب اپنے کو اللہ پر فدا کر دے اور ایسا فدا اور فنا کرے کہ خود اس فنا کرنے کو بھی ذہن سے نکال دے اس کا خیال بھی باقی نہ رہے تب سمجھ لو کہ اللہ والا ہو گیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر اپنے مٹانے کا خیال ہوگا تو یہ فنا ہے اور فنا الفنا کے بعد ہی بقا حاصل ہوتی ہے کیونکہ اگر اپنی فنا کا خیال دل میں باقی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ میں کچھ تھا اور اپنے کو مٹا ڈالا جب کہ اللہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے کچھ ہونے کا خیال ہی دل سے نکال ڈالو کہ تم یہ کہو کہ میں نے اپنے کو مٹایا تبھی جا کر اللہ تعالیٰ حقیقی معنی میں ملتے ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جسے مختلف صوفیاء کی کتابوں میں وحدت الوجود کا نام دیا گیا ہے جو کہ ایک امر واقعی اور سچی حقیقت ہے لیکن بہت سے اہل علم حضرات اس کے معنی و مطلب غلط سمجھنے کی بنا پر وحدت الوجود کے قائلین پر سخت قسم کے

اعتراضات کرتے ہیں حالانکہ اس کی محض اتنی حقیقت ہے جو احقر نے اوپر عرض کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو مٹا ڈالے اور اس کے فیصلوں اور خوشیوں کے سامنے اپنے ہر فیصلے اور خوشی کو فنا کر دے اور گویا اپنے وجود ہی کو بیچ میں سے ختم کر ڈالا اور اس سے بالکل صرفِ نظر کر لیا۔ اس کو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی پیش کی گئی مثالوں سے سمجھئے:

جیسے جگنورات کی تاریکی اور اندھیرے میں چمکتا رہتا ہے اور مختلف لائٹیں رات کے اندھیرے میں اپنے محدود دائرے میں مکانات اور جگہوں کو روشن کرتی ہیں لیکن جب دن کے وقت میں سورج نکل آتا ہے تو جگنو فضا میں ہونے اور لائٹوں کے جلتے رہنے کے باوجود ان کا اپنا کوئی وجود نظر نہیں آتا بلکہ بالکل معدوم اور فنا لگنے لگتا ہے مثلاً بادشاہِ حکومت اور صدرِ مملکت کہیں موجود ہو تو پھر وزیروں اور حکومت کے اہل کاروں کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان مثالوں میں قائل کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ سارے وجود مل کر ایک ہو گئے بلکہ صرف منشا یہ بتانا ہے کہ سورج کی روشنی کے سامنے جگنو اور لائٹوں کی روشنی بے اثر اور کالعدم ہے بالکل ٹھیک اسی طرح جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم انسانوں اور اللہ کا وجود العیاذ باللہ ایک ہو گیا ہے بلکہ منشا صرف اتنی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنی خودی کو بھول جائیں اور اپنے کو کالعدم سمجھیں اور اس کو فنا کر دیں جیسا کہ خواجہ صاحب نے اپنے اس شعر میں اسی وحدت الوجود کا ذکر کیا ہے ؎

تیرا گدا بن کر میں کسی کا دست نگر اے شاہ نہ ہوں
چین نہ لوں میں جب تک راز وحدت سے آگاہ نہ ہوں

گنہگاروں کا رونا تسبیح خوانوں کی تسبیح سے زیادہ محبوب ہے

تجھے ہو مبارک یہ اشک ندامت
نئے باب الفت کے وا ہو رہے ہیں

جتنا بندۂ مؤمن اشک ندامت گراتا ہے اتنا اللہ تعالیٰ کا زیادہ محبوب ہو جاتا ہے اور اس کا قرب حق تعالیٰ سے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت والفت کے نئے باب اسے عطا ہوتے رہتے ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿ لَاَنِيْنُ الْمُذْنِبِيْنَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴾

(تفسیر روح المعانی، ج: ۳۰)

البتہ گناہگاروں کا رونا مجھے تسبیح خوانوں کی آواز سے زیادہ پسند ہے یعنی سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے والوں کے مقابلے میں گناہگار کے اشک ہائے ندامت کے ساتھ رونے کی آواز اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور جب یہ ندامت کے آنسو محبوب ہیں تو ظاہر ہے کہ آنسو بہانے والا بھی محبوب ہوگا۔

اور حدیث شریف میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ مسبحین کی تسبیح کے برابر گنہگاروں کے رونے کی آواز محبوب

ہے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ زیادہ محبوب ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اشکِ ندامت کی کس قدر حیثیت و قیمت ہے اس لیے جتنی ہم میں یہ صفت موجود ہوگی اتنا زیادہ قرب الی اللہ نصیب ہوگا جیسا کہ الحمد اللہ ہم اپنے حضرت والا کی زندگی میں اس بات کا خاص مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ بڑی کثرت کے ساتھ خلوت میں ہوں یا جلوت میں حضرت والا کی آنکھیں آنسو بہاتی ہی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کرم اور کریم کے چار معانی

یہ شانِ کرم ہے کہ نالائقوں پر
کرم ان کے ہر دم عطا ہو رہے ہیں

جب تک بندے کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ تعلق قائم رہتا ہے کہ وہ یوں سمجھتا اور کہتا رہے کہ یا اللہ! جو کچھ آپ عطا فرما رہے ہیں، میں اس کا اہل اور مستحق نہیں ہوں، آپ کی یہ سب نعمتیں جو ہر آن میرے اوپر برس رہی ہیں بلا استحقاق مجھ جیسے نالائق پر آپ کا کرم ہے اور آپ کی شانِ کریمی کا ایک اثر ہے ورنہ میں اس قابل نہیں تھا۔ تو دراصل یہی بندے کی ادا حقیقت شکر کہلاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اور اللہ کریم ہی نہیں بلکہ اکرم الاکرمین ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ جو صرف لائقوں کو نہیں بلکہ نالائقوں کو بھی خوب عطا کرتا ہے۔ محدثین نے کریم کے چار معنی بیان کیے ہیں جس کو حضرت والا نے درسِ مثنوی مولانا روم میں ذکر فرمایا ہے:

(۱) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَيْنَا بِدُوْنِ الْاِسْتِحْقَاقِ وَالْمِنَّةِ کریم وہ ہے جو اپنے کرم سے نالائقوں کو بھی محروم نہ کرے، جس کا حق نہ بنتا ہو اس کو بھی عطا فردے۔

(۲) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَيْنَا بِدُوْنِ مَسْئَلَةٍ وَّلَا سُؤَالٍ جو بغیر سوال بغیر مانگے ہوئے ہم پر مہربانی کردے۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بغیر مانگے عطا فرمائی ہیں۔ جیسے ہمارا ایمان محض حق تعالیٰ کا کرم ہے، اس میں ہماری کسی محنت کا دخل نہیں، عالمِ ارواح میں ہم بے زبان تھے، ہم نے سوال نہیں کیا تھا کہ اے اللہ! ہمیں مسلمان کے گھر میں پیدا کیجئے لیکن بدون طلب اور بدون سوال مسلمان کے گھر میں پیدا کر کے ایمان عطا فرما دیا اور مفت میں جنت کا ٹکٹ دے دیا۔ اسی طرح ہر لمحہ بے شمار افضال وعنایات بدون سوال عطا فرما رہے ہیں۔

(۳) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَيْنَا فَوْقَ مَاتَتَمَنّٰى بِهٖ یعنی جو ہماری تمناؤں سے زیادہ دے دے۔ جیسا ایک کریم سے کسی نے ایک بوتل شہد مانگا۔ اس نے ایک مشک دے دیا۔ کسی نے کہا کہ اس نے تو ایک بوتل مانگا تھا۔ آپ نے پوری مشک کیوں دی؟ کہا کہ اس نے مانگا تھا اپنے ظرف کے مطابق میں نے دیا اپنے ظرف کے مطابق۔ جب دنیوی کریموں کا یہ حال ہے جن کو کرم کی ایک ذرہ بھیک مل گئی ہے تو اس کریم حقیقی کے کرم کا کیا ٹھکانہ ہے۔

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہا دیئے ہیں در بے بہا دیئے ہیں

(۴) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَیْنَا وَلَا یَخَافُ نَفَادَ مَا عِنْدَہٗ کریم وہ ہے جو ہمیں بے انتہا عطا فرمادے اور اپنے خزانوں کے ختم ہونے کا جسے اندیشہ نہ ہو کیونکہ غیر محدود خزانوں کا مالک ہے اور اپنے خزانوں سے بے نیاز ہے ہمارے لیے ہی وہ خزانے ہیں۔ (معارفِ مثنوی، صفحہ: ۹۷)

محبت کی کرامت ہے کہ سلطان گدا اور گدا سلطان ہو رہے ہیں

محبت کی اختر کرامت تو دیکھو
کہ سلطان ہو کر گدا ہو رہے ہیں

جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو پھر وہ اس کی خاطر اپنی سلطنت وحکومت بھی قربان کردیتا ہے اور حکومت چھوڑ کر فقیری اختیار کرنا پسند کرتا ہے جیسا کہ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں حضرت والا کے مواعظ وتصنیفات میں حضرت سلطان شاہ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا قصہ خاص طور پر اس سلسلے میں مذکور ہے معارف مثنوی، صفحہ: ۴۱ پر بھی یہ قصہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت سلطان ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو صورت یہ پیش آئی کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ رات کو بالا خانے پر سور ہے تھے کہ اچانک پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی گھبرائے کہ رات کے وقت شاہی بالا خانے پر کون لوگ ایسی جرأت کرسکتے ہیں دریافت فرمایا کہ اے واردین کرام آپ کون لوگ ہیں؟ یہ فرشتے تھے جو حق تعالیٰ کی طرف سے غفلت زدہ دل پر چوٹ لگانے آئے تھے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم یہاں اپنا اونٹ تلاش کررہے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ حیرت ہے کہ شاہی بالا خانہ پر اونٹ تلاش کیا جارہا ہے۔ ان حضرات نے جواب دیا کہ ہمیں اس سے زیادہ حیرت آپ پر ہے کہ اس ناز پروری اور عیش میں خدا کو تلاش کیا جارہا ہے اور شاہی تخت پر حق تعالیٰ کی ملاقات کی تمنا کررہے ہو یہ کہہ کر وہ رجال غیب تو غائب ہوگئے لیکن بادشاہ کے دل پر ایسی چوٹ لگ گئی کہ ملک وسلطنت سے دل سرد ہوگیا اور عشق حقیقی نے حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو ترک سلطنت پر مجبور کردیا اور عشق کائنات کی تمام لذتوں سے دل کو بیزار کردیا آخر کار آدھی رات کو بادشاہ اٹھا کنبل اوڑھا، اور اپنی سلطنت سے نکل پڑا سوزِ عشق کی ایک آہ نے زندان سلطنت کو پھونک دیا اور دست جنوں کی ایک ضرب نے گریبان ہوش کے پرزے اڑادیئے اور سلطنت بلخ ترک کر کے حضرت ابراہیم بن ادہم نیشاپور کے صحرا میں ذکرِ حق اور نعرائے عاشقانہ بلند کرنے میں مشغول ہوگئے۔

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو بغیر ریاضت ومجاہدے کے شاہ بلخ کا کام بن گیا بلخ کی سلطنت تو چھڑادی لیکن ایسی باطنی سلطنت عطا فرمادی کہ جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بلکہ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بے حقیقت ہوگئے۔شاہ کو خود بھی خبر نہ تھی کہ سلطنت کا سرسبز وشاداب باغ آتش عشق حقیقی کی نذر ہونے والا ہے،کوڑیاں چھن کر جواہرات عطا ہونے والے ہیں اور خارستان سوختہ ہوکر چمنستان بے خزاں بننے والا ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ دس برس تک صحرائے نیشاپور میں دیوانہ وار عبادت میں مصروف رہے اور ترک سلطنت کے نتیجہ میں جو نعمت ملی اور صحرا میں دریا کے کنارے ذکر وعبادت کی جو حلاوت ان کے باطن کو عطا ہوئی اس کا لطف انہی سے پوچھنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ ظاہری سلطنت کے ترک سے حق تعالیٰ کے قرب کی سلطنت لازوال حاصل ہوگئی۔ (معارفِ مثنوی،صفحہ:۴۱تا۴۵)

مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

ان کی جانب رفتہ رفتہ لے چلا
مری کشتی کا مرا غم ناخدا

خونِ حسرت پی کے وہ عشرت ملی
عیش دو عالم ہوا جس پر فدا

میری حسرت کی بہاروں کو نہ پوچھ
اہل عشرت بن گئے میرے گدا

سب کی عشرت دل سے باہر ہو گئی
میری حسرت میرے دل میں ہے سدا

بے وفا عشرت ہے یا حسرت ہے میر
سوچ کر خود فیصلہ کر لو ذرا

ان کی رحمت میر پر سایہ فگن
گو بظاہر میر ہے غم میں پڑا

خواجگی ان کی ہماری بندگی
جس طرح پالے تو ان پر رہ فدا

خنجرِ تسلیم سے اے دوستو
ہو رہی ہے غیب سے صد جاں عطا

اہلِ ظاہر کو خبر اس کی نہیں
جانِ حسرت کو ہے جو عشرت عطا

عشرتیں تو دشمنوں کو بھی ملیں
عاشقوں کو اپنا غم بخشا سدا

ساری دنیا کے مزے فانی ملے
غیر فانی مجھ کو تیرا غم ملا

قبر کی جانب ہیں جن کی منزلیں
مستند ان کو نہ تو اپنا بنا

دشمنوں کو عیشِ آب و گِل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا

ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ رفتہ رفتہ: آہستہ آہستہ۔ **غم**: گناہوں سے بچنے میں دل پر جو غم گذرتا ہے وہ مراد ہے۔ **ناخدا**: کشتی چلانے والا۔ **خونِ حسرت**: حرام خواہشات کا خون۔ **عشرت**: خوشی۔ **عیشِ دو جہان**: دونوں جہاں کا مزا۔ **خواجگی**: بادشاہت۔ **خنجرِ تسلیم**: اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی مرضی کو فنا کر دینا۔ **اہلِ ظاہر**: ظاہری حالات کو دیکھنے والے۔ **مستند**: سہارا۔ **آب و گل**: پانی و مٹی۔ **دردِ دل**: دل پر درد اٹھا کر اللہ کی نافرمانی سے بچنا۔ **طُغیانی**: طوفان۔ **ساحل**: کنارا۔

میرا غم میری کشتی کا ناخدا ہے

ان کی جانب رفتہ رفتہ لے چلا
مری کشتی کا مرا غم ناخدا

جس طرح سمندر میں چلنے والی کشتی کو اس کا ناخدا اور ملاح ساحل تک پہنچاتا ہے اور ہر طرح کے خطرات سے کشتی اور کشتی والوں کو بچا کر سمندر پار کرا دیتا ہے اسی طرح حضرت والا فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت

کا جو غم عطا فرمایا ہے وہ بڑی عافیت اور آسانی کے ساتھ مجھے میری منزل مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا تک لے کر چلا گیا اور میں نے یہ دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے کا غم اور مجاہدہ کس قدر تیزی کے ساتھ انسان کو اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے جب کہ بصورت دیگر گرچہ بندہ مومن کچھ نیک کام کرتا بھی رہے اور گناہوں کی حرام لذتوں سے کبھی کبھار مزے بھی لوٹتا رہے، ان سے بچنے کا غم اٹھانے کا اہتمام نہ کرے تو پھر اس کی کشتی طوفان کی موجوں میں پھنسی رہتی ہے جلد ساحل پر نہیں لگتی اور اسی طرح ایسے سالک کی ساری عمر الجھنوں اور پریشانیوں میں گزر جاتی ہے۔

خونِ حسرت عشرتِ دو جہاں کا ضامن ہے

خونِ حسرت پی کے وہ عشرت ملی
عیش دو عالم ہوا جس پر فدا

ظاہر بات ہے کہ جب دنیا کی لذتیں انسان کی فطرت میں رکھی گئیں اور طبیعتوں کا میلان اور رجحان بشری تقاضے کے تحت خواہشات کی طرف پایا گیا تو پھر اس جانب سے طبیعت کو روکنا دل میں حسرت اور رنج تو ضرور پیدا کرے گا اور طبیعت پر بوجھ اور دشواری تو ضرور آئے گی جس کو اس حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے جس میں جنت کو طبیعت کی ناپسندیدہ اور ناگوار چیزوں سے گھیرے جانے کا ذکر ہے اور جہنم کو مرغوب طبع اور مستلذات نفس اشیاء سے احاطہ کیا جانا مذکور ہے لیکن جو آدمی اس ناگواری اور رنج وحسرت کو اٹھالے گا تو پھر اسے دنیا میں بھی عیش اور آرام نصیب ہوگا اور آخرت کی عافیت وراحت بھی اس کا مقدر بنے گی۔

اور بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یوں کہیے کہ اس حسرت کے عوض اس کو خالق دو جہاں مل جائیں گے جو کہ ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ اس پر دونوں جہاں کا عیش و آرام بھی قربان کر دیا جائے اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اہل اللہ کو دنیا میں ہی جنت کا مزہ نصیب ہو جاتا ہے جیسا کہ احقر نے دوسرے مقامات پر یہ بات تفصیل سے نقل کی ہے۔ اور پھر عیش دو جہاں ان کی نظروں میں گر چکا ہوتا ہے۔

اہلِ عشرت اہلِ حسرت کے گدا بن جاتے ہیں

میری حسرت کی بہاروں کو نہ پوچھ
اہل عشرت بن گئے میرے گدا

اس شعر کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ جب کوئی اللہ کا ہو جائے گا تو پھر سارا عالم اس کا ہو جائے گا جو بندہ راہ خداوندی میں ہر طرح کے غم اور مجاہدے اٹھائے گا تو قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر یہ وعدے مذکور ہیں کہ اہل دنیا کو اللہ تعالیٰ اس کا خادم بنا دیں گے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں میں آئے گی ہر طرف سے اہل دنیا اس کا اعزاز و اکرام کریں گے اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ جو اہل عشرت دنیا ہیں وہ سب ایسے رجال اللہ کے گدا بن

جائیں گے جیسا کہ کتاب میں دوسرے مقامات پر یہ مضمون تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ تو ہمارے لیے اس شعر میں یہ سبق موجود ہے کہ کچھ دن کے لیے دنیا کے فانی عیش وعشرت کو چھوڑ دو اور اس راہ سلوک میں چل کرنا موافق طبیعت چیزوں کو اللہ کی رضا کے لیے گوارا کرلو پھر تمہیں دنیا وآخرت کا ہر طرح کا عیش وآرام میسر آجائے گا۔

صاحبو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیَنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِکَ لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِکَ بِنَا فَکُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا وَاھْدِنَا اِلٰی سَوَآءِ السَّبِیْلِ﴾

(کنز العمال)

یعنی کائنات کے بسنے والے تمام انسانوں کے دل اور تمام اعضاء وجوارح اور پیشانیاں اور چہرے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس پر قدرت اور اختیار نہیں دیا خود ہر آدمی کے اپنے دل دماغ اور اعضاء وجوارح بھی اس کے قبضے میں نہیں ہیں یعنی کہ ان کو خود بندہ جس طرف پھیرنا اور لگانا چاہے تو یہ اس کے بس سے باہر کی بات ہے ہر عضو انسانی کا رخ اسی سمت میں ہوگا جس سمت کے لیے مشیت باری تعالیٰ اس کے ساتھ ہوگی۔

عمل میں اخلاص کی ایک خاص حکمت

تو کیا اس میں ہمارے لیے یہ سبق نہیں ہے کہ ہم اپنے ہر قول وفعل سے اور ہر ادائے بندگی سے پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو حاضر رکھتے ہوئے صرف اسی ایک اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اگر ہم نے اس کو راضی کرلیا تو وہ خود لوگوں کے قلوب ہماری طرف پھیر دے گا اور ان کے دلوں میں ہماری عزت پیدا فرمادے گا ہمیں خود اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہماری فکر کا مرکز ومحور صرف ایک اللہ کو راضی کرنا ہو جس کی مشیت اور چاہت کے بغیر روئے زمین پر کوئی ایک پتہ بھی نہیں ہلتا یہی تو راز ہے اس مسئلے کا کہ بغیر ان شاء اللہ کے کسی کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ کرنے کی بات کہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾

(سورۃ الکہف، آیۃ: ۲۳)

ترجمہ: (ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھئے کہ) آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو (مثلاً) کل کردوں گا مگر خدا کے چاہنے کو (اس کے ساتھ) ملا دیا کیجئے (یعنی ان شاء اللہ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے) (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۵۷۰)

لباب میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پہلی دو آیتوں کے شانِ نزول کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ جب اہلِ مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصۂ اصحابِ کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ بغیر ان شاء اللہ کہے ہوئے کرلیا تھا۔ مقربین

بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہوا کرتی ہے، اس لیے پندرہ روز تک وحی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا غم ہوا، اور مشرکین مکہ کو ہنسنے اور مذاق اُڑانے کا موقع ملا۔ پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوالات کا جواب نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہدایت دینے کے لیے نازل ہوئیں کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو تو ان شاء اللہ کہہ کر اس کا اقرار کرلیا کریں کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے۔ ان دونوں آیتوں کو قصۂ اصحابِ کہف کے ختم پر لایا گیا ہے۔

اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں ان شاء اللہ کہنا مستحب ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آ جائے اسی وقت کہہ لے۔

بعض لوگ جو یوں کہہ دیتے ہیں کہ اگرچہ میں نے ان شاء اللہ نہیں کہا لیکن میری مراد یہی ہے تو اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس آیت کا منشا اور مقصد زبان سے ان شاء اللہ کہنا ہے محض دل میں ان شاء اللہ رکھنا نہیں ہے اس لیے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان شاء اللہ نہ کہہ سکے تھے اور اس پر ایک طویل مدت کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع رہا ظاہر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تو ان شاء اللہ تھا اور ہم سے زیادہ قوتِ یقین اور وثوق و اعتماد کے ساتھ مستحضر تھا مگر پھر بھی مذکورہ بالا حکم دیا گیا جس کا مطلب صاف یہ ہوا کہ زبان سے ان شاء اللہ کہنا مراد ہے۔

تو میرا منشا یہ بات عرض کرنے سے یہ ہے کہ اہل دنیا کے قلوب جب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں تو پھر جو اہل حسرت ہیں ان کے لیے اہل عشرت کو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کا خادم اور گدا بنا ہی دیا جائے گا۔ چنانچہ رات دن ہم اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ اللہ والوں کی خدمت میں بڑے بڑے دولت وثروت والے لوگ نیازمندانہ اور عاجزانہ حاضری دیتے رہتے ہیں۔

عشرتیں بے وفا ہیں یا حسرتیں

سب کی عشرت دل سے باہر ہو گئی
میری حسرت میرے دل میں ہے سدا
بے وفا عشرت ہے یا حسرت ہے میرؔ
سوچ کر خود فیصلہ کر لو ذرا

حضرت والا نے عشرت وحسرت کا تقابل کر کے بڑے انوکھے اور پیارے انداز سے یہ تعلیم دی ہے کہ اے مسلمانو! تم دنیا کے عیش وعشرت کے پیچھے مت پڑو بلکہ انبیاء اور اولیاء کی وراثت جو کہ اللہ کے دین کا غم اور اس کے راستے کی حسرتیں ہیں ان کو حاصل کرنے کی فکر کرو کیونکہ وہ تمہاری وفادار دوست ہیں جو دنیا میں بھی چوبیس گھنٹہ ہر وقت ساتھ رہتی ہیں اور یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے بھی قبر وحشر ونشر اور حساب وکتاب کے وقت ہر جگہ

تمہارے ساتھ ہونگی اور جہنم سے بچانے اور جنت دلانے کے کام آئیں گی۔

جب کہ دنیا کی عشرتیں اس قدر بے وفا ہیں کہ یہاں جیتے جی دنیا میں بھی بسا اوقات سب طرح کے اسباب عیش ہوتے ہیں مگر قلب کو عیش میسر نہیں آتا اور اسبابِ عیش ہر وقت ہمارے ساتھ اندرونی صفت اور کمال بن کر کے نہیں بلکہ خارج اور باہر کی ایک چیز کی حیثیت سے ساتھ ہوتے ہیں جیسے ہی ہم دنیا سے رخصت ہوئے سب کی سب عیش وعشرت کی چیزیں یہیں رکھی رہ جائیں گی اور دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی نہ قبر وحشر میں کام آنے والی نہ ہی حساب وکتاب کے دن نفع دینے والی تو اب حضرت والا فرماتے ہیں کہ خود ہی فیصلہ کر کے دیکھ لو کون باوفا ہے کون بے وفا؟ اور کس کو لینا چاہیے اور کس کو چھوڑنا چاہیے؟

دنیا کا عیش وعشرت جسم کے ظاہر کو آرام پہنچاتا ہے اور اللہ کی محبت کا غم قلب وروح کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے اور جسم انسان کے مرتے ہی ختم اور فنا ہو جاتا ہے لیکن روح باقی رہتی ہے تو جو روح کے اوصاف اچھے یا برے ہوں وہ بھی ساتھ جاتے ہیں اسلیے مومن کا ایمان اور کافر کا کفر اسی طرح متقی کا تقویٰ اور فاسق کا فسق مرنے کے بعد بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے آخرت میں درجات طے ہوتے ہیں اس لیے کہ موت کی حقیقت روح کا جسم سے علیحدہ ہو جانا ہے فنا ہو جانا نہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان کا اس عالم دنیا اور اس کے خواص سے جدا ہو کر دوسرے عالم عالم برزخ میں اس کے احکام کے ساتھ منتقل ہو جانا ہے اسی لیے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک بیان میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ انسان ازلی تو نہیں لیکن ابدی ہے یعنی ازل سے تو نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے معدوم تھا پھر وجود میں آیا مگر ابدی ضرور ہے کہ اب وجود میں آجانے کے بعد کبھی ختم نہیں ہوگا یہ الگ بات ہے کہ جنتی کو جنت میں اور جہنمی کو جہنم میں رہنا ہے مگر دونوں کو دونوں جگہوں میں ہمیشہ رہنا ہے لہٰذا عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چیز آپ کی وفادار ہے اس کو اپنا دوست بناؤ اور اس کو قریب لگاؤ اور اسے حاصل کرنے کی فکر کرو اور اس کے لیے جان توڑ محنت کرو نہ کہ اس کے لیے کہ جس میں بے وفائی کا داغ لگا ہوا ہے حقیقت میں یہی عقل مندی اور سمجھداری ہے۔

عیش وعشرت کی بے وفائی کا عالم تو یہ ہے کہ ساٹھ ستر سال کا رات و دن کے خون پسینے سے کمایا ہوا مال و دولت اور بنایا ہوا بنگلہ اور محل اور خریدا ہوا عمدہ فرنیچر اور گاڑیاں انسان کی روح نکلتے ہی یک دم اس سے علیحدہ اور جدا ہو جاتے ہیں اور موت بھی ایک ایسا معاملہ ہے کہ بقول ہمارے حضرت والا جس کا ویزا نا قابل توسیع اور نا معلوم المیعاد ہے، ایک سال کی توسیع تو دور کی بات ہے ایک لمحہ کی بھی توسیع نہیں کی جاتی اسی طرح دس بیس سال زندہ رہنے کی گارنٹی تو کیا مستقبل کے ایک لمحہ کا بھی علم نہیں ہوتا تو ایسے نا قابل اعتماد اور بے وفا عیش وعشرت کے گھر کو اپنا گھر بنا کر زندگی گزارنا سمجھداری نہیں ہے۔

اللہ والے ظاہر میں غمزدہ ہیں اور باطن میں پُرسکون ہیں

ان کی رحمت میر پر سایہ فگن
گو بظاہر میر ہے غم میں پڑا

حضرت والا میرؔ بول کر ایک مسلمان سامع اور سالک مراد لیتے ہیں یعنی جو سالک اللہ تعالیٰ کے راستے میں غم اور تکلیف اٹھا رہا ہو تو گو کہ وہ صورۃً کچھ غم زدہ نظر آئے اور اداس محسوس ہو اور بظاہر کچھ ناموافق طبع ناسازگار حالات میں مبتلا ہو جن میں نفس کو خوشی نہیں ملتی مگر یہ سب کچھ تو اس کا ظاہر ہے لیکن حقیقت میں ایسا سالک مردِ مومن اللہ کی رحمت کے سائے تلے ہوتا ہے اور جو شخص نفس کو حرام مزوں میں مبتلا کر کے ظاہری خوشیوں میں مگن دکھائی دے رہا ہو وہ اللہ کی رحمت کے بجائے اس کی لعنت کے سائے میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے پتہ چلتا ہے:

﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ م بِالسُّوْٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ إِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

(سورۃ یوسف، اٰیۃ:۵۳)

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو (ہر ایک کا) بُری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ (معارف القرآن، جلد۵، صفحہ۷۰)

اس لیے آیت مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی براءت کے اظہار کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ میرا یہ کہنا کچھ اپنے تقویٰ اور پاکبازی کا جتلانا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر چار عنصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو بُرے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔ بجز اس کے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو بُرے تقاضوں سے پاک کر دے، جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، اور ایسے ہی نفوس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایسے ابتلاءِ عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا یہ کوئی میرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت اور دستگیری کا نتیجہ تھا، اگر وہ میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نہ نکال دیتے تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا جیسے عام انسان ہوتے ہیں کہ خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

جس سے حضرت والا یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں 'ما' مصدریہ ظرفیہ زمانیہ ہے اَیْ فِیْ وَقْتِ رَحْمَةِ رَبِّیْ اسی طرح اس دعا نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ''اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ بِتَرْکِ الْمَعَاصِیْ'' سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ معصیت میں مبتلا شخص سایۂ رحمت میں نہیں ہوسکتا ہے اس لیے معصیت کا ترک سایۂ رحمت کیلیے لازم اور ضروری ہے۔ تو جیسے کوئی بدنظری کا گناہ کر رہا ہو اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور لعنت رحمت کی ضد ہے تو جو لعنت کے سائے میں ہوگا وہ رحمت کے زیرِ سایہ نہیں ہوسکتا اس لیے گناہوں سے بچ کر اگرچہ ظاہری کچھ غم پیش آئے مگر بندہ اللہ کی رحمت کے سائے میں ہو جاتا ہے۔

اس پر حضرت والا کا ایک قیمتی ملفوظ یاد آیا کہ ارشاد فرمایا کہ ماں کی گود سے بچہ تو چھینا جا سکتا ہے مگر کون مائی کا لعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت پر کنجی تو لگا دے۔

خواجگی ان کی ہماری بندگی
جس طرح پالے تو ان پر رہ فدا

اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے سامنے بندہ کی بندگی کا تقاضہ یہی ہے کہ جو بھی حق تعالیٰ کا حکم سامنے آئے اس پر دل و جان سے فدا رہے بجز اس کے بندہ اپنی ادائے بندگی میں ناقص اور نا تمام قرار دیا جائے گا جس راہ سے بھی ہو اور جس طریق سے بھی ہو ہمارا کام صرف اپنے اللہ پر فدا ہونا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے کوئی صبر آزما حالت ڈالی تو ہم بذریعہ صبر اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے اور خوشی و مسرت اور وسعت و کشادگی والے حال میں ہمیں رکھا تو ہم بذریعہ شکر اپنے اللہ کو یاد کریں گے مگر جس طرح بھی ہو جو بھی صورت ہو ہمارا کام یہی ہے کہ ہماری نظر اپنے اللہ کے اوپر ہو۔

تسلیم و رضا کی بہار اور جانِ حسرت کو عطائے عشرت

خنجرِ تسلیم سے اے دوستو
ہو رہی ہے غیب سے صد جاں عطا

تسلیم و رضا مومن کی زندگی کا قیمتی جوہر ہے جو ایمان والا جتنے درجے میں اس وصف سے متصف ہو تو اسے جینے کا وہ مزہ حاصل ہوگا جس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگی کیونکہ جب اپنے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہے گا تو کبھی غم زدہ و پریشان نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ہر لمحہ ایسی پر سکون حیات اور ایسی فرحت بخش زندگی عطا ہوگی کہ اس کی زندگی ہزاروں زندگیوں کے لیے قابلِ رشک ہو جائے گی اور اسے جینے کا ایسا مزہ حاصل ہوگا کہ گویا اس کی جان کو سینکڑوں جان عطا ہو رہی ہے اور ہزاروں زندگیوں کو اکھٹا کر کے بھی وہ لطف اور مزہ نہیں ہوگا جو کہ اسے حاصل ہو رہا ہوگا اسی کو حضرت نے فرمایا ہے کہ اس کو غیب سے صد جاں عطا ہو رہی ہوگی۔

اہلِ ظاہر کو خبر اس کی نہیں
جانِ حسرت کو ہے جو عشرت عطا

ظاہر میں دیکھنے والے لوگ، ایسے بے سروسامانی کے عالم میں جینے والے اللہ والوں کو جو پھٹے پرانے کپڑوں میں بوریا نشین رہتے ہیں اور صحراؤں، پہاڑوں اور بیابان اور جنگلوں جیسے مناظر میں یادِ خداوندی کے جلووں سے ان کو رشکِ گلستاں کیے ہوئے ہوتے ہیں وہاں اسبابِ عیش و عشرت نظر نہ آنے کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کوئی سکون زندگی اور لطفِ حیات نصیب نہیں ہے حالانکہ جو دل اندر اندر مزے لوٹ رہا ہوتا ہے اور جانِ حسرت کو جو عشرت ملی ہوتی ہے اس کی ان اہلِ ظاہر کو ہوا بھی نہیں لگتی۔

دنیا کی عیش وعشرت نصیبِ دشمناں ہے

عشرتیں تو دشمنوں کو بھی ملیں
عاشقوں کو اپنا غم بخشا سدا
ساری دنیا کے مزے فانی ملے
غیر فانی مجھ کو تیرا غم ملا
قبر کی جانب ہیں جن کی منزلیں
مستند ان کو نہ تو اپنا بنا
دشمنوں کو عیشِ آب و گِل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا
ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلدُّنْیَا دَارٌ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ وَ مَالٌ مَنْ لَّا مَالَ لَهٗ وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَهٗ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق)

کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں اور دنیا کو وہ شخص جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں یعنی دنیا کو بے وقوف اور بے عقل آدمی جمع کرتا ہے یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ ہیں اور محدثین نے اس کی دو تشریح بیان فرمائی ہیں کہ یہ دنیا ان کافروں مشرکوں کا گھر ہے جن کو آخرت میں کوئی گھر نصیب ہونے والا نہیں ہے بلکہ ان کو جو کچھ ملنا ہے یہیں دنیا میں مل جائے گا اور ان کا آخرت میں کوئی مال بھی نہیں ہے ان کی جنت یہی دنیا ہے جب وہ آخرت میں پہنچیں گے تو ان سے وہاں یوں کہا جائے گا:

﴿اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیٰوتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾

(سورۃ الاحقاف، ایۃ: ۲۰)

ترجمہ: تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے (یہاں کوئی لذت تم کو نصیب نہیں ہوگی) اور انکو خوب برت چلے (حتی کہ ان میں پڑ کر ہم کو بھی بھول گئے) سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی۔

تم نے دنیا میں اپنے سارے مزے لوٹ لیے اور وہیں دنیوی زندگی میں سب لطف اٹھا لیے یہاں تم کس چیز کی امید اور تلاش میں ہو اب یہاں تمہارے لیے کسی قسم کی راحت و آرام کا سوال نہیں۔ چنانچہ ایسے

لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں خوب ڈھیل دیتے ہیں تاکہ وہ اس فانی و عارضی لذت سے اپنا حصہ حاصل کرلیں گناہوں میں پڑ کر ہر طرح کے عیش و عشرت کی زندگی گزار کر دنیا میں وہ کچھ لذت اٹھا لیتے ہیں مگر یہ عارضی لذتیں سکون قلبی سے خالی ہوتی ہیں:

﴿وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾

(سورة الشورى، اية: ٢٠)

ترجمہ: اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی سارے عمل و سعی کا مقصد دنیا کی متاع ہو) آخرت کے لیے کچھ کوشش نہ کرے) تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دیدیں گے اور آخر میں اس کو کچھ حصہ نہیں۔

دوسرا اس کا معنی اور مطلب یہ ہے کہ دنیا کو گھر سمجھنے والو! حقیقت میں یہ گھر کہلانے کے قابل نہیں اور اس کا مال حقیقت میں مال کہلانے کے قابل نہیں سو جس کے پاس اس دنیا میں دار اور مال ہے تو بھی سمجھے کہ لَا دَارَ لَهٗ وَلَا مَالَ لَهٗ اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر تو دار اور مال عیش و آرام کی چیزیں ہیں لیکن یہی انسان اللہ تعالیٰ کا نافرمان بن کر اس عیش کو طیش میں بدل دیتا ہے اور سامان راحت کو سامان مصیبت بنا لیتا ہے اور چونکہ اس دار و مال کے فائدے عارضی اور فانی ہیں اس لیے اس عیش و عشرت کی اللہ کی نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں اصل لطف حیات دو جہاں انبیاء و اولیاء کو حاصل ہوا ہے جو نتیجہ ہے اس درد محبت کا جس کو اللہ نے اپنے دوستوں کا نصیبہ بنایا جو انبیاء و اولیاء کی سنت رہی ہے کہ وہ سب کے سب حاملین درد محبت خداوندی تھے جس کے نتیجے میں انسان بارگاہ خداوندی میں آہ و زاری کرتا ہے اور حالت سجدہ میں اس طرح اس کی چشم اشک بار ہوتی ہے کہ رحمت خداوندی کا آبشار اس کے سر پر ہوتا ہے یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے جو اللہ اپنے محبوبین ہی کو عطا فرماتے ہیں جب کہ دنیا کے ساز و سامان اور اسباب عیش و عشرت کی محبت اللہ تعالیٰ دشمنوں کو عطا کرتے ہیں اور اپنے دوستوں کو اس سے بچا کر رکھتے ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے:

﴿إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا حَمَاهُ الدُّنْيَا كَمَا يَظَلُّ أَحَدُكُمْ يَحْمِيْ سَقِيْمَهُ الْمَآءَ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الطب، باب ما جآء في الحمية)

کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو دنیا کی محبت اور عیش و عشرت سے ایسا بچا لیتے ہیں جس طرح تم اپنے استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو باوجود یہ کہ تمہارا وہ مریض تم سے پانی مانگتا ہے لیکن تم پانی کو اس بیماری میں اس کے لیے مضر اور نقصان دہ سمجھتے ہو اس لیے بالکل نہیں دیتے۔

اللہ کا دردِ محبت نصیبِ دوستاں ہے

چنانچہ قرآن کریم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ

وَرِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴿﴾

(سورۃ طٰہٰ: ۱۳۱)

ترجمہ: اور ہرگز اُن چیزوں کی طرف آپ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسا اب تک بھی نہیں دیکھا) جس سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ و مشرکین کو) اُن کی آزمائش کے لیے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے (مطلب اوروں کو سنانا ہے کہ جب معصوم نبی کے لیے یہ ممانعت ہے جن میں احتمال بھی نہیں تو غیر معصوم کو تو اس کا اہتمام کیونکر ضروری نہ ہوگا، اور آزمائش یہ کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے) اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا (اس سے) بہتر اور دیرپا ہے (کہ کبھی فنا ہی نہ ہوگا)

(معارف القرآن، جلد: ۶، ص۱۶۴-۱۶۵)

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور دراصل ہدایت کرنا اُمت کو ہے کہ دنیا کے مالداروں، سرمایہ داروں کو قسم قسم کی دنیوی رونق اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہیں، آپ ان کی طرف نظر بھی نہ اُٹھایئے کیونکہ یہ سب عیش فانی اور چند روزہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جو نعمت آپ کو اور آپ کے واسطے سے مؤمنین کو عطا فرمائی ہے وہ بدرجہا اُن کی اس چند روزہ رونقِ حیات سے بہتر ہے۔

دنیا میں کفار و فجار کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت ہمیشہ ہی سے ہر شخص کے لیے یہ سوال بنتی رہی ہے کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ذلیل ہیں تو اُن کے پاس یہ نعمتیں کیسی اور کیوں ہیں؟ اور طاعت شعار مؤمنین کی غربت و افلاس کیوں؟ یہاں تک کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عالی قدر بزرگ کو اس سوال نے متاثر کیا جس وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے خاص حجرہ میں داخل ہوئے جس میں آپ خلوت گزیں تھے اور یہ دیکھا کہ آپ ایک موٹی موٹی تیلیوں کے بوریئے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان تیلیوں کے نشانات آپ کے بدن مبارک پر کھڑے ہوگئے ہیں تو بے اختیار رو پڑے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ کسریٰ و قیصر اور اُن کے امراء کیسی کیسی نعمتوں اور راحتوں میں ہیں اور آپ ساری مخلوق میں اللہ کے منتخب رسول اور محبوب ہیں اور آپ کی معیشت کا یہ حال ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابن خطاب! کیا تم اب تک شک و شبہ میں مبتلا ہو۔ یہ لوگ تو وہ ہیں جن کی لذّات و محبوبات اللہ نے اسی دنیا میں اُن کو دے دی ہیں، آخرت میں ان کو کوئی حصہ نہیں۔ وہاں عذاب ہی عذاب ہے (اور مؤمنین کا معاملہ برعکس ہے) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی زینت اور راحت طلبی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق زندگی کو پسند فرماتے تھے۔ باوجودیکہ آپ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ اپنے لیے بہتر سے بہتر راحت کا سامان جمع کرلیں اور جب کبھی دنیا کی دولت آپ کے پاس بغیر کسی محنت مشقت اور سعی و طلب کے آبھی جاتی تھی تو فوراً اللہ کی راہ میں غرباء و فقراء پر اس کو خرچ کر ڈالتے تھے اور اپنے واسطے کل کے لیے بھی کچھ باقی نہ چھوڑتے

تھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ مَايَفْتَحُ اللّٰهُ لَكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا﴾

(ابن کثیر)

یعنی مجھے تم لوگوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے وہ دولت وزینتِ دنیا ہے جو تم پر کھول دی جائے گی۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو پہلے ہی یہ خبر بھی دے دی ہے کہ آئندہ زمانے میں تمہاری فتوحات دنیا میں ہوں گی اور مال ودولت اور عیش وعشرت کی فراوانی ہوجائے گی۔ وہ صورتِ حال کچھ زیادہ خوش ہونے کی نہیں بلکہ ڈرنے کی چیز ہے کہ اُس میں مبتلا ہوکر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کے احکام سے غفلت نہ ہوجائے۔ (معارف القرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۶۴-۱۶۵)

تو اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے متقی بندوں کے سینوں میں جو اپنا دردِ محبت ودیعت فرماتے ہیں پھر وہ ان کو عیش آب وگل سے بچا لیتے ہیں گو کہ کبھی کبھی یہ اللہ کے نیک بندے دنیا کی چیزوں کے حصول کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں اور اس کے لیے سعی وکوشش بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ دعاؤں میں بھی مصروف ہوتے ہیں مگر اس راہ سے ان کو کامیابی نہیں دی جاتی اور ان کو ان چیزوں سے بچایا جاتا ہے تاکہ ان کے دل ودماغ خالص ایک سمت پر لگے رہیں اور وہ اللہ کی یاد اور اس کے دین کی فکر ہے ہم اپنے ذہن کے اعتبار سے اس کو مقصد میں ناکامی کہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی شانِ ربوبیت سے رحم وکرم کا معاملہ فرما کر ایسے اپنے خاص بندوں کو علائق دنیویہ سے دور رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ دنیا کی عیش وعشرت اصل میں اللہ نے دشمنوں کے لیے رکھی ہیں اور ان کو دنیا کے ان فانی مزوں میں لگا دیا ہے اور وہ عیش آب وگل میں ایسے مست ہوئے کہ آخرت کو بالکل بھول گئے جن کے متعلق قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ لوگ نہ تو ہماری ملاقات پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ وہ آخرت میں جزاء وسزاء کے قائل ہیں اور دنیوی زندگی پر ہی خوش ہوکر اسی پر مطمئن ہو بیٹھے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا﴾

(سورۃ یونس: ۷)

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اللہ کی ملاقات پر یقین نہیں رکھتے، دنیا کی زندگی سے خوش ہوگئے اور اسی (فانی) زندگی سے مطمئن ہوگئے۔

عشرت وحسرت کی تقسیم پر ایک سوال اور جواب

اب کسی کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ایسی تقسیم کیوں اختیار فرمائی کہ دشمنوں کو سب کچھ دیا اور دوستوں کو محروم رکھا ان کو صرف اپنا دردِ دل عطا کر دیا تو حضرت والا نے آخری شعر میں اس کا جواب

ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے محبوب بندوں کے لیے دردِ دل اس لیے منتخب کیا تا کہ ان کو طوفانوں میں بھی ساحل کا مزہ دے دوں اور دشمن کو ساحل پر پہنچنے کے باوجود موجوں کی طغیانی میں پھنسے ہوئے انسان کی طرح بے قرار و بے چین رکھوں اور وہ لوگ اس طرح زندہ رہتے ہیں کہ ذہنی الجھنیں اور دماغی ٹینشن ان پر سوار رہ کر زندگی کے سارے عیش و نشاط کو مکدر کیے رہتا ہے گو کہ دیکھنے میں بڑے سکون میں نظر آتے ہیں مگر اندر میں ان کو سکون کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو ظاہری اعتبار سے طوفانوں میں پھنسا ہوا رکھتے ہیں کہ کبھی فقر و فاقہ ہے، کبھی دنیوی مصائب کا سامنا ہے، کبھی مال و اولاد میں کوئی نقصان درپیش ہے، تو کبھی دین پر جمنے کی سزا میں جیلوں کا رخ کرنا پڑ رہا ہے، کبھی اللہ کی راہ میں پتھر کھانے پڑ رہے ہیں تو کبھی تلواریں گردن میں ڈالے خدا کے دشمنوں کے تعاقب میں بھوک و پیاس کے عالم میں چلنا پھرنا پڑ رہا ہے، کبھی اپنوں کی ملامت کا سامنا ہے تو کبھی غیروں کی طرف سے تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے لیکن یہ خدا کا سچا عاشق اور پکا دوست بال برابر بھی اپنے مولیٰ کے حکم سے پیچھے نہیں ہٹتا تو پھر اللہ تعالیٰ ان حالات کے طوفانوں میں بھی اس کے دل کو سکون کا گہوارا بنا دیتے ہیں اور ایسی حلاوت ایمانی دل کو عطا فرماتے ہیں کہ جس کے سامنے ساری دنیا کے مزے کوئی حیثیت نہیں رکھتے جب یہ ان ناگوار حالات میں اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے اور اس کو آہ وزاری کے ساتھ پکارتا ہے تو اسے قرب کا وہ عالم میسر ہوتا ہے کہ جس پر دو جہاں کا عیش قربان کر دیا جائے۔

اور پھر یہ تو اس بندے کا حال دنیا میں ہے آخرت کے جو مزے ہیں وہ تو اپنی جگہ پر ہیں بہر حال محبوب محبوب کے لیے اچھا ہی چاہتا ہے برا نہیں سو وہ انبیاء و اولیاء جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی رنگ رلیوں سے محفوظ فرما کر یہ بتا دیا کہ اے میرے بندو! میں تم کو کوڑیوں کے بدلے جواہرات دینا چاہتا ہوں اور خارستان کے بدلے چمنستان بے خزاں عطا کرنا چاہتا ہوں اور میں تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کرنا چاہتا جو میرا سلوک دشمنوں کے ساتھ ہیکہ میں نے اپنے دشمنوں کو دنیا کے عیش وعشرت میں ایسا مگن کر دیا کہ انہوں نے یہاں کے مزوں اور لذتوں کو ہی سب کچھ سمجھا اور مجھے بالکل بھول بیٹھے وہ اپنے اعلیٰ مکانات، شاندار بنگلے، خوبصورت گاڑیاں، لمبا چوڑا خاندان وغیرہ ان چیزوں میں الجھ کر رہ گئے اور انہوں نے سراب کو پانی سمجھا اور کانٹوں کو پھول سمجھا جیسا کہ اس کتاب میں مختلف مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا کے مزے سب فانی ہیں ان کے سہارے جینے والا نادان و ناسمجھ ہے اور ایسی حسین، حسیناؤں پر فریفتہ ہونے والا جن کی منزلیں قبر کی جانب ہیں اگر نادان اور بے وقوف نہیں تو پھر کون بے وقوف ہوگا۔

لطف دنیا کے ہیں گے دن کے لیے
کھو نہ جنت کے مزے ان کے لیے
یہ کیا اے دل تو بس پھر یوں سمجھ
تو نے ناداں گل دیئے تنکے لیے

ہم اپنی اولاد کے دوست ہیں یا دشمن؟

صاحبو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی نوع آدم میں سے اپنا سب سے زیادہ محبوب اور پیارا طبقہ انبیاء علیہم السلام کو قرار دیا ہے اس لیے ان کے لیے جس چیز کا انتخاب کیا ہے وہ بھی سب سے زیادہ پیاری اور محبوب شے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت وقعت وحیثیت رکھنے والی ہے اور وہ اپنا درد محبت ہے اور آخرت کا غم ہے اور دنیوی عیش وعشرت سے بچانا ہے اور آخرت کی دائمی راحتوں اور ہمیشہ کی جنتوں میں اپنی رحمت کے سائے تلے ان کو جگہ دینا ہے جہاں وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی ہوں گے اور جہاں کی خوشی اصل خوشی اور راحت حقیقی راحت ہوگی اگرچہ دنیا میں کچھ عارضی مدت کے لیے ان کو ظاہری آزمائشوں سے گزارا جاتا ہے۔

سو احقر بڑی وضاحت کے ساتھ سامعینِ مجلس سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کیا ہم نے آج اپنی اولاد کے ساتھ محبوبوں والا سلوک کیا ہے یا دشمنوں والا سلوک؟ یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے دوستوں کے لیے اپنے درد محبت کا انتخاب کیا اور دشمنوں کو عیشِ آب وگل دے کر اس میں لگا دیا تو کیا ہم نے بھی اپنی اولاد کے لیے آخرت کی دائمی راحت اور ہمیشہ کی جنت کا سامان تیار کیا ہے اور ان کو اس کی راہ دکھلائی ہے اور اپنے اور ان کے خالق و مالک اللہ کی ذات عالی کا ان سب کو تعارف کرایا ہے۔

یا اس کے برخلاف ان کے واسطے دنیا کے ہر قسم کے سامانِ عیش وعشرت جمع کرنے کی فکر کی اور ان کو اس فانی دنیا کے نقشوں اور گورکھ دھندوں میں مصروف کردینے کی اسکیمیں اور پروگرام بنائے اور انہیں اسکولوں اور کالجوں کی نظر کر کے اللہ ورسول کی باتوں سے بے خبر اور آخرت کی فکروں سے دور رکھا۔

اگر ہم موجودہ زمانے کی صورت حال پر غور کریں تو ہم میں سے زیادہ بڑی تعداد ایسی ہی نظر آئے گی کہ جن کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے اس دنیائے فانی کے ہر نوع کے ساز وسامان اور اسباب عیش وعشرت جمع کرنے کی تو فکر کی اور ان کی دنیا بنانے کے لیے جان توڑ کوششیں صرف کردیں انہیں اسکول اور کالجوں کی نذر کر کے دین سے بے خبر رکھا اور دنیوی علوم سے آگاہ کیا جس کے نتیجے میں وہ دنیا کے نقشوں میں ایسے مصروف ہوگئے کہ اپنی ساری صلاحیتیں انہیں مادی چیزوں پر صرف کرڈالیں اور کائنات کی تہہ میں گھس کر اپنے کو اور خالق کائنات کو بھول گئے، جدید قسم کی عمدہ گاڑیاں، رہنے سہنے کے لیے شاندار بنگلے، اور لیٹسٹ (Latest) قسم کے سیل فون اور کمپیوٹرز (Cell Phones, Computers) اور اعلیٰ قسم کا گھر کا فرنیچر وغیرہ مادی چیزیں ان کا منتہائے جدوجہد بن کر رہ گیا۔

غرض یہ کہ اس فانی دنیا کے ناز ونعم اور عیش وعشرت کے ہر نوع کے سامان اولاد کے لیے جمع کرنے کی فکر تو کی مگر افسوس کہ اس کی آخرت کے متعلق کبھی کچھ سوچنے اور فکر کرنے کی ہمیں کوئی فرصت نہ ملی نہ تو کبھی ہم نے یہ سوچا کہ:

میرے بچے نمازیں پڑھتے ہیں یا نہیں؟
قرآن کی تلاوت کے پابند ہیں یا نہیں؟
اپنے اللہ و رسول کی معرفت و پہچان ان کو حاصل ہے یا نہیں؟
خدا اور رسول کا پیغام جو قرآن و سنت کی شکل میں ہمارے پاس ہے اس کو وہ سمجھتے ہیں یا نہیں؟
ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ان کی صحبت اور کمپنی (Company) اچھے لڑکوں کے ساتھ ہے یا برے؟
کیا ان کی زندگی میں اتنا دین ہے جو انہیں آخرت میں جنت میں لے جا سکے اور جہنم سے بچا سکے؟
کیا وہ دنیا میں رہتے ہوئے اللہ و رسول کی محبت سینے میں رکھتے ہیں یا نہیں؟
میرے دنیا سے جانے کے بعد ان کے دین پر بقا کی کیا صورت ہوگی؟
میری اولاد آخرت کی کامیابیوں اور خوشیوں میں میرے ساتھ کس طرح شریک ہو سکے گی؟
وہ زمانے کے خطرناک دینی فتنوں سے کیسے محفوظ رہ سکے گی میں نے ان کے لیے کچھ انتظام کیا کہ نہیں؟
میں نے انہیں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین سے جوڑنے کی کوئی فکر کی کہ نہیں؟
میں نے ان کے دین و دنیا کی فلاح اور سرخروئی کے لیے اللہ کے سامنے کچھ آہیں بھری ہیں یا نہیں؟

میرے ایمان والے بھائیو! اور آخرت پر یقین رکھے والو! احقر حضرت والا کے اس درد بھرے مضمون کے تحت اپنے سے اور آپ سب سے یہ درخواست کرتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کے لیے تقریباً ان ایک درجن سوالات پر سنجیدگی سے غور کریں تا کہ ہم بھی اپنی اولاد کو وہی تحفہ پیش کر سکیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب طبقۂ بنی آدم انبیاء علیہم السلام کو عطا کیا ہے اور ان کو دنیا کی فانی لذتوں اور عارضی عیشِ آب و گل سے بچایا جا سکے جس کے نتیجے میں کل ہم اور ہماری اولادیں جنت کی دائمی خوشیوں اور راحتوں میں اکٹھے جمع ہوں اور اصل کامیابی اور فلاح ہم سب کے قدم چومے یہی اصل دوستی اور محبت ہے۔

آہ! ہماری اپنی اولاد سے دُشمنی

مگر آہ! بڑے دکھ اور درد سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہم نے محبت کے روپ میں اور دوستی کی شکل و صورت میں اپنی اولاد سے عداوت اور دشمنی کی ہے اور ہم نے خود ان کو دنیا اور اسباب دنیا کی محبت بتلائی اور سکھلائی اور انہیں اس راہ پر ڈالا جو ان کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والی ہے اور ہمیشہ کے خسارے اور محرومی کا باعث ہے نہ ان کو دین کا پتہ ہے نہ دین داروں کی قدر ہے، نہ قرآن و سنت سے آگاہ ہیں، نہ ہی اللہ و رسول سے باخبر ہیں نہ انہیں اچھے اور برے میں تمیز ہے، نہ نفع نقصان کا کچھ علم ہے۔ بس ان کا مبلغ علم اور سعی و کوشش کا منتہا دنیا اور صرف دنیا ہے اسی عارضی اور فانی دنیا کو انہوں نے اپنا سب کچھ سمجھا ہے ان کی ہر سوچ و فکر بس دنیا بنانے کے اردگرد گھومتی ہے سوتے ہیں تو اس کی فکر اور اٹھتے ہیں تو اسی کا خیال ذہن و دماغ پر چھایا رہتا ہے روز بروز دنیا کے مال و دولت میں اضافہ ہونے

سے ان کی دنیا میں مشغولی اور آخرت سے دوری بڑھتی جاتی ہے۔ افسوس صد افسوس ہم ان کی اس حالت کو دیکھ کر مطمئن اور خوش نظر آتے ہیں جیسا کہ ہمارے دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہی تھا۔

بالآخر جب اولاد کی طرف سے والدین کی نافرمانی والے معاملات اور ان کو ایذاء و تکلیف پہچانے والے واقعات سامنے آنا شروع ہوتے ہیں نہ ان کی نگاہ میں والدین کی کوئی عزت و عظمت ہوتی ہے اور نہ ان کا کوئی خیال دل میں رہتا ہے کیونکہ انہوں نے والدین کے حقوق کو سرے سے جانا ہی نہیں نہ والدین نے ان کو اس کی تعلیم دی تو پھر آئے دن اپنی اولاد کی طرف سے شکایتوں کا ایک غیر معمولی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اب بزرگوں سے دعاؤں کی فکر اور عاملوں سے تعویذوں کی سوچ دل و دماغ پر سوار رہتی ہے اور یوں خود اپنے بگاڑے ہوئے کیس (Case) کو اس کے پورے بگڑ جانے کے بعد ہم سنوارنے کی طرف چلتے ہیں اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس کمان میں لانے کی نامعقول فکر کرتے ہیں جس کا انجام بس دنیا و آخرت کے خسارے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اس لیے میرے بھائیو! صورت حال بگڑ جانے سے پہلے اسے صحیح کرنے کی فکر کرو اور کبھی سنجیدگی سے تنہائی میں بیٹھ کر غور کرو کہ اگر یہ دنیا اور اس کا عیش و عشرت اتنا اچھا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و اولیاء کو سب سے زیادہ عطا کرتے اور دشمنوں کو کلی طور پر محروم کر دیتے سو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اولاد کے صحیح خیر خواہ اور ان سے سچی محبت رکھنے والے جب ہی کہلائیں گے، جب ہمارا سلوک اپنی اولاد کے ساتھ وہی ہو جو کہ اللہ تعالیٰ کا انبیاء و اولیاء کے ساتھ ہے یہ اس شعر کا ہمارے لیے ایک عظیم الشان سبق ہے کاش کہ ہم میں سے ہر ایک وقت گزر جانے سے پہلے اس کی فکر کرلے اور پھر اپنی اور اپنی اولاد کے لیے صحیح اور درست فیصلہ کر سکے۔

ہماری جنت کی خوشیاں اور اہل و عیال کی فکر

میرے اہل ایمان بھائیو! ہم کو اولاد کے مسئلے کو اس نقطۂ نظر سے بھی سوچنا چاہیے کہ ہم رات دن نمازوں میں اور دوسرے مواقع پر اپنے لیے یہ دعائیں کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہماری قبر کی منزل اور حشر و نشر کے مراحل سہل اور آسان ہو جائیں اور ہمیں آخرت میں پہنچ کر جنت میں داخلہ اور دوزخ سے نجات حاصل ہو جائے اور وہاں کی دائمی خوشی ہمارا مقدر بنے۔

تو بھلا کیا آپ اور میں اس بات پر خوش ہونگے کہ ہم تن تنہا جنت میں خوشیاں منا رہے ہوں اور وہاں کی نعمتوں میں مزے لوٹ رہے ہوں اور ہمارے بعد اپنے اپنے وقت پر جب اولاد ہمارے پاس پہنچ رہی ہو تو اس کا رخ کسی اور سمت میں ہو اور اس کا ٹھکانا خدا کے نافرمانوں اور بے دینوں والا ٹھکانا یعنی جہنم قرار پائے اور وہاں کے سخت عذاب اور تکالیف کا ان کو سامنا ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ایمان والا اپنی اولاد کے لیے ایسا خیال دل میں نہیں لا سکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی خوشی پوری خوشی جب تک نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اس خوشی میں اپنے اہل و عیال کو شریک نہ دیکھ لے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بے دین رکھ کر اور قرآن و حدیث کی تعلیمات سے ناآشنا

کر کے انہیں اس راستے پر ڈال رہے ہیں جو وہاں کی خوشیوں میں اکھٹا کرنے والا نہیں بلکہ ان کو الگ کر دینے والا ہے اور راحت کے بجائے مصیبت، جنت کے بجائے دوزخ، ثواب کے بجائے عذاب، رضائے خداوندی کے بجائے ناراضگی الٰہی کا ٹھکانا ہے لہٰذا سوچنے کی اور فیصلہ کرنے کی جگہ یہی دنیا ہے ہمیں یہیں رہ کر اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے صحیح فیصلہ کرنا چاہیے۔

مال واولاد اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں

صاحبو! ہمیں دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو بھی کچھ عطا کیا ہے اس کا ہم کو کلی طور پر مالک نہیں بنا دیا گیا بلکہ وہ سب کچھ امانت کے طور پر عطا ہوا ہے خواہ ہمارا اپنا بدن ہو یا ہمیں ملنے والا مال ہو اور یا عطا کی جانے والی اولاد ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہم سے ان سب چیزوں کے متعلق قیامت کے دن سوال ہوگا اور باز پرس کی جائے گی کہ تم نے ان چیزوں کے سلسلے میں میرے احکام کی پابندی کی یا نہیں؟ اور ان سے متعلق مقرر کئے ہوئے حقوق ادا کئے ہیں یا نہیں؟ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿الاَ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء)

یعنی کہ تم میں سے ہر ایک نگراں بنایا گیا ہے اور جو چیزیں اس کی نگرانی میں دی گئیں اس کے متعلق اس سے سوال ہوگا۔ آدمی سے اس کے اہل وعیال کے متعلق باز پرس ہوگی۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سے قیامت کے دن ہماری بیوی اور بچوں کے متعلق سوال کریں گے کہ تم نے ان کو میرا دین سکھایا تھا کہ نہیں اور ان کے ایمان اور اسلام کی فکر کی تھی کہ نہیں؟ انہیں صحیح تربیت دی کہ نہیں اگر بندہ جواب میں **نعم** کہے گا اور اس نے دنیا میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہوگی پھر خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی رہا ہو تو یہ بری الذمہ ہو جائے گا اور نجات پائے گا اور اگر ایسا نہیں کیا تو پھر اس کو اس کی سزا دی جائے گی اور اس جرم میں ماخوذ کر لیا جائے گا اگر چہ خود اس کے نیک اعمال کتنے ہی ہوں مگر اہل وعیال کے سلسلے میں ذمہ داری پوری نہ کرنے کی وجہ سے وہ ماخوذ ہوگا۔

اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ ایک والد نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آ کر اپنی اولاد کی نافرمانی کی شکایت کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اولاد کو بلایا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین آپ ذرا میرے والد سے پوچھو کہ انہوں نے میرا کوئی حق ادا کیا ہے؟ کیونکہ ان پر میرے تین حقوق تھے (۱) قوم کی کسی باعزت آزاد عورت سے شادی کرتے۔ (۲) میرا نام صحیح رکھتے۔ (۳) مجھے تعلیم وتربیت دیتے۔ جب کہ انہوں نے ان میں سے میرا کوئی بھی حق ادا نہیں کیا نہ تو باعزت عورت سے شادی کی نہ میرا نام صحیح رکھا بلکہ میرا نام جعل رکھا ہے جو گندگی کے کیڑے کو کہتے ہیں اور نہ میری دینی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو والد کو اپنے پاس سے نکال دیا اور یہ فرمایا اس کی

نافرمانی کرنے سے پہلے تم نے اس کے سلسلے میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کرکے اس پر ظلم کیا ہے۔ (تربیت اولاد)

اسی لیے قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾

(سورۃ التحریم، آیۃ ۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! (جب رسول کی بیبیوں کو بھی عمل صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر مامور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کرکے عملِ صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب اُمت پر بھی یہ فریضہ اور زیادہ مؤکد ہوگیا کہ اپنے اہل وعیال کی اصلاحِ اعمال واخلاق میں غفلت نہ برتیں اس لیے حکم دیا گیا کہ) تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود اطاعت احکام کرنا اور گھر والوں کو بچانا اُن کو احکامِ الٰہیہ کا سکھانا اور اُن پر عمل کرانے کے لیے زبان سے ہاتھ سے بقدر امکان کوشش کرنا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۵۰۱)

اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو دین کا علم سکھاؤ اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام کرو جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب نے تفسیر معارف القرآن میں ذکر فرمایا ہے۔

قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ (الآیۃ) اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی پھر نارِ جہنم کی ہولناک شدت کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا وہ کسی زور طاقت جتھہ یا خوشامد یا رشوت کے ذریعہ اُن فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا جو جہنم پر مسلط ہیں جن کا نام زبانیہ ہے۔

لفظ اَهْلِیْكُمْ میں اہل وعیال سب داخل ہیں جن میں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکامِ الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل وعیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے اُن کاموں سے ان سب کو منع کرو اور جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے اُن کے کرنے کا اہل وعیال کو بھی حکم کرو تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔ (روح المعانی)

حضراتِ فقہاء نے فرمایا اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اُس پر عمل کرانے کے لیے کوشش کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری

زکوٰۃ، تمہارا مسکین، تمہارا یتیم، تمہارے پڑوسی، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔ تمہاری نماز، تمہارا روزہ، وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا خیال رکھو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے اور مسکینکم یتیمکم وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں اُن کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل و غافل ہوں۔ (معارف القرآن، جلد ۸، صفحہ ۵۰۲)

مزید اس سلسلے کی تفصیل احقر کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ ایک مستقل مضمون ہے، جس پر علیحدہ سے مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں۔

اپنے گریبان میں ذرا ایک نظر

میرے دوستو اور بھائیو! آج جب ہم اپنے اردگرد کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑے افسوس اور دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ عام طور پر آج ہماری توجہ اور سعی و کوشش صرف ایک بات پر خرچ ہو رہی ہے اور اسی کی خاطر ہماری قیمتی صلاحیتیں استعمال میں آرہی ہیں اور عمر عزیز اس کی خاطر پگھلتی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ ہم میں سے ہر ایک اس تمنا میں ہے کہ میں کس طرح دولت بنانے کی مشین بن جاؤں اور اپنے موجودہ راس المال کو میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بڑھا سکوں۔ صبح اٹھتے ہی دل ودماغ پر یہی ایک فکر سوار رہتی ہے اور اسی دھن اور دھیان میں رات کو اپنے بستروں میں لیٹے ہوئے ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں کتنے ہی لوگ نیند کی نعمت سے محروم اور سکون کی لذت سے نا آشنا ہو چکے ہیں اور ان کو ہر وقت ذہنی تناؤ اور دماغی کھچاؤ اور ٹینشن و ڈیپریشن جیسے حالات کا شکار ہونا پڑ رہا ہے نہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی خیال، نہ اپنے معمولات اور اوراد و وظائف کا کوئی اہتمام، نہ تعلیم و تربیت سے متعلق کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا گھر میں کوئی خاص نظام اور نہ اپنے گھر والوں میں اسلامی مزاج اور دینی طبیعت پیدا کرنے کے لیے ان کے ساتھ گھر کے اندر رہ کر کچھ اوقات گزارنے کی کوئی فکر، نہ صبح سے شام تک اس کا کوئی خیال آتا ہے کہ میرے بچوں کے اوقات کہاں، کس کے ساتھ، اور کس طرح گزر رہے ہیں جس کے نتیجے میں نسلوں کی نسلیں تباہی اور بربادی کے دہانے پر کھڑی ہیں اور فحاشی اور عریانیت اور ننگے پن اور بے حیائی کے سیلاب میں غرق ہیں اور اپنی من مانی زندگی گزار کر دین و دنیا کے خسارے میں مبتلا ہیں۔

آہ! اے آج کے مسلمان! اگر تو نے اپنے بچوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، پلنے بڑھنے، اور پہننے اوڑھنے کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر کی اور ان کو اچھے مکان میں رکھنے اور اچھی گاڑیوں میں چلنے پھرنے کے لیے محنت اور جدوجہد کی ہے اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے شب و روز کی محنتیں اٹھا کر ان کے لیے ہر چیز بہتر سے بہتر بنانے کی فکر کی ہے تو بہت مبارک اور بہت قابل صد خوشی ہے۔

مگر دوسری طرف ان کی جو اصل غذا تھی اور جو ایمان کا جوہر تھا عمل صالح کی دولت تھی اور گناہوں سے بچا کر تقویٰ والی حیات کی نعمت عظمیٰ کا حصول تھا اس سے آخر کیوں صرف نظر کیا گیا؟ اور اس طرف آخر کیوں نظر نہ ڈالی گئی؟ جب کہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں اللہ و رسول کے کئے گئے وعدوں پر پورا اعتماد اور بھروسہ رکھتے ہوئے اور پوری تاریخ کی اس پر شہادت اور گواہی کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ میں اور آپ اور ہمارے بچے اگر اپنی سب فکروں کو صرف ایک کام کی طرف کر دیتے جو کہ ہماری ڈیوٹی اور ذمہ داری اور منجاب اللہ ہمارا فریضہ مقرر کیا گیا تھا تو پھر ان ساری فکروں کی طرف سے اللہ تعالیٰ ہمیں مکمل طور پر کافی ہو جاتے جیسا کہ تاریخ کے اوراق کھولنے سے یہ بات اظہر من الشمس نظر آجائے گی۔

ہم اپنا کام کریں، اللہ اپنا کام کریں گے

اور ہمارا وہ فریضہ اور ذمہ داری قرآن نے ان الفاظ میں بیان کی:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾

(سورۃ الطلاق، آیۃ ۲)

ترجمہ: جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیں گے اور اس کو بے گمان رزق عطا فرمادیں گے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۸۷ تا ۴۸۸)

لفظ تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنے بچنے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت ونسبت ہوتی ہے تو ترجمہ اللہ سے ڈرنے کا کر دیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے بچے اور ڈرے۔

اس آیت میں تقویٰ کی دو برکتیں بیان فرمائی ہیں۔ اوّل یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکال دیتے ہیں۔ کس چیز سے بچنا؟ اس میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے دنیا کی سب مشکلات و مصائب کے لیے بھی اور آخرت کی سب مشکلات ومصائب کے لیے بھی اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کے لیے دنیا وآخرت کی ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں، اور دوسری برکت یہ ہے کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں کا اس کو خیال وگمان بھی نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہی ہے کہ رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، مؤمن متقی کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس کی ہر مشکل کو بھی آسان کر دیتا ہے اور اس کی ضروریات کا بھی تکفل کرتا ہے اور ایسے راستوں سے اس کی ضروریات مہیا کر دیتا ہے جس کا اس کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ (کذا فی الروح)

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ سے روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے لڑکے سالم کو دُشمن گرفتار کر کے لے گئے، اس کی ماں سخت پریشان ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اور لڑکے کی والدہ کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت کے ساتھ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھا کرو۔ ان دونوں نے حکم کی تعمیل کی۔ کثرت سے یہ کلمہ پڑھنے لگے، اس کا یہ اثر ہوا کہ جن دُشمنوں نے لڑکے کو قید کر رکھا تھا وہ کسی روز ذرا غافل ہوئے، لڑکا کسی طرح اُن کی قید سے نکل گیا اور اُن کی کچھ بکریاں ہنکا کر ساتھ لے کر اپنے والد کے پاس پہنچ گیا۔

بعض روایات میں ہے کہ اُن کا ایک اونٹ ان کو مل گیا، اس پر سوار ہوئے اور دوسرے اونٹوں کو ساتھ لگایا، سب کو لے کر والد کے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے والد یہ خبر لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال بھی کیا کہ یہ اونٹ بکریاں جو میرا لڑکا ساتھ لایا ہے، یہ ہمارے لیے جائز وحلال ہیں یا نہیں؟ ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا.

اور بعض روایات میں ہے کہ عوف بن مالک اشجعی اور ان کی بیوی کو جب لڑکے کی مفارقت نے زیادہ بے چین کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا، اور اس میں کچھ بُعد نہیں کہ تقوے کا حکم دیا ہو اور بکثرت لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھنے کا بھی۔ (معارف القرآن، جلد۸، صفحہ۴۸۶)

مقاصد کے حصول کا مجرب نسخہ

حدیث مذکور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کو مصیبت سے نجات اور حصولِ مقصد کے لیے یہ تلقین فرمائی کہ کثرت کے ساتھ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھا کریں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دینی اور دنیاوی ہر قسم کے مصائب اور مضرتوں سے بچنے اور منافع و مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کلمہ کی کثرت بہت مجرب عمل ہے اور اس کثرت کی مقدار حضرت مجدد رحمہ اللہ نے یہ بتلائی ہے کہ روزانہ پانچ سو مرتبہ یہ کلمہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھا کرے اور سو سو مرتبہ درود شریف اس کے اوّل و آخر میں پڑھ کر اپنے مقصد کے لیے دعا کیا کرے۔ (تفسیر مظہری)

اور امام احمد رحمہ اللہ، اور حاکم بیہقی، ابو نعیم وغیرہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز اس آیت وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا کی تلاوت بار بار فرماتے رہے، یہاں تک کہ مجھے نیند آنے لگی، پھر فرمایا کہ اے ابوذر! اگر سب آدمی صرف اس آیت کو اختیار کر لیں تو سب کے لیے کافی ہے۔ (روح المعانی) کافی ہونے کی مراد ظاہر ہے کہ تمام دینی اور دنیوی مقاصد میں کامیابی کے لیے کافی ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کرے گا اللہ اس کی مہمات کے لیے کافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کام کو جس طرح چاہے

پورا کر کے رہتا ہے، اُس کی ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے، اسی کے مطابق سب کام ہوتے ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

﴿لَو انّكُم كُنتُم تَوكّلُونَ علَى اللهِ حَقَّ تَوكُّلِهٖ لَرُزِقتُم كَمَا تُرزَقُ الطَّيرُ تَغدُو خِمَاصًا وَتَرُوحُ بِطَانًا﴾

(سنن الترمذی، ابواب الزہد ج ۲ ص ۶۰)

اگر تم اللہ پر توکل کرتے جیسا کہ اس کا حق ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسا پرندے جانوروں کو دیتا ہے کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس ہوتے ہیں۔

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہوں گے، اُن کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہوں گے۔ (مظہری)

توکل کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے اسباب و آلات کو چھوڑ دے بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب اختیاریہ کو ضرور اختیار کرے مگر بھروسہ اسباب پر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر کرے کہ جب تک اُس کی مشیت و ارادہ نہ ہو جائے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

یعنی کہ تم اپنے کام پر لگو یعنی میرے متقی بندے بن کر زندگی گزارو، میرے احکام بجا لاؤ اور میری نافرمانیوں سے مکمل پرہیز کرو تو میں ساری مشکلات سے بچنے کا راستہ تمہارے لیے نکال دوں گا اور تمہارے رزق و روزی کا انتظام ایسی جگہ سے کر دوں گا کہ جس کا تمہیں خیال بھی نہ ہوگا۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق اور روزی کا انتظام ہر جاندار مخلوق کے لیے اپنی طرف سے مقرر فرمایا ہے جس میں تمام انسان اور پھر ان انسانوں میں تمام اہلِ ایمان بدرجۂ اولیٰ داخل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے رزق کی جانب سے فکرمند ہونا اور ذہنی طور پر پریشان ہونا مؤمن کی شان نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت ابو موسیٰ اور ابو مالک وغیرہ قبیلہ اشعریین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ توشہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لیے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرما دیں۔ یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھ رہے تھے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا اس شخص کو یہ آیت سن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں، وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کر کے وہیں سے واپس ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا۔

واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہو جاؤ! تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد آ رہی ہے۔ اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسبِ قرارداد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے، وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے۔ وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا دو آدمی ایک (قصعہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اُٹھائے لا رہے ہیں۔ (قصعہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تشلہ یا سینی) لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا۔ انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پھر بھی بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تا کہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صرف فرمادیں۔ اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ کا بھیجا ہوا کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس ولذیذ تھا۔'' آپ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے نہیں بلکہ اُس ذاتِ قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لیا ہے۔''

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہِ طور پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیاتِ الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت ورسالت عطا ہو ... عون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لیے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں، اس کا کون متکفل ہوگا؟ اس خیال کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں۔ انہوں نے تعمیلِ حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا۔ حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں۔ ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا۔ اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتّہ تھا۔

حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا، مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہوگئے۔ زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہے وہاں جا رہا ہوں۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۵۹۲)

اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے مختصر سے لفظوں میں ہماری ساری فکروں کا علاج یوں پیش کیا ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق، آیۃ:۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۴۷۲)

اگر تم اپنی ذمہ داری پوری کرو گے اور وہ اس طرح کہ تم تقویٰ والی حیات کے ساتھ متقی بن کر رہو گے تو میں تمہاری ہر نوع کی مشکل کو آسان کر دوں گا خواہ داخلی مشکل ہو یا بیرونی، معاشی واقتصادی مشکل ہو یا گھریلو اور خاندانی، اجتماعی نوعیت کی ہو یا انفرادی، غرض کہ جس لائن کی بھی چھوٹی یا بڑی مشکل کا سامنا ہو تقویٰ کی برکت سے اور اللہ کا صحیح بندہ بننے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سب کو آسان فرما دیتے ہیں اور ایسے ایسے راستوں سے مشکلات کا حل نکلتا ہے کہ اللہ کا یہ نیک بندہ اس طرف کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بظاہر اسباب کی دنیا میں نظر کرتے ہوئے ان مشکلات کے حل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی مگر اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کے سارے کام بناتے چلے جاتے ہیں اور آفات وبلیات سے بچاتے ہوئے راستے کی سب مشکلات ہٹا دیتے ہیں۔

بس بنیادی بات یہ ہوئی کہ ہم اور ہمارے اہل وعیال اپنے فریضے کی ادائیگی پر لگ جائیں تو باقی جتنی ہماری فکریں ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائیں گی اس طرف ہمیں سوچنے کی حاجت وضرورت بھی نہیں رہے گی۔

توفیقِ الٰہی اور فضلِ الٰہی سے احقر تحدیث نعمت کے طور پر یہ بات عرض کرتا ہے کہ احقر نے اتوار کی صبح کی مجلس میں حضرت والا دامت برکاتہم کی موجودگی میں جب یہ مضمون ان اشعار کے ضمن میں بیان کیا اور مجمع کو خطاب کر کے یہ بات عرض کی کہ آج احقر آپ لوگوں کو ان اشعار کی تشریح کی برکت سے اولاد سے محبت کرنا سکھانا چاہتا ہے اور اپنی اولاد سے دوستی ودشمنی کا فرق ظاہر کرنا چاہتا ہے تو بحمد للہ اپنے اہل ایمان بعض مسلمان بھائیوں کی طبیعتوں پر ایسا اثر پڑا کہ ان کی چیخیں نکل گئیں اور انہیں اولاد کے سلسلے میں اپنی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد آنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ کی گئی زیادتیاں اور حقیقی بدسلوکی سامنے آ گئی۔

اے اللہ! کتاب کی ان سطروں کے پڑھنے والے کے لیے بھی اس مضمون میں ایسی ہی تاثیر پیدا کر دیجیے کہ جو بھی پڑھ لے اس کی دل کی کایا پلٹ جائے اور اولاد کے سلسلے کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد آ جائے اور عمل کی توفیق ہو جائے۔ **وما علینا الاّ البلاغ.**

اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔
اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔
اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔

جملہ مشکلاتِ دنیویہ واُخرویہ کے سوفیصد یقینی حل کے لیے پانچ اعمال

از مرتب وشارح ''عرفان محبت''، حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند، استاذ حدیث دارالعلوم آزادل ول، جنوبی افریقہ

آج کل عام طور پر دنیا بھر میں مسلمان مختلف قسم کی پریشانیوں اور اُلجھنوں کا شکار ہیں۔ مگر افسوس یہ ہوتا ہے کہ اُن کے دور کرنے اور اُن سے حفاظت کی حقیقی اور صحیح تدابیر اختیار نہیں کی جاتی۔ بلکہ خود اپنے طور پر جو کچھ ذہن میں آتا ہے اُسی پر عمل کرلیا جاتا ہے جبکہ اللہ ورسول نے دنیا وآخرت کی ہر مشکل اور پریشانی سے نجات کے لیے قرآن وسنت میں ایسے اعمال بیان فرمائے ہیں کہ جن کے کرلینے کے بعد بلا شک وشبہ یقینی طور پر اس مقصود کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اپنے مسلمان بھائیوں کے فائدے کے لیے خلاصہ کے طور پر پانچ باتوں کو لکھا جاتا ہے جن کو کرلینے کے بعد ان شاء اللہ ہماری ہر طرح کی مشکل آسانی میں بدل جائے گی۔ فقر وغربت کا معاملہ ہو یا مرض وصحت کی اُلجھن ہو، اختلاف ورنجش اور دُشمنی وعداوت کی تلخیاں ہوں یا اپنے اور غیروں کی طرف سے پہنچنے والی ایذائیں اور تکلیفیں ہوں، اہل وعیال اور بیوی بچوں کی طرف سے ناگوار اور تکلیف دہ حالات کا سامنا ہو یا اولاد کے مناسب رشتے اور جوڑوں کے نہ ملنے کے باعث ذہنی پریشانی اور دماغی ٹینشن رہتی ہو۔

اعمالِ خمسہ

(۱)...... سب سے اہم اور ضروری عمل یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں مکمل تقویٰ اختیار کریں۔ جس کا مطلب تمام گناہوں کو چھوڑنا اور احکامِ خداوندی کو بجالانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ قرآن کریم میں مذکور ہے: ''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ **یجعل له مخرجا، ویرزقه من حیث لایحتسب**'' اور ارشادِ باری تعالیٰ **ومن یتق الله یجعل له من امره یسرًا**، کہ جو بندہ تقویٰ اختیار کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے تمام مشکلات ومصائب (دنیاویہ واخرویہ) سے نکلنے کا راستہ بنادیں گے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق (اور دوسری جملہ ضرورتیں) عطا کریں گے جہاں سے اُس کا گمان بھی نہ ہوگا۔ اور جو تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اُس کے تمام مشکل معاملات کو آسان کردیں گے۔

صاحبو! سوچو تو صحیح کہ یہ کس کا وعدہ ہے۔ یاد رکھو! یہ وعدہ چودہ سو سال سے قیامت تک کے لیے ہے اور رہے گا۔ اور اللہ ہر زمانے اس کو پورا کرتے رہیں گے، مگر افسوس کہ ہم پورے طور پر تقویٰ اختیار نہیں کرتے اور خود اپنے حالات درست کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ جبکہ ہماری ہر چھوٹی بڑی حالت اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ تو اگر ہم نے اُس کو راضی کرلیا تو سمجھو کہ پھر ہمارے تمام مصائب حق تعالیٰ کی طرف سے آسان ہوتے رہیں گے۔

(۲)...... صلوٰۃ الحاجت پڑھنا اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنا یعنی جو اہم معاملہ اور مشکل کام درپیش ہو تو اس کے لیے دو رکعت نماز پڑھ کر اور سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو نماز کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ سورۂ یٰسین شریف جس مقصد کے لیے پڑھی جاتی ہے تو وہ پورا ہوجاتا ہے۔

(۳)...... صدق دل سے اپنے تمام گناہوں سے توبہ واستغفار کرنا جیسا کہ قرآن کریم میں کئی آیتوں میں یہ مضمون مذکور ہے کہ اے میرے بندو اگر تم توبہ استغفار کروتو میں تمہارے اوپر دنیا وآخرت کی نعمتوں کی بارش برسادوں گا بارشوں کا برسایا

جانا اور مال واولاد کا ملنا اور زمین وآسمان سے برکتوں کے دہانے کھول دیا جانا غرض کہ ہر نعمت وراحت کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ واستغفار پر کیا گیا ہے۔بس شرط یہ ہے کہ حقیقی توبہ واستغفار ہو کہ اپنے کیے پر پوری ندامت اور ہر قسم کے گناہ سے مکمل دوری اور آئیندہ کے لیے دور رہنے کا پختہ عزم ہو۔

(۴)......**لاحول و لا قوة الا باللہ اور لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین** کی کثرت کیونکہ احادیث شریفہ کی روشنی میں یہ مضمون ثابت ہے کہ ان دونوں کلمات کی کثرت سے بڑی سے بڑی اور سخت سے سخت مشکل اللہ تعالیٰ آسان فرمادیتے ہیں یہاں تک کہ قید سے رہائی اور چھٹکارا بھی ان کی برکت سے نصیب ہوتا ہے۔(معارف القرآن)

مگر اپنی صحت وقوت کے مطابق اتنی ہی مقدار پڑھے جو بسہولت اور آسانی پڑھی جا سکے جس کے لیے کم سے کم مناسب مقدار ستر ۷۰ مرتبہ پڑھنا ہے۔اور اسی کے ساتھ ساتھ درود شریف کا پڑھنا بھی ہے کہ اس کی کثرت سے ضرورتوں کا پورا ہونا اور گناہوں کا معاف کیا جانا حدیث شریف میں وارد ہے اور خاص طور پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ عشاء کے بعد ستر ۷۰ مرتبہ صلوٰۃ تنجینا کا پڑھنا مصائب وحوادث سے حفاظت کے لیے اکسیر ہے۔(فضائل درود شریف حضرت شیخ الحدیث)

﴿اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوةً تُنْجِیْنَا بِهَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَهْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِهَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّاٰتِ وَتَرْفَعُنَا بِهَا عِنْدَکَ اَعْلَی الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِهَا اَقْصَی الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

(۵)......اپنے خاص مقصد اور ضرورت کے لیے اور ذہن میں سوچی ہوئی مشکل کے دور کرنے کے لیے کچھ اللہ کی راہ میں صدقہ اور خیرات کرنا کیونکہ از روئے حدیث شریف صدقات سے بلائیں ٹلتی ہیں اور اللہ کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔

نوٹ: جملہ فرائض وواجبات خاص طور پر پانچوں وقت کی نماز باجماعت اور سنن مؤکدہ کی ادائیگی اور گناہوں سے مکمل حفاظت کے ساتھ ان مذکورہ اعمال خمسہ پر کچھ دنوں مداومت اور پابندی سے ہی ان شاء اللہ ہر قسم کی الجھنیں اور پریشانیاں دور ہوتی نظر آئیں گی مگر ہمیں اپنے ذہن میں یہ نہ سوچنا چاہیے کہ اس قسم کے معمولات پڑھ کر ہم اللہ تعالیٰ کو مجبور کردیں گے اور پھر ضرور ہمارے ذہن میں سوچے ہوئے ہمارے تمام پروگرام آسان ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ مومن کی اصل شان بندگی ہے اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر قدم پر اللہ ہی سے مدد چاہے اور اسی کی طرف رجوع ہو اور یہ اعمال خمسہ بھی اسی رجوع اور بندگی کی ایک شکل ہے مگر پھر جو بھی اللہ کا فیصلہ ہو اس پر دل سے راضی رہے اور اسی کو اپنے لیے خیر تصور کرے۔

صاحبو! آج بہت سے لوگ اس قسم کے تعویذات ایجاد کیے ہوئے ہیں کہ جن میں گناہوں کو چھوڑے بغیر اور طاعات کی پابندی کیے بغیر ان کی طرف سے تمام مشکلات دور کرنے کا دعویٰ ہوتا ہے یاد رکھنا یہ سراسر دھوکہ ہے اور یہ دعویٰ بے بنیاد ہے پوری شریعت اسلامیہ میں ایسا کوئی تعویذ اور عمل نہیں ہے کہ اللہ کی نافرمانیوں میں مبتلا رہ کر اس کے ذریعے انسان کو پرسکون زندگی میسر آجائے اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا آخرت کی تمام مشکلات سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب کا مقدر عافیت دارین ہو اور ہمیں دین کی صحیح سمجھ نصیب ہوجائے۔